مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

نصیحۃ الشیعہ

مکمل

ہر سہ جلد

مصنفہ

فاضل اجل مناظر اسلام حضرت مولانا محمد احتشام الدین صاحب

مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مکتبہ صدیقیہ ملتان پاکستان

قیمت ٦ روپے

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ

نصیحۃ الشیعہ

مکمل

ہر سہ جلد

مصنفہ

فاضل اجل مناظر اسلام حضرت مولانا محمد احتشام الدین صاحب

مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر

مکتبہ صدیقیہ ملتان پاکستان

قیمت ۶ روپے

فہرست مطالب نصیحۃ الشیعہ جلد اوّل

فہرست مضامین نصیحۃ الشیعہ جلد دوم

فتنہ ابن سبا

یہ کتاب "مکتبہ صدیقیہ ملتان" سے دستیاب ہوتی ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مذہب شیعہ کی بنیاد ابن سبا یہودی منافق نے رکھی تھی۔ کتاب ہٰذا کے متعلق حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی مدظلہٗ کی رائے ملاحظہ فرماویں:۔

رائے عالی جناب حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

یہ کتاب "فتنۂ ابن سبا" ایک ایسے مخلص کی تالیف لطیف ہے جنہوں نے اپنے نام کا بھی اظہار نہیں کیا۔

میں نے پوری کتاب کو غائر نظر سے دیکھا۔ ابن سبا کی ایسی مفصل تاریخ اور جن جن تدابیر سے اس نے مذہب شیعہ کی بنیاد رکھی اور اس کی اشاعت کی، اس تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ شاید اس سے پہلے کسی نے نہیں لکھا۔ کتب شیعہ کے جس قدر حوالے اس کتاب میں ہیں وہ سب صحیح ہیں۔ ان کی صحت کی میں ذمہ واری لیتا ہوں۔

اس کتاب سے یقیناً شیعوں میں ایک جنبش پیدا ہوگی اور کچھ عجب نہیں کہ اس کا جواب بھی لکھا جائے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شیعہ صاحبوں کے لیے کسی کتاب کا جواب لکھ ڈالنا کچھ دشوار بھی نہیں۔ جب اس بات کی پابندی نہ ہو کہ جواب کیسا ہونا چاہیے تو پھر میدان وسیع ہے

لیکن اگر انصاف کی نظر سے اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے گا پھر جواب مشکل ہے۔

واللہ متم نورہٖ

کتبہٗ احقر عباداللہ محمد عبدالشکور عافاہ مولاہ

ناشر:۔ مکتبہ صدیقیہ ملتان شہر

دیباچہ

از حضرت الحاج مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی مدظلہ العالی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے جس نے اس اُمت مرحومہ کو ہدایت عالم کے لیے پیدا فرمایا اور امر معروف و نہی منکر کا فریضہ اُس کے سپرد کر کے علمائے اُمت کو نیابت پیغمبر کا منصب عطا فرمایا کما قال عزوجل کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ

اور درود نا محدود اُس ہادی برحق پر جس نے بلاغ مبین اور اشاعت دین متین میں وہ کام کیا جس کی مثال حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک کہیں نہیں ملتی (علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام) اس امام الانبیاء نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک اُمی گروہ کو ورطۂ ضلالت سے نکال کر ہدایت کی معراج پر پہونچا دیا ذٰلِکَ مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ عَلَیۡنَا وَ عَلَی النَّاسِ وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَشۡکُرُوۡنَ ۝

اما بعد کتاب نصیحت الشیعہ (جس کو جناب مولوی احتشام الدین صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تصنیف فرمایا اور افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور صرف تین جلدیں اس کتاب کی مکمل ہوئیں) ایک عجیب

کتاب ہے۔ استدلال کی متانت، عبارت کی صفائی اور سلاست، طرز بیان اور سلیقۂ تفہیم کی نفاست غرض ہر حیثیت سے یہ کتاب اہل علم کے نزدیک قابلِ پسند اور اپنے مصنف کی قابلیت اور عالی دماغی کی شاہد عادل ہے۔

میرے خیال میں اردو زبان میں اس سے پہلے شاید ان خوبیوں کے ساتھ اس مبحث میں کوئی کتاب نہ لکھی گئی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر دے اور اس بہترین تصنیف کے صلہ میں ان کو اپنی رضامندی کی گراں بہا خلعت عطا فرمائے۔ آمین۔

مگر مدت سے یہ کتاب[ا] نایاب ہے۔ یقیناً اگر ایسی عمدہ کتاب دوسری قوم میں ہوتی تو بار بار چھپتی اور بڑی قدر کی جاتی۔

نصیحۃ الشیعہ کے جواب کے چند نمونے

واضح ہو کہ نصیحۃ الشیعہ کے جواب میں صدر المحققین صاحب نے تیزی اور تیز روی کا اظہار تو خوب کیا ہے مگر سوا طولِ فضول کے اور سوا بے تعلق باتوں میں اوراق سیاہ کرنے کے ایک بات بھی کام کی نہیں لکھی۔ اور عبارت اس قدر اُلجھی ہوئی ہے کہ اس کو دیکھ کر یہ شعر مشہور یاد آجاتا ہے ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ا؎ یہ کتاب پہلے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب نے شائع فرمائی تھی جس میں حضرت مدظلہ نے ہر جلد کے اخیر میں ایک تکملہ کا اضافہ کر دیا جس سے مصنف کے اصل مباحث کو بجز ضرورت مزید قوت پہنچائی گئی یا اس مبحث کی تکمیل کر دی گئی اس طرح سے گویا یہ کتاب ایک مکمل شرح کے ساتھ ہوگئی۔ اب مکتبہ صدیقیہ

بااین ہمہ پوری کتاب کا کیا نصف کتاب کا جواب بھی نہیں دیا اور مہر خاموشی لگا کر بیٹھ رہے۔

روشنی[ب] کے شروع میں آٹھ صفحہ کی تمہید ہے۔ اس تمہید میں حسبِ ذیل گراں قدر افادات ہیں:—

(۱) مصنف رحمۃ اللہ علیہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ آپ کی اس کتاب کا کوئی اثر شیعوں پر نہ پڑے گا بلکہ شیعہ آپ کے سایہ سے بھاگیں گے۔

مقصد یہ ہے کہ مصنف اپنی محنت کو بے نتیجہ سمجھ کر نصیحۃ الشیعہ کی تصنیف کا سلسلہ آگے نہ بڑھائیں۔

(۲) فرماتے ہیں کہ شیعہ اپنے زندہ مجتہد کے فتوے پر عمل کرتے ہیں اور جو مجتہد مر گیا اس کا فتویٰ بھی مر گیا۔

مطلب یہ ہے کہ مصنف نے نصیحۃ الشیعہ میں جن کتبِ شیعہ کے حوالے دیے ہیں چونکہ ان کتب کے مصنفین مر چکے ہیں اس لیے شیعوں کا عمل ان کتابوں پر نہیں ہے لہٰذا ان کتابوں کی عبارتوں کا نقل کرنا بے سود ہے۔

اس مضمون کی لطافت کے متعلق کچھ عرض کرنا بے سود ہے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایسا کہنے والا خود اپنی مغلوبیت کا معترف ہے۔

ب؎ روشنی حسبِ مقولہ برعکس نہند نام زنگی کافور اس کتاب کا نام ہے جو کسی مجیب نے جس کا نام پردۂ راز میں رکھا گیا تھا شائع کی تھی اس میں نصیحۃ الشیعہ کا ناکام جواب دینے کی کوشش کی گئی۔ آخر پتہ چل گیا کہ یہ جواب شیعوں کے قبلہ اور صدر المحققین شمس العلما، مولوی ناصر حسین مجتہد کی دماغ سوزی کا نتیجہ ہے۔

(۳) فرماتے ہیں کہ مصنف کو چاہیے تھا کہ اپنی نقل کی ہوئی روایات کا قطعی الصدور ہونا ثابت کرتے اور یہ بھی ثابت کرتے کہ ان احادیث کا جو مطلب انہوں نے بیان کیا وہی مطلب علمائے شیعہ بھی بیان کرتے ہیں۔

اے سبحان اللہ قطعی الصدور ہونے کی ایک رہی۔ بہت اچھا آپ بتا دیجیے کہ کون کون سی روایات آپ کے یہاں قطعی الصدور ہیں انشاء اللہ ہم انھیں سے استدلال کیا کریں گے۔ مگر پھر آپ بھی اہل سنت پر سوا قرآن پاک کے اور کسی چیز سے استدلال نہیں کر سکتے کیونکہ اہل سنت کے یہاں یہی مقدس کتاب اول سے آخر تک قطعی الصدور ہے اور بس۔

رہا ان احادیث کا مطلب تو اگر مصنف نے کہیں غلط مطلب بیان کیا ہو تو اس غلطی کا اظہار آپ کریں۔ یہ آپ کا فرض ہے۔

(۴) فرماتے ہیں کہ "شیعہ اثنا عشریہ کی بعض کتابوں میں ہر قسم کی حدیثیں جمع ہیں یہاں تک کہ مختلف۔ اور بعض اختلاف بھی ایسے ہیں کہ حلال و حرام و جواز و غیر جواز ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے غیر معتبر روایات کتب شیعہ سے نقل کر کے شیعوں پر الزام قائم کیا ہے۔

اس کے متعلق عرض یہ ہے کہ اگر مصنف نے ایسا کیا ہے تو آپ کا فرض تھا کہ آپ ظاہر کر دیتے کہ فلاں روایت مصنف کی نقل کی ہوئی غیر معتبر ہے اور اس کے غیر معتبر ہونے کے یہ وجوہ ہیں مگر آپ نے کہیں بھی ایسا نہ کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف نے کوئی غیر معتبر روایت نقل ہی نہیں کی۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ یہ سب باتیں آپ لوگ اپنے لیے تو کہا کرتے ہیں۔ مگر جب اہل سنت کی روایات سے اہل سنت پر کوئی الزام قائم کرنا چاہتے ہیں وہاں یہ سب بھول جاتے ہیں اس کا کیا سبب ہے؟۔

یہ حالت تو تمہید کی تھی۔ اب اصل جوابات کی حالت ملاحظہ ہو:-

پہلا نمونہ

مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی روایت اصول کافی سے یہ نقل کی ہے کہ ائمہ نے مذہب شیعہ کو چھپانے اور امر حق کو ظاہر نہ کرنے کی حد سے زیادہ تاکید کی ہے۔ (دیکھو نصیحۃ الشیعہ)

روشنی میں جو اس کا جواب دیا گیا ہے اس کا خلاصہ تین باتیں ہیں۔

(۱) یہ روایت تقیہ کے متعلق ہے۔ (۲) تقیہ کے معنی جھوٹ بولنے کے نہیں ہیں بلکہ پرہیز کرنا، پوشیدہ کرنا، راز کا چھپانا۔ (۳) سورۂ تحریم کی آیت وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ الخ نقل کی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی راز کو چھپایا۔

جواب یہ ہے کہ (۱) ہرگز یہ حدیث تقیہ کے متعلق نہیں ہے بلکہ کتمان کے متعلق ہے۔ اصول کافی میں باب الکتمان ایک علیحدہ باب ہے جو باب التقیہ کے بعد ہے اسی باب الکتمان میں یہ روایت ہے۔ (۲) تقیہ یقیناً جھوٹ بولنے کے معنی میں ہے جیسا کہ تکملہ میں انشاء اللہ تعالیٰ اس بات کو بہت صاف طور پر دکھایا جائے گا لیکن یہاں اس کی بحث ہی نہیں ہے مصنف نے کب کہا ہے کہ اس روایت سے جھوٹ بولنے کا

جواز ثابت ہوتا ہے لہٰذا شیعوں کے صدر المحققین نے یہ بات بالکل بے تعلق لکھ ڈالی۔

(۳) رازداری کا معیوب نہ ہونا اور خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کا ثبوت ہم تسلیم کرتے ہیں لیکن کلام اس میں ہے کہ آیا دین کوئی رازداری کی چیز ہے؟ آیاتِ قرآنی سے یا اہل سنت کی کسی روایت سے یہ ثابت کرتے کہ دین کو راز کہا گیا ہو یا دین کے چھپانے کا حکم دیا گیا ہو تو البتہ جواب الزامی درست ہو سکتا تھا۔ لیجیے ہم آپ کو دکھاتے ہیں کہ جو دین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے وہ ہرگز چھپانے کے لیے نہ تھا بلکہ عالم آشکار کرنے کے لیے تھا۔ قولہ تعالیٰ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ جو دین ایسا ہے کہ اس کو چھپانے کا حکم ہے اس کے ظاہر کرنے والے کو خدا ذلیل کرتا ہے وہ دین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا نہیں ہے۔

دوسرا نمونہ مصنف نے دوسری روایت کافی کی کتاب الروضہ سے اس مضمون کی نقل کی ہے کہ نجات کے لیے صرف محبت کافی ہے نماز روزہ کی بھی ضرورت نہیں۔ (دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول) صفحہ ۷

روشنی میں سب سے پہلے تو اعتراض کیا ہے کہ مصنف نے پوری روایت نقل نہ کی اور پھر خود پوری روایت نقل کر دی ہے لیکن یہ اعتراض تو اس وقت صحیح ہوتا جب کہ اس روایت کے باقی حصے میں کوئی مضمون اس کے خلاف ہوتا حالانکہ ہرگز ایسا نہیں ہے پھر اعتراض ہی کیا ہوا؟ اس اعتراض کے بعد اہل سنت کی کتابوں سے اس مضمون کی احادیث نقل کی ہیں کہ ہر آدمی قیامت کے دن اپنے محبوب کے ساتھ ہوگا۔ مطلب یہ کہ مصنف نے شیعوں کی روایت پر جو اعتراض کیا ہے وہ اعتراض خود اہل سنت کی روایات پر بھی ہوتا ہے

جواب اس کا یہ ہے کہ بالکل غلط ہے کہ اہل سنت کی روایات میں بھی یہ مضمون ہے۔ شیعوں کی روایت زیر بحث میں صاف تصریح نماز نہ پڑھنے اور روزہ نہ رکھنے کی موجود ہے۔ اہل سنت کی روایت میں یہ تصریح کہاں ہے؟ رہا یہ کہ محبت کو سبب معیت کا فرمایا گیا تو اس سے نفی اعمال کی نہیں نکلتی بلکہ اعمال کی ضرورت ثابت ہوتی ہے کیونکہ محبت کا خاصہ یہ ہے کہ محب کو محبوب کا متبع اور پیرو بنا دے۔

تیسرا نمونہ مصنف نے تیسری روایت اصول کافی سے یہ نقل کی ہے کہ ائمہ کے زمانہ کے شیعہ صفت امانت و صدق و وفا سے بے بہرہ تھے اور یہ صفتیں اُس وقت بھی اہل سنت میں تھیں۔ (دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول) صفحہ ۱۴

روشنی میں اس کا جواب جو کچھ بھی دیا گیا ہے وہ گھبراہٹ اور پریشانی کا ایک عمدہ مرقع ہے۔ اس خبط بے ربط تحریر کے جواب میں اس کے متعلق صرف تین باتیں ہیں۔

(۱) کتب اہل سنت سے یہ نقل کیا ہے کہ جو شخص امام وقت کو نہ مانے اس کا کوئی عمل مقبول نہیں مگر یہ بالکل غیر متعلق بات ہے۔ مصنف نے حدیث کے اس جزو پر کوئی اعتراض نہیں کیا کہ امام اپنے نہ ماننے والوں کو بے دین اور ناری بتاتے ہیں۔ مصنف نے تو صرف اس بات پر گرفت کی ہے کہ ائمہ کے زمانے میں بھی شیعہ صفت امانت وصدق و وفا سے بے نصیب تھے۔

(۲) حدیث میں یہ تاویل کی ہے کہ کل شیعوں کی حالت نہیں بیان ہوئی بلکہ صرف بعض شیعوں کی، اور وہ بھی عوام ان صفات سے محروم تھے اور بعض اہل سنت بھی ان صفات سے موصوف تھے۔

مگر افسوس کہ روایت کے الفاظ اس تاویل کو قبول نہیں کرتے بدو وجہ۔

اوّل یہ کہ روایت میں اقوام یتولونکم کا لفظ ہے جو تمام شیعوں کو شامل ہے بعض
ہرگز مراد نہیں ہو سکتے۔ وجہ دوم یہ کہ اگر یہ حالت بعض شیعہ سُنیوں کی ہوتی تو اس
میں تعجب کی کیا بات تھی۔ خود رد روشنی والے لکھتے ہیں کہ ایسا ہوا کرتا ہے۔ حالانکہ روایت
میں اس پر تعجب ظاہر کیا گیا ہے اور وہ بھی معمولی نہیں بلکہ بہت تعجب لہٰذا صاف ظاہر
ہو گیا کہ روایت میں شیعوں کے کل افراد اور سُنیوں کے کل افراد کی حالت بیان ہوئی ہے۔

(۳) اہل سنت کے اسماء الرجال سے بعض شیعوں کی توثیق نقل کی ہے مطلب یہ
کہ شیعوں میں ان صفات کا ہونا اہل سنت نے تسلیم کر لیا ہے۔

جواب یہ ہے کہ اہل سنت کی تسلیم سے آپ کو کیا مطلب؟ جب کہ آپ
کے امام نے آپ کو ان صفات سے بے بہرہ بتا دیا۔ علمائے اہلسنت کی توثیق کی وجہ تو
ظاہر ہے کہ وہ عالم الغیب نہ تھے۔ شیعہ اپنا مذہب چھپاتے تھے۔ لہٰذا ان کو
مذہب شیعہ کی حقیقت سے واقفیت نہیں ہوئی کہ اس مذہب میں جھوٹ
بولنا جائز ہی نہیں بلکہ عبادت ہے اور انہوں نے ان کی توثیق کر دی۔ جرح و
تعدیل ایک دوسری چیز ہے اس کو اس بحث سے کیا تعلق۔

یہ تین ۳ نمونے روشنی کے جوابات کی حقیقت سمجھنے کے لیے کافی ہیں
وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۝

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ الذی انزل الفرقان المبین والصلوۃ علی رسولہ
الذی ارسل رحمۃ للعالمین وعلی الہ الطیبین الطاہرین و
علی الذین جاھدوا معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم
من الانصار والمھاجرین ۝

امّا بعد:۔ بندۂ مسکین محمد احتشام الدین مرادآبادی
غفرلہ اللہ الہادی اس رسالہ نصیحۃ الشیعہ کو بندگان خدا کی خدمت میں
پیش کرتا ہے۔ مجیب الدعوات سے دعا ہے کہ اس کو قبول فرما کر ذریعہ
ہدایت بنائے۔ حضرات اہل سنت سے امید ہے کہ میری محنت کی قدر
فرما کر دعائے خیر سے یاد کریں گے۔ حضرات شیعہ کی خدمت میں التماس
ہے کہ تعصب سے قطع نظر کرکے انصاف کی نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں۔
من یھدی اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی
لہ۔

شیعوں کی روایتیں جو اس کتاب میں مذکور ہوں گی وہ اکثر ایسی ہوں گی جو کتب شیعہ مثل کافی وغیرہ سے میں نے بچشم خود دیکھ کر نقل کی ہیں اُن کو میں بلاواسطہ کتب شیعہ کے حوالے سے لکھوں گا۔ اور اگر کتب مطبوعہ سے نقل ہے تو صفحات کا پتہ بھی بتادوں گا۔ اور جو روایتیں کتب مناظرہ مثل تحفہ یا ازالۃ الغین سے نقل کروں گا اُن میں ان کتب مناظرہ کا واسطہ ظاہر کر دوں گا۔ یہ بارِ عظیم جو میں نے اپنے سر پر لیا ہے ایسا مشکل کام ہے جو میرے حوصلہ سے باہر ہے۔ مگر اللہ کے فضل سے بہت کچھ امید ہے اور اسی کی مدد پر بھروسہ کرکے اب میں اصل مدعا شروع کرتا ہوں وھو حسبی و نعم الوکیل۔

سبب اس کی تالیف کا یہ ہوا کہ حسب اتفاق آج کل میری نظر بعض کتب احادیث شیعہ پر پڑی تو مجھ کو سخت تعجب ہوا کہ حضرات شیعہ اس امر پر کیوں نہیں غور کرتے کہ ان کی روایتیں نصوص قرآنی بلکہ شہادت عقل سلیم کے لیے بالکل مخالف ہیں۔ باوجود دعوائے غلو محبت اہل بیت کے انھیں کی روایتوں سے بہت کچھ توہین اہل بیت کی لازم آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ عوام شیعہ اپنی احادیث کے مطالب سے بے خبر ہیں۔ ان کے علماء و مجتہدین عوام کی سمجھ سے ان اسرار کو مخفی رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے عوام کو انصاف کرنے اور حق کے سمجھنے کا موقع نہیں ملتا۔

علمائے شیعہ اس لیے چھپاتے ہیں کہ ان کے ائمہ نے حد سے زیادہ چھپانے اور اُن اسرار کو مخفی رکھنے کی تاکید کی ہے۔

اصول کافی[1] میں سلیمان بن خالد سے روایت ہے:-

عن سلیمان بن خالد	سلیمان بن خالد سے روایت ہے
قال قال ابو عبد اللہ[2]	کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا
علیہ السلام یا سلیمان	کہ تم ایسے دین پر ہو کہ جو شخص اس دین
انکم علی دین من کتمہ	کو چھپائے گا اللہ اس کو عزت دے گا
اعزہ اللہ ومن اذاعہ	اور جو اس دین کو ظاہر کرے گا اللہ
اذلہ اللہ	اس کو ذلیل کرے گا۔

کبھی امر حق کو زباں پر نہ لانا — جو حق پوچھے کوئی تو ناحق بتانا
چھپاؤ گے حق کو تو عزت ملے گی — جو ظاہر کروگے تو ذلت ملے گی

علمائے شیعہ یہ بھی جانتے ہیں کہ نجات کے لیے صرف محبت کافی ہے یہی ایمان ہے، یہی عمل ہے، نماز روزہ کی بھی ضرورت نہیں اسی لیے وہ اپنے عوام کو بجز فضائل نوحہ وشیون اور طعن صحابہ کے اور کچھ بھی نہیں سکھاتے کافی[3] کی کتاب الروضہ میں یزید[4] بن معاویہ سے روایت ہے:-

قال ابو جعفر علیہ السلام	فرمایا امام باقر علیہ السلام نے نہیں ہے
وھل الدین الا الحب	دین مگر محبت۔

---

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص ۴۸۵۔ [2] ابو عبد اللہ کنیت امام جعفر۔
[3] فروع کافی جلد ۳ کتاب الروضہ مطبوعہ لکھنؤ ص ۳۸۔
[4] یہ یزید بن معاویہ قاتل حسین نہیں بلکہ حضرت عباس علمدار شہید کربلا کا پوتا ہے ۱۲

ان رجلا اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ احب المصلین ولا اصلی واحب الصوامین ولا اصوم فقال لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم انت مع من احببت

ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور اُس نے کہا کہ یارسول اللہ میں نمازیوں کو دوست رکھتا ہوں مگر خود نماز نہیں پڑھتا اور روزہ داروں کو دوست رکھتا ہوں مگر خود روزہ نہیں رکھتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو اُنہیں کے ساتھ ہوگا جن کو دوست رکھتا ہے

ان سب سے قطع نظر ایک بڑی وجہ عوام شیعہ کو تعلیم نہ کرنے کی یہ بھی ہے کہ علمائے شیعہ جانتے ہیں کہ اگر تمام روایات کے مضامین پر عوام کو خبر ہوئی تو عوام پر یہ بھی کھل جاوے گا کہ ہمارے قدما صفت امانت اور صدق اور وفا سے محروم تھے اور یہ صفات سلف میں بھی نصیب اعدا تھیں۔ یعنی زمانہ ائمہ میں زہد و تقویٰ اہل سنت میں پایا جاتا تھا اور اصحاب امام نے بہت غور و تحقیق کے بعد ائمہ کو اطلاع دی تھی کہ زہد و تقویٰ ہم میں نہیں اہل سنت میں ہے۔ مگر با ایں ہمہ ائمہ نے اپنے گروہ کو پسند کیا۔ اصول[1] کافی میں عبد اللہ بن یعفور سے روایت ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے

ف۔ قدمائے شیعہ صفت صدق اور عدل اور وفا سے محروم تھے اور اہل سنت میں یہ سب صفات موجود تھیں۔

قال قلت لابی عبد اللہ علیہ السلام انی اخالط الناس فیکثر عجبی من اقوام لا یتولونکم ویتولون فلانا وفلانا لھم

کہا کہ میں لوگوں سے ملتا ہوں تو مجھ کو بڑا تعجب اُن لوگوں پر ہوتا ہے جو تمہاری ولایت کو نہیں مانتے اور فلانے اور فلانے کی ولایت کو مانتے ہیں۔ اُن میں امانت ہے،

[1] اصول کافی ص ۲۳۷

امانۃ وصدق ووفاء واقوام یتولونکم لیس لھم تلک الامانۃ ولا الوفاء ولا الصدق قال فاستوی ابوعبد اللہ علیہ السلام جالسا فاقبل علی کالغضبان ثم قال لا دین لمن دان اللہ بولایۃ امام لیس من اللہ ولا عتب علی من دان بولایۃ امام من اللہ۔

صدق ہے۔ وفا ہے۔ اور جو لوگ تمہاری ولایت کو مانتے ہیں اُن میں نہ امانت ہے نہ وفا ہے نہ صدق ہے یہ سُنتے ہی امام طیش میں آکر سیدھے بیٹھ گئے اور غضبناک ہوکر میری طرف متوجہ ہوئے پھر فرمایا کہ جس نے ایسے امام کی ولایت اختیار کی جو اللہ کی طرف سے مقرر نہیں ہوا اس کا دین ہی نہیں اور جس نے اس امام کی ولایت مانی جو اللہ کی طرف سے ہے اُس پر کوئی عتاب نہ ہوگا۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ فرقۂ اہل سُنت صفت صدق و وفا اور امانت سے موصوف تھا اور دوسرے فریق میں باوجود حضور اور صحبت امام نہ امانت تھی نہ وفا نہ صدق۔ والفضل[1] ما شھدت بہ الاعداء ؎

بے وفائی کسی معشوق کی معیوب نہیں
جس میں کچھ صدق و وفا بھی ہو وہ محبوب نہیں

[1] بڑی فضیلت وہ ہے جس پر دشمن بھی گواہی دے ۱۲۔

اگر عوام شیعہ پر یہ راز کھل جاوے تو بہت مشکلیں واقع ہوں اول اصحاب ائمہ سے بداعتقادی پیدا ہو۔ دوسرے اگر ان میں سے کوئی صدق و امانت سے موصوف ہوگیا تو اصحاب امام پر غیر اصحاب کو ترجیح لازم آنے کے علاوہ اہل سنت کی مشابہت بھی لازم آوے گی۔

علمائے شیعہ کو یہ بھی خوف درپیش ہے کہ اگر عوام شیعہ کو یہ بھید معلوم ہوگیا کہ جن ائمہ کی اطاعت نہایت تاکید کے ساتھ واجب کی گئی ہے وہ خود بھی ایک بات پر قائم نہ تھے۔ ایک سوال کا جواب کسی کو کچھ دیتے کسی کو کچھ تو عوام کو سخت حیرانی ہوگی کہ ائمہ کی کس بات کا اعتبار کریں اور قسم قسم کے شکوک پیدا ہوں گے۔ چنانچہ اصول[1] کافی میں ہے کہ زرارہ بن اعین نے امام باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے:۔

عن زرارۃ بن اعین عن ابی جعفر قال سالتہ عن مسئلۃ فاجابنی ثم جاءہ رجل فسالہ عنہا فاجابہ بخلاف ما اجابنی واجاب صاحبی فلما خرج الرجلان قلت یا ابن

زرارہ کہتا ہے کہ میں نے امام باقر علیہ السلام سے ایک مسئلہ پوچھا۔ مجھ کو انہوں نے ایک جواب دیا۔ پھر ایک اور شخص آیا اس نے بھی وہی مسئلہ پوچھا اس کو اور جواب دیا جو میرے جواب کے خلاف تھا۔ پھر ایک تیسرے شخص نے آکر وہی مسئلہ پوچھا اس کو ہم دونوں کے خلاف جواب دیا۔ جب وہ دونوں چلے گئے

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص ۳۷۔

رسول اللہ رجلان من اہل العراق من شیعتکم قدما یسئلان فاجبت کل واحد منہما بغیر ما اجبت صاحبہ فقال یا زرارۃ ان ھذا خیر لنا وابقی لنا ولکم ولو اجتمعتم علی امر واحد لصدقکم الناس علینا ولکان اقل لبقاءنا وبقائکم ثم قال قلت لابی عبد اللہ شیعتکم لو حملتموھم علی الاسنۃ او علی النار لمضوا وھم یخرجون من عندک مختلفین قال فاجابنی بمثل جواب ابیہ۔ اصول کافی ص ۳۷

تو میں نے کہا کہ اے فرزند رسول اللہ! دونوں شخص عراق کے رہنے والے تمہارے شیعوں میں سے ہیں یہ دونوں تم سے مسئلہ پوچھنے آئے تم نے ایک کو کچھ جواب دیا دوسرے کو اس کے خلاف جواب دیا۔ تو امام نے فرمایا کہ اے زرارہ یہی بہتر ہے ہمارے لیے اور باقی رکھنے والا ہے ہم کو اور تم کو اور اگر تم سب ایک مذہب میں جمع ہو جاؤ تو سب آدمی تصدیق کرلیں گے کہ تم ہمارے گروہ میں ہو تو اس میں ہماری اور تمہاری دونوں کی بقا کم ہو جائے گی۔ پھر زرارہ نے کہا کہ میں نے امام جعفر صادق سے ایک مرتبہ پوچھا کہ تمہارے ایسے شیعہ کہ اگر تم ان کو برچھیوں میں یا آگ میں بھیج دو تو چلے جاویں وہ تمہارے پاس سے مختلف ہو کر نکلتے ہیں یعنی ایک کو تم کچھ تعلیم کرتے ہو اور دوسرے کو اس کے خلاف۔ زرارہ کہتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھ کو اس کا وہی جواب دیا جو انکے باپ امام باقرؑ نے دیا تھا۔

اک سوال اور سینکڑوں اُن کے جواب

ہم سے کچھ غیروں سے کچھ دربان سے کچھ

اگر عوام ان اسرار پر مطلع ہو جاویں تو اُن میں وہ خوش اعتقادی کہاں ہے جو علماء میں ہے وہ تو صاف کہہ بیٹھیں گے کہ ایسے ائمہ کو سلام ہے جن کی بات کو قرار نہیں وہ اپنے مخلصین شیعہ کو عمداً اختلاف میں ڈالتے تھے حالانکہ مخلصین شیعہ سے کچھ خوف بھی نہ تھا جو تقیہ کا احتمال ہو۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ امام باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام دونوں کا یہ شیوہ تھا کہ اپنے مخلصین میں عمداً اختلاف ڈالتے تھے۔ دو مختلف قولوں میں ایک حق ہوگا اور ایک ناحق بس ایک سے حق کہہ دیا اور دوسرے سے ناحق۔ ؎

دل فریبوں نے کہی جس سے نئی بات کہی
ایک سے دن کہا اور دوسرے سے رات کہی

حضرات شیعہ انصاف فرمائیں کہ اپنے گروہ میں اختلاف ڈال دینا اور عمداً خلافِ حق حکم دینا کیسا ہے؟ درحقیقت ائمہ پر یہ سب افتراء ہے ہرگز ان کی یہ شان نہ تھی کہ خلاف حق جواب دیتے۔ یہ اُنھیں راویوں کا کام ہے جنھوں نے ایک سبز باغ کی طرح مذہب شیعہ کو تصنیف کیا اور ائمہ کرام کی طرف منسوب کر دیا۔

اگر عوام پر یہ راز فاش ہو جاوے کہ روایاتِ شیعہ میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منافقین کے جنازوں میں شریک ہو کر

بظاہر نماز پڑھتے تھے مگر حقیقت میں ان کے لیے زیادتِ عذاب کی دعا مانگا کرتے تھے اور جناب امام حسین علیہ السلام کی بھی یہ عادت تھی کہ خوارج اور نواصب کے جنازوں کی نمازیں اسی طرح پڑھتے تھے کہ سب لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے جنازہ کی نماز پڑھی اور وہ اُس پر لعنت کرتے تھے اور زیادتِ عذاب کی دعا مانگتے تھے۔

اس حالت کو معلوم کرنے کے بعد خواہ مخواہ عوام کو یہ شبہ پیدا ہوگا کہ یہ تو علانیہ دھوکا دینا ہے۔ انبیاء اور ائمہ علیہم السلام کا تو یہ فرض ہے کہ جس جنازہ کی نماز اور دعائے مغفرت جائز نہ ہو اس کی نماز نہ ہو اس کی نماز میں ہرگز شریک نہ ہوں اور سب مسلمانوں کو اُس جنازہ کی نماز پڑھنے سے منع کریں نہ یہ کہ اور مسلمانوں پر تو یہ ظاہر کریں کہ نماز پڑھتے ہیں اور وہاں معاملہ برعکس ہو۔ جلد اول فروع کافی کی کتاب الجنائز میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال لما مات عبد اللہ بن ابیّ بن سلول حضر النبی صلی اللہ علیہ وآلہ جنازتہ فقال عمر لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ یا رسول اللہ الم ینہاک اللہ ان تقوم علی قبرہ فسکت فقال یا رسول اللہ

جب عبد اللہ بن اُبیّ بن سلول مر گیا تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ اس کے جنازہ پر تشریف لائے۔ اُس وقت عمرؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کیا آپ کو اللہ نے اس کی قبر پر کھڑے ہونے سے منع نہیں کیا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ پھر عمرؓ نے

الم ینهك الله ان تقوم علی قبره
فقال له ویلك ما یدریك ما قلت
انی قلت اللهم احش جوفه نارا
واملاء قبره نارا واصله نارا قال
ابو عبدالله علیه السلام فابدا من
رسول الله صلی الله علیه وآله ما کان
یکره۔ (فروع کافی جلد اول کتاب الجنائز ص ۹۹)

کہا کہ یا رسول اللہ کیا آپ کو اللہ نے اس کی قبر پر
کھڑے ہونے سے منع نہیں کیا؟ تو رسول اللہ نے
فرمایا کہ تُو کیا جانے میں نے کس طرح دعا کی میں نے یہ
دعا کی تھی کہ اے اللہ اس کے پیٹ میں آگ بھر دے اس کی
قبر میں آگ بھر دے اسکو دوزخ میں پہنچا دے پھر امام جعفر صادق
نے فرمایا کہ عمرؓ نے رسول اللہ کا وہ راز ظاہر کر دیا جس کے
ظاہر ہونے کو وہ برا سمجھتے تھے۔

اس روایت سے ظاہر ہے کہ اُس منافق کی نماز نہ پڑھنے کا حکم آچکا تھا۔ با
ایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اُس کی نماز پڑھنے سے منع نہ فرمایا۔
حالانکہ تبلیغ رسالت فرض تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک ہونے سے اور مسلمان بھی اُس جنازہ
کی نماز میں شریک ہوئے اور چونکہ اوروں کو یہ راز معلوم نہ تھا اس لیے سب نے
دعاء مغفرت پڑھی ہوگی۔ اب حضرات شیعہ انصاف فرمائیں کہ مسلمانوں کو
اس غلطی میں ڈالنا یہ امر شان نبوت کے خلاف ہے یا نہیں؟

اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ (معاذ اللہ) رسول کا ظاہر اور
تھا اور باطن اور تھا اور رسول بھی تقیہ کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے منافقوں کو اپنے نفاق کی
اور تائید ملی۔

یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ظاہر اور باطن ایک تھا

اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی ظاہر و باطن ایک
رہے۔ اُن کو منافقوں سے سخت عداوت تھی، اُن کے جنازہ کی نماز پڑھنا وہ
پسند نہیں کرتے تھے اور اللہ کے اس حکم سے بھی واقف تھے کہ منافقوں کے جنازہ
کی نماز جائز نہیں۔

اصول کافی میں اس کے بعد ایک دوسری روایت مذکور ہے جس میں
اسی قسم کا قصہ جناب امام حسین علیہ السلام سے منسوب کیا گیا ہے:۔

عن ابی عبد الله علیه السلام
ان رجلا من المنافقین مات
فخرج الحسین بن علی صلوة الله
علیهما یمشی معه فلقیه مولی
له فقال له الحسین علیه السلام
این تذهب یا فلان قال فقال
له مولاه افر من جنازة هذا
المنافق ان اصلی علیها فقال
له الحسین علیه السلام انظر
ان تقوم علی یمینی فما سمعتنی
اقول فقل مثله فلما ان کبر
علیه ولیه قال الحسین علیه السلام
الله اکبر اللهم العن فلانا

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت
ہے کہ منافقوں میں سے ایک شخص مر گیا تو
امام حسین علیہ السلام اُس کے جنازہ کے
ساتھ چلے۔ راستہ میں امام حسین علیہ السلام
کا ایک غلام ملا۔ امام حسین علیہ السلام نے
اس سے پوچھا کہ اے فلانے تو کہاں جاتا
ہے؟ اُس نے کہا کہ میں اس منافق کے
جنازہ کی نماز سے بھاگتا ہوں۔ امام حسین
علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ تو میرے
سیدھے ہاتھ پر کھڑا ہو جا اور میرا قول
سنیو جو میں کہوں وہی تو کہیو۔ جب اس
میت کے ولی نے تکبیر کہی تو جناب امام
حسین علیہ السلام نے اللہ اکبر کے بعد

عبدك الف لعنة موتلفة غير	یوں کہنا شروع کیا کہ اے اللہ اس
مختلفة اللهم اجز عبدك في	اپنے بندے پر لعنت کر ہزار لعنتیں جو ساتھ
عبادك وبلادك واصله حر	ساتھ ہوں مختلف نہ ہوں۔ اے اللہ اس
نارك واذقه اشد عذابك	اپنے بندے کو اپنے بندوں میں اور شہروں
فانه كان يتولى اعدائك و	میں ذلیل کر اپنی آگ کی سوزش میں اس کو
يعادي اوليائك ويبغض اهل	پہنچا اور اپنے عذاب کی سختی اس کو چکھا بیشک
بيت نبيك	وہ ان میں سے تھا جو تیرے دشمنوں سے

دوستی رکھتے ہیں اور تیرے نبی کے اہل بیت سے بغض رکھتے ہیں

اب فرمائیے کہ جناب امام حسین علیہ السلام نے ایسے جنازہ کی نماز کیوں پڑھی جس کے لیے دعائے مغفرت جائز نہ تھی اور تمام مسلمانوں کو غلطی میں ڈالا۔ سب مسلمانوں نے یہ جان لیا ہوگا کہ اگر یہ شخص بے دین ہوتا تو جناب امام حسین علیہ السلام اس کی نماز کیوں پڑھتے ؟ پس ضرور گمان ہوا ہوگا کہ جو اس کا دین تھا وہ برا دین نہ تھا۔ اگر اس کے لیے بد دعا کرنے کا جوش جناب امام کو اٹھا تھا اور عالم الغیب قہار بغیر ان کی دعا کے جو عذاب اس پر نازل کرتا اس سے جناب امام کی تسکین نہیں ہوتی تھی تو بغیر شراکت جنازہ کے بھی جتنی چاہتے اتنی بد دعائیں کر لیتے اور جی بھر کر کوس لیتے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ موقع تقیہ کا نہ تھا امام علیہ السلام اپنے قصد سے جنازہ کے ساتھ تشریف لے گئے۔ غلام کو بڑے اہتمام سے اسی کام میں شریک کر لیا حالانکہ وہ اس جنازہ سے بھاگتا تھا۔ قطع نظر اس کے جناب امام حسین

علیہ السلام تو کسی حالت میں تقیہ نہیں کرتے تھے۔ ؎

ساتھ میت کے تو کرتے ہوئے افسوس گئے
قبر پر پہنچے تو چپکے سے مجھے کوس گئے

دیگر

نہ آنے دیجو انھیں لاش پر خدا کے لیے
نماز پڑھنے کو آئیں گے بد دعا کے لیے

کافی کے اسی باب میں امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے بھی ایک ناصبیہ عورت کے جنازہ کی اسی طرح نماز پڑھی تھی۔ پھر ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے بھی خاندان بنی امیہ کے ایک عورت کے جنازہ کی اسی طرح نماز پڑھی تھی ؎

حسرت نکالی لاش پہ بھی کوس کوس کے
دیں بد دعائیں خوب کلیجہ مسوس کے

اب ہم حضرات شیعہ سے انصاف چاہتے ہیں کہ پیغمبر اور ائمہ علیہم السلام کا ایسے جنازہ کی جس کے لیے دعائے مغفرت جائز نہ ہو مسلمانوں کے دکھانے کے لیے نماز پڑھنا اور باطن میں بد دعا کرنا اور مسلمانوں کو ایسے شبہ میں ڈالنا جس سے وہ پیغمبر علیہ السلام یا ائمہ کو ایک بے دین کے جنازہ کی نماز پڑھتے دیکھ کر بے دین کو دین دار اور بے دینی کو دین سمجھ جاویں شان نبوت اور امامت کے منافی ہے یا نہیں ؟۔

عوام پر اگر یہ راز کھل جائے کہ شیعوں پر خدا کا قہر نازل ہونے والا تھا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنی جان کا فدیہ دے کر دنیا دی عذاب سے

بچایا تو ان کو عجیب خلجان ہوگیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ چنانچہ اصول کافی[1] میں روایت ہے کہ :-

عن ابی الحسن علیہ السلام قال ان اللّٰہ غضب علی الشیعۃ فخیرنی نفسی او ھم فوقیتھم واللّٰہ بنفسی۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ غضبناک ہوا ہے شیعوں پر اور مجھ کو اختیار دیا ہے کہ یا تو میں اپنی جان دوں یا وہ ہلاک ہو جاویں (یعنی ان دونوں میں سے جو چاہوں اختیار کروں) اب واللہ میں اپنی جان دے کر اُن کو بچاتا ہوں۔

یہ وہی معاملہ ہے جیسا کہ نصاریٰ کے اعتقاد میں جناب مسیح علیہ السلام نے عیسائیوں کے گناہوں کے کفارہ میں اپنی جان دیدی (کرے کوئی اور بھرے کوئی)۔

اس روایت میں دو لطیفے ہیں۔ ایک یہ کہ شیعوں کی ایسی حالت تھی کہ اگرچہ دنیا میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین بھی موجود تھے مگر خدا کا قہر شیعوں پر ہی نازل ہونے والا تھا اور جب حضور ائمہ کے وقت یہ حالت تھی تو اب خدا جانے کیا نوبت ہے۔ اگر امام کی جان نے کفارہ بن کر دنیا میں نزول عذاب کو نہ روکا ہوتا تو اب تک خدا کے قہر سے سب ہلاک ہو گئے ہوتے۔

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ جو گناہ شیعوں نے کیے تھے ان کو امام معصوم کی جان عزیز سے کیا تعلق اگر قوم اپنے امام کی ہدایت کو نہ مانے تو امام کا کیا قصور اب حضرات شیعہ انصاف کر کے فرمائیں کہ عیسائیوں کے قول میں

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۵۹

اور اس کفارہ میں کیا فرق ہے۔

اے حضرات شیعہ! اپنے متقدمین کی حالت کو دیکھو کہ اُن پر اُمم سابقہ کی طرح دنیا میں ہی خدا کا قہر نازل ہونے والا تھا امام کی جان گئی تب دنیاوی عذاب رُکا مگر آخرت کا معاملہ درپیش ہے۔

علمائے شیعہ کو خوف ہے کہ کہیں عوام پر یہ راز فاش نہ ہو جائے کہ ائمہ کی یہ عادت تھی کہ غیب کی خبریں بطور پیشین گوئی کے بیان فرمایا کرتے تھے اور اُن کے وقت مقرر کر دیا کرتے تھے جب وہ وقت گزر جاتا اور اُن خبروں کا ظہور نہ ہوتا تو ائمہ اپنی بات بنانے کے لیے یہ فرما دیا کرتے تھے کہ ہم کیا کریں اللہ کی رائے پہلے وہی تھی جو ہم نے خبر دی تھی مگر بعد میں اللہ کی رائے بدل گئی اگر عوام یہ بھید پا جائیں تو ائمہ تو در کنار خدا سے بد اعتقاد ہو جائیں۔ اصول کافی صفحہ ۲۳۲ میں ابو حمزہ الثمالی سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ :-

عن ابی حمزۃ الثمالی قال سمعت ابا جعفر علیہ السلام یقول یا ثابت ان اللّٰہ تبارک وتعالٰی قد کان وقت ھذا الامر فی السبعین فلما ان قتل الحسین صلوٰۃ اللّٰہ علیہ اشتد غضب اللّٰہ علی اھل الارض فاخرہ الی اربعین ومائۃ فحدثناکم

میں نے سُنا کہ امام باقر علیہ السلام ثابت سے فرماتے تھے کہ اللہ نے یہ امر (یعنی ظہور مہدی) سنہ ستر ہجری میں پہلے سے مقرر کیا تھا مگر جب حسین علیہ السلام کو قتل کیا گیا تو اللہ کا غصہ زمین والوں پر بڑھ گیا اور اُس نے ظہور مہدی کے وقت کو ٹال دیا اور سنہ ایک سو چالیس مقرر کر دیا۔ یہ حدیث ہم نے تم سے بیان کی تم نے اس حدیث کو

فاذعتم الحدیث فکشفتم قناع السرّ ولم یجعل اللہ بعد ذلک وقتا عندنا قال ابوحمزۃ فحدثت بذلک اباعبداللہ فقال قد کان ذلک

مشہور کردیا اور اس راز کا پردہ فاش کردیا تو اللہ نے سنہ ایک سو چالیس میں بھی ظہور مہدی کو ملتوی کردیا اور اب اللہ نے اس کا کوئی وقت ہمارے لیے مقرر نہیں کیا۔ ابوحمزہ کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث امام جعفر صادق علیہ السلام سے بیان کی انھوں نے فرمایا کہ بے شک یہی ہوا

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رائے ہمیشہ پلٹا کھاتی ہے اور اس نے اپنی رائے بدل کر ائمہ کی بات بھی بگاڑ دی۔ قتل حسین کی پہلے سے خدا کو خبر تھی مگر شاید اللہ کو پہلے سے یہ معلوم نہ ہوگا کہ اس حادثہ کی وجہ سے اللہ کو غصہ آجاوے گا اسی وجہ سے سنہ ستر مقرر کیا تھا مگر بعد ظہور اس حادثہ کے جب اللہ کو یکایک غضب آگیا اس ضد میں اللہ نے وہ وقت بدل دیا۔ ایک سخت تعجب اس مقام پر یہ ہے کہ ظہور مہدی علیہ السلام شیعوں کے حق میں باعث رحمت و کامیابی اور ظالموں کے حق میں موجب عقاب و ناکامی تھا پس خروج مہدی جو رکا گیا تو درحقیقت شیعوں کے واسطے مصیبت بڑھائی گئی جو ان کے حق میں ایک قسم کا عذاب تھا۔ پھر یہ کیسا غصہ ہے جس سے انھیں کو نقصان پہونچا جو جناب امام حسین علیہ السلام کے طرفدار تھے شاید شدت غضب کی بے اختیاری میں دوست دشمن کی تمیز نہ رہی اور جب شیعہ اللہ کی رائے بدلنے اور ائمہ کی خبر غلط ہو جانے کے قائل ہو گئے تو کیا عجب ہے کہ حالت غضب کی بے اختیاری بھی اللہ کے واسطے تجویز کرلیں۔

اور اگر اللہ پر احسان کریں اور ایسی بے اختیاری اس کے واسطے جائز نہ رکھیں تو دوسری مشکل پیش آوے گی اور وہ یہ ہے کہ اس شبہ کا کیا جواب ہے کہ قتل حسین کی وجہ سے شیعوں پر اللہ کا غضب کیوں ہوا؟ اس لاحل شبہ کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ بے شک اللہ کا علم یہی تھا کہ درحقیقت شیعوں کا قتل حسین میں کچھ دخل ہے اس لیے کہ جنھوں نے امام علیہ السلام کو خط لکھے تھے اور کوفہ میں بلایا تھا اور مسلم بن عقیل رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر نہایت خلوص و اعتقاد کے ساتھ امام کی بیعت کی تھی ان کے شیعہ ہونے میں کیا شبہ تھا؟ مگر جب ابن زیاد کی قوت غالب ہوگئی تو تقیہ کا وقت آگیا اسی مجبوری میں مسلم اور ان کے معصوم بچوں پر جو کچھ گزری وہ گزری۔

امن واماں کے راستے جب بند ہوگئے
جو شیعہ تھے تقیہ کے پابند ہوگئے

ائمہ نے نااہلوں سے حدیث کیوں بیان کی جنھوں نے مشہور کر دی اور اہل و نااہل میں ان کو تمیز کیوں نہ ہوئی؟

عوام سے یہ چھپانا بھی مصلحت ہے کہ مذہب شیعہ میں بلا ضرورت کسی فائدہ کے لیے جھوٹ بولنا بھی تقیہ اور سنت انبیا ہے۔ چنانچہ اصول کافی[1] کی کتاب الایمان والکفر میں باب تقیہ میں مذکور ہے کہ:۔

قال ابوعبداللہ علیہ السلام التقیۃ من دین اللہ قلت من دین اللہ قال ای واللہ

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے تقیہ امور دین اللہ میں سے ہے (راوی کہتا ہے) کہ میں نے پوچھا کہ کیا تقیہ دین کے کاموں میں سے ہے؟

[1] اصول کافی۔ ص ۴۸۳۔

من دین اللہ ولقد قال یوسف ایتھا العیر انکم لسارقون واللہ ما کانوا سرقوا شیئا۔	تو امام نے کہا کہ ہاں خدا کی قسم دین کا کام ہے اور بےشک یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اے قافلے والو بےشک تم چور ہو۔ واللہ انہوں نے کچھ چرایا نہ تھا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ کسی مصلحت دنیاوی سے جھوٹ بول دینا بھی تقیہ ہے۔ نہ تقیہ کے واسطے مصلحت دینی شرط ہے نہ حالت خوف۔ اس لیے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خود ہی اپنے بھائی کے اسباب میں پیالہ رکھ دیا اور پھر ان کو چور بتایا نہ یہ امر دینی تھا نہ حالتِ خوف۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسی کو تقیہ فرمایا اور چونکہ تقیہ من جملہ دین اللہ ہے پس جھوٹ بولنا بھی دین کا کام ہوا (نعوذ باللہ منہا) ؎

کیا جو جھوٹ کا شکوہ تو یہ جواب ملا
تقیہ ہم نے کیا تھا ہمیں ثواب ملا

یہ آیت سورۂ یوسف میں ہے۔ قصہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے سب بھائی غلّہ لے کر مصر سے رخصت ہوئے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ منظور تھا کہ کسی طرح اپنے حقیقی بھائی بنیامین کو روک لیں مگر حضرت یوسف علیہ السلام کے دس بھائی جو اور تھے وہ بنیامین کو چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوتے اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے عہد کر کے لائے تھے کہ بنیامین کو ضرور ساتھ لاویں گے۔ پس حضرت یوسف علیہ السلام نے بنیامین کو روکنے کی تدبیر یہ کی کہ ایک قیمتی ظرف بنیامین کے اسباب میں

اس طرح باندھ دیا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی ممکن ہے کہ اس سے حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ غرض ہو کہ بنیامین جب اس ظرف کو اپنے اسباب میں دیکھیں گے تو اس کے واپس کرنے کے لیے پھر یہاں آئیں گے اُس وقت اُن کو روک لینے کا موقع ہوگا۔ جب وہ قافلہ چلا گیا ہوا اور خادموں نے اس ظرف کو موجود نہ پایا ہو تو شاید اُس قافلہ والوں پر شبہ کیا اس لیے ایک خادم چیختا ہوا دوڑا چنانچہ اللہ فرماتا ہے

ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ ۝	پھر پکارا ایک پکارنے والا کہ اے قافلہ والو تم چور ہو۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اُن کو چور نہیں کہا بلکہ کسی اور نے کہا تھا اور اس نے بھی شاید بطور استفہام کہا ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام نے جو یہ فرما دیا کہ یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے (اِنَّكُمْ لَسَارِقُوْنَ ۝) کہا تھا، یہ ظاہر قرآن کے خلاف ہے اور پیغمبر معصوم پر یہ الزام لگانا ہے کہ انھوں نے بے وجہ ایک دنیاوی غرض کے لیے جھوٹ بولا اور جھوٹ بھی ایسا سخت کہ بے گناہوں پر چوری کا الزام لگایا اسی کو امام نے تقیہ فرمایا جو موجب ثواب ہے اور اسی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیاوی غرض کے لیے جھوٹ بولنا تقیہ ہے اور ثواب ہے اور سُنتِ انبیاء ہے۔

اس کے بعد کا قصہ جو قرآن سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے یہ معاملہ پیش ہوا تو انھوں نے فوراً اپنے سوتیلے بھائیوں کا اسباب دیکھا اور اس طریقہ سے اُن کی بے گناہی ظاہر کر دی: البتہ اپنے حقیقی بھائی کی براءت کو دوسرے وقت پر موقوف رکھا اس لیے کہ ان کا

بھائی اس تاخیر برات پر راضی تھا۔ علاوہ اس کے جو برات بعد میں ہوئی وہ اٹکل تھی۔ قطع نظر اس کے یہ الزام بطور شبہ کے تھا نہ یقینی طور پر۔ اور ممکن ہے کہ بحکم وحی یہ تاخیر ہوئی ہو۔ بہرحال قرآن سے حضرت یوسف علیہ السلام پر جھوٹ بولنے کا الزام نہیں ثابت ہوتا۔

شاید شیعوں کے نزدیک حضرت یوسف علیہ السلام کی قدر اس وجہ سے کم ہے کہ ان کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں نور نبوت ان کی ذات سے نکل گیا تھا اور آیندہ کو بھی ان کی اولاد میں نبوت کا سلسلہ گم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب ج ۱ ص ۱۷۴ میں لکھا ہے :۔

”و بچند سند معتبر از حضرت صادق علیہ السلام منقول است کہ چوں، یوسف علیہ السلام باستقبال حضرت یعقوب علیہ السلام بیروں آمد و یک دیگرے را ملاقات کردند یعقوب پیادہ شد و یوسف را شوکت بادشاہی مانع شد و پیادہ نشد وہنوز از معانقہ فارغ نشدہ بودند کہ جبرئیل بر حضرت یوسف نازل شد و خطاب مقرون بعتاب از جانب رب الارباب آورد کہ اے یوسف خداوند عالمیاں مے فرماید کہ ملک و بادشاہی ترا مانع شد کہ پیادہ شوی برائے بندہ شایستہ صدیق من، دست خود را بکشا چوں دست را کشود از کف دستش بروایت از میان انگشتانش نورے بیروں رفت۔ یوسف گفت ایں چہ نور بود اے جبرئیل، گفت نور پیغمبری بود از صلب تو پیغمبر ہم نخواہد رسید بعقوبت آنچہ کردی نسبت بہ یعقوب کہ برائے او پیادہ نشدی۔“

اس روایت میں جب ملا باقر مجلسی کو یہ مشکل نظر آئی کہ جب انبیاء کی عصمت کا اعتبار نہ رہا تو ائمہ معصومین کی عصمت کا کیا اعتبار رہے گا؟ اس لیے ملا صاحب نے اس مشکل سے بچنے کے لیے بڑی سہل ترکیب سوچ لی اور یوں لکھ دیا

”مولف گوید کہ بعضے ایں احادیث را بر تقیہ حمل کردہ اند چوں ایں در طریقہ عامہ منقول است۔“

اس کا حاصل یہ ہوا کہ اکثر مجتہدین شیعہ تو اس روایت کو سچا مانتے ہیں مگر بعض مجتہدین شیعہ کا یہ قول ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ روایت سچی نہیں بیان کی بلکہ کسی مصلحت سے جھوٹ بولا ہے اور قرینہ اس جھوٹ بولنے کا یہ نکالا گیا ہے کہ یہ روایت بطریقۂ عامہ بھی منقول ہے۔ عامہ سے اہل سنت مراد ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ امام کا یہ قول اس وجہ سے جھوٹا ہے کہ اہل سنت کے مطابق ہے۔ حالانکہ یہ ملا صاحب کا محض افترا ہے کہ اہل سنت کی طرف بھی اس روایت کو منسوب کیا ہے۔

ائمہ کے اقوال میں تقیہ کا احتمال ایسا جاری ہے کہ اب اُن کا کوئی قول قابل اعتبار نہ رہا جس قول کو چاہا مانا اور جو قول پسند نہ آیا اس کو یہ کہہ دیا کہ کسی مصلحت سے امام نے جھوٹ بولا ہے۔

میں نے حیات القلوب کی پہلی جلد کو کہیں کہیں بنظر سرسری دیکھا ہے اس سرسری نظر میں بیسیوں روایتیں ایسی نظر پڑیں جو ائمہ سے منقول ہیں اور تقیہ پر محمول ہیں۔ جب ایک کتاب میں ایسی روایتیں اتنی ملیں تو شیعوں کی سب کتابوں میں سیکڑوں روایتیں ایسی ہوں گی جو باحتمال تقیہ جھوٹی سمجھی گئیں اور

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ کی زبان پر ہمیشہ جھوٹی باتیں جاری رہا کرتی تھیں معاذ اللہ منہا ہرگز ائمہ کی ایسی شان نہ تھی جیسی کہ علمائے شیعہ نے بنادی جیسی عصمت علمائے شیعہ ائمہ کے لیے ثابت کرتے ہیں ایسی عصمت تو ہر شخص اپنے لیے ثابت کر سکتا ہے۔ جو سچ بولا وہ مقتضائے عصمت تھا اور جو جھوٹ بولا وہ مقتضائے تقیہ، کسی طرح عصمت میں خلل نہیں آتا۔

عوام پر اس راز کا ظاہر ہونا بھی خلاف مصلحت ہے کہ صبح کو آسمان سے یہ آواز آتی ہے کہ علیؑ اور ان کے گروہ والے مراد پانے والے ہیں اور شام کو آسمان سے یہ آواز آتی ہے کہ عثمان اور ان کے گروہ والے مراد پانے والے ہیں چنانچہ کلینی نے کتاب الروضہ میں روایت کی ہے:۔

عن محمد بن علی الحلبی قال سمعت اباعبد اللہ علیہ السلام یقول اختلاف بنی العباس من المحتوم والنداء من المحتوم وخروج القائم من المحتوم قلت وکیف النداء قال ینادی مناد من السماء اول النھار الا ان علیا علیہ السلام وشیعتہ ھم الفائزون قال وینادی مناد آخر النھار الا

محمد بن علی الحلبی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق سے سُنا کہ وہ فرماتے تھے کہ بنی عباس میں اختلاف پڑنا بھی یقینی ہے اور ندا بھی یقینی ہے اور مہدی کا خروج بھی یقینی ہے۔ میں نے پوچھا کہ ندا کس طرح ہوتی ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ اول نہار میں ایک منادی آسمان سے ندا کرتا ہے کہ آگاہ ہو جاؤ کہ علی السلام اور ان کے گروہ والے مراد کو پہونچیں گے۔ پھر فرمایا اور شام کے وقت ایک منادی

ان عثمان وشیعتہ ھم الفائزون۔

ندا کرتا ہے کہ آگاہ ہو جاؤ کہ عثمان اور اُن کے گروہ والے مراد کو پہونچیں گے۔

اس روایت سے معلوم ہوگیا کہ منادی غیب جس طرح حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کے مناقب بیان کرتا ہے اسی طرح حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھیوں کے بھی مناقب بیان کرتا ہے [۱]

ہے ابھی دونوں طرف باقی لگاوٹ یار کی
صبح کو تعریف میری شام کو اغیار کی

یہ روایت تقیہ پر بھی محمول نہیں ہو سکتی اس لیے کہ محتوم کے لفظ سے موکد ہے جس کے معنی یقینی اور قطعی کے ہیں اس کے علاوہ اگر تقیہ ہوتا تو اختلاف بنی عباس اور قائم آل محمد کا ذکر نہ ہوتا۔ اب حضرات شیعہ یقین کر لیں کہ مراد پانے والے وہی لوگ ہیں جو دونوں کی تعظیم کرتے ہیں اور جو شخص ان دونوں میں سے کسی سے سوء اعتقادی رکھتا ہے وہ نامراد ہے۔

عوام یہ سُن کر بھی متحیر ہوں گے کہ شیعوں کی روایتوں سے یہ پایا جاتا ہے کہ نکاح کے لیے نہ ایجاب وقبول بصیغۂ نکاح شرط ہے نہ نیت نکاح شرط ہے اگر تنہائی میں بہ نیت زنا بھی عورت و مرد راضی ہو جائیں تو وہ بھی زنا نہیں بلکہ نکاح ہے۔ فروع[۲] کافی کی کتاب النکاح میں عبد الرحمٰن بن کثیر نے امام جعفر صادق سے روایت کی ہے:۔

---

[۱] فروع کافی۔ ج ۳ کتاب الروضہ ص ۱۴۶۔

[۲] فروع کافی جلد ثانی مطبوعہ لکھنؤ۔ کتاب النکاح۔ ص ۱۹۸۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال جاءت امرأۃ الی عمر فقالت انی زنیت فطھرنی فامر بھا ان ترجم فاخبر بذلك امیر المومنین صلوات اللہ علیہ فقال کیف زنیت فقالت مررت بالبادیۃ فاصابنی عطش شدید فاستقیت اعرابیا فابی ان یسقنی الا ان امکنہ من نفسی فلما اجھدنی العطش وخفت علی نفسی سقانی فامکنتہ من نفسی فقال امیر المومنین علیہ السلام ھذا تزویج ورب الکعبۃ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ عمرؓ کے پاس ایک عورت آئی اور اس نے کہا کہ مجھ سے زنا سرزد ہو گیا تم اس گناہ سے مجھ کو پاک کر دو۔ عمرؓ نے اس کے سنگسار کرنے کا حکم دیا امیر المومنین علیہ السلام کو اس قصہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ تو کس طرح زنا میں مبتلا ہوئی؟ اس نے کہا کہ میں جنگل میں گئی تھی وہاں مجھ کو سخت تشنگی واقع ہوئی میں نے ایک گاؤں والے سے پانی مانگا، اُس نے کہا کہ جب تک تو مجھ سے راضی نہ ہو جاوے اس وقت تک پانی نہ دوں گا جب مجھے اپنی جان کا خوف ہوا تو اس نے مجھے پانی پلا دیا اور میں اس کی خواہش پر راضی ہو گئی۔ یہ سُن کر امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ رب کعبہ کی قسم یہ تو نکاح ہے۔

یہ مسئلہ تو متعہ سے بھی بڑھ گیا۔ متعہ میں ایک مدت معین تک معاہدہ تو ہوتا تھا اس میں کسی قسم کا معاہدہ نہیں اور اس روایت کے مطابق فساق جو زنان بازاری سے زنا کرتے ہیں سب جائز ہیں ؎

منظور ہے کہ سیم تنوں کا وصال ہو مذہب وہ چاہیے کہ زنا بھی حلال ہو

ف۔ اگر تم اس ... زنا کی عورت ... [illegible]

اگر عوام کو یہ خبر ہو جائے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے امام ابو حنیفہؒ کی اون کے سامنے بہت تعریف کی اور جب ابو حنیفہؒ ان کی مجلس سے اٹھ گئے تو برائی کی تو خواہ مخواہ عوام کو امام کی طرف سے بدگمانی ہو گی کہ ایسی حرکت تو عوام کو بھی جائز نہیں نہ کہ امام کو۔ کافی کی کتاب الروضہ میں ہے:۔

عن محمد بن مسلم قال دخلت علی ابی عبد اللہ علیہ السلام وعندہ ابو حنیفۃ فقلت لہ جعلت فداك رائیت رویا عجیبۃ فقال لی یا ابن مسلم ھاتھا فان العالم بھا جالس واومی بیدہ الی ابو حنیفۃ فقلت رائیت کانی دخلت داری واذا اھلی قد خرجت علی فکسرت جوزا کثیرا ونثرتہ علی فتعجبت من ھذہ الرؤیا فقال ابو حنیفۃ انت رجل تخاصم وتجادل مانی مواریث اھلك فبعد نصب شدید تنال حاجتك منھا

محمد بن مسلم سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس گیا اور ان کے پاس ابو حنیفہؒ تھے۔ میں نے امام سے کہا کہ میں آپ پر قربان ہو جاؤں میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ امام نے کہا اے ابن مسلم بیان کر اس لیے کہ تعبیر کے عالم بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنے ہاتھ سے ابو حنیفہؒ کی طرف اشارہ کیا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے کہا کہ میں نے یہ دیکھا کہ گویا میں اپنے گھر میں گیا ہوں اور میری بی بی میری طرف آئی اور اس نے کچھ اخروٹ توڑے اور مجھ پر پھینک دیے۔ مجھ کو اس خواب سے تعجب ہے۔ ابو حنیفہ نے کہا کہ تجھ کو اپنی بی بی کی میراث کی بابت شوم آدمیوں سے خصومت اور لڑائی کرنی پڑے گی اور

ف۔ امام جعفر صادق نے امام ابو حنیفہ کے سامنے ان کی تعریف کی اور پیٹھ پیچھے برائی

انشاء اللہ فقال ابو عبد اللہ علیہ السلام اصبت واللہ یا اباحنیفۃ قال ثم خرج ابو حنیفۃ من عندہ فقلت لہ جعلت فداك انی کرھت تعبیر ھذا الناصب فقال یا ابن مسلم لا یسوءك اللہ فما یواطی تعبیرھم تعبیرنا ولا تعبیرنا تعبیرھم ولیس التعبیر کما عبرہ قال فقلت لہ جعلت فداك فقولك اصبت علیہ وھو مخطی قال نعم حلفت علیہ انہ اصاب الخطاء۔

بہت سی مشقت کے بعد انشاء اللہ تیری حاجت پوری ہوگی۔ یہ سن کر امام علیہ السلام نے فرمایا (اصبت واللہ یا ابا حنیفۃ) یعنی خدا کی قسم بہت ٹھیک جواب دیا تم نے اے ابو حنیفہ۔ راوی کہتا ہے پھر ابو حنیفہ ان کے پاس سے چلے گئے تو میں نے امام سے کہا کہ میں آپ پر قربان ہو جاؤں مجھ کو اس ناصبی کی تعبیر ناپسند ہے تو امام نے کہا کہ اے ابن مسلم ان لوگوں کی تعبیر ہماری تعبیر سے مطابق نہیں ہوتی اور نہ ہماری تعبیر ان کی تعبیر سے مطابق ہو۔ ابو حنیفہ نے جو تعبیر بیان کی ہے وہ ٹھیک نہیں ہے۔ راوی کہتا ہے کہ تب تو میں نے امام سے یہ کہا کہ آپ نے تو ان سے کہا تھا کہ تم نے صحیح جواب دیا اور اس پر قسم کھائی تھی حالانکہ انھوں نے تعبیر میں خطا کی تھی۔ امام نے کہا کہ ہاں میں نے قسم اس بات پر کھائی تھی (انہ اصاب الخطاء) یعنی وہ غلطی پر پہونچ گئے۔

میرے آگے مری تعظیم ہے تعریف بھی ہے
پیچھے بدکیوں نہ کہیں غیر کی تالیف بھی ہے

اب حضرات شیعہ انصاف فرماؤ کہ تمہارے راویوں نے کیسی کیسی باتیں امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیں۔ امام کے تقدس کو غور کر کرد کیا اُن کی یہ حالت تھی کہ سامنے کچھ اور پیچھے کچھ۔ امام ابو حنیفہ میں بجز علم کے اور قوت کیا تھی جس کی وجہ سے امام جعفر صادق علیہ السلام تقیہ کرتے۔ قطع نظر اس کے تقیہ کا کوئی موقع نہ تھا۔ ابن مسلم نے خواب کی تعبیر امام سے پوچھی تھی اس کو خود ہی جواب دیدیتے اس میں کسی مضرت کا خوف نہ تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے عمداً امام ابو حنیفہ کی طرف ابن مسلم کو متوجہ کیا اور امام ابو حنیفہ کو عالم بتایا اور جو تعبیر امام ابو حنیفہؒ نے بیان کی اس کو قسم کھا کر صحیح اور صواب کہا اور جب امام ابو حنیفہؒ اٹھ گئے تو ان کی تعبیر کو غلط کہا۔ آخر ابن مسلم نے خود ہی امام پر اعتراض کیا کہ ابھی تو آپ قسم کھا کر کہہ چکے ہیں کہ تعبیر صحیح بیان کی اور اب جو وہ چلے گئے تو ان کی تعبیر کو غلط کہتے ہو۔ اس اعتراض کے جواب میں جب امام سے کچھ نہ بن پڑا تو اپنی قسم کی نہایت عجیب تاویل کی۔

افسوس کہ امام معصوم پر ایسی تہمتیں اسی قوم نے لگائیں جو حد سے زیادہ ان کی محبت میں غلو رکھتے تھے۔ اب فرمایئے کہ امام کی کس بات کو سچ کہیں اُن کی قسم بھی تو قابل اعتبار نہ رہی۔

شاید امام صادق علیہ السلام ابن مسلم سے تقیہ کرتے ہوں گے پہلے اس امر کا خیال نہ رہا اس لیے امام ابو حنیفہ کی تعریف کی اور ان کی تعبیر کو بھی صحیح کہا جس کو قسم سے بھی موکد کیا اس کے بعد امام کو یہ خیال ہوا کہ ابن مسلم کے سامنے امام ابو حنیفہ کی تعریف خلاف مصلحت ہے اس لیے اس کے بعد جو گفتگو کی وہ

بطور تقیہ کے تھی اور قرینہ اس کا ابن مسلم کی یہ گستاخی ہے کہ امام کا ذرا بھی ادب نہ کیا اور اُن کے سامنے اُن پر اعتراض کیا کہ ابھی تو آپ قسم کھا کر ابو حنیفہ کی تعبیر کو سچا کہہ چکے ہیں اور اب غلط کہتے ہیں۔

۹۔ عوام یہ سُن کر بھی شبہ میں پڑیں گے کہ ائمہ علم نجوم کو بھی سچا بتلاتے تھے اور اس بات کے بھی قائل تھے کہ نجوم کے حساب سے غیب کی خبریں معلوم ہوجاتی ہیں اور ستاروں کی سعادت اور نحوست کے بھی قائل تھے اور اپنے سوا ہندوستان کے جوتشی پنڈتوں کو بھی اس فن میں بڑا کامل جانتے تھے۔ کلینی نے کتاب الروضہ[1] میں معلی بن خنیس سے روایت کی ہے کہ:۔

عن معلی بن خنیس قال سالت ابا عبد اللہ ؑ عن النجوم احق ھی فقال نعم ان اللہ عزوجل بعث المشتری الی الارض فی صورۃ رجل فاخذ رجلا من العجم فعلمہ النجوم حتی ظن انہ قد بلغ ثم قال لہ انظر این المشتری فقال ما اراہ فی الفلک و

میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ نجوم حق ہے؟ انھوں نے کہا کہ ہاں حق ہے اللہ نے مشتری ستارے کو آدمی کی صورت بنا کر زمین پر بھیجا تھا اس نے عجم کے ایک شخص کو شاگرد بنایا اور نجوم سکھایا جب مشتری کو یہ گمان ہوا کہ یہ شخص نجوم سیکھ کر کامل ہوگیا تو اس سے پوچھا کہ بتا مشتری کہاں ہے؟ تو اُس نے کہا کہ میں اس کو آسمان پر نہیں دیکھتا اور یہ میں نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ امام نے فرمایا کہ یہ سُن کر مشتری نے

[1] فروع کافی جلد ثالث کتاب الروضہ ص ۱۵۳

فنحاہ واخذ بید رجل من الھند فعلمہ حتی ظن انہ قد بلغ فقال انظر الی المشتری این ھو فقال ان حسابی لیدل علی انک انت المشتری قال فشھق شھقۃ فمات وورث علمہ اھلہ فالعلم ھناک۔

اس کو جدا کر دیا۔ اور ہند کے ایک شخص کا ہاتھ پکڑا اور اس کو نجوم سکھایا جب مشتری نے جان لیا کہ وہ اس فن میں کامل ہوگیا تو اُس سے پوچھا کہ مشتری کو دیکھ کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟ اُس نے کہا کہ میرا حساب یہ بتاتا ہے کہ تو مشتری ہے یہ سُن کر مشتری نے ایک نعرہ مارا اور مر گیا۔ اس کے بعد اُس ہندی نے جس نے علم سیکھ لیا تھا اپنے خاندان کو اس علم کا وارث بنایا پس یہ علم اُسی ملک میں ہے۔

اس کے بعد اسی کتاب میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک دوسری روایت ہے کہ:۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال سئل عن النجوم قال لا یعلمہا الا اھل بیت من العرب واھل بیت من الھند۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ اُن سے کسی نے نجوم کی حقیقت پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ نجوم کو کوئی نہیں جانتا مگر ایک خاندان عرب کا اور ایک خاندان ہند کا۔

اور کتاب الروضہ میں حمران[1] سے روایت ہے کہ:۔

قال من سافر او تزوج

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہ جس نے

[1] فروع کافی ج ۳۔ مطبوعہ لکھنؤ۔ کتاب الروضہ ص ۱۳۰۔

والقمر فی العقرب لم یر الحسنی۔

سفر کیا یا نکاح کیا ایسے وقت میں کہ قمر در عقرب ہو وہ بھلائی نہ دیکھے گا۔

امام نے جو یہ فرمایا کہ نجوم کا جاننے والا ایک خاندان عرب میں ہے اور ایک خاندان ہند میں تو عرب کے خاندان سے تو انہوں نے اپنا خاندان مراد لیا اور ہند میں پنڈتوں کا خاندان جوتش میں مشہور ہے۔ مشتری فقط ایک ہندی کو سکھایا گیا تھا شاید عرب میں کسی طرح ہند سے یہ فن پہنچا ہوگا۔ قمر در عقرب کی نحوست کی بھی امام نے تصریح فرما دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ائمہ کا خواص نجوم پر بھی عمل تھا۔ نعوذ باللہ منہا۔

ہر مہینہ کا آخری چہار شنبہ بھی منحوس ہے۔ ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب[1] کی جلد اول باب دوم فصل پنجم میں احوال اولاد آدم کے ضمن میں لکھا ہے:-

"وبسند معتبر از امام رضا منقول است کہ مردے از اہل شام از امیر المومنین پرسید از قولِ خدا کہ روزے کہ مرد از برادرش بگریزد چیست فرمود کہ قابیل است کہ از برادرش ہابیل خواہد گریخت۔ پرسید از نحوست روز چہار شنبہ، فرمود کہ آں چہار شنبہ آخر ماہ است کہ در تحت الشعاع واقع شود۔"

یہ وہ امور ہیں جن کی اسلام نے جڑ اکھیڑ دی تھی۔ رواۃ شیعہ نے ائمہ پر بہتان باندھ کر پھر ان کو دین میں داخل کیا۔ اس کے علاوہ ائمہ سے یہ بھی نقل کر دیا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس جفر بھی ہے اور وہ چمڑے کا ایک برتن ہے جس میں سے

[1] حیات القلوب ج ۱ ص ۶۹۔

تمام علوم نکل آتے ہیں۔ چنانچہ اصول کافی[1] میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ:-

قال وان عندنا الجفر وما یدریہم ما الجفر قال قلت وما الجفر قال وعاء من آدم فیہ علم النبیین والوصیین وعلم العلماء الذین مضوا من بنی اسرائیل

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے اور ہمارے پاس جفر ہے اور وہ کیا جانیں کہ جفر کیا ہے۔ راوی (ابو بصیر) کہتا ہے کہ میں نے پوچھا کہ جفر کیا چیز ہے؟ تو امام نے فرمایا کہ چمڑے کا ایک ظرف ہے اس میں انبیاء اور اوصیاء اور علمائے بنی اسرائیل کے علم بھرے ہوئے ہیں۔

سبحان اللہ علم سینوں میں ہوتا ہے کہ چمڑے کے برتن میں۔ شاید اس ظرف میں قواعد جفر کے مطابق حروف کے نقشے لکھے ہوں گے جیسے فال نامے ہوتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے انگلی رکھی جس خانہ میں انگلی پہنچی وہیں سے مطلوب معلوم ہو گیا۔ ان روایات سے بخوبی یہ پتا مل گیا کہ شیعوں کی نقل کے بموجب ائمہ کے سب علوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہ تھے بلکہ نجوم اور جفر اور ستاروں کی نحوست وغیرہ کی بھی اٹکلیں لگائی جاتی تھیں اور انھیں ذریعوں سے علوم انبیاء و اوصیاء متقدمین معلوم ہو جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس ایک اور قرآن بھی تھا کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نازل ہوا تھا اور قرآنِ رسول کا ایک حرف بھی اس میں نہ تھا۔ چنانچہ اصول کافی کی حدیث کا ایک فقرہ جو ہم نے

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۴۶۔

نقل کیا اس کے بعد یہ ہے :-

ثم قال وانّ عندنا لمصحف فاطمة عليها السلام ما يدريهم ما مصحف فاطمة قال مصحف فيه مثل قرآنكم هذا ثلث مرات والله ما فيه من قرآنكم حرف واحد

پھر امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا اور ہمارے پاس مصحف فاطمہ علیہا السلام ہے۔ وہ کیا جانیں کہ مصحف فاطمہ کیا ہے فرمایا کہ ایک مصحف ہے جو تمہارے قرآن سے سہ چند ہے۔ واللہ، اس میں تمہارے قرآن کا ایک حرف بھی نہیں۔

لیجیے اب قرآن رسول کے سوا ایک دوسرا قرآن بھی ائمہ کے پاس تھا جو جناب فاطمہ علیہا السلام پر نازل ہوا تھا۔ یہ قرآن رسول کے قرآن سے سہ چند تھا اور بالکل اس سے جدا تھا۔ ایک حرف بھی رسول کے قرآن کا اس میں نہ تھا۔ بہرحال ائمہ کے پاس بہت سے ذریعے علم کے ایسے تھے جو علم رسول سے بالکل جدا تھے ممکن ہے کہ ایک ذریعہ اُن کے علم کا یہ بھی ہو کہ رسول سے بذریعہ نقل کے کچھ علم ان تک پہنچا ہو جو اور علوم کے ساتھ مل کر غیر متمیز ہو گیا اور اب یہ امتیاز مشکل ہو گیا کہ جن روایتوں کی نسبت کسی طور پر یہ اعتماد ہو جائے کہ یہ تقیہ پر مبنی نہیں اور ائمہ جو عمداً اختلاف پیدا کرنے کے لیے مختلف جواب دیا کرتے تھے اُس سے بھی محفوظ ہیں ان میں کون سی باتیں علم رسول سے ماخوذ ہیں اور کون سی باتیں نجوم اور جفر وغیرہ سے مستنبط ہوئی ہیں۔

ظاہر یہ ہے کہ علم رسول کی نقل کا ذریعہ اُن کے پاس بہت تھوڑا تھا، اس لیے کہ رسول اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے اور انبیاء سابقین کے زمانے کے واقعات جو وہ بیان کرتے ہیں ان میں سند کا سلسلہ اکثر نہیں ہوتا جو امام رسول علیہ السلام کے زمانہ سے سَو یا ڈیڑھ سو برس کے بعد ہیں وہ اس زمانہ کے واقعات کو اس طرح بیان کر رہے ہیں کہ گویا خود دیکھ رہے تھے اگر کسی سند سے اُن کو پہونچے ہوتے تو اس کا ذکر کرتے۔ پس ظاہر ہے کہ اکثر وہ علوم اُس چمڑے کے تھیلے میں کو بقاعدۂ جفر ماخوذ ہوتے تھے یا بحساب نجوم معلوم ہوتے تھے یہ وہ ذریعے ہیں جن کے لیے اسلام بھی شرط نہیں۔

افسوس کہ ان مقدس ائمہ اہلِ بیت پر رُواۃِ شیعہ نے کیا کیا الزام لگا دیے جن سے وہ بزرگوار اہلِ سنت کے اعتقاد کے بموجب یقیناً مبرّا تھے۔

عوام یہ سُن کر بھی پریشان ہوں گے کہ جو لوگ مذہب شیعہ کو ائمہ سے نقل کرتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ امام نے یہ عقائد خفیہ ہم کو سکھا دیے تھے اور وہ سب کے سامنے ان عقائد کی مخالفت کرتے تھے مگر ہم سے یہ کہدیا تھا کہ تم جو کچھ ہم سے معلوم کر چکے ہو اُسی پر جمے رہنا اور اُس کے خلاف جو کچھ ہم کہیں وہ دفع الوقتی ہے۔ چنانچہ اُصولِ کافی[1] میں نضر خثعمی سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ :-

عن نضر الخثعمی قال سمعت ابا عبد الله عليه السلام يقول من عرف انا لا نقول

میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو یہ کہتے سُنا کہ جو شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ ہم حق کے سوا اور کچھ نہیں کہتے اس کو چاہیے

---

[1] اصولِ کافی مطبوعہ لکھنؤ ص ۳۸۔

الاحقا فلیکتف بما	کہ جو کچھ ہم سے معلوم کر چکا ہے اُسی پر
یعلم منا فان سمع منا خلاف	جمار ہے اور اگر ہم سے خلاف اُن باتوں
ما یعلم فلیعلم ان ذلک	کے سُنے جو معلوم کر چکا ہے تو یہ سمجھ لے کہ ہم
دفاع مناعنہ	اُن باتوں سے دفع الوقتی کرتے ہیں۔

کیا اس روایت کو سُن کر یہ شبہ نہ ہوگا کہ ایسے اماموں کا کیا اعتبار ہے کہ خفیہ جو کچھ سکھاتے اس کو اعلان کے ساتھ رد کرتے تھے بس ائمہ کو جو ساقط الاعتبار بناویں اس سے تو بہتر یہی ہے کہ اُن شیعہ راویوں کو جھوٹا سمجھ لیں جو یہ کہتے ہیں کہ مخفی طور پر ائمہ نے ہم کو مذہب شیعہ سکھایا ہے اور یہ کہہ دیا ہے کہ یہی باتیں سچی ہیں اس کے علاوہ جو ہم کہیں اس کو جھوٹ سمجھو۔

سچی باتیں وہ ہیں جو تم سے کہا کرتے ہیں
جھوٹے وعدے ہیں جو غیروں سے رہا کرتے ہیں

عوام یہ سُن کر بھی حیران ہوں گے کہ ائمہ کی رائے بھی بدلا کرتی تھی آج کچھ کہتے تھے اور چند روز کے بعد اُس قول سے پھر جاتے تھے اور اپنے اصحاب سے اُنھوں نے کہہ دیا تھا کہ جب ہم پہلی بات کے خلاف بات کہیں تو تم اخیر کی بات ماننا پہلے قول کو چھوڑ دینا۔ چنانچہ اصولِ[1] کافی میں لکھا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب سے روایت ہے کہ:۔

عن بعض اصحابنا من ابی	وہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت
عبد اللہ علیہ السلام	کرتا ہے کہ انھوں نے مجھ سے کہا کہ تو یہ بتا

۱؎ اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص ۳۸۔

قال ارایتک لو حدثتک	کہ اگر تو اس سال میں مجھ سے ایک
بحدیث العام ثم جئتنی	حدیث سُنے اور پھر سال آئندہ میں میرے
من قابل فحدثتک بخلافہ	پاس آوے اور ہم تجھ سے اس کے خلاف
بایہا کنت تاخذ	حدیث بیان کریں ایسی صورت میں تو کون
قال کنت اخذ	سی حدیث کو مانے گا؟ میں نے کہا کہ میں اخیر کی
بالاخیر۔	بات کو مانوں گا تو امام نے کہا کہ اللہ تجھ پر رحمت کرے

عوام یہ سُن کر بھی پریشان ہوں گے کہ شیعوں کی روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ امام معصوم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگرچہ مسلمان کو دوسرے مسلمان کا ستر دیکھنا جائز نہیں مگر کافر کو برہنہ دیکھنے اور اس کے ستر پر نظر کرنے کا وہی حکم ہے جو گدھے کے ستر دیکھنے کا حکم ہے۔ فروعِ[1] کافی میں موجود ہے:۔

عن ابی عبد اللہ علیہ	امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے
السلام قال النظر الی	کہ انہوں نے فرمایا کہ جو مسلمان نہ ہو اس
عورۃ من لیس بمسلم مثل	کے ستر پر نظر کرنا ایسا ہے جیسے گدھے
نظرک الی عورۃ الحمار۔	کے ستر پر نظر کرنا۔

نگاہ شوق کو حاصل ہے کیا کیا لطفِ نظارہ
کہ عُریاں دیکھنا جائز ہے معشوقانِ کافر کو

عوام کو یہ روایت سُن کر بھی کمال حیرت ہوگی کہ امام باقر علیہ السلام نورہ لگا کر حمام میں غیر لوگوں کے سامنے بالکل برہنہ ہو جایا کرتے تھے چنانچہ فروع[2]

۱؎ فروع کافی کتاب الزی والتجمل۔ ج ۲ ص ۶۱۔ ۲؎ ایضاً۔

کافی میں روایت ہے کہ:۔

ان ابا جعفر علیہ السلام کان یقول من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلا یدخل الحمام الا المیزر قال فدخل ذات یوم الحمام فتنور فلما ان اطبقت النورۃ علی بدنہ القی المیزر فقال لہ مولی لہ بابی انت وامی انک لتوصیا بالمیزر ولزومہ وقد التقیہ عن نفسک فقال اما علمت ان النورۃ قد اطبقت العورۃ۔

امام باقر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھے وہ حمام میں بغیر ازار کے نہ جاوے۔ راوی کہتا ہے کہ ایک دن امام حمام میں داخل ہوئے اور نورہ لگایا۔ جب نورہ ان کے بدن پر لگ گیا تو ازار پھینک دی۔ تب اُن کے غلام نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں تم تو ہم کو ازار کا اور ہر وقت اُس کے پہننے کا حکم کرتے ہو اور تم نے خود اپنے بدن سے ازار اُتار دی۔ تو امام نے فرمایا کہ کیا تو نہیں جانتا کہ نورہ نے ستر کو ڈھک لیا۔

اب حضرات شیعہ انصاف فرمائیں کہ کہاں امام علیہ السلام کا تقدس اور کہاں اس بے ستری کی خیالی فحش تصویر۔ رُواۃِ شیعہ نے کیا کیا تہمتیں ان مقدس بزرگوں پر لگائیں۔

شاید عوام کو اس پر بھی تعجب ہو کہ امام معصوم کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر انسان بالکل برہنہ ہو جائے اور سامنے کے ستر کو ہاتھ سے چھپالے

تو کافی ہے پیچھے کا ستر قدرتی طور پر خود بخود چھپا ہوا ہے وہاں ہاتھ رکھنے کی بھی حاجت نہیں۔ چنانچہ فروع[1] کافی میں مذکور ہے:۔

عن ابی الحسن الماضی ؑ قال العورۃ عورتان القبل والدبر اما الدبر فمستور بالالیتین واما القبل فاسترہ بیدک

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت ہے کہ ستر دو ہیں۔ ایک آگے اور ایک پیچھے۔ پیچھے کا ستر دونوں سُرینوں میں خود بخود مستور ہے۔ سامنے کے ستر پر ہاتھ رکھ لے۔

کیا عوام شیعہ کو اس پر تعجب نہ ہوگا کہ روایت صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ معصومین شیخین رض سے محبت رکھنے کا حکم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ کافی کی کتاب الروضہ میں مذکور ہے:۔

عن ابی بصیر قال کنت جالسا عند ابی عبد اللہ علیہ السلام اذ دخلت علینا ام خالد تستاذن علیہ فقال ابو عبد اللہ علیہ السلام ایسرک ان تسمع کلامھا قال فقلت نعم فاذن لھا

ابو بصیر کہتا ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس بیٹھا تھا۔ اتنے میں آئی ان کے پاس ام خالد۔ اجازت چاہی تھی ان کے پاس آنے کی۔ تو امام جعفر صادق علیہ السلام نے (مجھ سے) فرمایا کہ کیا تو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اُس کی باتیں سُنے میں نے کہا ہاں تو امام نے اُسے اجازت دی۔ کہا (ابو بصیر نے) تو بٹھایا مجھے (امام نے)

---

[1] فروع کافی۔ کتاب الزی والتجمل ص ۶۱۔

قال فاجلسنی معہ علی الطنفسۃ قال ثم دخلت فتکلمت فاذا امرأۃ بلیغۃ فسألتہ عنھما فقال لھا تولیھما قالت فاقول لربی اذا لقیتہ انک امرتنی بولایتھما قال نعم قالت فان ھذا الذی معک علی الطنفسۃ یأمرنی بالبرأۃ منھما وکثیر النوا یامرنی بولایتھما فایھما خیر واحب الیک قال ھذا واللہ احب الی من کثیر النوا واصحابہ ان ھذا یخاصم فیقول ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون ۞[1]

اپنے ساتھ مسند پر۔ کہا (ابو بصیر نے) پھر وہ آئی اور اُس نے باتیں شروع کیں تو وہ عورت بلیغ تھی۔ پھر پوچھا اُس عورت نے اُن دونوں (شیخین) کا حال تو امام نے کہا کہ ان دونوں سے محبت رکھ۔ اُس عورت نے کہا کہ جب میں اپنے رب کے پاس جاؤں گی تو یہ کہہ دوں گی کہ تم نے مجھ کو اُن دونوں سے محبت رکھنے کا حکم کیا تھا۔ امام نے کہا کہ ہاں۔ اُس عورت نے کہا کہ یہ شخص جو تیرے ساتھ مسند پر بیٹھا ہے اُن دونوں سے بیزاری کا مجھ کو حکم کرتا ہے۔ تو ان دونوں میں کون تمہارے نزدیک افضل اور راجح ہے، امام نے کہا کہ یہ شخص واللہ زیادہ محبوب ہے مجھ کو کثیر النوا اور اس کے اصحاب سے بے شک یہ جھگڑا کرتا ہے اور کہتا ہے۔ " اور جس نے نہ حکم کیا اُس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے تو وہی لوگ کافر ہیں۔

۱؎ کتاب الروضہ ص ۲۹۔

اس روایت پر غور کرنے کے بعد بڑی وضاحت سے یہ ظاہر ہو گیا کہ امام نے نہایت تصریح اور تاکید کے ساتھ شیخین سے محبت رکھنے کا حکم کیا اور جب اس عورت نے یہ کہا کہ میں قیامت کے دن اللہ کے سامنے تمہارا حوالہ دوں گی کہ تم نے مجھ کو شیخین سے محبت رکھنے کا حکم کیا ہے تو امام نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اب اگر محبت شیخین جائز نہ تھی تو یہ لازم آوے گا کہ امام نے عمداً اس عورت کو گمراہ بنایا حالانکہ امام کا کام ہدایت ہے۔ اُس عورت پر امام کی اطاعت واجب تھی اگر اُس حکم کو نہ مانتی تو گمراہ ہو جاتی اور چونکہ شیعوں کے نزدیک تمام جہان پر امام کی اطاعت واجب ہے پس شیعوں کو اس حکم میں بھی امام کی اطاعت واجب ہے اگر مخالفت کریں گے تو صریح نافرمانی کے گناہ میں مبتلا ہوں گے۔

اور یہ بھی اس روایت سے ظاہر ہو گیا کہ امام کے اصحاب میں سے کثیر النوا بھی یہی حکم کرتا تھا۔ البتہ ابو بصیر اس قول میں امام کا مخالف تھا۔

شاید حضرات شیعہ اس روایت میں یہ تاویل کریں کہ یہ حکم امام نے بطور تقیہ دیا تھا یعنی مصلحت وقت کی وجہ سے جھوٹ بولا اور عمداً حکم ناحق بیان کیا اور اُس عورت کو گمراہ بنایا اور قرینہ امام کے اس جھوٹ بولنے کا یہ ٹھیرائیں کہ امام نے ابو بصیر کو احب فرمایا اور یہ بھی ارشاد کیا کہ ابو بصیر جھگڑا کرتا ہے اور آیت من لم یحکم الخ پڑھا کرتا ہے یعنی شیخین کو (معاذ اللہ) یوں کہتا ہے کہ وہ خلاف ما انزل اللہ حکم کرتے تھے۔

مگر یہ تاویل اس روایت میں ہرگز صحیح نہیں ہو سکتی اور کوئی بات کسی طرح نہیں بن سکتی اس لیے کہ ایسا صریح جھوٹ بولنا اور خلاف حق حکم دینا اور

قیامت کے دن اللہ کے سامنے حکم ناحق کی ذمہ داری قبول کرنا امام کی شان سے نہایت بعید ہے اُس عورت کا ایسا کیا خوف تھا جس کی وجہ سے امام ایسا جھوٹا حکم بیان کرتے جو لوگ حقانی ہوتے ہیں وہ ہر حالت میں اللہ پر توکل کرتے ہیں اور کلمۂ ناحق زبان سے نہیں نکالتے کیا یہی امام معصوم اور واجب الاطاعت تھے جو اس طرح خلاف حق حکم کیا کرتے تھے اور لوگوں کو گمراہ بنایا کرتے تھے۔

قطع نظر اس کے کثیر النوا جو امام کا صحابی تھا وہ بھی شیخین کی محبت کا حکم کرتا تھا اس سے معلوم ہو گیا کہ امام کی تعلیم بھی یہی تھی۔

ابوبصیر جو اس مسئلہ میں امام کا مخالف تھا اور شیخین سے عداوت رکھتا تھا اُس کو اس جلسہ میں امام نے اسی لیے شریک کیا تھا کہ اس کو اپنی غلطی پر تنبیہ ہو جائے اور اس اعتقاد فاسد سے توبہ کرے۔ ام خالد کو جو محبت شیخین کا حکم کیا اس میں یہ بھی مقصود تھا کہ ابوبصیر بھی اس حکم کو سُن لے۔ جب اُس عورت نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک کثیر النوا اور ابوبصیر میں خیر اور احب کون ہے؟ تو خیر کے جواب میں امام نے سکوت کیا اور ابوبصیر کو کثیر النوا سے خیر یعنی افضل نہ بتایا البتہ احب کہا اس میں اس کی تالیف مقصود تھی اس لیے کہ تالیف کی صورت میں انسان حق کو جلد قبول کرتا ہے بایں ہمہ (یخاصم) کے لفظ سے اس کی غلطی پر تنبیہ فرما دی یعنی شیخین کی نسبت جو وہ آیت ومن لم یحکم بما انزل اللہ کو پڑھتا ہے یہ اس کا جھگڑا ہے اور یہ بات ظاہر ہے کہ جھگڑا بُری چیز ہے۔ چنانچہ انھیں امام جعفر صادق سے اصول کافی ص۴۸۴ میں منقول ہے:۔

لا تخاصموا بدینکم الناس فان المخاصمۃ ممرضۃ للقلب۔

مت جھگڑا کرو اپنے دین پر آدمیوں سے اس لیے کہ مخاصمت دل کو مریض بنا دیتی ہے۔

پس اگر ابوبصیر کا قول امام کے نزدیک حق ہوتا تو اس کو مخاصمت نہ فرماتے (یخاصم) کا لفظ جو فرمایا اسی سے ظاہر ہو گیا کہ ابوبصیر کے قلب میں مرض تھا۔ ابوبصیر کی فقط یہی غلطی نہ تھی بلکہ اس کی عادت تھی کہ امور منہیہ میں مبتلا رہتا تھا اور اہل بیت پر افترا کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایسی مسکرات پیتا تھا کہ جو اہل بیت کے نزدیک مثل خمر کے تھی۔ اور کہتا تھا کہ اہل بیت نے مسکرات کے حلال ہونے کا فتویٰ دیا ہے اُس وقت بھی امام نے اس کو تنبیہ کی تھی اور شرب مسکرات اس سے چھڑایا تھا۔ چنانچہ فروع کافی جلد ۲ ص۱۸۱ میں ہے کہ:۔

عن کلیب بن معاویۃ قال کان ابوبصیر واصحابہ یشربون النبیذ ویکسرونہ بالماء فحدثت بذلک اباعبداللہ علیہ السلام فقال لی وکیف صار الماء یحلل المسکر مرھم لا یشربوا منہ قلیلا ولا کثیرا قلت انھم یذکرون ان الرضا من آل محمد یحللہ لھم فقال

کلیب بن معاویہ سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ ابوبصیر اور اس کے اصحاب نبیذ پیا کرتے تھے اور اس کی تیزی پانی سے توڑتے تھے۔ میں نے یہ حال امام جعفر صادق علیہ السلام سے بیان کیا۔ امام نے فرمایا کہ بھلا پانی نشے کی چیز کو کیسے حلال کر دے گا؟۔ تو ان کو حکم کر کہ اس میں سے نہ پئیں نہ تھوڑا اور نہ بہت۔ میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ آل محمدؐ سے رضا نے اس کے حلال ہونے کا

وکیف کان یحلون آل محمد المسکر وھم لایشربون منہ قلیلا ولا کثیرا فقلت فامسکوا عن شربہ فاجتمعنا عند ابی عبد اللہ صلوۃ اللہ علیہ فقال لہ ابو بصیر ان ذا جائنا عنک بکذا وکذا فقال صدق یا ابا محمد ان الماء لایحلل المسکر فلا تشربوا منہ قلیلا ولا کثیرا۔

اُنھیں حکم کیا ہے تو امام نے کہا کہ بھلا آل محمدؐ نشے کی چیز کو کیسے حلال کر دیں گے حالانکہ آل محمدؐ مسکرہ چیز نہ تھوڑی پئیں نہ بہت۔ تب میں نے (ابو بصیر وغیرہ سے) یہ کہلا بھیجا اور وہ اس کے پینے سے باز رہے۔ پھر جمع ہوئے ہم سب امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس تو ابو بصیر نے امام سے کہا کہ یہ شخص تمہاری طرف سے ایسا ایسا حکم لایا ہے تو امام نے کہا کہ وہ سچ کہتا ہے اے ابو محمد بے شک پانی مسکر کو حلال نہیں کرتا تم اُس میں سے تھوڑا پیو نہ بہت۔

اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ ابو بصیر ایسا جاہل تھا کہ اس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ائمہ اہل بیت کا یہ مذہب ہے کہ نشے کی چیز تھوڑی اور بہت سب حرام ہوتی ہے بلکہ سب نشے کی چیزیں خمر ہیں اور اہل بیت پر افترا کرتا تھا کہ وہ حلال بتاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس کی جہالت یہ ہے کہ جب امام نے اس کی حرمت کا حکم کہلا بھیجا پھر بھی اس کو شک باقی رہا اور دوبارہ امام سے استفسار کیا۔ پس جو شخص ایسا جاہل اور مفتری ہو وہ اگر شیخین سے عداوت رکھے تو کیا بعید ہے۔ اور امام نے جس طرح شرب مسکر سے اس کو تنبیہ کی اور منع کیا اسی طرح عداوت شیخین سے بھی اُس کو اس طرح منع کیا کہ ابو بصیر کے سامنے ام خالد کو محبت

شیخین کا حکم کیا تاکہ ابو بصیر بھی سُن لے اور ابو بصیر جو یہ کہا کرتا تھا کہ شیخین خلاف ما انزل اللہ حکم کیا کرتے تھے اس کو مخاصمت بتا دیا۔ کافی کی اس روایت سے۔ اور ابو بصیر کا جاہل اور مفتری ہونا ثابت ہوگیا۔ اب امام کی نسبت جو اس کی بد اعتقادی تھی وہ بھی سُن لیجیے۔ تنقیح ص۱۶۷ میں رجال کشی سے نقل کیا ہے:۔

عن محمد بن مسعود قال حدثنی محمد بن عیسی عن یونس قال جلس ابو بصیر علی باب ابی عبد اللہ لیطلب الاذن فلم یوذن لہ فقال لو کان معنا طبق لاذن فجاء کلب فشغر فی وجہ ابی بصیر۔

کہا یونس نے کہ ابو بصیر امام جعفر صادق کے دروازہ پر بیٹھا تھا اور اندر جانے کی اجازت چاہتا تھا۔ پھر اجازت نہ ملی تو ابو بصیر نے کہا کہ اگر ہمارے ساتھ خوان آتا تو اجازت مل جاتی، اتنے میں ایک کُتا آیا اور اُس نے ابو بصیر کے منہ میں مُوت دیا۔

(تنقیح ص ۱۶۷)

پس جو ابو بصیر امام کو بھی طماع سمجھتا تھا اور اُس کے وبال میں کُتے نے اس کے منہ میں مُوت دیا اگر وہ شیخین پر بھی طعن کرے تو کیا تعجب اور یہاں سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ چونکہ ابو بصیر سامنے بیٹھا تھا اس لیے امام نے اس کو احسب بنایا کہ وہ کوئی فساد نہ کرے ورنہ جس شخص کے ایسے حالات ہوں اُس سے امام ہرگز محبت نہ رکھتے ہوں گے۔

اور نیز تنقیح میں بحوالۂ رجال کشی یہ بھی نقل کیا ہے:۔

روی الکشی باسنادہ قال سالت ابا الحسن عن رجل

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے یہ مسئلہ پوچھا کہ اگر کسی شخص نے

تزوج امرأة لها زوج ولم یعلم قال ترجم المرءة ولیس علی الرجل شئ اذا لم یعلم فذکرت ذلک لابی بصیر المرادی قال فقال لی واللہ جعفر ترجم المرءة و یجلد الرجل الحد وقال اظن صاحبنا ما تکامل علمہ۔ (تنقیح ص۱۶۷)

ایک ایسی عورت سے نکاح کر لیا جس کا شوہر موجود ہے اور اُس شخص کو یہ حال معلوم نہ تھا تو کیا حکم ہے؟ امام نے کہا عورت سنگسار کی جاوے اور مرد پر کوئی مواخذہ نہیں اس لیے کہ اس کو معلوم نہ تھا۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ قصہ ابو بصیر مرادی کے سامنے بیان کیا تو اُس نے کہا کہ واللہ مجھ سے امام جعفر صادق نے کہا تھا کہ عورت سنگسار کی جاوے اور مرد پر بھی حد جاری کی جائے۔ پھر ابو بصیر نے کہا کہ میرا گمان یہ ہے کہ ہمارے امام کا علم پورا نہیں ہوا۔

اب بہت اچھی طرح ظاہر ہو گیا کہ ابو بصیر ائمہ کو کم علم بھی جانتا تھا اور جب یہ شخص ائمہ کو طماع اور بے علم جانتا تھا تو اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ان کی امامت کا معتقد نہ تھا۔

یہ ابو بصیر وہ شخص ہے کہ کافی وغیرہ کتب احادیث شیعہ اسی کی روایتوں سے مالا مال ہیں اور مذہب شیعہ کو ائمہ سے زیادہ تر اسی نے نقل کیا ہے۔

ایک بہت بڑی دلیل اس بات کی امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ حکم بطور تقیہ کے نہ تھا یہ ہے کہ امام جعفر صادق کو تقیہ جائز ہی نہ تھا۔ چنانچہ عہد نامہ جو اُن کے لیے نازل ہوا تھا اُس کے الفاظ اصول کافی میں اس طرح مذکور ہیں:۔

ثم دفعہ الی ابنہ جعفر علیہ السلام ففک خاتما فوجد فیہ حدث الناس وافتھم وانشر علوم اھل بیتک وصدق آبائک الصالحین ولا تخافن الا اللہ عزوجل وانت فی حرز و امان۔ (اصول کافی ص۱۶۲)

پھر امام باقر نے (وہ کتاب عہد جس پر مہریں لگی ہوئی تھیں) اپنے بیٹے جعفر علیہ السلام کے حوالے کی۔ انھوں نے ایک مہر توڑی تو اس کتاب میں یہ پایا کہ حدیث بیان کر اور فتویٰ دے اور علوم اہل بیت کو شایع کر اور اپنے آباء صالحین کی تصدیق کر اور اللہ کے سوا کسی سے مت ڈر اور حفاظت اور امن میں ہے۔

پس جب امام صادق کے لیے حکم آچکا تھا کہ اللہ کے سوا کسی سے مت ڈر اور اللہ اُن کو خبر دے چکا تھا کہ تم حفاظت اور امن میں رہو گے پھر ان کو کسی کا خوف نہ تھا وہ تقیہ کیوں کرتے وہ اللہ کی طرف سے حکم دینے اور فتوے بیان کرنے پر مامور ہوئے تھے۔ پس جو حکم انھوں نے بیان کیا وہ ضرور واجب العمل ہوگا اور ان کے حکم کی نسبت یہ کہنا کہ مصلحت کی وجہ سے انھوں نے جھوٹ بولا درحقیقت ان کی امامت کا انکار کرنا ہے۔

کیا عوام اس خبر سے متحیر نہ ہوں گے کہ شیعوں کی روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت معصومین کی یہ عادت تھی کہ اللہ جو اپنی نعمتوں کی بشارت اُن کے پاس بھیجا کرتا تھا اس کو کئی کئی بار رد کیا کرتے تھے اور قبول کرنے میں عذر کرتے تھے اور بڑی مشکل سے قبول کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اصول کافی میں ہے:۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال ان جبرئیل نزل علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم فقال لہ یا محمد ان اللہ یبشرک بمولود یولد من فاطمۃ تقتلہ امتک من بعدک فقال وعلی ربی السلام لا حاجۃ لی فی مولود یولد من فاطمۃ تقتلہ امتی من بعدی فعرج ثم ھبط فقال لہ مثل ذلک فقال یا جبریل وعلی ربی السلام لا حاجۃ لی فی مولود تقتلہ امتی من بعدی فعرج جبریل الی السماء ثم ھبط فقال یا محمد ان ربک یقرئک السلام ویبشرک بانہ جاعل فی ذریتہ الامامۃ والولایۃ والوصیۃ فقال انی قد

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ جبرئیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اے محمد اللہ تم کو ایک مولود کی بشارت دیتا ہے جو فاطمہ سے پیدا ہوگا تمہاری امت تمہارے بعد اس کو قتل کرے گی تو رسول نے کہا اور میرے رب پر سلام ہو مجھ کو ایسے مولود کی کچھ حاجت نہیں جو فاطمہ سے پیدا ہو اور میری امت اس کو میرے بعد قتل کرے۔ جبرئیل آسمان پر گئے اور پھر اُترے اور وہی کہا جو پہلے کہا تھا تو رسولؐ نے کہا کہ اے جبرئیل اور میرے رب پر سلام ہو مجھ کو ایسے مولود کی حاجت نہیں جس کو میری امت میرے بعد قتل کرے۔ پھر چڑھے جبرئیل آسمان کی طرف پھر اُترے تو کہا اے محمدؐ بیشک تمہارا رب تمہیں سلام کہتا ہے اور یہ بشارت دیتا ہے کہ اللہ اُس مولود کی اولاد میں امامت اور ولایت اور وصیت

رضیت ثم ارسل الی فاطمۃ ان اللہ یبشرنی بمولود یولد لک تقتلہ امتی من بعدی فارسلت الیہ ان لا حاجۃ لی فی مولود تقتلہ امتک من بعدک فارسل الیھا ان اللہ قد جعل فی ذریتہ الامامۃ والولایۃ والوصیۃ فارسلت الیہ انی قد رضیت۔

(اصول کافی ص ۲۹۴)

مقرر کرے گا تب رسولؐ نے کہا میں راضی ہوا۔ پھر فاطمہؓ کو پیغام بھیجا کہ اللہ نے مجھ کو ایک بچے کی بشارت دی ہے جو تجھ سے پیدا ہوگا اور میری امت میرے بعد اس کو قتل کرے گی۔ تو فاطمہ نے یہ جواب بھیجا کہ مجھ کو ایسی اولاد کی حاجت نہیں جس کو تمہاری امت تمہارے بعد قتل کردے۔ پھر پیغمبرؐ نے فاطمہؓ کے پاس یہ پیغام بھیجا کہ اللہ نے اُس کی اولاد میں، امامت اور ولایت اور وصیت مقرر کی ہے تو کہلا بھیجا فاطمہ نے کہ میں راضی ہوگئی۔

اس روایت سے کئی نتیجے نہایت عجیب ظاہر ہوتے ہیں۔

اوّل یہ کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب سیدہ رضی اللہ عنہا کو باوجود مرتبۂ عبودیت کے اپنے خالق کی عظمت و جلال کا (معاذ اللہ) کچھ بھی ادب نہ تھا اور بڑی جُرأت کے ساتھ بار بار اس کے انعام کو رد کرتے تھے۔ اگر کوئی دنیائی بادشاہ کسی امیر کو انعام دینا چاہے اور وہ اس طرح رد کرے تو بادشاہ کی بہت بڑی توہین سمجھی جاوے گی اور ہر شخص اس امیر کو بڑا گستاخ کہے گا نہ کہ عبد اور معبود کا معاملہ۔ اس سے بڑھ کر اور ناشکری کیا ہوگی۔ حالانکہ جن کو قرب الٰہی زیادہ حاصل ہوتا ہے ان کو ادب بھی اوروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اوروں کے مقابلہ میں خوفِ الٰہی زیادہ تھا۔

دوسرے یہ کہ اللہ نے جس چیز کو رسولؐ اور جناب سیدہؓ کے لیے موجبِ نعمت اور رحمت تجویز کیا اور اس کی بشارت بھیجی ان دونوں نے اس کو اپنے لیے مصیبت اور قابلِ رد سمجھا۔ پس معلوم ہوا کہ اللہ کو حکیم اور لطیف اور خبیر نہ جانا اور اپنی رائے اللہ کی تجویز پر غالب سمجھی اور یہ خیال نہ کیا کہ جس چیز کی اللہ نے بشارت بھیجی ہے وہ ضرور بہت بڑی نعمت ہوگی۔

تیسرے یہ کہ شہادت فی سبیل اللہ میں وہ دونوں کچھ بھی فضیلت نہ جانتے تھے بلکہ شہادت کو نہایت حقیر اور قابلِ رد سمجھتے تھے۔

چوتھے کہ جناب امام حسین علیہ السلام کی ذات مبارک میں (معاذ اللہ) کچھ بھی خوبی نہ تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ ان کی قسمت میں شہادت مقرر ہو چکی تھی اُن کی ذات بیزاری کے لائق تھی اور اگر ان کی اولاد میں امامت مقرر نہ ہوئی ہوتی تو ہرگز اُن کی ذات قبول نہ کی جاتی۔

پانچویں یہ کہ جناب امام حسن علیہ السلام کی ذات حسینؓ سے بھی زیادہ بیزاری کے لائق تھی اس لیے کہ ان کی قسمت میں بھی شہادت تھی اور ان کی اولاد میں امامت بھی نہ تھی اسی وجہ سے اللہ نے اُن کو بغیر بشارت بھیجنے کے پیدا کر دیا ورنہ وہ کسی طرح نہ قبول کیے جاتے اور ان کے قبول کرانے میں اللہ کو بڑی مشکل پیش آتی۔ معاذ اللہ۔

چھٹے یہ کہ اللہ نے رسولؐ کے پاس تین مرتبہ یہ بشارت بھیجی مگر امر امامت کو اول دو مرتبہ میں ظاہر نہ کیا شاید اس میں یہ مصلحت تھی کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) فضیلت ردِ نعمت کو دو مرتبہ حاصل کر لیں اور عبد شکور بن جاویں۔

ساتویں یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اوّل بار جناب سیدہؓ کے پاس بشارت بھیجی تو امر امامت ظاہر نہ کیا۔ اس سے بھی شاید یہی غرض تھی کہ ایک مرتبہ سُنتِ رد کو ادا کرا لیں۔

اے حضراتِ شیعہ انصاف کرو کہ تمہارے راویوں نے کیا کیا افترا کیے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیسی کیسی تہمتیں ناشکری اور بے ادبی وغیرہ کی لگائیں۔ حضرت جبریلؑ کو بار بار آسمان پر چڑھنے اور اُترنے کی کشاکش میں ڈالا۔

طرفہ یہ ہے کہ بظاہر مجبور ہو کر اگرچہ جناب سیدہ نے رضامندی ظاہر کر دی مگر دل میں وہی ناگواری اور بیزاری موجود تھی اور اللہ کی اس بشارت کو اُنہوں نے صدق دل سے قبول نہیں کیا چنانچہ حمل بھی اُن کو ناپسند تھا اور ولادت حسینؓ کے وقت بھی اس فرزند سے اُن کو سخت بیزاری تھی۔ چنانچہ اصول کافی ص۲۹۴ میں امام جعفرؓ صادق علیہ السلام سے روایت مذکور ہے کہ:۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال لما حملت فاطمۃ بالحسین جاء جبریل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان فاطمۃ ستلد غلاما تقتلہ امتك من

جب فاطمہؓ کو حسین کا حمل ہوا تو جبریل، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ فاطمہ کے ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کو تمہاری امت تمہارے بعد قتل کرے گی۔ پھر جب فاطمہ کو حسین کا حمل ہوا تو اُن کو حسین کا حمل ناپسند تھا

بعد ذلك فلما حملت فاطمة بالحسين كرهت حمله وحين وضعته كرهت حمله ثم قال ابو عبد الله عليه السلام لم ترفي الدنيا ام تلد غلاما تكرهه ولكنها كرهته لما علمت انه سيقتل قال وفيه نزلت هذه الآية حملته امه كرها ووضعته كرها۔

اور جب حسینؓ پیدا ہوئے تو اُن کا پیدا ہونا بھی ناپسند تھا۔ دنیا میں کوئی ماں ایسی نہیں دیکھی گئی کہ اپنے فرزند کی ولادت اُس کو ناپسند ہو لیکن فاطمہ نے حسین کی ولادت اس وجہ سے ناپسند کی کہ اُن کو معلوم ہو گیا تھا کہ حسین قتل ہوں گے پھر امام جعفر صادق نے فرمایا کہ انھیں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی ہے کہ حمل میں رکھا اس کو اس کی ماں نے ناپسندیدگی میں اور جنا اُس کو ناپسندیدگی میں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے جو اس آیت کی تفسیر کی اُس سے ظاہر ہو گیا کہ اس آیت میں کراہت سے درد اور ایذا کی کراہت مراد نہیں ہے بلکہ ناپسندی اور ناگواری طبیعت مراد ہے اور خاص جناب امام حسین علیہ السلام کے حمل اور ولادت اور ان کی والدہ ماجدہ جناب سیدہ علیہا السلام کی اُس سے بیزاری کا بیان ہے۔

حسین مظلوم کی یہ حالت ہوئی کہ ان کی بشارت کو دو مرتبہ رسولؐ نے اور ایک مرتبہ جناب سیدہ نے رد کیا آخر کو قبول بھی کیا تو جناب سیدہؓ نے دل سے قبول نہ کیا اور اُن کی ولادت سے سخت بیزار ہوئیں۔

پس جس مظلوم بچے کی ولادت کے وقت ایسی قدر ہوئی اگر اس کی

موت بھی مظلومی سے ہوئی تو (اول را آخر نسبتے ہست) کا مضمون صادق آگیا۔

آخر جب حسین غیور پیدا ہوئے تو انھوں نے اپنی ماں جناب سیدہ کا دودھ ہرگز نہ پیا اور جب ماں کا دودھ چھوڑا تو کسی دوسری عورت کا دودھ کیوں پیتے؟ تب رسولؐ کو اپنے فرزند غیور کے لیے اپنے انگوٹھے سے دودھ نکالنا پڑا۔ چنانچہ کافی کی پہلی روایت جو ہم نقل کر چکے اُس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ:۔

ولم يرضع الحسين من فاطمة عليها السلام ولا من انثى كان يوتي به النبي فيضع ابهامه في فيه منها ماتكفيه اليومين اوالثلث

حسین نے نہ فاطمہ علیہا السلام کا دودھ پیا نہ کسی اور عورت کا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کو لاتے تھے تو نبیؐ اپنا انگوٹھا ان کے منہ میں رکھ دیتے تھے تو وہ اس قدر چوس لیتے تھے کہ دو یا تین دن کو کافی ہو

ہائے اے شبیر مظلومی تری — رد ہوئی تیری بشارت تین بار
گرچہ راضی ہو چکی تھیں فاطمہؓ — پھر بھی تھی تیری ولادت ناگوار
کہتی ہے اس رمز کو قرآن میں — اُمّہ کرہاً کی آیت آشکار
تم کو بھی غیرت کا ایسا جوش تھا
دودھ اُس ماں کا نہ چوسا زینہار

اب حضرات شیعہ براہ انصاف بیان فرمائیں کہ اللہ کی بھیجی ہوئی بشارت کو اس طرح رد کرنا اور اللہ کی نعمت کو مصیبت سمجھنا اور رضامندی کا

اقرار کرکے کے بعد پھر اس سے بیزار ہونا کیسا ہے ؎

خدا سے کس کو جائز اس طرح ردّ و بدل ہوگا
تمہیں انصاف سے کہدو یہ عقدہ کیسے حل ہوگا

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دو مرتبہ اور جناب سیدہ نے ایک مرتبہ بشارت حسین کو اس نفرت کے ساتھ رد کیا اور حمل اور ولادت کے وقت بھی جناب سیدہ بیزار تھیں جس بیزاری کا قرآن میں بھی تذکرہ ہوا یہ بیزاری فقط اپنے لیے تھی کہ آخر کو حسین علیہ السلام امتِ رسولؐ کے ہاتھ سے قتل ہوں گے اگر یہ قتل ہونا کوئی عیب تھا تو یہ صفت تو جناب امیر اور جناب امام حسن علیہما السلام میں بھی موجود تھی اور یہ دونوں بھی آخر میں مظلومی کے ساتھ شہید ہوئے۔ حسین علیہ السلام کے قتل ہونے کا صدمہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب سیدہ علیہا السلام کی حیات میں پیش آنے والا نہ تھا پس ان کی بشارت کو رد کرنا اور ان کی ولادت سے ناراض ہونا گویا قبل از مرگ واویلا تھا۔ بالفرض اگر اُن دونوں کی حیات میں بھی یہ حادثہ پیش آنے والا ہوتا تو اُن سے بڑھ کر جادۂ رضا و تسلیم میں ثابت قدم اور کون ہو سکتا ہے۔ کیا اپنی اولاد کے لیے وہ کوئی ایسا انتظام چاہتے تھے کہ اُن کے بعد بھی اُن کی اولاد پر کوئی صدمہ نہ آوے حالانکہ یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ سب سے زیادہ مصائب اہل بیت کے لیے مقدر ہو چکے ہیں۔

اب ان سب سے قطع نظر کیجیے اور اس امر پر غور کیجیے کہ واقعۂ شہادت حسین میں کیا مصیبت تھی جس کے مقابلے میں اجر شہادت کی کچھ

وقعت نہ سمجھی گئی اور بشارت حسین کو بار بار رد کیا گیا۔

شہادت حسین علیہ السلام کے واقعات میں سب سے پہلا امر جو باعث ظاہر باعث اس حادثہ کا ہوا یہ تھا کہ جناب امام علیہ السلام نے بیعت یزید کی گوارا نہ کی اور طریقۂ انبیاء اور سنت جناب امیر کی مخالفت کی۔ ان کے سامنے جناب امیر نے خلفائے ثلثہ سے اور جناب امام حسن نے امیر شام سے بیعت کی تھی۔ پھر جناب امام حسین علیہ السلام کو انکار بیعت کی کوئی وجہ نہ تھی جو ایسے وقت میں تقیہ کو جو اس وقت اُن پر واجب تھا ترک کیا۔ کیا مذہب اہل بیت کو چھوڑ کر جناب امام حسین علیہ السلام نے اپنے واسطے کوئی نیا مذہب تجویز کیا تھا جو اپنے باپ اور بھائی کا طریقہ چھوڑا۔

شیعوں کے مشہور مناظر مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی نے اپنے والد ماجد مولوی سید محمد قلی صاحب کا رسالہ تقیہ جو اپنی طرف سے اصلاح و ترمیم کے بعد چھپوایا ہے اس میں اس مشکل لاحل کا جواب یوں دیا ہے :۔

"شیعیان قائل تقیہ علی الاطلاق فی جمیع الازمنۃ والاحوال نیستند و قطع نظر ازیں چوں اہل کوفہ عہود و مواثیق بسیار کردند و نامہ ہائے بے شمار نوشتند و احکام مبنی بر ظاہر ست لہذا آنجناب عزم جہاد فرمودہ بود. ہرگاہ بے وفائی و غدر ایشاں ظاہر شد ہر چند قصد رجوع کرد لیکن ممکن نشد. واگر توہم کردہ شود کہ چرا در آں وقت بیعت عمر سعد و ابن زیاد نمود پس مدفوع است بایں کہ غالباً آنحضرت دانستہ باشد کہ آں ملاعنہ از غدر و بے وفائی باز نہ خواہند آمد اگرچہ آنحضرت بیعت ہم کند۔"

اس عبارت کے پہلے فقرے کا حاصل یہ ہوا کہ شیعہ ہر وقت میں اور ہر حالت میں تقیہ کے قائل نہیں مگر اس شبہ کے جواب میں یہ تقریر محض بے فائدہ ہے اس لیے کہ ہر حالت سے بحث نہیں بلکہ فقط حالت خوف سے بحث ہے اور جناب امام حسین علیہ السلام کے لیے اس وقت میں بے شک حالت خوف موجود تھی اور وہی حالت تھی جس حالت میں جناب امام حسن علیہ السلام نے تقیہ کر کے امیر شام کی بیعت کی تھی بلکہ اہل شام کی قوت اور زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے جناب امام حسین علیہ السلام کے لیے اور زیادہ خوف کی حالت تھی پس اُن کے لیے تقیہ ضرور واجب تھا۔

اصول کافی ص۴۸۲ میں ابو عمیر اعجمی سے روایت ہے کہ:۔

قال قال لی ابو عبد اللہ علیہ السلام یا ابا عمر ان تسعۃ اعشار الدین فی التقیۃ ولا دین لمن لا تقیۃ لہ والتقیۃ فی کل شئ الا فی النبیذ والمسح علی الخفین۔

وہ کہتا ہے کہ مجھ سے امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اے ابو عمر بیشک دین کے دس حصوں میں سے نو حصے دین تقیہ میں ہے اور جو تقیہ نہ کرے اس کا دین ہی نہیں اور تقیہ ہر چیز میں ہے مگر نبیذ میں اور موزوں پر مسح کرنے میں۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ تقیہ ایک ایسی ضروری چیز ہے کہ نو حصے دین تقیہ میں ہے اور ایک حصہ باقی ارکان دین (یعنی توحید اور اقرار رسالت و امامت و ادائے فرائض وغیرہ) میں اور جو تقیہ نہ کرے

وہ بے دین ہے۔ پس سخت تعجب ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے تقیہ کے اُن مناقب اور ترک تقیہ کی اس وعید پر کیوں نہ لحاظ کیا اور حکم تقیہ سے فقط دو چیزیں مستثنیٰ ہیں۔ ایک نبیذ، دوسرے موزوں پر مسح کرنا۔ ان دونوں چیزوں میں کسی حالت میں تقیہ جائز نہیں۔ ان کے سوا سب چیزوں میں تقیہ ہے۔ بلکہ تقیہ ایک ایسا عمدہ حیلہ ہے کہ تقیہ کی آڑ میں جناب امیر پر تبرا کہنا بھی جائز ہے۔ چنانچہ اصول کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:۔

عن مسعدۃ بن صدقۃ قال قیل لابی عبد اللہ علیہ السلام ان الناس یروون ان علیا علیہ السلام قال علی منبر الکوفۃ ایھا الناس انکم ستدعون الی سبی فسبونی ثم ستدعون الی البراءۃ منی فلا تبرءوا منی۔ فقال ما اکثر ما یکذب الناس علی علی علیہ السلام ثم قال انما قال ستدعون الی سبی فسبونی ثم ستدعون

مسعدہ بن صدقہ سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ پوچھا گیا کہ لوگ روایت کرتے ہیں کہ علی علیہ السلام نے منبر کوفہ پر یہ فرمایا کہ اے لوگو! تم بُلائے جاؤ گے مجھے بُرا کہنے کی طرف تو مجھ کو بُرا کہہ لینا۔ پھر بُلائے جاؤ گے مجھ سے تبرا ظاہر کرنے کی طرف تو مجھ پر تبرا ظاہر مت کرنا۔ تو فرمایا کہ بہت جھوٹ بولتے ہیں لوگ علی علیہ السلام پر۔ پھر فرمایا کہ علی علیہ السلام نے یہ کہا تھا کہ تم بلائے جاؤ گے مجھے بُرا کہنے کی طرف تو مجھے بُرا کہہ دینا پھر بُلائے

الی البراءۃ منی والی لعلی حین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ ولم یقل ولا تبروا منی فقال لہ السائل ان اختار القتل دون البراءۃ فقال واللہ ما ذلک علیہ وما لہ الا ما مضی علیہ عمار بن یاسر حیث اکرھہ اھل مکۃ۔

(اصول کافی ص۴۸۴)

جاؤ گے مجھ سے بیزاری ظاہر کرنے کی طرف حالانکہ میں دین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر ہوں اور علی علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ مجھ سے بیزاری ظاہر مت کرنا۔ تو سائل نے پوچھا کہ اگر وہ قتل ہونا اختیار کرے اور تبرا کہنا گوارا نہ کرے۔ تو فرمایا کہ واللہ یہ اس پر واجب نہیں۔ اور نہیں جائز اُسے مگر وہی جو عمار بن یاسر نے کیا جب اہل مکہ نے اُس پر جبر کیا۔

حاصل اس روایت کا یہ ہوا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے کسی نے یہ روایت بیان کی کہ جناب امیر نے یہ فرمایا تھا کہ مجھ کو بُرا کہہ لینا، مگر مجھ پر تبرا مت کہنا۔ اس روایت کو امام جعفر صادق نے جھوٹا بتایا اور یہ اجازت دی کہ حالت خوف میں جناب امیر پر تبرا کہنا جائز ہے جیسے عمار نے اہل مکہ سے مجبور ہو کر کلمات کفر کے کہے تھے۔

تعجب ہے کہ تقیہ میں جناب امیر پر تبرا جائز ہو مگر نبیذ پینا اور موزوں پر مسح کرنا جائز نہ ہو۔ بہر حال یزید کی بیعت جناب امیر پر (معاذ اللہ منہا) تبرا کہنے سے بہت سہل تھی پھر جناب امام حسین علیہ السلام نے اجر تقیہ کیوں چھوڑا اور سنت اماماں سابقین کی کیوں مخالفت کی؟۔

جناب امام حسین علیہ السلام کے واسطے تو یقیناً حالتِ خوف تھی،

حالانکہ تقیہ تو بغیر حالتِ خوف کے اور بغیر مصلحتِ دینی کے بھی جائز ہے بلکہ سنتِ انبیاء ہے۔ چنانچہ حضرت یوسف[1] علیہ السلام کے تقیہ سے یہ مضمون بہت اچھی طرح ظاہر ہو چکا۔

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ جناب امام حسین علیہ السلام نے اس وجہ سے تقیہ نہ کیا کہ انہوں نے اہل کوفہ کے خطوط سے دھوکا کھا کر عزم جہاد کیا تھا اس لیے کہ جب مدینہ میں یزید کی بیعت سے انکار کیا ہے اُس وقت تک اہل کوفہ کے خطوط نہیں آئے تھے پس کوئی وجہ تقیہ چھوڑنے کی نہ تھی۔ قطع نظر اس کے حالتِ خوف مدینہ میں بلکہ تمام عرب میں موجود تھی اس لیے کہ یہ سب ملک یزید کی حکومت میں تھا اور جن شیعیانِ عراق نے خط لکھے تھے اور اُن سے مدد کی امید تھی وہ کوفہ میں تھے ایسی حالت میں تقیہ چھوڑنے کا کیا موقع تھا؟ اور عزمِ جہاد مانع تقیہ نہ تھا حالتِ خوف میں تقیہ کر کے بیعت کرتے اور جب سامانِ جہاد مہیا ہو جاتا تب جہاد کرتے۔ کیا جناب امام حسن علیہ السلام کی حالت یاد نہ تھی کہ انہوں نے عزمِ جہاد چھوڑا اور تقیہ کر کے امیر شام کی بیعت کی۔ علاوہ اس کے جناب امام حسین علیہ السلام نے اہل کوفہ کے خطوط پر ابتدا میں ہرگز اعتماد نہیں کیا تھا بلکہ امتحان کے لیے حضرت مسلم کو بھیجا جب مسلم کا خط آیا اُس وقت عزم جہاد کیا۔ صرف شیعیان کوفہ کے خطوط کو دیکھ کر عزمِ جہاد کیسے کر سکتے تھے حالانکہ اُن کی بدعہدی پہلے سے معلوم تھی اس لیے کہ جناب امیر اور جناب امام حسن علیہما السلام کو بھی وہ دغا دے چکے تھے۔ پھر ایسے دغابازوں کی تحریریں کیا قابل اعتبار تھیں

---

[1] نصیحۃ الشیعہ ص۲۵

پس اس میں کچھ شک نہیں کہ جس وقت امام حسین علیہ السلام نے بیعت یزید سے
انکار کیا وہ حالتِ خوف تھی اور ایسی حالت میں تقیہ واجب تھا اور ترک تقیہ
کی صورت میں وعید لا دین لمن لا تقیۃ لہٗ موجود یعنی جو تقیہ نہ کرے وہ
بے دین ہے۔

سب سے زیادہ عجیب یہ قول ہے کہ (اہل کوفہ کی بے وفائی ظاہر
ہونے کے بعد امام نے ہرچند قصد رجوع کیا مگر رجوع ممکن نہ ہوا)

رجوع ممکن نہ ہونے کی وجہ فقط یہ تھی کہ برادران مسلم رجوع پر راضی
نہ ہوئے۔ پس جب انھوں نے امام کے حکم کی اطاعت نہ کی اور نافرمان بن گئے
تو امام نے اُن کی رائے سے موافقت کیوں کی اور تقیہ واجب کو ترک کیا،
امامین سابقین کی مخالفت کی وعید لا دین لمن لا تقیۃ لہٗ کا بھی
لحاظ نہ کیا۔

مولوی حامد حسین اور اُن کے والد ماجد نے جو یہ تحریر فرمایا (کہ
ہرچند قصد رجوع کرد ممکن نشد) اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ بعض شیعہ جو
امام کے تقیہ نہ کرنے کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ امام کو (عزم جہاد کے بعد رجوع
جائز نہیں) اور بعض یہ کہتے ہیں کہ (امام نے اپنے عہد پر عمل کیا جو منزل من اللہ
تھا اور اُس میں یہی حکم تھا کہ جاؤ لڑو اور مرو) یہ دونوں جواب باطل ہیں اس
لیے کہ ان دونوں صورتوں میں امام کو قصد رجوع ہرگز جائز نہ ہوتا حالانکہ امام
نے رجوع کی کوشش کی جس میں مخالفت برادران مسلم کی وجہ سے کامیابی
نہ ہوئی۔

اب اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ شبہ یہ تھا کہ جناب امام حسین علیہ السلام
نے حالتِ خوف میں تقیہ کیوں نہ کیا؟ اس کا جواب صاحب رسالہ تقیہ نے یہ
دیا کہ "ہرچند قصدِ رجوع کیا مگر ممکن نہ ہوا"۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ امام نے حتی
الامکان رجوع کی کوشش کی مگر رجوع کرنا ان کے اختیار سے باہر ہو گیا اور
وہ مجبوری اور بے اختیاری کی حالت میں خلاف اپنی مرضی کے کربلا تک پہنچا دیے
گئے۔ تب بھی یہ جواب اس شبہ کو زائل نہیں کرتا اس لیے کہ قصد رجوع سے یہ
مراد ہے کہ جہاد کا قصد ترک کیا تھا مگر بیعت نہ کرنے پر وہی اصرار باقی تھا اور تقیہ
کی صورت تو یہ تھی کہ یزید کے یا سرداران یزید کے پاس جا کر یزید کی بیعت کر لیتے
پس باوجود قصد کے رجوع ممکن نہ ہونے سے ترکِ تقیہ واجب کا الزام نہیں اُٹھ
سکتا اس لیے کہ قصد رجوع کیا تھا نہ قصدِ تقیہ۔

کربلا میں پہونچنے کے بعد جب امام کا راستہ روکا گیا اور دو روز تک
فریقین میں بحث رہی اس وقت بھی امام نے تقیہ نہ کیا اور انکار بیعت پر اصرار
رہا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ (امام شاید یہ جانتے ہوں گے کہ بیعت کرنا کچھ مفید
نہ ہوگا اور اہل شام کسی صورت میں بے وفائی نہ چھوڑیں گے) مگر یہ جواب
ہرگز صحیح نہیں اس لیے کہ یہ جاننا بطور الہام یا خبر رسول یا جفر و نجوم وغیرہ علوم
ائمہ کے ہوگا اُس کا اعتبار نہیں اس لیے کہ صاحب رسالہ تصریح کر چکے ہیں کہ
احکام ظاہر حال پر مبنی ہوتے ہیں۔ ظاہری حالت جو روایات شیعہ سے ثابت
ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ گروہ شام بیعت کا طالب تھا پس ظاہری حجت ختم کرنا
واجب تھی۔ ملا باقر مجلسی نے جو روایتیں جلاء العیون میں لکھی ہیں اُن سے ظاہر

ہوتا ہے کہ عمر سعد وغیرہ آخر وقت تک اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح امام بیعت یزید کرلیں اور اُن کو امام سے لڑنا سخت ناگوار تھا مگر جب امام نے بیعت نہ کی تب مجبور ہو کر انھوں نے امام کو شہید کیا۔

آخر انھیں امام حسین علیہ السلام کے خلف الصدق جناب امام زین العابدین علیہ السلام نے کیسی عاجزی کے ساتھ یزید کی غلامی کا اقرار کیا چنانچہ کافی کی کتاب الروضہ صفحہ ۱۱۱ میں ہے:۔

عن یزید بن معاویة قال سمعت ابا جعفر علیه السلام یقول ان یزید بن معاویة دخل المدینة وهو یرید الحج فبعث الی رجل من قریش فاتاه فقال له یزید اتقر لی انك عبد لی ان شئت بعتك وان شئت استرققتك فقال له الرجل والله یا یزید ما انت باکرم منی فی قریش حسبا ولا کان ابوك افضل من ابی فی الجاهلیة والاسلام وما انت بافضل

یزید بن معاویہ کہتا ہے کہ میں نے امام باقر علیہ السلام سے سُنا وہ فرماتے تھے کہ یزید بن معاویہ مدینہ میں آیا اور اُس کا ارادہ حج کا تھا تو اُس نے قریش میں سے ایک شخص کو بُلایا جب وہ آیا تو اُس سے یزید نے کہا کہ کیا تو میرے واسطے یہ اقرار کرتا ہے کہ تو میرا غلام ہے اگر میں چاہوں تو تجھے بیچ ڈالوں اور اگر چاہوں اپنا غلام بنائے رکھوں۔ تو یزید سے اُس شخص نے کہا کہ واللہ اے یزید باعتبار حسب کے تو قریش میں مجھ سے زیادہ بزرگ نہیں اور نہ تیرا باپ میرے باپ سے افضل تھا نہ زمانہ جاہلیت میں نہ زمانۂ اسلام میں اور نہ تو مجھ کو دین میں

منی فی الدین ولا بخیر منی فکیف اقر لك بما سألت فقال له یزید ان لم تقر لی والله قتلتك فقال له الرجل لیس قتلك ایای باعظم من قتلك الحسین بن علی فامر به فقتل۔ ثم ارسل الی علی بن الحسین بن علی علیهم السلام فقال له مثل مقالته للقرشی فقال له علی بن الحسین علیهما السلام ارایت ان لم اقر لك الیس تقتلنی کما قتلت الرجل بالامس فقال له یزید لعنه الله بلی. فقال له علی بن الحسین علیهما السلام انا عبد مکره لك فان شئت فامسك وان شئت فبع۔

افضل ہے اور نہ بہتر پس میں تیرے لیے ایسا اقرار کیوں کروں جو تو چاہتا ہے۔ تو یزید نے اُس سے کہا کہ اگر تو میرے سامنے ایسا اقرار نہ کرے گا تو میں تجھ کو قتل کر دوں گا تو یزید سے اُس شخص نے کہا کہ تیرا مجھ کو قتل کرنا حسین بن علی کے قتل کرنے سے بڑا نہیں۔ تو یزید نے اس کے قتل کا حکم دیا اور وہ قتل ہو گیا۔ پھر اُس نے امام زین العابدین علیہ السلام کو بُلایا اور اُن سے بھی وہی گفتگو کی جو قریشی سے کی تھی۔ تو امام زین العابدین علیہ السلام نے اُس سے کہا کہ مجھے یہ بتا کہ اگر میں تجھ سے یہ اقرار نہ کروں تو کیا مجھ کو تو اسی طرح قتل نہ کرے گا جیسے تو نے کل اُس شخص کو قتل کر دیا۔ تو امام سے یزید ملعون نے کہا کہ ہاں ایسا ہی کر دوں گا۔ تو اُس سے امام زین العابدین علیہ السلام نے کہا کہ میں مجبوری میں تیرا غلام ہوں تو چاہے تو مجھے غلامی میں رکھ اور چاہے بیچ ڈال۔

اس روایت سے ظاہر ہوگیا کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے حالتِ مجبوری میں کس طرح یزید کی غلامی کا اقرار کیا اور اپنی جان بچائی۔ امام حسین علیہ السلام نے بیعت نہ کی اور اپنی جان کھوئی۔

اگر پدر نہ تواند پسر تمام کند

آمدم برسر مطلب، اب غور فرمایئے کہ جس شہادت کی وجہ سے بشارتِ حسین علیہ السلام بار بار رد ہوتی تھی اور ان کی ولادت بھی ناگوار تھی وہ ایسی چیز تھی جس کو جناب امام حسین نے باسباب ظاہر اپنے قصد سے اختیار کیا اس لیے کہ تقیہ نہ کیا اب اس سے بھی قطع نظر کیجیے اور اس کے بعد کے واقعات پر غور کیجیے۔

اگر ان کی تنہائی اور بے کسی کی مصیبت سخت سمجھی گئی تھی جس کی وجہ سے یہ نفرت تھی کہ ردِ بشارت تک نوبت پہونچی تو یہ بھی انہوں نے باختیار خود بڑھائی اور جو فوج ان کے ساتھ تھی اُس کو رخصت کر دیا۔ چنانچہ ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب میں لکھا ہے:-

"در تفسیر امام حسن عسکری مسطور است کہ امام فرمود کہ چوں امتحان کردہ شد امام حسین را آنہا کہ با آنحضرت بودند بالشکر شقاوت اثر کہ او را شہید کردند سر مبارکش با خود بر داشتند در آں وقت فرمود بہ لشکر خود کہ شمارا حلال کردم از بیعتِ خود پس ملحق شوید بخویشاں و قبیلہا و دوستان خود۔ و باہل بیتِ خود فرمودہ کہ حلال کردم بر شما بیعتِ خود را کہ شما تابِ مقاومت ایں جماعت ندارید زیرا کہ آنہا اضعاف شمایند در قوت و تہیۂ ایشاں یا

از شما ست مرا بایشاں واگذارید کہ حق تعالیٰ مرا یاری خواہد کرد و مرا از نظر نیک خود خالی نخواہد گذاشت۔ پس لشکر آنحضرت مفارقت کردند و خویشاں نزدیک آنحضرت اباکردند و گفتند ما از تو جدا نمی شویم۔"

(حیات القلوب جلد اول ص ۳۹)

اس روایت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ جناب امام نے اپنے اختیار سے اپنی جماعت کم کر لی اور لشکر کو خوشی سے رخصت کر دیا با ایں ہمہ ان کے عزیز و اقربا جو بہتر آدمی تھے آخر وقت تک ان کے ساتھ رہے۔

اس کے علاوہ اللہ کی مدد اُن کے لیے نازل ہوئی تھی جس کو اُنہوں نے اپنے اختیار سے قبول نہ کیا۔ اصول کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:-

قال لما نزل النصر علی الحسین بن علی کان بین السماء والارض ثم خیر النصر او لقاء اللہ فاختار لقاء اللہ۔ (اصول کافی ص ۲۹۵)

امام فرماتے ہیں کہ جب نصر حسین علیہ السلام پر نازل ہوا تو زمین اور آسمان کے درمیان میں تھا پھر اختیار دیے گئے حسین کہ اس کی مدد اختیار کریں یا اللہ کی ملاقات اختیار کریں تو حسین نے اللہ کی ملاقات اختیار کی۔

شارحین کافی نے لکھا ہے کہ نصر نام ایک فرشتہ کا تھا جو امام حسین علیہ السلام کی مدد کے لیے نازل ہوا تھا۔

اس روایت سے ظاہر ہوا کہ امام حسین علیہ السلام کو اختیار دیا گیا تھا کہ اگر چاہیں تو اُس سے نجات پاویں اور اللہ کا فرشتہ اسی وقت تمام فوج شام کو غارت

کر دیتا. مگر امام حسین نے وہ مدد قبول نہ کی اور اللہ کی ملاقات اختیار کی۔ پس جس مصیبت کو باوجود قدرت کے دفع نہ کیا وہ مصیبت ایسی ناگوار کیوں کر ہو گئی کہ رسولؐ نے اور جناب سیدہ نے اس کی وجہ سے بشارتِ حسین کو رد کیا اور جناب سیدہ کو ولادتِ حسین ناگوار تھی۔ اس حدیث کا ترجمہ صافی شرح کافی میں اس طرح لکھا ہے :۔

"روایت ست از امام باقر علیہ السلام گفت فرستاد اللہ عز و جل فرشتہ کہ نام او نصر است بر امام حسین علیہ السلام در کربلا تا آنکہ ایستادہ نصر میانِ آسمان و زمین بر سر امام حسین علیہ السلام بعد از ان مخیر کرد امام حسین را گفت کہ نصرت بر اعدا می خواہی یا مرگ و ملاقات تو اللہ تعالی را۔ پس کشتہ شد باختیار خود۔"

اگر یہ شبہ ہو کہ نصر کی مدد اس لیے اختیار نہ کی کہ اُن کے عہد نامہ میں یہ حکم تھا کہ لڑ کر قتل ہو جاؤ تو اس کا جواب یہ ہے کہ :۔

اول تو عہد نامہ کا یہ حکم ہی ماننے کے لائق نہ تھا اس لیے کہ نص قرآنی کے مخالف تھا جس میں صاف یہ حکم ہے کہ اپنے اختیار سے ہلاکت میں نہ پڑو اور جو مضمون قرآن کے مخالف ہو وہ رد کرنے کے لائق ہے۔

دوسرے اگر یہ مان لیا جاوے کہ فی الواقع عہد نامہ کی روایت صحیح ہے اور یہ حکم باوجود مخالفتِ قرآن کے بھی ماننے کے لائق تھا تو ظاہر ہے کہ دوسرا حکم جو نصر کے ساتھ نازل ہوا کہ اختیار ہے کہ ان دونوں صورتوں میں جس صورت کو چاہو اختیار کرو۔ اس سے پہلا حکم عہد نامہ کا منسوخ ہو گیا۔ جب دونوں حکم اللہ کی طرف

سے تھے تو اعتبار آخر کے حکم کا ہو گا۔

اب اگر یہ شبہ ہو کہ جناب امام حسین علیہ السلام نے نصر کی مدد اس لیے اختیار نہ کی کہ تقدیر الٰہی معلوم ہو چکی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب امیر علیہ السلام اور بہت سے انبیاء سابقین بڑے شد و مد سے اس حادثہ کی خبر دے چکے تھے۔ پس اگر جناب امام شہید نصر کی مدد اختیار کر لیتے تو اللہ کی تقدیر بدلتی اور یہ تمام پیشین گوئیاں غلط ہو جاتیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ امام پر اپنی جان بچانا اور ہلاکت سے بچنا، واجب تھا اور اس کی وجہ سے جو مشکلات لازم آتیں اُن میں امام پر کیا الزام تھا۔

قطع نظر اس کے اللہ نے خود ان امور کا لحاظ نہ کیا اور امام کو اختیار دیا کہ دونوں صورتوں میں سے جونسی صورت چاہیں اختیار کر لیں۔ پس اگر یہ امور ناشدنی ہوتے تو اللہ جناب امام کو اختیار کیوں دیتا۔ جب اختیار دے دیا تو ان تمام امور کا تدارک بھی اللہ کے ذمہ تھا۔

اس کے علاوہ اللہ کو اپنی تقدیر بدلنے کا اختیار تھا وہ لوح محفوظ سے جس تقدیر کو چاہتا ہے محو کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے جس طرح اللہ نے خروجِ مہدی کا وقت سنہ ستر میں مقرر کر دیا تھا اور پھر قتل حسین کی وجہ سے ناراض ہو کر وہ وقت بدل دیا اور سنہ ایک سو چالیس ۱۴۰ ہجری مقرر کر دیا۔ اور پھر نا اہلوں نے جو یہ حدیث مشہور کر دی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اس کا وقت ہزاروں برس کے لیے ٹل گیا ائمہ کو بھی اُس وقت کی خبر نہیں دی گئی اس لیے

کہ وہ اس راز کو چھپا نہ سکے حالانکہ اسرارِ دین کا چھپانا نہایت تاکید سے واجب کیا گیا ہے مگر انھوں نے خلاف مرضی الٰہی ہر اہل و نااہل پر اس بھید کو ظاہر کر دیا اور اہل و نااہل میں ذرا تمیز نہ کی۔ پس جس طرح خروج مہدی کا وقت دو مرتبہ ٹل گیا اور اللہ کی تقدیر دو مرتبہ بدلی اور ائمہ معصومین کی پیشین گوئی دو مرتبہ غلط ہو گئی۔ اسی طرح وقت شہادت حسین بھی ٹل جاتا اور اس امر میں بھی اللہ کی تقدیر بدل جاتی اور پیشین گوئیوں کا ظہور بھی ملتوی ہو جاتا اور پھر ٹلتے ٹلتے قیامت تک ٹل سکتا تھا۔

آخر خروج مہدی کا وقت جو سنہ ۷۰ھ میں مقرر ہوا تھا وہ بھی تو شہادت حسین کی وجہ سے ہی ٹلا تھا اس سے بہتر تھا کہ شہادت حسین ہی ٹل جاتی۔

اگر امام حسین علیہ السلام نصر کی مدد قبول کر لیتے تو اُن کی جان بچنے کے سوا اور بھی کئی فائدے حاصل ہوتے۔

ایک یہ کہ اللہ کو اتنا غصہ نہ آتا جس کی وجہ سے خروج مہدی کا وقت جو سنہ چالیس میں مقرر ہو چکا تھا بدلنا پڑا۔

دوسرے یہ کہ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ صدمہ نہ ہوتا جس کی وجہ سے بار بار خدا کی بھیجی ہوئی بشارت رد کرنا پڑی تھی۔

تیسرے یہ کہ شیعوں پر دو احسان ہوتے ایک یہ کہ سنہ چالیس میں مہدی ظاہر ہو جاتے پس جو بے انتہا مصائب شیعوں پر آئے اُس سے نجات مل جاتی اور اُسی وقت سے شیعوں کا غلبہ ہو جاتا۔

دوسرے یہ کہ ہر سال شیعہ جو بغیر حدوث کسی تازہ رنج کے بار بار گریہ

وزاری اور نوحہ و شیون میں مبتلا ہوتے ہیں اس بے وجہ واویلا کی دردِ سری سے بھی چھوٹتے۔

افسوس کہ جناب امام نے نہ اپنی جان کا لحاظ کیا نہ اپنے ساتھیوں کی جان کا۔ نہ یہ خیال کیا کہ اللہ کا غضب تمام زمین والوں پر نازل ہوگا خصوصاً شیعوں پر اُس کا اثر زیادہ پہونچے گا۔ یہ نہ خیال ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب سیدہ کی روح مبارک پر وہ صدمۂ عظیم ہوگا جس کی وجہ سے ردِ بشارت تک نوبت پہنچی تھی۔ اگر وہ نصر کی مدد قبول کر لیتے تو یہ سب آفتیں ٹل جاتیں۔

بیان مذکورۂ بالا سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ آخر وقت تک کوئی مجبوری جناب امام حسین علیہ السلام پر نہ تھی پھر یہ واقعہ ایسا ناگوار کیوں تھا جس کی وجہ سے اُن کی بشارت بار بار رد ہوئی تھی۔

اگر یہ گمان ہو کہ جو مصائب جناب امام اور اُن کے ساتھیوں پر بوقت قتل واقع ہوئے وہی ایسے ناگوار تھے جن کی وجہ سے ردِ بشارت کی نوبت پہونچی مثلاً ان کا جسم مبارک زخموں سے چُور چُور ہوا، تیروں سے چھن گیا، خنجر کی تیز دھار گردن پر پھیری گئی، یہ سختیاں ایسی تھیں جن کا تصور بھی ناگوار تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جناب امام پر درحقیقت کچھ بھی مصیبت نہ تھی۔ قطب الدین راوندی نے کتاب الخرائج والجرائح میں لکھا ہے:۔

عن ابی جعفر قال قال الحسین لاصحابہ قبل ان یقتل ان رسول اللہ

امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے قتل ہونے سے پہلے اپنے ساتھیوں سے

صلی اللہ علیہ وسلم قال یا بنی انك ستساق الی العراق وانك تستشھد بھا و یستشھد معك جماعۃ من اصحابك لا یجدون الم مس الحدید وتلا قلنا یانار کونی بردا وسلاما علی ابراھیم یکون الحرب علیك وعلیھم بردا و سلاما فابشروا۔

(الخرائج والجرائح مطبوعہ بمبئی صفحہ ۱۳۸ فصل الرجعۃ)

کہہ دیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اے میرے بیٹے قریب ہے کہ تو نکالا جائے گا عراق کی طرف اور تو وہاں شہید کیا جاوے گا اور تیرے ساتھ ایک جماعت تیرے ساتھیوں کی شہید ہوگی جو نہ پاویں گے ایذا آہنی ہتیاروں کے زخموں کی اور پھر یہ آیت پڑھی کہ قلنا یا نار کونی الخ یعنی ہم نے کہہ دیا کہ اے آگ ہو جا ٹھنڈک اور سلامتی ابراہیم پر۔ ہو جائے گی جنگ تجھ پر اور ان پر ٹھنڈک اور سلامتی پس تم بشارت پا لو۔

اس روایت سے ظاہر ہو گیا کہ کربلا کی تمام سختیاں جناب امام حسین علیہ السلام اور اُن کے ساتھیوں پر آسان ہو گئی تھیں پہلے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی خبر دے گئے تھے اور جناب امام نے اپنے ساتھیوں کو پہلے سے یہ بشارت سُنا دی تھی۔ شاید اسی وجہ سے امام حسین علیہ السلام نے کوئی موقع اپنے بچاؤ کا اختیار نہ کیا اور اللہ کی مدد بھی قبول نہ کی اور خوشی خوشی موت پر راضی ہو گئے۔ اس لیے کہ اس حالت میں اُن پر کوئی سختی نہ تھی بلکہ بہت راحت تھی اور وہی حالت تھی جیسے نمرود نے ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا تھا اور وہ اُن پر گلزار ہو گئی تھی۔

اب اگر یہ خیال ہو کہ شاید بعد قتل ان کی لاشیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندی گئی ہوں گی یہ مصیبت ناگوار تھی اور اسی وجہ سے بشارت رد کی گئی اور ولادت حسین ناگوار تھی سو یہ خیال بھی صحیح نہیں چنانچہ اصول کافی میں روایت ہے کہ جب امام حسین علیہ السلام قتل ہو گئے تو قوم نے یہ ارادہ کیا کہ اُن کے جسم کو گھوڑوں سے روندیں۔ حسب اتفاق ایک شیر ایک طرف کھڑا ہوا تھا فضہ رضی اللہ عنہا شیر کے پاس گئیں تو فضہ نے شیر سے کہا:۔

فقالت یا ابا الحارث فرفع راسہ ثم قالت اتدری ما یریدون ان یعملوا غدا بابی عبد اللہ یریدون ان یوطئوا الخیل ظھرہ۔

کہا کہ اے ابوالحارث[1]! تو شیر نے اپنا سر اٹھایا۔ پھر فضہ نے کہا کہ تجھ کو معلوم ہے کہ دشمنوں کا کیا ارادہ ہے؟ کہ کل کو امام حسین علیہ السلام کے ساتھ [illegible] یں گے۔ ان کا ارادہ ہے کہ گھوڑے ان کے اوپر دوڑا دیں۔

قال فمشی حتی وضع یدہ علی جسد الحسین فاقبلت الخیل فلما نظروا الیہ قال لھم عمر بن سعد لعنہ اللہ فتنۃ لا تثیروھا انصرفوا فانصرفوا[2]

راوی کہتا ہے تو شیر چلا اور اُس نے اپنا ہاتھ حسین علیہ السلام کے جسم مبارک پر رکھ دیا تو سوار آئے۔ جب اُنہوں نے شیر کو دیکھا تو اُن سے عمر سعد نے کہا کہ یہ فتنہ ہے اس کو مت اٹھاؤ پھر چلو تو سب پھر گئے۔

---

[1] ابوالحارث عربی میں شیر کی کنیت ہے ۱۲۔ [2] اصول کافی ص ۲۹۵

اگر یہ خیال ہو کہ اگرچہ جناب امام حسین علیہ السلام پر میدانِ کربلا میں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی اور نہ اُن کی لاش روندی گئی اور بڑی راحت وعیش میں ان کی شہادت ہوگئی جیسا کہ جرائح کی روایت سے ظاہر ہو چکا۔ مگر بعد شہادت امام جو اہل بیت کو اسیر کرکے یزید کے پاس لے گئے وہاں کی سختیاں جو اہل بیت پر گذریں وہ ناگوار تھیں اس وجہ سے بشارت حسین رد ہوئی تھی اور ولادت حسین ناگوار تھی تو ان واقعات کی تفصیل جو ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون میں تحریر فرمائی ہے اُس کو ہم تنقیح سے نقل کرتے ہیں :-

"یزید گفت اے ہند نوحہ وزاری بکن بر فرزند رسولِ خدا و بزرگ قریش کہ ابن زیاد لعین در امر او تعجیل کرد و من راضی بکشتن او نبودم پس اہل بیت را در خانۂ او جائے داد و ہر چاشت وشام حضرت امام زین العابدین را بر سر خوان خود می طلبید۔" (تنقیح ص ۱۶۵)

اس روایت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یزید نے اہل بیت کو بہت تعظیم سے رکھا اور بڑی عزت کے ساتھ مہمانی کی اور شہادت حسین علیہ السلام سے اپنی بیزاری ظاہر کی اور یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ شہادت امام حسین علیہ السلام کے بعد دنیا کے آدمیوں میں سب سے پہلے ماتم حسین کا حکم یزید نے دیا اور سب سے پہلے یہ رسم یزید نے جاری کی اور سب سے پہلے یزید کے گھر میں حسین علیہ السلام کا ماتم ہوا۔ سہ

رسمِ ماتم بنا یزید نمود
ہر کہ آمد بر آں مزید نمود

پھر جلاء العیون میں یہ بھی لکھا ہے :-

"روز ہشتم یزید اہل بیت را طلبید و نوازش و عذر خواہی کرد و تکلیف بماندن شام کرد و ایشاں قبول نہ کردند۔ محملہائے مزین برائے ایشاں ترتیب داد و اموال برائے خرچ ایشاں حاضر کرد و گفت اینہا عوض آنست کہ نسبت بہ شما واقع شدہ۔"

اس روایت سے ظاہر ہو گیا کہ بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا اور بہت سامان بھی دیا۔

اب فرمائیے قتل حسین میں وہ کون سی مصیبت تھی جس کے لیے بشارت حسین رد ہوئی تھی اور ولادت حسین ناگوار تھی اور پھر اولاد حسین میں امامت کی خبر سُن کر یہ سب مصیبت گوارا ہو گئی۔ حالانکہ امام حسین پر جو مصیبت آئی وہ آخر عمر میں آئی اور باقی ائمہ تو تمام عمر مصیبت میں رہے۔

کیا شہادت حسین کی یہی مصیبت تھی جس کے لیے ملائکہ میں اور حضرت آدم کے وقت سے تمام انبیاء سابقین میں قبل از مرگ واویلا بلکہ ہزار ہا سال قبل از ولادت واویلائے مرگ تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو ستاروں پر نظر ڈالی تھی اور اس کے بعد اپنے آپ کو بیمار بتایا تھا جس کا ذکر قرآن میں ہے وہ بیماری اسی شہادت حسین کے غم کی تھی۔ چنانچہ اصول کافی میں ہے :-

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قول اللہ عزوجل فَنَظَرَ نظرۃ فی النجوم فقال انی سقیم قال	امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں روایت ہے کہ دیکھ نظر ڈالی ابراہیم نے ستاروں پر اور کہا

حسب فرای ما یحل بالحسین فقال انی سقیم لما یحل بالحسین علیہ السلام

(اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۲۹۴)

کہ میں بیمار ہوں) امام فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کو دیکھ کر نجوم کا حساب کیا تو ان کو وہ حالت معلوم ہوگئی جو حسین پر آنے والی تھی اس لیے کہا کہ میں بیمار ہوں اُس غم میں جو حسین پر گذرنے والا ہے۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام نجوم کے حساب سے واقعات آیندہ کا حال معلوم کیا کرتے تھے۔

اس سے بڑھ کر اور سُنیئے یہی مصیبت حسین جس میں کچھ بھی ایذا نہ تھی۔ حروفِ مقطعات میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ ملّائے مجلسی حیات القلوب میں فرماتے ہیں :۔

"وبسند معتبر منقول ست کہ سعد بن عبد اللہ از حضرت صاحب الامر صلوات اللہ علیہ سوالے چند کرد در ہنگامیکہ آنحضرت کودک بود و در دامن حضرت امام حسن عسکری نشستہ بود واز جملہ آں سوالہا آں بود کہ پرسید از تاویل کہیعص فرمود کہ ایں حروف از خبر ہائے غیب ست کہ مطلع گردانید بر آنہا بندۂ خود زکریاؑ را وبعد ازاں برائے محمدؐ ذکر کردہ استؐ ایں قصہ چناں بود کہ زکریاؑ از پروردگار خود سوال کرد کہ تعلیم او نماید نامہائے آل عبا صلوات اللہ علیہم را۔ پس جبرئیل نازل شد وآں نامہائے مقدس تعلیم او نمود۔ پس زکریاؑ ہرگاہ محمد و علی وفاطمہ و حسن صلوات اللہ علیہم را یاد می کرد اندوہ والم او برطرف می شد وچوں نام حسین را یاد می کرد گریہ در گلوئے او گرہ می شد وازبسیاری گریستن نفس او تنگ می شد۔ پس روزے

مناجات کرد کہ خداوندا چرا آں چہار بزرگوار را کہ یاد می کنم غمہا از دلم بیروں می رود و دلم کشادہ می شود وچوں حسین را یاد می کنم دیدہ ام گریاں و دلم محزون می شود و نالہ بلند می گردد۔ پس حق تعالیٰ واقعۂ کربلا را باو وحی نمود چنانچہ فرمودہ است کہیعص کہ کاف اشارہ است بکربلا و ہا بہلاک عترت رسولؐ دراں صحرا و یا بیزید علیہ اللعنۃ والعذاب الشدید کہ ظلم کنندۂ بر حسین علیہ السلام ست و عین عطش و تشنگی آنحضرت ست وصاد صبر آنحضرت چوں زکریاؑ ایں را شنید سہ روز از جائے نماز خود بیروں نیامد و منع کرد مردم را کہ بنزد او بروند و درد آورد دیگر بہ او فغاں ونوحہ ومرثیہ می خواند برائے مصیبتِ او و می گفت آیا بدرد خواہی آورد دل بہترین جمیع خلقت را بمصیبت فرزند او آیا ایں بلیہ ومحنت را بساحت عزت او فرو خواہی آورد۔ آیا جامۂ ایں ماتم را بر علی وفاطمہ خواہی پوشانید آیا شدت ایں درد ومحنت را بعرصۂ قرب ومنزلت ایشاں داخل خواہی کرد پس می گفت الٰہی روزی کن مرا فرزندے بایں پیری کہ دیدۂ من بادروشن گردد وچوں بمن عطا کنی مرا بہ محبت آں فرزند مفتوں گرداں پس دل مرا بمصیبت او بدرد آور چنانچہ دل محمد حبیبِ خود را بفرزندش بدرد خواہی آورد۔ پس خدا حضرت یحییٰ را بآنحضرت روزی کرد وبمصیبت او دل او را بدرد آورد۔" (حیات القلوب صفحہ ۳۴۳)

حضرت زکریا علیہ السلام نے ہزاروں برس پہلے امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا اتنا بڑا ماتم کیا۔ حالانکہ اس شہادت کے واقعہ میں کچھ بھی مصیبت نہ تھی

جو صاحبِ انصاف عقل سلیم رکھتا ہو اور تعصب سے خالی ہو وہ ان روایتوں پر غور کرنے سے معلوم کر سکتا ہے کہ احادیث شیعہ کے راوی ائمہ پر افترا کرنے اور روایات کے تصنیف کرنے میں کیسا ید طولیٰ رکھتے تھے۔

بہر حال یہ تعجب کسی طرح رفع نہیں ہو سکتا کہ جس شہادت میں کچھ بھی مصیبت نہ ہو اُس کے واسطے حضرت آدم سے لے کر ہمارے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء میں اتنا بڑا ماتم کیوں قائم ہوا؟۔

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب سیدہ نے جو بشارت کو بار بار رد کیا اور ولادت بھی ناگوار ہوئی اُس وقت اجر شہادت کی فضیلت عظیم پر کیوں نہ لحاظ کیا حالانکہ حضرات شیعہ کا یہ بھی قول ہے کہ یہی شہادت بخشش امتِ رسول کا ذریعہ بنے گی پس اتنی بڑی نعمت کیوں رد کی جاتی تھی۔ حالانکہ امام شہید کو اس مصیبت کی اتنی بھی پروا نہ ہوئی کہ اس کے رفع کی دعا مانگتے۔

اب تصویر کا رُخ بدلو اور یہ فرض کر لو کہ اللہ کی طرف سے فرشتہ بھی امام حسین علیہ السلام کی مدد کے لیے نہیں اُترا تھا اور نہ اُن کو اس فرشتہ سے مدد لینے کا اختیار دیا گیا تھا اور جو سختیاں قتل کی اور ایذا ہتھیاروں سے زخمی ہونے کی ہوتی ہے وہ بھی جناب امام اور ان کے ساتھیوں پر پہونچی۔ اسی طرح شیر نے جو لاش کی حفاظت کی اور یزید نے جو ماتم کیا اور اہل بیت کی مدارات کی یہ بھی غلط ہے۔ تب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب سیدہ کو خدائی کے کارخانوں میں کیا دخل تھا، اللہ کی تقدیر اور حکمت میں بندہ کو کیا چارہ۔ بہت سے انبیاء بھی قتل ہو چکے ہیں اور اکثر مقربین پر اس قسم کے مصائب آیا کرتے ہیں۔ اللہ جو چاہے وہ کرے

اپنی حکمت اور مصلحت کو وہی خوب جانتا ہے۔ ایسے مصائب پر کاملین کا فرض ہے کہ طریقۂ صبر و شکر اور تسلیم و رضا اختیار کریں۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب سیدہ سے بڑھ کر مقرب بارگاہ الٰہی اور کون ہو سکتا ہے۔ پھر کیا وجہ کہ تقدیر الٰہی پر راضی نہ ہوئے اور رضا و تسلیم کا طریقہ چھوڑا اور بار بار بشارت رد کی اور جناب سیدہ کو ولادت حسین بھی ناگوار ہوئی۔ کیا ان کی ناگواری سے تقدیر الٰہی ٹل گئی۔ پھر اس بیزاری سے کیا فائدہ ہوا؟۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے پیارے بیٹے کو اللہ کے حکم کے بموجب اپنے ہاتھ سے ذبح کرنے پر راضی ہو گئے تھے بلکہ انھوں نے اپنی دانست میں اپنے بیٹے کی گردن پر چھری پھیر دی تھی جبرئیل نے اُس چھری کے تلے بکرے کی گردن پہنچا دی۔ اور ہمارے رسول اور جناب سیدہ کو اُس قتل حسین پر صبر نہ تھا جو ان کی وفات سے پچاس برس کے بعد ہونے والا تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی خواہش سے یہ مصیبت مول لی اور قتل ہونے کے لیے اللہ سے بیٹا مانگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت جو صبر کیا تھا اور اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

حیات القلوب میں ایک طویل روایت مذکور ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی جناب امیر سے بحث کرنے لگا اور وہ انبیائے سابقین کا ایک ایک معجزہ ذکر کرتا تھا اور ہر معجزے کے مقابلے میں جناب امیر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ذکر کرتے تھے۔ من جملہ اس کے یہ بھی ہے:۔

"یہودی گفت کہ ابراہیمؑ فرزند خود را خوابانید کہ قربان کند حضرت فرمود کہ

از برائے ابراہیم بعد از خوابانیدن فرزند خود گوسفند را خدا فرستاد ذبح نہ کرد فرزند خود را۔ و محمد در روے عظیم تر بدل او رسید در وقتے کہ در جنگِ اُحد بر سر عم خود حمزہ آمد کہ شیر خدا و رسول بود و یا در دین او بود او را کشتہ و پارہ پارہ دید باں محنتے کہ باو داشت از برائے رضائے خدا بقضائے الٰہی تسلیم و انقیاد نمود نزد امر او اظہار جزعی نہ کرد و آہے نہ کشید و آبے از دیدہ جاری نہ گردانید و فرمود کہ اگر نہ ایں بود کہ صفیہؓ محزون می شد و بعد از من سنتے می شد ہر آئینہ او را چنیں می گذاشتم کہ درندگاں و مرغاں او را بخورند و از شکم آنہا محشور شود۔"

(حیات القلوب جلد دوم صہ۱۷)

اس روایت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ اپنے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کمال محبت تھی اور جب وہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے دیکھا تو کیسا صبر کیا اور قضائے الٰہی پر راضی ہو گئے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جی یہ چاہتا تھا کہ لاش ان کی اسی طرح پڑی رہے اور اس کو درندے اور وحوش و طیور کھا دیں۔ اور قیامت کو حمزہ اُن جانوروں کے پیٹ میں سے محشور ہوں پس تعجب ہے کہ حمزہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شہید ہوئے تو ایسا صبر کیا اور راضی برضا رہے اور حسین علیہ السلام جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس برس بعد شہید ہوں گے ان کی شہادت کی خبر سُن کر ابھی سے یہ بے صبری ظاہر کی کہ بار بار بشارت رد کی۔

حمزہؓ کی شہادت کا تو ایسا اہتمام منظور تھا کہ اُن کی لاش بھی دفن نہ ہو اور حسین علیہ السلام کی شہادت سے پچاس بلکہ چوّن برس پہلے یہ نفرت۔ حالانکہ، حسین علیہ السلام شہید ہو کر بھی اُنھیں کی مجلس میں اور ابد الآباد کے عیش میں پہونچنے والے تھے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے صابر و شاکر تھے کہ اُنھوں نے اپنے بیٹے ابراہیم کی موت اپنی خوشی سے گوارا کر لی اور حسین علیہ السلام پر اس کو فدیہ کر دیا چنانچہ ملائے مجلسی نے حیات القلوب میں لکھا ہے:-

"ابن شہر آشوب از ابن عباس روایت کردہ است کہ روزے حضرت رسول نشستہ بود و بر ران چپش ابراہیم پسرش را نشاندہ بود و بر رانِ راستِ خود امام حسین علیہ السلام را نشاندہ بود. یک مرتبہ ایں را مے بوسید و یک مرتبہ او را۔ ناگاہ آنجنابؐ را حالتِ وحی عارض شد و چوں آں حالت از او زائل گردید فرمود کہ جبرئیل از جانبِ پروردگار من آمد و گفت اے محمد پروردگارت ترا سلام می رساند و می گوید کہ ایں ہر دو را برائے تو جمع نخواہم کرد یکے را فدائے دیگرے آں گرداں۔ پس حضرت نظر کرد بسوئے ابراہیم و گریست و نظر کرد بسوئے سید الشہدا و گریست پس فرمود کہ ابراہیم مادرش ماریہ است چوں بمیرد کسے بغیر از من برو محزون نخواہد شد و مادر حسین فاطمہ است و پدرش علی ست کہ پسر عم من و بمنزلہ جان من و گوشت و خونِ من است و چوں او بمیرد دختر م و پسر عمم ہر دو اندوہناک می شوند و من نیز برا و محزون می گردم و من اختیار

می کنم حزن خود را برحزن ایشاں ۔ اے جبرئیل فدائے حسین کردم ابراہیم
را و بہ فوت او راضی شدم پس از سہ روز مرغ روح ابراہیم بجنات نعیم
پرواز نمود ۔" (حیات القلوب ص ۵۹۳ مطبوعہ لکھنؤ)

اس قصہ میں جو امر سب سے زیادہ عجیب ہے وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی کے رنج کا تو خیال کیا مگر بے چاری ماریہؓ جو محض بے کس تھیں اور کوئی ان کا والی وارث نہ تھا اس کے رنج کا کچھ بھی خیال نہ کیا آخر وہ بھی اللہ کی مخلوق تھیں انسانی حقوق اُن کو بھی حاصل تھے۔ اور غریب الوطن اور بے کس ہونے کی وجہ سے زیادہ رحم کے قابل تھیں۔ حالانکہ جناب ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کا بھی وہ مرتبہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خلفاء کو جو دین رسولؐ کے تمام جہان میں پھیلانے والے تھے قوم ماریہؓ کی سفارش کی تھی۔ ملّائے مجلسی نے حیات القلوب میں جہاں بیانِ معجزات رسول میں واقعات آیندہ کی پیشین گوئیاں لکھی ہیں وہاں بحوالہ ابن شہر آشوب یہ روایت بھی نقل کی ہے :۔

"فرمود کہ چوں مصر را فتح کنید قبطیاں را نکشید کہ ماریہ مادر ابراہیم از ایشانست و فرمود کہ رومیہ را فتح خواہید کرد و چوں آں را فتح کنید کلیسائیکہ در جانبِ شرقی آں واقع است آں را مسجد کنید ۔" (حیات القلوب جلد دوم ص ۳۴۵)

اب حضرات شیعہ انصاف فرمائیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مصر کی فتح کی بشارت کس کو دی؟ اس لیے کہ مصر خلیفۂ ثانی کے زمانہ میں فتح ہوا ہے پس ظاہر ہے کہ اُنھیں کو فتح مصر کی بشارت دی تھی، انھیں سے قوم ماریہ کی

سفارش کی تھی اُنھیں کو مسجد بنانے کا حکم کیا پس اگر خلیفۂ ثانی کی (معاذ اللہ) وہ حالت ہوتی جو شیعوں نے فرض کر لی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ان کو فتح مصر کی بشارت دیتے نہ اُن سے قوم ماریہ کی سفارش کرتے نہ اُن کو مسجد بنانے کا حکم کرتے اس لیے کہ ایسے لوگوں کی بنائی ہوئی مسجد تو مقبول بھی نہیں ہوتی۔ پس فتح مصر کی بشارت اور اس کے ساتھ ان دینی کاموں کی ہدایت درحقیقت خلافتِ حقہ کی بشارت ہے اس قسم کی بہت سے بشارتیں خلفاء کی خلافت راشدہ کے حق ہونے کی احادیث شیعہ سے ثابت ہیں ان کی تفصیل انشاء اللہ تعالیٰ مبحث امامت میں مذکور ہوگی۔

آمدم برسر مطلب۔ قدمائے شیعہ نے جو رد بشارت کا الزام رسولؐ اور جناب سیدہ پر لگایا یہ محض تہمت اور افترا ہے اور غرض ان روایتوں کے تصنیف کرنے سے یہ تھی کہ عوام ان روایات کو سُن کر ماتم حسین میں جہد بلیغ کریں اور حکم صبر کے نصوص سے اس ماتم کو مستثنیٰ سمجھیں اس لیے کہ جب رسولؐ اور جناب سیدہ نے اس حادثہ کو سن کر صبر نہ کیا اور ایسی بے صبری کی کہ رد بشارت تک نوبت پہونچی تو امت کو تو اور زیادہ بے صبری اور جامہ دری اور سینہ خراشی اور سر کوبی چاہیے ان کو صرف ماتم کی فضیلت ثابت کرنی منظور تھی۔ اس سے ان کو کیا غرض کہ ان روایتوں کے تصنیف کرنے سے رسول پاکؐ اور جناب سیدہ علیہا السلام پر کیسے کیسے الزام عائد ہو گئے اور خود جناب امام حسین علیہ السلام کی کیسی توہین ہوئی کہ ان کی والدہ ماجدہ کو ان کی ولادت بھی ناگوار تھی۔

اسی غرض سے انھوں نے یہ روایتیں تصنیف کیں کہ انبیاء سابقین بھی اس غم میں رویا کرتے تھے بلکہ بعض کی تو یہ حالت تھی کہ روتے روتے بے

اختیار ہو جاتے تھے۔ حالانکہ امام حسین علیہ السلام کی جو مصیبت تھی وہ فقط تین دن میں ختم ہو گئی اور اس کے بعد وہ ابدالآباد کے عیش مخلد میں پہنچے۔ پس ایسی فانی مصیبت بمقابلہ ایسے عیش مخلد کے کیا حقیقت رکھتی ہے جو انبیا کی نظر اس عیش پر نہ جاتی اور اس فانی مصیبت پر جاتی۔ خصوصاً جب یہ بھی ثابت ہو چکا کہ امام حسین علیہ السلام پر کوئی مصیبت نہ تھی۔ شریعت میں کوئی نظیر ایسی نہیں ملتی کہ کسی کی موت پر یا مصیبت پر رونے کی شارع نے ترغیب دی ہو بر خلاف اس کے احکام صبر نہایت تاکید کے ساتھ موجود ہیں۔ اور بمقتضائے بشریت اپنی مصیبت پر یا غیر کی مصیبت پر بغیر اپنے قصد کے جو کیفیت رقت کی طاری ہوتی ہے اُس کو شریعت نے جائز رکھا ہے اس لیے کہ وہ اختیاری فعل نہیں اور اُس میں جہاں تک ممکن ہو صبر کا قصد کرنا شرعاً محمود ہے۔

اس مقام پر اگر یہ شبہ کیا جائے کہ بعض روایات سے ثابت ہوا ہے کہ شہادت حسین علیہ السلام کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض صحابہ نے اس طرح خواب میں دیکھا کہ موئے مبارک پریشان اور گرد آلود تھے اور خون کا بھرا شیشہ ہاتھ میں تھا اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ خون حسین اور ان کے ساتھیوں کا ہے اس روایت سے فضیلت ماتم حسین کی ثابت ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ احادیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی صورت خواب میں نظر آتی ہے اور شیطان آپؐ کی صورت میں متمثل نہیں ہوتا۔ با ایں ہمہ خواب کی حالت ایسی مشتبہ ہوتی ہے کہ اُس پر احکام شرع مبنی نہیں ہوتے اور اگر کوئی حکم خواب میں معلوم ہو تو نصوص شریعت پر اس کا

پیش کرنا واجب ہے اور اگر خلاف نصوص شریعت ہو تو اس پر عمل کرنا جائز نہیں۔

جو قصہ اس خواب میں مذکور ہے وہ ایسے واقعات نہیں کہ جو در حقیقت واقع ہوئے ہوں۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر مبارک سے باہر نکل کر میدان کربلا میں تشریف لے گئے تھے نہ فی الواقع آپؐ کے ہاتھ میں کوئی شیشہ تھا۔ نہ آپؐ نے اُس میں خون بھرا تھا بلکہ جو نمونہ کسی حالت کا خواب میں نظر آیا وہ محتاج تعبیر ہے اور تعبیر اس کی یہی ہو سکتی ہے کہ قتل حسین ایک ایسا امر عظیم تھا کہ اگر یہ حادثہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہوتا تو آپؐ کو سخت صدمہ ہوتا۔

قطع نظر اس کے یہ خواب اُس وقت دیکھا گیا تھا جس وقت حادثہ شہادت واقع ہوا تھا۔ پس جو کچھ اس کا اثر ہوگا وہ حدوث حادثہ کے وقت سے مختص ہوگا۔ مگر ہزاروں برس پہلے اور سیکڑوں برس بعد یہ نوحہ و شیون نہایت عجیب ہے۔

کیا عوام اس پر تعجب نہ کریں گے کہ ائمہ علیہم السلام حرام جانور کو حلال بتا دیا کرتے اور لوگوں کو حرام گوشت کے کھا لینے میں مبتلا کرتے تھے۔ مگر ائمہ کے لیے تقیہ کی شق موجود تھی۔ فروع کافی کی کتاب الصید میں ابان بن تغلب سے روایت ہے کہ:۔

قال سمعت ابا عبد اللہ	وہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق
علیہ السلام یقول کان	علیہ السلام سے سُنا کہ میرے باپ

ابی علیہ السلام یفتی فی زمن بنی امیۃ ان ما قتل البازی والصقر فھو حلال وکان یتقیھم وانا لا اتقیھم وھو حرام ما قتل۔	علیہ السلام بنی امیہ کے زمانہ میں یہ فتویٰ دیتے تھے کہ باز اور شاہین جس جانور کو قتل کرے وہ حلال ہے اور وہ بنی امیہ سے تقیہ کرتے تھے اور میں بنی امیہ سے تقیہ نہیں کرتا اور وہ حرام ہے جو باز اور شاہین نے قتل کیا۔
(فروع کافی جلد ۲۔ کتاب الصید ص۸)	

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ظاہر کر دیا کہ ان کے باپ امام باقر علیہ السلام یہ فتویٰ دیتے تھے کہ جس جانور کو باز اور شاہین قتل کرے وہ حلال ہے چونکہ امام جعفر صادق اس مسئلہ میں اپنے باپ کے مخالف تھے اس لیے انھوں نے اپنے والد معصوم کی غلطی پر تقیہ کا پردہ ڈال دیا اور یوں فرمایا کہ بنی امیہ کے خوف سے وہ بطور تقیہ ایسا فتویٰ دیتے تھے۔

اب حضرات شیعہ انصاف فرمائیں کہ امام باقر علیہ السلام نے مسلمانوں کو مردار گوشت کھانے کا حکم کیا۔ کیا امام معصوم نائب رسول کا یہی کام ہے اس مسئلہ کے بیان کرنے میں ایسا کیا خوف تھا؟ سب مجتہدین اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق فتویٰ دیتے تھے۔ بالفرض اگر امام باقر علیہ السلام کو ایسا ہی خوف تھا تو سکوت اختیار فرماتے اگر یہ بھی ممکن نہ تھا تو اس مسئلہ سے لاعلمی ظاہر کر دیتے مگر حکم ناحق زبان سے نہ نکالتے۔ حرام کو حلال نہ بتاتے۔ مسلمانوں کو مردار نہ کھلاتے آخر انھیں بنی امیہ کے زمانہ میں اور بھی مشاہیر علماء ایسے تھے کہ وہ باز اور شاہین کے مارے ہوئے جانور کی کراہت کا فتویٰ دیتے تھے۔ چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں

لکھا ہے کہ سعید بن جبیر اور مجاہد اور ضحاک اور سدی اور ابن عمر کا یہی مذہب تھا ان سے اس مسئلہ کی وجہ سے خلفائے بنی امیہ نے کبھی تعرض نہیں کیا۔ پس جب اتنے علماء اس مسئلہ میں متفق تھے پھر امام باقر کو تقیہ کی کیا وجہ تھی؟ اس لیے کہ یہ مسئلہ ائمہ اہل بیت سے مختص نہ تھا۔ قطع نظر اس کے امام باقر علیہ السلام کے لیے جو عہد نامہ نازل ہوا تھا اس میں تقیہ کی ممانعت تھی۔ چنانچہ اصول کافی میں ہے:۔

ثم دفعہ الی ابنہ محمد بن علی ففک خاتما فوجد فیہ حدث الناس وافتھم ولا تخافن الا اللہ عزوجل فانہ لا سبیل لاحد علیک۔	امام زین العابدین علیہ السلام نے کتاب عہود ائمہ اپنے بیٹے محمد بن علی کو دی انھوں نے مہر توڑی تو اس میں یہ مضمون پایا کہ لوگوں سے حدیث بیان کر اور فتویٰ دے اور نہ اللہ کے سوا کسی اور سے ہرگز مت ڈر اس لیے کہ تجھ پر کوئی قابو نہ پاوے گا۔
(اصول کافی ص۱۷۱)	

اس روایت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ امام باقر علیہ السلام کو تقیہ کی اللہ کی طرف سے خاص ممانعت تھی بلکہ ان کو یہ حکم تھا کہ اللہ کے سوا کسی سے مت ڈر اور ان کا اطمینان کر دیا گیا تھا کہ تجھ پر کوئی قابو نہ پاوے گا۔ پس کیوں کر ممکن تھا کہ امام باقر علیہ السلام تقیہ کرتے اس لیے کہ اس میں اللہ کے حکم کی مخالفت تھی اور یہی حکم امام جعفر صادق علیہ السلام کے لیے بھی تھا اور یہاں سے ثابت ہو گیا کہ ان دونوں اماموں کے تقیہ کی جتنی روایتیں ہیں وہ سب باطل اور افترا ہیں۔

درحقیقت اس مسئلہ میں ان دونوں اماموں میں ایسا ہی اختلاف تھا جیسا کہ مجتہدین میں ہوتا ہے۔ احادیث شیعہ کے راویوں نے ائمہ معصومین کے

اختلاف کو سخت مشکل سمجھا اس لیے کہ مسئلہ عصمت کی جڑ اکھڑتی ہے لہٰذا تقیہ کا طرّہ
ملا دیا اور یہ خیال نہ کیا کہ اس تقیہ میں امام معصوم پر کیا کیا الزام عائد ہوتے ہیں
شیعہ راویوں نے اسی مضمون کی ایک اور روایت بھی تصنیف کر لی
جو فروع کافی کے باب الصید البزاۃ میں سب سے پہلے مذکور ہے۔ اُس کا حاصل
یہ ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہمارے والد یعنی امام باقر علیہ السلام
بطور تقیہ کے فتوے دیتے تھے اور اُس وقت ہم کو شکار باز اور شاہین کے مسئلہ
میں خوف تھا لیکن اب ہم کو کچھ خوف نہیں باز اور شاہین کا شکار بغیر ذبح کے
حلال نہیں اور حضرت علی علیہ السلام کی کتاب میں بھی یہ لکھا ہوا ہے کہ اس مسئلہ
میں جو قرآن کی آیت نازل ہوئی ہے وہ کتے کے شکار سے مختص ہے۔

اس روایت میں حضرت علی علیہ السلام کی کتاب کا حوالہ اور بڑھایا
گیا تاکہ سب کو یقین ہو جائے کہ امام باقر علیہ السلام کو یہ مسئلہ ضرور معلوم تھا
کہ باز اور شاہین کا شکار بغیر ذبح کے حرام ہے اس لیے کہ حضرت علی علیہ السلام
کی کتاب میں مذکور تھا مگر اُس کے حلال ہونے کا جو فتویٰ دیتے تھے یہ مصلحت وقت
کے سبب جھوٹ بولتے تھے اور حکم ناحق بیان کرتے تھے۔

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ کتاب علی علیہ السلام کیا چیز ہے۔ اس کتاب
کا نام جامعہ ہے اور صحیفہ بھی ہے۔ اصول کافی میں چند روایتیں اس مضمون
کی ہیں کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ہمارے پاس جامعہ ہے اور
وہ ایک صحیفہ ستر ہاتھ لمبا ہے اور اتنا چوڑا ہے جیسے بکری کی کھال اور لپیٹ
کر اتنا موٹا ہے جیسے اونٹ کی ران۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بتاتے جاتے تھے

اور حضرت علی علیہ السلام لکھتے جاتے تھے۔ اُس میں سب حرام و حلال کے مسائل
اور ہر چیز کا حکم ہے جس کی لوگوں کو حاجت ہوتی ہے۔ یہاں تک اگر کوئی شخص کسی کے
خراش لگا دے تو اُس کی سزا بھی اُس میں مذکور ہے۔

حضرات شیعہ اتنا بھی غور نہیں فرماتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے قرآن کو تو غیر مرتب چھوڑا جو جدا جدا کاغذ کے پرچوں اور لکڑیوں اور ہڈی کے
ٹکڑوں وغیرہ پر لکھا ہوا تھا اور کتاب علی ستر گز لمبے کاغذ پر مرتب کرا دی۔

ائمہ علیہم السلام نے جیسا کہ اصلی قرآن میں شیعوں سے بخل کیا ویسا ہی
اس کتاب سے اُن کو محروم رکھا۔ نہ اصلی قرآن کی نقل شیعوں کو دی نہ اس کتاب
کی۔ اور حضرت صاحب الامر ایک بغل میں قرآن اور دوسری بغل میں کتاب
علی اور مصحف فاطمہ۔ ایک ہاتھ میں جفر کا تھیلا اور دوسرے میں ہتھیاروں کا
صندوق لے کر سامرہ کے غار میں تشریف لے گئے۔ شیعوں میں یہ لیاقت ہی
نہ تھی کہ قرآن یا کتاب علی ان کو دی جاتی۔ ایک مرتبہ جناب زرارہ صاحب
کی نظر اس کتاب پر پڑ گئی تھی اُس کی نسبت جو انہوں نے اپنی رائے صائب
ظاہر فرمائی ہے اُس کا بیان بھی لطف سے خالی نہ ہوگا۔

اوّل یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ زرارہ صاحب کون ہیں۔ قاضی نور اللہ
شوستری نے مجالس المومنین میں بہت سے مناقب زرارہ کے نقل کیے ہیں
جن میں سے چند فقرات بطور نمونہ یہاں مذکور ہوتے ہیں:۔

"زرارہ بن اعین الشیبانی الکوفی در کتاب ابن داؤد مذکور است کہ او
از راویان حضرت امام محمد باقر علیہ السلام و امام جعفر صادق و امام موسیٰ کاظم بود

واصدق اہل زمان خود وافضل ایشان بود۔ وحضرت امام جعفر صادق
دربارۂ او فرمودند۔"

لولا زرارۃ لقلت ان احادیث ابی سیذھب	اگر زرارہ نہ ہوتا تو میں سمجھتا کہ میرے باپ کی حدیثیں گم ہو جاویں گی۔

اور نیز مجالس المومنین میں بحوالہ کتاب کشی یہ بھی منقول ہے :-
"وازفضل بن عبدالملک روایت نمودہ کہ گفت از امام جعفر صادق شنیدم کہ فرمودند دوست ترین مردم از زندہ ومردہ شما نزد من چہار کس اند۔ یزید بن معاویۃ العجلی وزرارہ ومحمد بن مسلم واحول۔ واز آنحضرت نیز روایت نمودہ کہ می فرمودہ اند کہ زرارہ وابوبصیر ومحمد بن مسلم وبریدہ از جملہ کسانے اند کہ خدائے تعالےٰ دربارۂ ایشان فرمودہ اَلسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝

یہ مناقب جن کے تھے اب اُن کے جوہر دیکھیے
یاد تھے کیا کیا انہیں جادو کے منتر دیکھیے

یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جناب زرارہ صاحب کے مناقب کتب شیعہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہیں حالانکہ یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ امام جعفر صادق کی یہ بھی عادت تھی کہ بمقتضائے مصلحت جھوٹ بولا کرتے تھے پھر ایسے شخص کی تعریف کا کیا اعتبار ہے۔

آمدم بر سر مطلب۔ ان زرارہ صاحب کی نظر ایک مرتبہ کتاب علی

لہ مجالس المومنین مطبوعہ طہران ص۱۴۴ مجلس پنجم ۱۲

پڑی تھی اس کی نسبت جو انہوں نے اپنا خیال ظاہر فرمایا اُس سے اس کتاب کی حالت بہت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے مگر جناب زرارہ صاحب کا وہ ریویو جو کتاب علی پر ہے درحقیقت ایک کہہ مکرنی ہے کہ سب کچھ کہہ دیا اور بات بنا دی کتاب کی واقعی حالت ظاہر کر دی اور پھر مومن پاک اعتقاد بن گئے۔ فروع کافی کی کتاب المواریث میں روایت ہے کہ عمر بن اذینہ زرارہ سے نقل کرتا ہے:-

عن زرارۃ قال سالت ابا جعفر علیہ السلام عن الجد فقال ما اجد احدًا قال فیہ الا برأیہ الا امیر المومنین علیہ السلام قلت اصلحك اللہ فما قال فیہ امیر المومنین (فروع کافی جلد ثالث کتاب المواریث ص ۵۲)	زرارہ کہتا ہے کہ میں نے امام باقر علیہ السلام سے یہ مسئلہ پوچھا کہ میراث میں دادا کو کتنا حصہ ملتا ہے؟ تو امام نے فرمایا کہ حضرت علی علیہ السلام کے سوا اور جس کسی نے دادا کی میراث کا مسئلہ بیان کیا ہے اپنی رائے سے بیان کیا ہے۔ (زرارہ کہتا ہے) میں نے کہا کہ اللہ تمہاری حالت درست کرے فرمائیے کہ امیر المومنین نے اس مسئلہ میں کیا کہا ہے۔

ف زرارہ صاحب نے جو امام باقر علیہ السلام کو دعا دی اُس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ امام باقر علیہ السلام کی حالتِ موجودہ کو قابل اصلاح جانتے تھے۔

فقال اذا کان غدا فالقنی حتی اقرئک فی کتاب۔	امام باقر علیہ السلام نے زرارہ سے فرمایا کہ کل صبح کو مجھ سے ملو میں تجھ کو کتاب میں پڑھاؤنگا

ف یہ مضمون روایات شیعہ سے بتواتر ثابت ہوا ہے کہ تمام ائمہ کو اپنا دین چھپانے میں حد سے زیادہ اہتمام تھا خصوصًا نا اہل سے اخفائے اسرار کی

دین میں اور زیادہ کوشش تھی اور یہ بھی کافی کی روایتوں سے ثابت ہے کہ امام دوست و دشمن کو بخوبی پہچان لیتے تھے کبھی دھوکا نہیں کھاتے تھے۔ چنانچہ کافی میں ایک باب اسی بیان میں باندھا ہے۔ پھر تعجب ہے کہ جناب امام باقر علیہ السلام نے زرارہ کو کتاب علی کیوں دکھائی؟ حال آنکہ وہ اس کتاب کو دیکھ کر اس کا انکار کرے گا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امام کی امامت کا بھی معتقد نہ تھا۔

قلت اصلحك الله حدثنی فان حدیثك احب الی من ان تقرئنیہ فی کتاب فقال لی الثانیۃ اسمع ما اقرئك فی کتاب۔

(اصول کافی ص ۲۷۷)

(زرارہ کہتا ہے) کہ میں نے کہا کہ اللہ تمہاری حالت درست کرے مجھ سے زبانی بیان کر دیجیے کتاب میں پڑھانے سے میں تمہاری باتوں کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ تو امام علیہ السلام نے مجھ سے دوبارہ فرمایا کہ جو میں تجھ سے کہتا ہوں اُس کو سُن کل مجھ سے ملیو میں تجھ کو کتاب میں پڑھا دوں گا۔

ف۔ زرارہ کو اتنی بڑی دولت ملتی تھی کہ امام علیہ السلام نے کتاب علی دکھانے کا اس سے وعدہ کیا۔ حضرت علی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کتاب کی زیارت نصیب ہوتی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلی تھی اور زرارہ نے تو صرف ایک مسئلہ میراث جد کا پوچھا تھا اس کے طفیل میں ساری کتاب بہ نظر پڑ جاتی اور دین کے تمام مسائل ایسے معتمد ذریعے سے معلوم ہو جاتے جس میں کوئی شک نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر جناب زرارہ صاحب کو اتنی بڑی دولت کی ذرا بھی پروا نہ تھی اور اس کے دیکھنے سے انکار کرتے تھے۔ یہ بہت بڑی دلیل

اس بات کی ہے کہ اُس کا قلب ایمان اور اسلام سے بالکل خالی تھا۔

فاتیتہ من الغد بعد الظهر وکانت ساعتی التی کنت اخلو بہ فیها بین الظهر والعصر وکنت اکرہ ان اسألہ الا خالیا خشیۃ ان یفتینی من اجل من یحضرہ بالتقیۃ

(زرارہ کہتا ہے) تو آیا میں دوسرے دن ظہر کے بعد اور تھا میرا وقت جس میں تنہائی کرتا تھا میں امام سے ظہر اور عصر کے درمیان اور جب تک تنہائی نہ ہو اُس وقت تک میں سوال کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس خوف سے کہ اور لوگوں کی وجہ سے امام تقیہ کا جواب دیں گے۔

ف۔ زرارہ صاحب ظہر اور عصر کے درمیان میں امام سے تخلیہ کی ملاقات کیا کرتے تھے اور کسی دوسرے کے سامنے سوال امام سے نہیں کرتے تھے اس خیال سے کہ بلحاظِ مصلحت امام جھوٹ بول دیں گے۔

زرارہ کو امام کے ساتھ جب ایسا تخلیہ نصیب ہوتا تھا اور امام بغیر تقیہ کے اُس سے باتیں کرتے تھے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مومن پاک اعتقاد اور مخلص امام تھا۔ با ایں ہمہ اُس نے امام کے قول کی تکذیب کی اور کتاب علی کو باطل کہا جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تکذیب امام ایمان اور خلوص عقیدت کے منافی نہ تھی اور باوجود اس انکار اور بے اعتقادی کے زرارہ ایسا یقین میں تھا کہ امام نے اس سے تقیہ توڑ دیا تھا۔ پس جب امام ایسے منکروں سے تقیہ نہیں کرتے تھے تو اور کس سے تقیہ کرتے ہوں گے۔

اگر حضرات شیعہ تعصب کو چھوڑ کر ذرا انصاف کی طرف توجہ فرمائیں

تو یہیں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ کیوں کر ایجاد ہوا۔ یہی چند چالاک شخص اس مذہب کے موجد ہیں۔ جیسے ابو بصیر اور زرارہ اور دونوں ہشام اور ابو جعفر احول صاحب الطاق وغیرہ وغیرہ یہ سب لوگ اسی کمیٹی کے ممبر تھے جو عبد اللہ بن سبا کے وقت سے قائم ہوئی تھی انھیں بزرگواروں نے ائمہ سے عقائد مذہب شیعہ نقل کیے، امامت کا مسئلہ ایجاد کیا۔ جناب امیر علیہ السلام سے بے مثل دلاور کرار غیر فرار خیبر شکن صاحب ذو الفقار کو باوجود حکم قتال و جہاد کے جو قرآن میں مذکور رہے خلفا کے مقابلہ میں سخت مجبور بنا کر گھر میں بٹھا یا اور پھر رسی گلے میں باندھ کر کھنچوایا۔ جناب سیدہ علیہا السلام کو جہاد خلفا کے لیے گھر سے باہر نکالا اور یہاں تک افترا کیا کہ جناب سیدہ علیہا السلام اور عمر رضی اللہ عنہ میں ہاتھا پائی کرا دی۔ چنانچہ اصول[1] کافی میں موجود ہے کہ جناب سیدہ نے عمرؓ کا گریبان پکڑ کر عمرؓ کو اپنی طرف کھینچ لیا (معاذ اللہ منہا) پھر افترا میں اس سے بھی ترقی کر کے قتل جناب سیدہ اور غصب ام کلثوم تک نوبت پہنچائی۔

اسی زرارہ نے غصب ام کلثوم کی روایت کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے ایسے فحش لفظوں میں ذکر کیا کہ کسی مسلمان کو اہل بیت کرام کی نسبت اُن الفاظ کے استعمال کی جرأت نہ ہو گی نہ کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو (معاذ اللہ منہا) محمد بن یعقوب کلینی شیخ المحدثین شیعہ کی خوش اعتقادی تھی کہ اہل بیت کی اس توہین اور ان فحش الفاظ کو نہایت تعظیم سے قبول کر کے اپنی کتاب کافی میں داخل کیا اور آج تک مجتہدین شیعہ اس کی

[1] اصول کافی صفحہ ۲۹ ۱۲ [2] فروع کافی کتاب النکاح صفحہ ۱۴۱ ۱۲

درس و تدریس کو عبادت سمجھتے ہیں۔ حد سے زیادہ بے ادبی تو فقط غصب کے ہی لفظ سے ظاہر ہے اور پھر جس چیز کا غصب بنایا ہے وہ نہایت شرمناک مضمون ہے۔ کیا یہ مضمون مہذب لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا تھا؟ مگر زرارہ کو تو اہل بیت کی توہین مقصود تھی اسی واسطے گالی کا لفظ اختیار کیا۔

دیکھو اسی مضمون کو قاضی نور اللہ شوستری نے کس چالاکی کے ساتھ مناقب جناب امیر میں شامل کر لیا۔ چنانچہ مجالس[1] المومنین میں انھوں نے لکھا ہے:-

"اگر او (نبیؐ) بوقت عجز بغارہ[2] فرار نمود ایں (علی) بوقت منع و عجز در خانہ بر روئے خود فراز کرد اگر (نبیؐ) دختر بعثمانؓ داد ولی دختر بہ عمر فرستاد"

انہیں نازک خیال خوش مزاج ظریفوں نے جن کی نازک خیالی اور خوش مزاجی اور ظرافت کی تمام قوت اہل بیت کے ساتھ ہی صرف ہوتی تھی یہ بھی تصنیف کر لیا کہ ان تمام ناگوار حوادث کو جناب امیر نے بڑی رضامندی کی نگاہ سے دیکھا اور کچھ بھی حس و حرکت نہ کی۔

[1] مجالس المومنین۔ مجلس سوم ترجمہ مقداد صفحہ ۵۹ مطبوعہ طہران۔

[2] یہ ادب بھی شوستری صاحب کا داد دینے کے لائق ہے کہ رسولؐ کے لیے تو یہ کہا کہ (فرار نمود) اور جناب امیر کے لیے لفظ فرار نہ لکھا بلکہ دروازہ بند کر لینے کا مضمون اختیار کیا۔ فرار کی نسبت رسولؐ کی طرف ہو جائے تو مضائقہ نہیں جناب امیر کی طرف نہ ہو۔ مگر اس کا کیا علاج کہ جناب سیدہ نے جناب امیر سے مخاطب ہو کر (مثل جنین در خانہ گریختہ) فرما دیا ۱۲۔

۹۔ جب جناب سیدہ جہاد خلفاء سے فارغ ہو کر واپس تشریف لائیں تو اپنے گھر میں جناب امیر پر بھی اُن کو جہاد کرنے کی ضرورت پیش آئی اور اپنے شوہر بزرگوار سے بھی انہوں نے وہی معاملہ کیا جو عمرؓ وغیرہ سے کیا تھا اور کیوں نہ کرتیں ثقلین کے ساتھ تمسک کرنے کی رسولؐ نے وصیت کی تھی ثقلین سے قرآن اور عترتِ رسول مراد ہیں۔ جناب امیر نے ان دونوں کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ان کے سامنے قرآن میں تحریف ہوئی اور بڑی خوشی سے دیکھتے رہے اور اصلی قرآن کو چھپالیا اور اہل بیت کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ جناب سیدہ علیہا السلام کو تنہا مخالفوں کی فوج سے لڑنے کے لیے گھر سے باہر بھیج دیا اور بذاتِ خود ذرا بھی مدد نہ کی اور کنج عافیت سے قدم باہر نہ نکالا۔ اس جلن میں خلفا کے جہاد سے واپس ہو کر جناب سیدہ نے جناب امیر پر جہاد شروع کیا اور جوشِ غضب میں جو گفتگو کی ہے اُس کا ترجمہ فارسی جناب ملائی مجلسی نے حق الیقین میں بڑی فصاحت و بلاغت سے ذکر کیا ہے اور وہ یہ ہے :۔

”حضرت امیر المومنین علیہ السلام انتظار معاودت او می کشید چوں بمنزل قرار گرفت خطاب ہائے درشت با سیدِ اوصیا نمود کہ مانند جنین[1] در رحم پردہ نشیں شدہ و مثل خائباں[2] در خانہ گریختہ۔ بعد از آں کہ

---

[1] جنین وہ بچہ جو ماں کے پیٹ میں ہو ۱۲۔ [2] خائباں خائب کی جمع ہے اور اس کے معنے ہیں ذلیل اور نامراد۔ اور بعضے نسخوں میں خائناں لکھا ہے۔ اور جناب مولوی سید محمد صاحب مجتہد لکھنوی کی یہ تحقیق تھی کہ یہ لفظ خائفاں ہے۔ مگر ہم نے جس نسخے سے لکھا ہے اُس میں خائباں لکھا تھا ۱۲۔

شجاعان دہر را بر خاک ہلاک افگندی، مغلوب ایناں گردیدہ اینک پسر ابو قحافہ بظلم و جبر بخشیدۂ پدر مرا و معیشتِ فرزندانم از من گرفتہ و بہ آواز بلند با من مخاصمہ و لجاج می کند و انصار مرا یاری نمی کنند و مہاجران خود را بکنار کشیدہ اند و سائر مردم دیدہ ہا را پوشیدہ اند، نہ دافعے دارم نہ مانعے و نہ یاورے و نہ شافعے۔ خشمناک بیروں رفتم و غمناک برگشتم خود را ذلیل کردی۔ در روزے کہ دست از سطوت خود برداشتی گرگاں می درند و می برند و تو از جائے خود حرکت نمی کنی کاش پیش ازیں مذلت و خواری مردہ بودم وائے بر من در ہر صبحے و شامے محل اعتماد من مُردہ و بازوئے من سُست شد۔“ (حق الیقین ص۲۳۳)

اس عبارت سے جو جو فوائد ثابت ہوتے ہیں وہ اپنے محل پر مذکور ہوں گے اور ملائے مجلسی نے جو مصلحت کی تاویلیں کی ہیں ان کی حقیقت بھی ظاہر کی جائے گی۔

حضرات شیعہ نے یہ بھی تو غور نہ کیا کہ جناب سیدہ نے صبر واجب کو کیوں ترک کیا اور تقیہ چھوڑ کر عمرؓ سے ہاتھا پائی کیوں کی اور گریبان پکڑ کر عمرؓ کو اپنی طرف کیوں کھینچا مسئلہ تقیہ میں میاں بی بی میں اختلاف کیوں ہوا؟ میاں پردہ نشین ہو کر گھر میں بیٹھے بی بی نے باہر نکل کر بذاتِ خود تنہا جہاد کیا بلکہ جناب امیر کو گھر میں بیٹھ رہنے پر سخت ملامت کی اب فرمائیے کہ ان دونوں معصوموں میں جو یہ مذہبی اختلاف تھا ان میں کس کا مذہب صحیح تھا اور کس کا غلط؟

۱۰۔ جناب سیدہ علیہا السلام نے جو وصیتِ رسولؐ کے خلاف عمل کیا اور

صبر کا جب چھوڑا، تقیہ توڑا۔ جناب امیر سے مخالفت کی۔ تنہا بذاتِ خود میدانِ جہاد میں قدم رکھا اور عمرؓ سے ہاتھا پائی کی۔ یہ تمام جاں فشانیاں اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے نہ تھیں جو اصل مقصود جہاد ہے بلکہ اس لیے تھیں کہ پورا باغ فدک فقط انھیں کو کیوں نہ دیا اور مال موقوفہ ٹھیرا کر تمام بنی ہاشم پر اُس کی آمدنی کیوں تقسیم کی جس میں جناب سیدہ کا حصہ تھوڑا رہ گیا۔ سب آمدنی فقط انھیں کو نہ ملی۔ حالانکہ اس وقت جناب سیدہ علیہا السلام کو یہ بھی معلوم تھا کہ اب ان کی زندگی فقط دو ڈھائی مہینے کی باقی ہے۔ اس کے علاوہ جناب سیدہ کچھ محتاج نہ تھیں۔ بڑی دولت مند تھیں۔ کافی[1] میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سات گاؤں بلا شراکت غیرے جناب سیدہ کے قبضے میں تھے اور اُن ساتوں گاؤں کے نام یہ ہیں۔ دلال[1]، عفاف[2]، حسنیٰ[3]، صافیہ[4]، مالام ابراہیم[5]، مبیت[6]، برقہ[7]۔ ان ساتوں گاؤں میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے میراث کا دعویٰ کیا تھا مگر جناب سیدہ نے ایک حبہ بھی ان کو نہ دیا اور وہی جواب دیا جو خلیفۂ اول نے فدک کے معاملہ میں کیا تھا یعنی یہ کہہ دیا کہ یہ وقف ہیں ان میں میراث جاری نہ ہوگی اور حضرت علی علیہ السلام نے گواہی دی کہ یہ گاؤں فاطمہؓ پہ وقف ہیں۔ اور اُن ساتوں گاؤں کی نسبت جناب سیدہ ایک وصیت نامہ لکھ گئی تھیں کہ میرے بعد علیؓ قابض رہیں اُن کے بعد حسنؓ پھر حسین پھر جو حسینؓ کی اولاد میں بڑا ہو مقداد اور زبیر کی اُس پہ گواہی ہے حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا وصیت نامہ ہے جس کی نقل کافی میں موجود ہے۔ اولادِ حسنؓ کو جناب سیدہ اس جائداد سے محروم کر گئیں۔

---

[1] حق الیقین صفحہ ۲۳۱

اس جاگیر کے علاوہ خلیفہ اول نے بھی تمام مال اپنا نہایت التجا کے ساتھ جناب سیدہ کے سامنے حاضر کر دیا تھا کہ جتنا چاہو لے لو۔ چنانچہ حق الیقین[1] میں ہے کہ جب جناب سیدہ مطالبۂ فدک کا خطبہ پڑھ چکیں تو خلیفۂ اول نے بہت سے مناقب جناب سیدہ کے بیان کیے اور بہت سی معذرت کے بعد یہ کہا:۔

"واموال واحوال خود را از تو مضائقہ نمی کنم انچہ خواہی بگیر تو سیدۂ امت پدر خودی وشجرۂ طیبہ از برائے فرزندان خود انکار فضل تو کسے نمی تواند کرد وحکم تو نافذ ست در اموال من اما در اموال مسلماناں مخالفت گفتۂ پدر تو نمی توانم کرد۔"

قطع نظر اس کے نفقہ اُن کا اور اُن کی اولاد کا جناب امیر کے ذمہ تھا جو صاحب جائداد کثیرہ تھے جس کی تفصیل اُن کے وصیت نامے[1] سے ظاہر ہے جو فروع کافی کی جلد ثالث میں مذکور ہے۔

ان سب اسباب ظاہری سے اگر قطع نظر کی جائے تو اللہ کی رزاقی پر کافی اعتماد ہو سکتا تھا۔ ہمارے زمانے میں بھی خاندان شرفا میں جن مفلس و محتاج بیوہ دکھیوں کو اس قسم کی شکایت ہوتی ہے وہ نہایت صبر کے ساتھ اپنے گھروں میں ہی بیٹھی ہوئی اپنے دکھڑے رویا کرتی ہیں۔ جناب سیدہ پہ تو یہ افترا باندھا گیا کہ انہوں نے باوجود کمال دولتمندی اور سامان رزق کے ایک باغ کی شکایت میں گھر سے باہر نکل کر نامحرموں سے ہاتھا پائی شروع کر دی (العیاذ باللہ)

---

[1] فروع کافی جلد ثالث کتاب الوصایا صفحہ ۲۶ ۱۲ منہ

کیا یہی مقتضائے محبت اہل بیت ہے کہ بلا سوچے سمجھے اہل بیت کی ایسی توہین کو مان لیا جاوے۔ استغفر اللہ جن لوگوں نے ایسے واقعات کو تسلیم کر لیا درحقیقت انہوں نے کچھ بھی اہل بیت کی وقعت نہ سمجھی اور جس طرح شجاعت اور غیرت کی صفت سے جناب امیر کو پاک کر دیا اسی طرح صبر اور قناعت اور رضا و تسلیم اور توکل کی صفت سے جناب سیدہ کو معرا بنا دیا۔ معاذ اللہ[۵]

یہ عقائد شیعہ اس موقع پر نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں آئندہ ان کی پوری تفصیل مذکور ہوگی۔ یہ بدنما تصویر اسی کمیٹی کی بنائی ہوئی ہے جس کے پریسیڈنٹ جناب زرارہ صاحب تھے۔ ان مطالب کو اس کمیٹی کے سب ممبر ائمہ سے روایت کرتے تھے مگر چالاکی یہ تھی کہ ائمہ تو مدینہ میں تھے اور یہ روایتیں ان کی کوفہ وغیرہ دور دراز ملکوں میں بیان ہوتی تھیں۔ مگر وہاں بھی ایسے مسلمان ضرور ہوتے تھے جو ائمہ سے مل چکے تھے، ان کی باتیں سن چکے تھے، ان کے حالات سے واقف تھے وہ اُن عجیب روایتوں کی تکذیب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم بھی ائمہ سے ملے ہیں ان کے عقائد اہل سنت کے عقائد کے مطابق ہیں وہ ہرگز یہ باتیں نہیں کہتے جو تم کہتے ہو۔ تو یہ چالاک راوی ذُریات ابن سبا یوں بات بناتے تھے کہ ائمہ سب کے سامنے بغرض مصلحت جھوٹ بولا کرتے ہیں اور سُنی بن جایا کرتے۔ مگر تنہائی میں ہم سے یہ روایتیں بیان کرتے ہیں جو ہم کہتے ہیں۔ ظاہر میں وہ سُنی ہیں باطن میں شیعہ۔ بلکہ شیعوں کے امام وہ اپنے دل کی باتیں صرف ہمیں چند آدمیوں سے کہتے ہیں کسی اور سے نہیں کہتے اور ہم کو بھی ان باتوں کے چھپانے کی حد سے زیادہ تاکید کی ہے۔ اور ان اسرار

[۵] دیکھو نصیحۃ الشیعہ ص۲

کے ظاہر کرنے والے کو قاتلِ ائمہ کہا ہے۔ چنانچہ ابو بصیر سے اصول کافی[۱] میں روایت ہے وہ کہتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھ سے یہ کہہ دیا ہے کہ جس نے ہمارے امر میں سے کوئی بات ظاہر کر دی اُس نے ہم کو عمداً قتل کیا۔ کبھی یہ کہہ دیتے تھے کہ ائمہ اپنے مخلصین[۲] شیعہ میں بھی اختلاف ڈالا کرتے ہیں اور ہر ایک سے نئی بات کہدیتے ہیں ہم کو ائمہ نے یہ باتیں خفیہ سکھائی ہیں اور کہہ دیا ہے کہ ہم سے اس کے خلاف سنو تو اس کو دفع الوقتی سمجھنا۔ کبھی کہہ دیتے تھے کہ ائمہ[۳] ہر شخص کی آواز سُن کر معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ نجات پانے والا ہے یا ہلاک ہونے والا ہے۔ پس جیسا شخص ہوتا ہے ویسا ہی اس کو جواب دیتے ہیں اور اس قول کا حاصل ظاہراً یہی ہے کہ جس کو ناجی سمجھتے ہیں اُس کو ایمان سکھاتے ہیں اور جس کو ناری سمجھتے ہیں اُس کو کفر سکھاتے ہیں۔

اگر کوئی اُن سے کہتا کہ ائمہ ہمیشہ اہل سنت کے جنازوں میں شریک ہوتے ہیں ان کی نمازیں پڑھتے ہیں اگر وہ اہل سنت کو بُرا سمجھتے تو اُن کے جنازوں میں کیوں شریک ہوتے۔ اس کا جواب یہ دیتے تھے کہ ہمیشہ رسول[۴] کی اور ائمہ کی یہ عادت تھی کہ منافقین اور نواصب کے جنازوں میں شریک ہوتے تھے اور باطن میں اُن کے لیے بددعا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ علیہم السلام کا ظاہر اور تھا باطن اور تھا۔

اگر کوئی ان سے کہتا کہ مجبوری جناب امیر اور جبادہ جناب سیدہ اور

---

[۱] اصول کافی ص۱۵۲ [۲] دیکھو نصیحۃ الشیعہ ص۴ ۱۲ [۳] دیکھو نصیحۃ الشیعہ ص۲۲ ۱۲ [۴] اصول کافی ص۲۷۰ ۱۲

قتلِ فاطمہؓ اور غصبِ ام کلثوم اور ارتداد تمام صحابہ وغیرہ وغیرہ کی جو کہانیاں تم بیان کرتے ہو یہ ایسی عجیب اور خلاف ظاہر ہیں کہ کسی طرح عقل بھی ان کو قبول نہیں کرتی نقل بھی اُس کے خلاف ہے اور بہت سے دلائل اور قرائن اس کی تکذیب کرتے ہیں تو اس کا جواب دیتے کہ ائمہ نے کہہ دیا ہے کہ پیغمبر[1] یہ کہہ گئے ہیں کہ آل محمد کی باتیں ایسی مشکل ہوتی ہیں کہ ملائکہ مقربین اور انبیاء مرسلین اور مومنین کامل کے سوا کسی اور کو اُن پر یقین نہیں آتا. پس تم کو چاہیے جو بات سمجھ میں آوے اُس کو مانو. جو سمجھ میں نہ آوے اس کو اللہ اور رسول اور امام کی طرف رد کر دو.

اگر کوئی اُن سے کہتا کہ تم تمام صحابہ کو مرتد بتاتے ہو حالانکہ قرآن کی اکثر آیات سے تمام صحابہ مہاجرین وانصار اور اصحاب بیعت رضوان کی اور آیت غار سے خلیفۂ اول کی بہت کچھ فضیلت ثابت ہوتی ہے تو جواب دیتے کہ قرآن کو ائمہ کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا اور یہ قرآن تو محرف ہے اصلی قرآن ائمہ کے پاس ہے جو آخر کو سامرہ کے غار میں پہنچ گیا۔[2]

اگر کوئی کہتا کہ تمہاری روایتیں کیوں کر مانی جاویں تم میں نہ امانت[3] ہے نہ عہد ہے نہ صدق ہے نہ وفا ہے۔ پھر ایسے لوگوں کی بات کیوں کر معتبر ہوگی؟ تو جواب دیتے کہ اصحاب ائمہ اور شیعوں کی خاص نشانی یہی ہے اور باایں ہمہ یہی لوگ بخشے جاویں گے اور امانت اور عہد اور صدق اور وفا کی صفتیں تو سنیوں میں ہوتی ہیں جنھیں نجات نصیب نہ ہوگی۔

---

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ صفحہ ۵ ۱۲ [2] اصول کافی صفحہ ۲۵۴ [3] دیکھو نصیحۃ الشیعہ صفحہ ۳ ۱۲

سمجھنے والے یہیں سے سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب شیعہ کیوں کر ایجاد ہوا اور ائمہ پر کس طرح افترا کیے گئے اور جو روایتیں اہتمام تقیہ اور اخفائے دین کی تصنیف کی گئیں اُن تصنیف کرنے والوں کا ان روایتوں سے کیا مقصود تھا.

یہی چند چالاک شخص ائمہ پر افترا کرتے تھے اور اُن افتراؤں پر جو اعتراض وارد ہوتے تھے اُس کے جواب میں اُنہوں نے یہی جادو کے فقرے تجویز کر لیے تھے. یہ سب روایتیں جو انہوں نے اپنے جوابوں کے لیے تجویز کی تھیں کتب احادیث شیعہ خصوصًا کافی میں مذکور ہیں اور اُنھیں سے مذہب شیعہ کی ایجاد کا سُراغ مل گیا۔

اس سے بڑھ کر اور لطف سُنیے یہ لوگ ائمہ پر افترا کر کے جو باتیں، دوسروں کو سکھلاتے تھے ان کے خود معتقد نہ تھے۔ مثلاً اوروں کو تو انہوں نے یہ سکھایا کہ ائمہ مثل انبیاء کے معصوم ہیں کوئی خطا اُن سے ممکن نہیں اور بہت سی روایتیں اس مضمون کی تصنیف کر دیں۔ ایسی تصانیف اور ایجادات میں وہ بڑے مشاق تھے مگر خود...... اصحاب ائمہ کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ ائمہ معصوم ہیں۔ اس کا پتہ بھی احادیث شیعہ میں بہت اچھی طرح موجود ہے۔ ملا مجلسی نے حق الیقین[1] میں جو شہید ثانی کا قول اصول ایمان کے بیان میں نقل کیا ہے اُس میں اعتقاد عصمت ائمہ میں شیعوں کے اختلاف کی تفصیل ہے۔ اول قول تو یہ لکھا ہے کہ ائمہ معصوم ہیں اور دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ ائمہ معصوم نہیں اس کی دلیل یہ لکھی ہے:۔

---

[1] حق الیقین صفحہ ۶۹۶ ۱۲

"از احادیث ظاہر می شود کہ جمعے از راویان کہ در اعصار ائمہ علیہم السلام بودہ اند از شیعیان، اعتقاد بہ عصمت ایشان نداشتہ اند بلکہ ایشان را علمائے نیکو کار میدانستہ اند۔ چنانکہ از رجال کشی ظاہر مے شود و مع ذلک ائمہ علیہم السلام حکم بایمان بلکہ عدالت ایشان مے کردہ اند۔"

لیجیے اب تو عصمت کا پردہ بہت اچھی طرح ٹوٹ گیا اور ثابت ہوگیا کہ اعتقاد عصمتِ ائمہ، ائمہ کے زمانہ میں نہ تھا اور خود اصحاب ائمہ عصمتِ ائمہ کے معتقد نہ تھے اور ائمہ کو امام نہیں سمجھتے تھے بلکہ علمائے نیکوکار جانتے تھے۔ اور ائمہ اُن کے اس اعتقاد پر راضی تھے اور اُن کو مومن بلکہ عادل جانتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جو معصوم نہ ہو وہ امام مفترض الطاعت کیسے ہو سکتا ہے؟۔

غور کرو کہ جو اصحاب ائمہ مذہب شیعہ کی روایت کرتے تھے انہوں نے اس مذہب کو کن کن چالاکیوں سے نقل کیا ہے اور وہ خود اس مذہب کے معتقد نہ تھے۔ یہ تمام تفصیل شیعوں ہی کی کتابوں سے ملی ہے کہ ان جلیتی پُرزوں نے کس طرح مذہب شیعہ کو ایجاد کیا۔ ؎

صیّاد نے لگائے ہیں پھندے کہاں کہاں
سارے پتے عیاں ہیں اسی سبز باغ میں

جو لوگ عقل سلیم رکھتے تھے وہ اِن فریبوں اور چالاکیوں کو سمجھ گئے بعض سادہ لوح اس مغالطے میں پھنس گئے اسی طرح مذہب شیعہ کا سبز باغ

مرتب ہوگیا۔

آمدم بر سر مطلب۔ اس تمہید کے بعد یہ سمجھ لو کہ زرارہ نے جو یہ کہا کہ میں بعد ظہر امام سے تخلیہ کی ملاقات کیا کرتا تھا اور عام مجلس میں اُن سے کوئی سوال نہیں کرتا تھا اس لیے کہ مجھ کو یہ خوف ہوتا تھا کہ وہ بہ نظر مصلحت جھوٹ بول دیں گے۔ یہ قول اس کا وہی جادو کا فقرہ تھا جس سے مذہب شیعہ ایجاد ہوا۔

امام باقر علیہ السلام کا ظاہر اور باطن ایک تھا جو اُن کے دل میں تھا وہی اُن کی زبان پر تھا یہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ اُن کے دل میں کچھ اور ہو اور زبان پر کچھ اور ہو۔ اُن کے واسطے تو بالتخصیص اللہ کا یہ حکم نازل ہوا تھا کہ تم احکام دین کے ظاہر کرنے میں اللہ کے سوا کسی سے مت ڈرو کوئی تم پر قابو نہ پائے گا پھر وہ تقیہ کیوں کرتے؟۔

پس یقین جان لو کہ زرارہ امام باقر علیہ السلام پر افترا کا قابو ڈھونڈنے کے لیے یہ ظاہر کیا کرتا تھا کہ امام کی باتیں عام مجلس میں اور ہوتی ہیں اور وہ بالکل جھوٹی باتیں ہوتی ہیں جو بہ نظر مصلحت بیان کیا کرتے ہیں اور سچی باتیں وہ ہوتی ہیں جو تخلیہ میں مجھ سے کہا کرتے ہیں۔

اس کے بعد اب پھر اسی روایت کی طرف توجہ کرو کہ زرارہ نے حضرت علی علیہ السلام کی کتاب کیوں کر دیکھی۔

فلما دخلت علیہ اقبل علی ابنہ جعفر فقال اقرء — (زرارہ کہتا ہے) جب میں امام باقر علیہ السلام کے پاس گیا تو اُن کے بیٹے جعفر

زرارۃ صحیفۃ الفرائض ثم قام لینام فبقیت انا وجعفر فی البیت فقام فاخرج الی صحیفۃ مثل فخذ البعیر فقال لست اقرئکھا حتی تجعل لی اللہ علیک ان لا تحدث بما تقرء فیھا احدا ابدا حتی اذن لک ولم یقل حتی یاذن لک ابی۔

میرے پاس آئے تو امام نے فرمایا کہ زرارہ کو فرائض کی کتاب پڑھا دو۔ پھر امام باقر علیہ السلام سونے کے لیے اُٹھ گئے اور اس مکان میں فقط میں اور جعفر رہ گئے تو جعفر کھڑے ہوئے اور ایک کتاب میرے لیے نکالی جو اونٹ کی ران کے برابر موٹی تھی تو جعفر نے کہا کہ میں یہ کتاب اُس وقت تک تجھ کو نہ پڑھنے دوں گا جب تک تو اللہ کی قسم کھا کر مجھ سے یہ نہ کہہ دے کہ جو کچھ اس میں پڑھے اس کو کبھی کسی سے بیان نہ کرے جب تک کہ میں تجھ کو اجازت نہ دوں اور انہوں نے یوں نہ کہا کہ جب تک میرے باپ اجازت نہ دیں۔

قلت اصلحک اللہ لم تضیق علی ولم یامرک ابوک بذلک۔

(زرارہ کہتا ہے) کہ میں نے جعفر سے کہا کہ تم مجھ پر اتنی تنگی کیوں کرتے ہو حالانکہ تمہارے باپ نے اس کا تم کو حکم نہیں کیا۔

فقال لی ما انت بناظر فیھا الا علی ما قلت لک۔

تو جعفر نے مجھ سے کہا کہ تو اس کتاب کو دیکھ نہیں سکتا جب تک کہ اُس شرط کو پورا نہ کرے جو تجھ سے میں نے کی ہے۔

فقلت فذالک لک۔

(زرارہ کہتا ہے) تب میں نے کہا کہ میں اس شرط کو بھی تمہارے لیے قبول کرتا ہوں۔

وکنت رجلا عالما بالفرائض والوصایا بصیرا بھا فلما القی الی طرف الصحیفۃ اذا کتاب غلیظ یعرف انہ من کتاب الاولین فنظرت فیھا فاذا فیھا خلاف ما بایدی الناس من الصلۃ والامر بالمعروف الذی لیس اختلاف واذا عامتہ کذلک

(زرارہ کہتا ہے) کہ میں فرائض اور وصایا کا عالم اور بصیر تھا۔ جب میرے سامنے اُس کتاب کا کنارہ ڈالا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک موٹی کتاب ہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پُرانی کتاب ہے میں نے اُس کتاب کو دیکھا تو یہ معلوم ہوا کہ جو احکام صلہ اور امر بالمعروف کے لوگوں کو معلوم ہیں جن میں کسی کا اختلاف نہیں ان کے مخالف باتیں اس میں لکھی تھیں اور وہ ساری کتاب ایسی ہی تھی۔

ف۔ کتاب علی پر زرارہ نے جو ریویو بیان کیا یہ اس کا پہلا فقرہ ہے۔ زرارہ نے اول اپنا کمال علمی ظاہر کر دیا اور اپنے آپ کو احکام شرعیہ کا عالم اور بصیر بتا دیا اس کے بعد زرارہ کہتا ہے کہ جو مسائل مسلمانوں میں اجماعی اور اتفاقی تھے جن میں کسی کا بھی اختلاف نہ تھا اُن کے مخالف باتیں کتاب علی میں لکھی ہوئی تھیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اول سے آخر تک اس کتاب میں دین اسلام کے سوا کسی اور دین کا بیان تھا۔

فقرات حتی اتیت علی اخرہ

میں نے اس کو اول سے آخر تک

بخبث نفس وقلة تحفظ واسقام رأي۔

خباثتِ نفس کے ساتھ دیکھا اور یاد کرنے کا قصد کم کیا اور غلط سمجھا۔

ف خبثِ نفس ہر جگہ زرارہ کے ساتھ تھا اسی لیے کتاب علی کو بھی اُس نے خبثِ نفس کے ساتھ دیکھا اور اس کے مسائل کو ایسا غلط سمجھا کہ یاد کرنے کا قصد بھی نہیں کیا۔

وقلت وانا اقرأه باطل حق اتيت على آخره ثم ادرجتها ورفعتها اليه ثم لقيت ابا جعفر عليه السلام فقال لي اقرأت صحيفة الفرائض فقلت نعم فقال كيف رأيت ما قرأت، فقلت باطل ليس بشيء هو خلاف ما الناس عليه۔ قال فان الذي رأيت والله يا زرارة هو الحق الذي رأيت املاء

اور اول سے آخر تک پڑھ کر میں نے اس کو باطل سمجھ لیا پھر میں نے اس کو لپیٹ کر اُن کے حوالے کر دیا۔ پھر میں امام باقر علیہ السلام سے ملا تو اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تونے فرائض کی کتاب کو پڑھ لیا؟ میں نے کہا ہاں پڑھ لیا۔ تو امام نے فرمایا کہ تو نے جس کتاب کو پڑھا کیسا پایا؟ (زرارہ کہتا ہے) کہ میں نے کہا کہ وہ تو جھوٹی کتاب ہے۔ کچھ قابل اعتبار نہیں اور جو مذہب سب آدمیوں کا ہے اس کے خلاف ہے امام باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ اے زرارہ جو کتاب تونے دیکھی ہے واللہ وہی حق ہے تونے جو کتاب دیکھی ہے اُس کو بتایا ہے

رسول الله صلى الله عليه وسلم وخط علي عليه السلام بيده فاتاني الشيطان فوسوس في صدري فقال وما يدري انه املاء رسول الله وخط علي بيده

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور لکھا ہے علی نے اپنے ہاتھ سے (زرارہ کہتا ہے) کہ میرے پاس شیطان آیا اور اس نے میرے دل میں وسوسہ ڈالا کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا ہے اور حضرت علی نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔

ف شیطان تو اب آیا ہے۔ زرارہ انکار پہلے ہی سے کر رہا تھا۔ پس جو پہلے سے زرارہ کا قول تھا وہی شیطان نے تعلیم کیا۔ پھر شیطان کے وسوسے کا ذکر فضول تھا۔

فقال لي قبل ان انطق يا زرارة لا تشك ود الشيطان والله انك شككت۔

تو امام باقر علیہ السلام نے میرے کلام کرنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ شیطان کا دوست بن کر شک مت کر واللہ تونے شک کیا۔

ف زرارہ تو ایسا منکر تھا کہ امام کے قول کو اُس نے نہ مانا۔ امام کے ولی عہد جعفر صادق علیہ السلام نے نہایت تاکید کے ساتھ اخفا کا عہد و قسم لے کر وہ کتاب اس کو دکھائی اس پر بھی اس نے اعتماد نہ کیا۔ آخر امام کو قسم کھانا پڑی پھر بھی زرارہ کی صورت سے ظاہر تھا کہ اس منکر کو قسم پر بھی یقین نہیں ہوا اور امام کے قول و قسم کو اُس نے جھوٹ سمجھا۔ منکر کی صورت سے ہر شخص انکار کی علامت سمجھ سکتا ہے۔ اسی وجہ سے امام بغیر اس کے کچھ اور کہنے کے اس کی صورت کے قرائن سے سمجھ گئے کہ وہ امام کے قول کو باوجود قسم کے بھی جھوٹا سمجھتا ہے اور ظاہر ہے

کہ اس کے کچھ اور کہنے کی کیا حاجت تھی وہ تو اس کتاب کو پہلے ہی باطل کہہ چکا تھا۔ آخر میں اپنے شک کو زرارہ نے وسوسۂ شیطانی کی طرف منسوب کیا۔ مگر یہ تو ثابت نہیں ہوا کہ زرارہ وسوسۂ شیطانی کو برا سمجھتا تھا شاید اس کا اعتقاد یہی ہو کہ وسوسۂ شیطانی مثل الہام کے ہوتا ہے چنانچہ اہل جاہلیت کا اعتقاد یہی تھا۔

وکیف لا ادری انہ	اور مجھے کیسے خبر نہ ہو کہ اُس کو رسول نے بتایا
املاء رسول اللہ وخط علی	اور علی نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے حالانکہ میرے
بیدہ وقد حدثنی ابی	باپ نے میرے دادا سے روایت
عن جدی ان امیر المومنین	کی ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام نے ان
علیہ السلام حدثہ ذلک	سے یہ قصہ بیان کیا تھا۔

ف امام کا قول زرارہ نے نہ مانا، قسم زرارہ نے نہ مانی، بار بار تاکید سے کہا تب بھی زرارہ نہ مانا اور جب امام نے اُس کی صورت دیکھ کر قرائن سے سمجھ لیا کہ اس کو یہ شک ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ کتاب رسولؐ نے بتائی ہے اور علیؓ نے اپنے قلم سے لکھی ہے تب مجبور ہو کر امام نے سند بیان کی۔ مگر کیا زرارہ جانتا نہ تھا کہ مصلحت کے لیے جھوٹ بولنا امام کا خاص شیوہ ہے اور بالفرض اگر امام باقر علیہ السلام سچ کہتے ہوں تو ائمۂ سابق کی بھی یہی عادت تھی پھر ایسی سند کا کیا اعتبار۔ خصوصاً جب راوی اُس سند کے ایسے ہوں جو مصلحتی کذب کو واجب سمجھتے ہوں اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ایسے قصے نقل کرتے ہوں کہ انہوں نے اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے بغیر ضرورت دینی کے ایسا جھوٹ

بولا کہ بے گناہوں پر چوری کا الزام لگایا۔

ان لوگوں میں دروغ مصلحت غیروں سے مختص نہ تھا بلکہ آپس میں بھی ایک دوسرے سے تقیہ کرتے تھے۔ چنانچہ اصول کافی سے ثابت ہے کہ سلمانؓ اور ابوذرؓ آپس میں ایک دوسرے سے تقیہ کرتے تھے اس کا ذکر انشاء اللہ عن قریب آنے والا ہے۔

قال قلت لا کیف جعلنی	(زرارہ کہتا ہے) میں نے کہا کہ مجھ کو شک
اللہ فداک وندمت علی	نہیں اور میں آپ پر قربان ہوں مجھے
مافاتنی من الکتاب ولو	کیوں کر شک ہو سکتا ہے اور مجھے ندامت
کنت قرأتہ وانا اعرفہ	ہے کہ میں نے اُسے یاد نہ کر لیا اور اگر میں
لرجوت ان لا یفوتنی منہ	اس کو پہچانتا تو ساری کتاب یاد کر لیتا۔
حرف۔	ایک حرف مجھ سے نہ چھوٹتا۔

ف دیکھیے زرارہ کی چالاکی۔ امام کا قول نہ مانا، قسم نہ مانی، اب جو امام نے سند بیان کی حالانکہ زرارہ کو اس سند کا حال خوب معلوم تھا کہ اس کے راوی کیسے ہیں اور جھوٹ سے کہاں تک بچتے ہیں مگر امام سے کہہ دیا کہ اب مجھ کو شک نہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ مجھ کو ندامت ہے کہ میں نے تمام کتاب کو یاد کیوں نہ کر لیا اگر میں پہلے سے اُس کو پہچانتا ہوتا تو ساری کتاب مجھ کو یاد ہو گئی ہوتی۔

زرارہ نے جواب بات بنائی اور ندامت ظاہر کی یہ دروغ مصلحت آمیز تھا۔ حال آنکہ اگر یہ ندامت سچی ہوتی تو دوبارہ امام سے کتاب مانگ لیتا۔

امام نے تو اس وقت بھی اُسے کتاب دکھا دی تھی جب اس کے دل میں انکار تھا اور کتاب دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا اور اب تو بظاہر تصدیق کرنے لگا۔ اس وقت تو امام اُس کو کتاب دکھانے میں اور زیادہ اہتمام کرتے۔ اس بات بنانے سے زرارہ کا مقصود یہ تھا کہ آیندہ امام تک رسائی باقی رہے اور تہمت وافترا کا سلسلہ بند نہ ہو جائے۔ بہر حال کچھ ہو مگر یہ ظاہر ہو گیا کہ اس کتاب کے مطالب مسائل اجماعیہ اور اتفاقیہ کے خلاف تھے اور تمام مسلمانوں کا جو مذہب تھا اس کے مخالف مضامین اس میں مندرج تھے۔

افسوس کہ ائمہ نے یہ کتاب بھی شیعوں کو نہ دی۔ بھلا قرآن میں بُخل کیا تھا تو یہ کتاب تو حوالے کر جاتے۔

البتہ ائمہ اپنے مخلصین شیعہ کو بعض علوم حقہ کا پتہ ہندوؤں میں[1] بتا گئے ہیں۔ بعض کا ذکر بطور نمونہ تھا شاید اشارہ یہ ہو کہ جس طرح ایک علم حق اُن میں ملے گا اسی طرح اور علوم حقہ بھی انھیں میں ڈھونڈو۔

تعجب ہے کہ حضرات شیعہ اتنا بھی غور نہیں کرتے کہ اگر ائمہ کے پاس کوئی دوسرا قرآن ہوتا یا فی الواقع اس کتاب علی کا کوئی وجود ہوتا تو وہ مخلصوں کو کیوں نہ دے جاتے یہ شبہ لاحل تھا مگر زرارہ وغیرہ ممبران کمیٹی معلومہ نے جس طرح ائمہ کی امامت اور ان کے پاس ایک دوسرے قرآن اور کتاب علی وغیرہ کی روایتیں تصنیف کیں اُسی کے ساتھ اس لاحل شبہ کا جواب بھی تصنیف کر دیا یعنی تمام شیعوں کو رجعتِ خیالی کا منتظر بنا گئے اور یہ سمجھا دیا کہ حضرت صاحب الامر کبھی غار میں سے نکلیں گے اور قیامت

---

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ صـ۱۹

سے پہلے بہت سے مُردہ زندہ ہو جائیں گے اور بڑا جماؤ ہو گا شیعوں کی سلطنت ہو گی وہ ظالموں کو زندہ کر کے سزا دیں گے قسم قسم کے تماشے ہوں گے۔ یہ ناول شیعوں کو ایسا دلچسپ معلوم ہوا جس کی دل فریبی نے اس شبہ لاحل کو ان کی نگاہوں میں حل کر دیا اور اس معاملہ پر غور کامل کرنے سے روک دیا۔

یہ زرارہ ایسا منکر امام تھا کہ ایک مرتبہ امام باقر علیہ السلام سے بحث کر رہا تھا اور اُن کے قول کو بار بار رد کر رہا تھا اور ہرگز نہیں مانتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ امام کو قائل کر دے آخر اُس نے اپنے دل میں جو کچھ خیال باندھ لیا وہ اصولِ کافی[1] میں اس طرح مذکور ہے:—

عن زرارۃ قال قلت	زرارہ کہتا ہے کہ میں نے اپنے دل میں کہا
فی نفسی شیخ لا علم لہ	یہ بوڑھا ایسا ہے کہ مناظرہ کا طریقہ جانتا
بالخصومۃ	ہی نہیں۔

خلیل قزوینی نے صافی[2] شرح کافی میں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:—

"ایں پیر بے دماغ شدہ نمی داند روشِ گفتگو با خصم"

حالانکہ اس کے بعد جب امام نے بدلیل اس کو الزام دیا اُس وقت زرارہ نے اپنی جہالت کا اقرار کیا لیکن جب تک الزام نہ کھایا تب تک نہ مانا اور امام کے قول کو حجت نہ سمجھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ زرارہ امام باقر علیہ السلام کی امامت کا معتقد نہ تھا۔ چنانچہ سابق میں مذکور ہو چکا کہ اصحاب ائمہ ائمہ کی عصمت کا اعتقاد نہیں رکھتے تھے اور جو معصوم نہیں وہ امام بھی نہیں۔

---

[1] اصول کافی صـ۵۵۶　[2] جلد ثانی صافی کتاب الایمان والکفر۔

ملا باقر مجلسی نے بھی حق الیقین میں یہ قول نقل کیا ہے کہ جو اصحاب ائمہ منکرِ عصمتِ ائمہ تھے اُن میں زرارہ اور ابو بصیر بھی شامل تھے۔ چنانچہ عبارت حق الیقین[1] کی یہ ہے:-

"در باب جماعتے وارد شدہ است کہ اجماع صحابہ بر ضلالتِ ایشاں شدہ است مثل زرارہ و ابوبصیر۔"

اس تحقیق سے ظاہر ہو گیا کہ زرارہ اور ابو بصیر کی ضلالت اجماعی ہے۔

یہ زرارہ اور ابو بصیر وہ شخص ہیں کہ شاید ایک ثلث حدیثیں کافی کی انھیں کی روایات سے ہیں اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ اصحاب ائمہ کی کیا حالت تھی اور احادیثِ شیعہ کے راوی کیسے ہیں یہی لوگ ہیں جنھوں نے مذہب شیعہ کو نقل کیا ہے۔

شیعوں نے اصحاب رسولؐ کو معاذ اللہ مرتد سمجھ لیا، ائمہ کی عادت ایسی فرض کر لی کہ وہ بغرض مصلحت جھوٹ بولا کرتے تھے، جھوٹے مسئلے بیان کیا کرتے تھے۔ اصحاب ائمہ کی یہ حالت تھی جو مذکور ہوئی۔ اب فرمائیے دینِ رسول حاصل ہونے کا کیا ذریعہ ہے؟۔

کیا عوام یہ سُن کر پریشان نہ ہوں گے کہ روایاتِ شیعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ کی یہ عادت تھی کہ عمداً جھوٹے مسئلے بغیر تقیہ کے بھی بیان کیا کرتے تھے۔ فروعِ کافی[2] میں سلمہ بن محرز سے روایت ہے:-

[1] حق الیقین ص۶۵۷ ۱۲ [2] فروع کافی کتاب المواریث ص۴۳ ۱۲

قال قلت لابی عبد اللہ علیہ السلام ان رجلا ارمانیا مات واوصی الیّ بترکتہ فقال لی وما الارمانی قلت نبطی من انباط الجبال مات واوصی الی بترکتہ وترک ابنتہ قال فقال لی اعطہا النصف قال فاخبرت زرارۃ بذلک فقال لی اتقاک انما المال لہا قال فدخلت علیہ بعد فقلت اصلحک اللہ ان اصحابنا زعموا انک اتقیتنی فقال واللہ ما اتقیتک ولکنی اتقیت علیک ان تضمن فہل علم بذلک احد قلت لا قال فاعطہا ما بقی۔

وہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ ایک شخص ارمانی مر گیا اور اُس نے اپنے مال متروکہ کا وصی مجھے بنایا تھا۔ امام نے پوچھا ارمانی کسے کہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ایک پہاڑی قوم ہے اُن میں سے ایک شخص مر گیا اور مجھے اپنے ترکہ کا وصی بنا گیا اور اپنی ایک بیٹی چھوڑی۔ راوی کہتا ہے کہ امام نے مجھ سے کہا کہ اُس بیٹی کو نصف مال دیدے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے زرارہ کو اس کی خبر کی تو اُس نے مجھ سے کہا کہ امام نے تجھ سے تقیہ کیا صحیح یہی ہے کہ سب مال بیٹی کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد پھر میں امام کے پاس گیا اور میں نے کہا کہ اللہ تیری اصلاح کرے بے شک ہمارے اصحاب گمان کرتے ہیں کہ تو نے مجھ سے تقیہ کیا۔ امام نے فرمایا کہ واللہ میں نے تجھ سے تقیہ نہیں کیا اور لیکن میں نے تجھ کو بچایا تھا کہ کہیں تجھ پر تاوان نہ پڑے کیا اس کی کسی کو خبر ہو گئی ہے؟ میں نے کہا

نہیں۔ امام نے کہا کہ بیٹی کو دیدے جو باقی ہو۔

اسی مضمون کی ایک اور روایت اسی کتاب میں عبد اللہ بن محرز سے ہے:-

قال سالت ابا عبد اللہ علیہ السلام عن رجل اوصی الیّ وھلک وترک ابنۃ فقال اعط الابنۃ النصف واترک للموالی النصف فرجعت فقال اصحابنا لا واللہ ما للموالی شئ فرجعت الیہ من قال فقلت ان اصحابنا قالوا لیس للموالی شئ وانما اتقاک فقال لا واللہ ما اتقیتک ولکن خفت علیک ان توخذ بالنصف فان کنت لا تخاف فادّ النصف الاخری ابنۃ فان اللہ سیودّی عنک

وہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ ایک شخص نے اپنے مال کا مجھ کو وصی بنایا اور وہ مر گیا اور اُس نے اپنی بیٹی چھوڑی تو امام نے فرمایا کہ بیٹی کو آدھا مال دیدے اور غلاموں کے لیے آدھا چھوڑدے جب میں وہاں سے آیا تو ہمارے اصحاب نے کہا کہ واللہ غلاموں کا کچھ بھی حصہ نہیں۔ پھر میں سال آیندہ میں امام کے پاس گیا اور میں نے کہا کہ ہمارے اصحاب یہ کہتے ہیں کہ غلاموں کا کچھ بھی حصہ نہیں اور بے شک امام نے تجھ سے تقیہ کیا۔ تو امام نے فرمایا کہ واللہ میں نے تجھ سے تقیہ نہیں کیا اور لیکن میں نے تجھ پر خوف کیا کہ کہیں تجھ سے نصف کا مواخذہ نہ ہو پس اگر تجھ کو خوف نہ ہو تو دوسرا نصف بھی اس کی بیٹی کو دیدے پس بے شک اللہ تجھ سے ادا کرا دے گا۔

صحیح مسئلہ یہ ہے کہ جب بیٹی کے سوا اور کوئی وارث نہیں ہے تو سب مال بیٹی کو ملے گا۔ غلاموں کو میراث میں کچھ نہیں ملتا۔ مگر امام نے یوں بتا دیا کہ بیٹی کو آدھا مال دے اور باقی غلاموں کے واسطے رکھ۔ یہ حکم سراسر غلط اور باطل تھا آخر زرارہ وغیرہ نے امام کی غلطی پکڑی اور سال آیندہ میں جب وہ سائل پھر امام کے پاس گیا اور یہ سارا قصہ بیان کیا تب امام کو اپنی غلطی پر تنبیہ ہوئی اور یہ بھی خیال آیا کہ سب میں رسوائی ہو گی اس لیے یہ بھی پوچھا کہ کسی کو اس مسئلے کی خبر تو نہیں ہوئی۔ سال بھر تک سائل غلطی میں پڑا رہا بڑی خیر ہوئی کہ امام کے قول پر عمل نہیں کیا ورنہ غلاموں کو آدھا مال دے دیتا اور وہ خورد بُرد کر جاتے تو کیسی حق تلفی ہوتی۔ یہاں تو تقیہ کا احتمال بھی نہیں کہ سب مسلمانوں کا مذہب یہی ہے کہ ایسی صورت میں کُل مال بیٹی کو ملتا ہے۔ اس وقت خلفا کے فیصلے بھی اسی کے مطابق ہوتے تھے۔ پھر امام کو سچا مسئلہ بتانے میں جان کا خوف کیا تھا جو تقیہ کرتے۔

قطع نظر اس کے امام نے قسم کھا کر کہا کہ میں نے تجھ سے تقیہ نہیں کیا۔ اس کے سوا جعفر صادق علیہ السلام کے عہد نامہ میں تقیہ کی ممانعت تھی۔ اس سب کے علاوہ پوچھنے والا شیعہ خالص مخلص تھا اُس سے تقیہ کیوں کرتے۔

اب حضرات شیعہ فرمائیں کہ کیا انھیں ائمہ کی اطاعت واجب تھی جن کو ایسے مشہور مسئلے بھی معلوم نہ تھے۔ جب امام کو اپنی غلطی پر تنبیہ ہوئی تو رفع ندامت کے واسطے سائل کے سامنے یوں تاویل کی کہ میں نے جھوٹ مسئلہ اس لیے بتا دیا تھا کہ کہیں غلام تجھ سے جھگڑا نہ کریں اور تجھ پر تاوان نہ پڑے

یہ کیسی غلط تاویل تھی۔ جب غلاموں کا کچھ حق نہیں تو پھر وہ کس بنا پر جھگڑا کر سکتے۔ بالفرض یہ بھی خیال نہ ہوتا تب بھی امام کو جھوٹا مسئلہ بتانا جائز نہ تھا۔ اور غلاموں کا شر دفع کرنے کے لیے حکام کی عدالتیں موجود تھیں۔

زرارہ اگر امام جعفر صادق علیہ السلام کو امام جانتا تو اس طرح ان کی غلطی پکڑ کے اُن کو رسوا نہ کرتا بلکہ ان کے جھوٹے فتوے کو بھی سچا جان لیتا۔ اس اعتراض میں زرارہ کے ساتھ اور بھی اصحاب ائمہ شریک ہوئے۔ اس سے اسی قول کی تائید ہوتی ہے کہ اصحابِ ائمہ ائمہ کو معصوم نہیں جانتے تھے۔ بالفرض اگر ان معترضین کو امام کے تقیہ کا احتمال ہوا تھا تو تقیہ کے راز کو فاش کیوں کیا۔ یہ راز فاش کرنا ایسا گناہ تھا جیسے امام کو عمداً قتل کرنا۔ بہرحال زرارہ اور دیگر اصحاب ائمہ جنھوں نے امام کی غلطی پکڑی یا منکر امام تھے یا امام کے ایسے دشمن تھے جیسے قاتل۔

عوام یہ سُن کر بھی حیران ہوں گے کہ ائمہ اپنی امامت کا فقط ممبرانِ کمیٹی سبائیہ کے سامنے اقرار کیا کرتے تھے ان کے سوا اوروں کے سامنے انکار کرتے تھے۔ چنانچہ مجالس المومنین[1] میں لکھا ہے:—

"در کتاب مختار از سعید منقول است کہ گفت روزے در خدمتِ امام جعفر علیہ السلام بودم کہ دو کس در مجلس اذن دخول طلبیدند و آنحضرت ایشاں را اذن کرد۔ چوں نشستند یکے از ایشاں از اہل مجلس پرسید کہ آیا در شما امام مفترض الطاعۃ ہست؟

[1] مجالس المومنین مطبوعہ طہران ص ۱۲۶ مجلس پنجم ذکر سعید۔

آں حضرت فرمودند کہ چنیں کسے در میان خود نمی شناسم او گفت در کوفہ قومے ہستند کہ زعم ایشاں آنست کہ در میان شما امام مفترض الطاعۃ موجود است و ایشاں دروغ نمی گویند زیرا کہ صاحب ورع و اجتہاد اند و از جملہ ایشاں عبداللہ بن ابی یعفور و فلاں فلاں اند۔ پس آں حضرت فرمودند کہ من ایشاں بایں اعتقاد امر نہ کردہ ام گناہِ من در آں چیست و مقارن ایں گفتار بر رخسار مبارک او آثار احمرار[1] غضب بسیار ظاہر شد و چوں آں دو کس اور ا در غضب دیدند از مجلس برخاستند و چوں از مجلس بدر رفتند، آں حضرت باصحاب خود فرمود کہ آیا می شناسید ایں دو مرد را گفتند بلے ایشاں از زیدیہ اند گماں آں دارند کہ شمشیر حضرت رسولؐ نزد عبداللہ بن الحسن ہست پس آں حضرت فرمود کہ دروغ گفتہ اند و سہ بار بر ایشاں لعنت فرستاد۔"

یہ عبارت ہم نے بقدرِ ضرورت نقل کی۔ اس کے بعد یہ ہے کہ جب وہ دونوں سائل چلے گئے تو امام نے اپنی امامت کی نشانیوں کا ذکر شروع کیا۔ اب یہ فرمائیے کہ امام نے ان دونوں پر کیوں لعنت کی؟ وہ محض بے قصور تھے۔ اور امام مفترض الطاعۃ کی خبر سُن کر کوفے سے امام کی تلاش میں آئے تھے۔ امام نے خود اپنی امامت سے انکار کر دیا۔ اب ان کی کیا خطا ہے اگر قیامت کے دن اُن سے یہ سوال ہوا کہ تم اپنے زمانہ کے امام پر ایمان

[1] احمرار بمعنی سرخی۔ مراد یہ ہے کہ غصہ میں امام کا چہرہ سرخ ہو گیا ۱۲

کیوں نہ لائے تو اُن کے پاس معقول جواب موجود ہے کہ امام صاحب نے خود اپنی امامت سے انکار کیا تھا۔ ایسی امامت کا کیا اعتبار جس کا کسی کے سامنے اقرار اور کسی کے سامنے انکار۔

امام نے صاف کہہ دیا کہ نہ مجھ کو امام مفترض الطاعت کی خبر نہ میں نے عبد اللہ بن ابی یعفور وغیرہ اہل کوفہ کو یہ حکم کیا کہ مجھ کو امام مفترض الطاعت سمجھیں اگر وہ اپنی طرف سے کہتے ہیں تو اس میں میرا کیا گناہ ہے۔

اب فرمائیے کہ یہ قول امام کا سچ تھا یا جھوٹ۔ امام کو تو یہ خبر سُن کر ایسا غصہ آیا کہ ان کا منہ سُرخ ہوگیا۔ یہ غصہ عبد اللہ بن ابی یعفور وغیرہ پر تھا جنھوں نے اپنی طرف سے امام جعفر صادق علیہ السلام کو امام مفترض الطاعت بتایا تھا۔

یہ حدیث اصول کافی میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ جو مضمون ہم لکھ چکے ہیں اس کے بعد کا حصہ جو کافی میں موجود ہے حاصل اُس کا یہ ہے کہ امام نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار ہمارے پاس ہے۔ عبد اللہ بن حسن نے بلکہ اُس کے باپ نے بھی کبھی اُس کو نہ دیکھا ہوگا۔ اگر وہ دونوں سچے ہیں تو اس تلوار کی علامتیں بتا دیں۔ پھر امام نے فرمایا کہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زرہ اور خود اور مغفر اور علم ہے اور ہمارے پاس الواح موسیٰ اور عصاء موسیٰ اور خاتم سلیمان ہے اور ہمارے پاس وہ اسم اعظم ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان کر دیتے تھے تو مشرکوں کا تیر مسلمانوں تک نہیں پہنچتا تھا

اور ہتیار ہم میں امامت کی نشانی ہے جس کے پاس ہتیار ہیں وہی امام ہے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ امام نے اپنے امام مفترض الطاعت ہونے کا انکار کیا اور آخر میں مطلق امامت کا اقرار کیا جس کے معنی فقط پیشوا کے ہیں اور ایسی امامت اُن میں سُنّیوں کو بھی تسلیم ہے۔ پس ان دونوں قولوں میں تناقض نہیں۔ اور اگر اخیر قول کے یہ معنی سمجھے جاویں کہ آخر میں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے آپ کو امام مفترض الطاعت بتایا تو اس سے لازم آوے گا پہلے جو امام نے انکار کیا تھا وہ صریح جھوٹ بولا تھا جو بڑے شرم کی بات ہے۔

افسوس کہ حضرات شیعہ امام کے قول کو جھوٹا سمجھنے پر بڑے دلیر ہیں کچھ بھی شرم نہیں کرتے اور باایں ہمہ اُن کو مفترض الطاعت بھی سمجھتے ہیں جس کا امام خود انکار کرتے ہیں۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کو تو تقیہ کرنا جائز ہی نہ تھا اس لیے کہ اللہ ان کو حکم کر چکا تھا کہ تم اللہ کے سوا کسی سے مت ڈرو اور تم حفاظت اور امان میں رہو گے۔ قطع نظر اس کے جب ان کے پاس انگشتری حضرت سلیمان علیہ السلام کی موجود تھی تو ہر شخص کو مسخر کر سکتے تھے ان کے پاس عصائے موسیٰ موجود تھا جو اژدہا بن کر سب دشمنوں کو نگل جاتا ان کے پاس اسم اعظم موجود تھا جس کی برکت سے کوئی آسیب نہ پہونچتا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کو بذریعہ نجوم و جفر وغیرہ (علوم ائمہ) کے یہ بھی معلوم تھا کہ ان دونوں شخصوں سے اُن کو کوئی مضرت نہ پہنچے گی پھر امام کو کیا خوف تھا اور کیوں جھوٹ بولتے۔

اگر امام ان آثارِ انبیاء سے کچھ کام نہیں لے سکتے تھے تو بے کار یہ چیزیں اُن کو کیوں دی گئی تھیں اور جب وہ ڈر کے مارے جھوٹ بولتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہتیار اُن کو کیوں ملے تھے؟ ؎

چوں تقیہ شعارِ ایشاں بود
بہرِ ائمہ سلاحِ جنگ چہ سُود

اور جب امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے مفترض الطاعت ہونے سے انکار کر دیا اور یہ بھی فرما دیا کہ میں نے کسی کو یہ حکم نہیں کیا تو مذہب شیعہ بالکل باطل ہو گیا اب شیعے امام جعفر صادق علیہ السلام کو اس قول میں جھوٹا بنا کر ان کو امام مفترض الطاعت بناتے ہیں۔

اب اگر یہی فرض کیا جائے کہ امام نے بہ لحاظِ مصلحت جھوٹ بولا تھا تو عبداللہ بن ابی یعفور وغیرہ اصحاب امام نے جو کوفہ میں امام کے اس راز کو فاش کیا وہ نافرمان اور مرتکب گناہ اور قاتلِ امام تھے۔

یہیں سے سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ لوگ کس طرح امام پر افترا کیا کرتے تھے اور امام کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ اس روایت کے اول کے انکاری حصہ کے ساتھ آخر کا اقراری حصہ اس لیے تصنیف کیا گیا کہ پہلا حصہ مصلحتی جھوٹ بن جاوے۔

تعجب ہے کہ عصائے موسیٰ نے معرکۂ کربلا میں جناب امام حسین علیہ السلام کو کچھ کام نہ دیا کہ اژدہا بن کر دشمن کی تمام فوج کو نگل جاتا۔ نہ خاتم سلیمان نے دشمنوں کی تمام فوج کو مسخر بنایا اور اس سے بھی اسی مضمون کی تائید ہوتی ہے

جو پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ جناب امام حسین نے باوجود قدرت کے بچاؤ کے طریقے اختیار نہ کیے اور قصداً اس معرکہ میں موت قبول کی۔

موسیٰ کے عصا کا تھا فقط نام تو بے کار
خاتم بھی سلیماں کی نہ دے کام تو بے کار
جب خوف یہ غالب تھا کہ کہہ سکتے نہ تھے حق
پھر گھر میں پیمبرؐ کی تھی صمصام تو بے کار

اب حضرات شیعہ انصاف فرمائیں کہ یہ کیسے امام مفترض الطاعت تھے کہ علانیہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔ مکہ میں مشرکین کا کیسا غلبہ تھا مگر کبھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین کے خوف سے بتوں کی تعریف نہیں کی، شرک کو جائز نہیں کہا، اپنی رسالت سے انکار نہیں کیا۔ پھر ائمہ نے علانیہ جھوٹے حکم دینے کا طریقہ کیوں اختیار کیا، کبھی حرام جانور کو حلال کہہ دیا، کبھی بیٹی کی میراث کا مسئلہ غلط بتا دیا۔ حالانکہ اس مسئلہ میں تقیہ بھی نہ تھا محض بے علمی تھی کبھی اپنی امامت سے صاف انکار کر دیا۔ عام مجلسوں میں ہمیشہ سُنّی بنے رہے۔ اپنے مخلصین شیعہ میں بھی اختلاف ڈالتے رہے اور ایک سوال اگر تین آدمیوں نے پوچھا تو ہر ایک کو جُدا جواب دیا۔

جب بزعمِ شیعہ بعد رسولؐ کے دین رسول کا مدار ہر زمانے میں ایک امام پر ٹھیرا اور ائمہ کی یہ حالت تھی تو اب فرمائیے کہ ائمہ کا کون سا قول سچا مانا جاوے۔

ائمہ کو اللہ نے اس لیے امام مقرر کیا تھا کہ بندے ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ پس ضرور ہے کہ اللہ ان کی اتنی حفاظت کرے کہ احکام باطلہ اُن کی زبان پر جاری نہ ہوں اس لیے کہ احکام باطلہ کا ان کی زبان پر جاری

ہونا اللہ کی اُس غرض کے منافی ہے جس غرض سے اُن کو امام مفترض الطاعت مقرر کیا ہے۔ ملائے مجلسی نے حیات القلوب میں فرمایا ہے:-

"چوں غرض از بعثت ایشاں این ست کہ مردم اطاعت نمایند و ہرچہ از اوامر و نواہی الٰہی بایشاں فرمایند امتثال کنند اگر معصوم و یا محفوظ نگر دانند ایشاں را منافی غرض از بعثت خواہد بود۔ و بر حکیم روا نیست کہ فعلے کند منافی غرض او باشد۔" (حیات القلوب جلد اول ص۱)

قرآن میں اللہ نے صاف فرمادیا ہے فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي یعنی اُن سے مت ڈرو مجھ سے ڈرو۔ اور نیز اللہ نے فرمایا فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ○ یعنی اگر تم مومن ہو تو اُن سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ اور نیز اللہ کا حکم پہنچانے والوں کی صفت قرآن میں یہ مذکور ہے:- وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللّٰهَ یعنی اللہ سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ جو لوگ امامت کا دعویٰ کریں اور آدمیوں سے ڈر کر اللہ کے حکم جھوٹے بیان کریں وہ ہرگز اللہ کا حکم پہنچانے والے نہیں۔

شیعے کہتے ہیں کہ یہ آیتیں متروک العمل ہیں اس لیے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر عمل نہیں کیا اور مشرکین سے ڈر کر غار میں جان چھپائی۔

مگر اس کا جواب یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ انھیں کے مطابق عمل کیا اور مشرکین سے کبھی خوف نہ کیا ہمیشہ ان کے سامنے شرک اور بتوں کی بُرائی صاف صاف بیان کرتے رہے کبھی ان سے ڈر کر کوئی حکم

خلافِ حق بیان نہیں کیا اور غار میں تشریف لے جانا خوف کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اس وجہ سے تھا کہ اُس وقت تک جہاد کی اجازت نہ تھی۔

البتہ موافق روایاتِ شیعہ ائمہ نے ان آیتوں کے خلاف عمل کیا اس لیے کہ مخالفوں سے ڈر کر علانیہ جھوٹے مسئلے بیان کرتے تھے اور عام مجلسوں میں اپنے آپ کو سُنی کہتے تھے۔ خلفاء کی تعریف کرتے تھے۔ اللہ پر اُن کو کچھ بھی توکل نہ تھا۔

اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرنے کا حکم اگرچہ قرآن میں بھی موجود تھا مگر ائمہ کے واسطے بالتخصیص بھی عہد ناموں میں یہی حکم نازل ہوا جن میں امام باقر اور امام جعفر علیہما السلام سے خاص خطاب تھا مگر پھر بھی اُن کا خوف زائل نہ ہوا اور ڈر کے مارے جھوٹے مسئلے علانیہ بیان کرتے رہے۔ انبیاء سابقین نے کیسی کیسی ایذائیں اٹھائیں مگر کلمۂ حق سے کبھی تجاوز نہیں کیا۔ ائمہ تو شیعوں کے اعتقاد میں انبیاء سابقین سے بھی افضل ہیں پھر انہوں نے جھوٹے مسئلے کیوں بیان کیے۔

جب کہ اللہ نے قرآن میں یہ حکم دیا ہے کہ میرے سوا کسی سے نہ ڈرو تو اُس کے ساتھ یہ بھی خبر دی ہے کہ اللہ کی یہ عادت ہے کہ صالحین کا مددگار اور کارساز ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:- وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِينَ اور اللہ کارساز ہوتا ہے صالحین کا۔ پھر ائمہ کو اس وعدہ پر اعتماد کیوں نہ تھا۔ اور جھوٹے مسئلے کیوں بیان کرتے تھے۔

جناب سیدہ علیہا السلام نے باوجود عورت ہونے کے اتنا بھی

خوف نہ کیا کہ دعویٰ فدک سے دست بردار ہوں بلکہ اتنی جرأت کی کہ گھر سے نکل کر عمرؓ سے ہاتھا پائی کی (معاذ اللہ) اور ائمہ پر باوجود مرد ہونے کے ایسی ہیبت چھائی کہ ڈر کے مارے جھوٹے حکم بیان کرنے لگے۔

جناب امام حسین علیہ السلام نے قتل ہونا گوارا کیا مگر تقیہ نہ کیا۔ یہ جرأت باقی ائمہ کو کیوں نہ نصیب ہوئی۔ حال آنکہ ائمہ اگر دعا کرتے تو ضرور مقبول ہوتی مگر تعجب ہے کہ ائمہ نے اپنے خوف دور ہونے کی دعا بھی نہ مانگی عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمان جو اُن کے پاس تھی اُس سے بھی کام نہ لیا۔ رسولؐ کے ہتیاروں کو معطل کیا اور گھر میں چھپا کر رکھ چھوڑے اُن سے کام لینے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اُن کو اپنی موت کا وقت بھی معلوم تھا، مرنا اپنے اختیار میں تھا جو حوادث اُن پر واقع ہونے والے تھے وہ بھی پہلے سے معلوم تھے پھر کیا خوف تھا۔ چنانچہ اصول کافی میں ایک باب اسی بیان میں باندھا گیا ہے :۔

بابٌ ان الائمۃ علیہم السلام	باب اس بیان میں کہ ائمہ علیہم السلام
یعلمون متی یموتون وانہم	جانتے ہیں کہ کب مریں گے اور وہ نہیں
لایموتون الا باختیارھم	مرتے مگر اپنے اختیار سے۔

(اصول کافی ص ۱۵۸)

جن لوگوں کو اپنی موت کا وقت معلوم نہ ہو وہ تو موت کے خوف سے ڈرتے ہیں۔ ائمہ کو تو اپنی موت کا وقت معلوم تھا اُس سے پہلے ہرگز اُن کو

ت کا خوف نہیں ہو سکتا تھا پھر کیوں ڈرتے تھے اور جھوٹے مسئلے کیوں بیان تے تھے؟۔

ائمہ پر جتنے حوادث آنے والے ہوتے ہیں وہ سب اُن کو پہلے سے علوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ اصول کافی میں ہے :۔

عن ابی بصیر قال ابو	ابوبصیر سے روایت ہے وہ کہتا ہے
عبد اللہ علیہ السلام	کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا
ای امام لا یعلم ما یصیبہ	کہ جس امام کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کو کیا پہنچنے
والی ما یصیر فلیس ذلک	والا ہے اور اس کی کیا حالت ہونے
بحجۃ اللہ علی خلقہ۔	والی ہے وہ مخلوق میں اللہ کی حجت
(اصول کافی ص ۱۵۸)	نہیں۔

پس ہر ہر امام کو اپنے حوادث پہلے ہی سے معلوم تھے اُس سے زیادہ کوئی آفت اُن پر نہیں آسکتی۔ پھر جھوٹے فتوے کیوں دیتے تھے۔

اب اگر یہ بھی فرض کرو کہ ان کو اپنی جان کا خوف تھا اس لیے جھوٹے مسئلے بیان کرتے تھے۔ تو بھی تعجب ہے کہ اُنہوں نے یہ نہ خیال کیا کہ اگر حق کہنے پر مارے جائیں گے تو شہیدِ اکبر ہوں گے۔ پھر ایسی موت سے کیوں بھاگتے تھے۔ اگر اپنی زندگی اس لیے عزیز تھی کہ ہدایت کا کام ان سے متعلق تھا تو یہ بھی معلوم تھا کہ زمانہ امام سے خالی نہیں رہتا۔ اُن کے مرتے ہی اُن کا جانشین قائم ہو جائے گا ظاہری قوت بھی ان کو ایسی تھی کہ پوری فوج تیار کر سکتے تھے اس لیے کہ بہت سے مسلمان اہل بیت کی مدد پر آمادہ تھے۔ بڑی دلیل اس کی

یہ ہے کہ سادات نے جب کبھی خروج کیا ایک بھاری فوج ان کے ساتھ ہوتی تھی شکست کی وجہ تو سوء تدبیری تھی اگر ائمہ بذاتِ خود جہاد کا انتظام کرتے تو غالباً فتح پاتے اور چونکہ خاندانِ سادات میں ائمہ سب میں افضل سمجھے جاتے تھے اگر یہ خروج کرتے تو اُن کے ساتھ جمعیت بھی زیادہ ہوتی۔ اکثر لوگ لشکر زید شہید کے اس لیے بھاگ گئے کہ امام ساتھ نہ تھے۔ انھیں کے بھاگنے سے اوروں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ یہی وجہ شکست کی ہوئی۔ چنانچہ مجالس[1] المومنین میں سلیمان بن خالد کے بھاگنے کی وجہ یہی لکھی ہے

امام زین العابدین علیہ السلام پر خوف وہراس ایسا غالب ہوا کہ باپ کی غیرت کو بھول گئے اور یزید کے سامنے نہایت عاجزی کے ساتھ غلامی کا اقرار کیا مگر جب ان کے مخلصین شیعہ میں سے مختار نے کامل غلبہ پایا اور خونِ حسین کا پورا انتقام لیا اور کئی برس تک بہت بڑے ملک پر مسلط رہا اس وقت بھی امام سے یہ نہ ہو سکا کہ مختار کو ساتھ لے کر بذاتِ خود جہاد کا انتظام کرتے۔ مجالس[2] المومنین میں لکھا ہے :۔

"مختار بن ابی عبید الثقفی رحمۃ اللہ تعالیٰ علامہ حلی اورا از جملہ مقبولاں شمردہ۔"

جناب امیر علیہ السلام نے خلافت کا چھن جانا جناب سیدہ علیہا السلام کا گھر سے باہر نکل کر عمرؓ سے ہاتھا پائی کرنا اور آخر کو قتل ہونا فدک کا چھن جانا اُم کلثوم کا غصب ہو جانا، اپنی گردن میں رسّی بندھوا کر کھنچنا وغیرہ

---

[1] مجالس المومنین مطبوعہ طہران ص ۱۵۰ ۱۲ [2] ایضاً ص ۵۲ ۱۲

وغیرہ گوارا کیا اور ان ناگوار تلخیوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئے۔ مگر جہاد پر کمر باندھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ حالانکہ عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمانؑ اور لشکر جنات اور اختیار اظہار معجزات کے علاوہ شجاعتِ ذاتی اور تمام جوانان بنی ہاشم اور قبیلۂ بنو حنیف جاں نثاری کے لیے موجود تھے۔ مجالس المومنین میں لکھا ہے :۔

"بنو حنیف طائفہ از عرب بادیہ اند کہ در زمان حضرت رسالت پناہ مسلمان شدند و رئیس آں قوم مالک بن نویرہ بود کہ از ارادف ملوک و شجاعان روزگار بود و شرف صحبت حضرت رسالت پناہ دریافتہ بود و ہمگی ایشاں از جملہ محبان اہل البیت بود۔" (مجالس المومنین مطبوعۂ طہران ص ۵۲)

اس کے بعد مجالس المومنین میں یہ قصہ لکھا ہے کہ مالک بن نویرہ ابوبکرؓ کے خلیفہ ہو جانے کی خبر سُن کر مدینہ میں آیا اور مسجد میں جاکر ابوبکرؓ سے لڑا اور نص امامت جناب امیر کو یاد دلائی اور دونوں طرف سے سخت کلامی واقع ہوئی۔ پھر ایک جماعت نے للکاری کرکے مالک کو نکال دیا اور اس کے بعد ابوبکرؓ نے خالدؓ کو فوج جرار کے ساتھ مالک سے لڑنے کے لیے بھیجا۔

اگر جناب امیر اس قوم کو ساتھ لے کر جہاد کرتے تو اچھی خاصی فوج ان کے واسطے موجود تھی۔ غضب تو یہ ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کی حمایت کی وجہ سے جب مسجد میں مالک کی للکاری ہوئی اُس وقت بھی جناب امیر نے مالک کی ذرا بھی مدد نہ کی اور جب خلیفۂ اول کی فوج غضب الٰہی کی طرح قوم بنو حنیف پر پہنچی اُس وقت بھی جناب امیر نہایت رضامندی کے ساتھ

یہ تماشا دیکھتے رہے اور اپنے جاں نثاروں کی ذرا بھی معاونت نہ کی۔ و
اگر اُس قوم کو حُسنِ تدبیر کے ساتھ لڑاتے تو کیا عجب تھا کہ فتح پاتے جس طرح رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں فقط ایک جناب امیر کی جنگ سے بڑے بڑے
معرکہ فتح ہو گئے کیا تعجب تھا کہ مالک کی فوج میں بھی جناب امیر کی شرکت وہی
جلوہ دکھا دیتی۔ بلکہ جناب امیر نے یہ کیا کہ جب اس قوم کے قیدی گرفتار ہو
آئے تو اُن میں سے ایک باندی خولہ اپنے حرم سرا میں داخل کر لی جو محمد بن
حنفیہ کی ماں ہے۔ اس الزام کو مٹانے کے لیے شیعوں نے عجیب عجیب روایتیں
تصنیف کر لی ہیں۔

اس کے علاوہ اگر جناب امیر کوشش کرتے تو تمام انصار کو اپنے
ساتھ کر لیتے اس لیے کہ انصار کے قبیلہ خزرج کا سردار سعد بن عبادہ جناب
امیر کی امامت کا معتقد تھا اور نصِ رسولؐ کے خلاف عمل کرنا نہیں چاہتا تھا
اسی وجہ سے خلافت اُس نے قبول نہ کی۔ مجالس[1] المومنین میں لکھا ہے :۔

"شیخ فاضل حسن بن علی بن محمد الطبری درکتاب کامل بہائی کہ آں را بنام
صاحب اعظم خواجہ بہاء الدین جوینی نوشتہ ذکر نمودہ کہ سعد بن عبادہ
رئیس قبیلہ خزرج واز نقبائے انصار بود چوں مردم در بیعت ابوبکر
شروع کردند انصار گفتند چوں ترک نصِ خدا ورسول کردید و
اتباع ہوا می کنید یکے از دیگرے اولیٰ نیست ماکہ انصاریم سعد بن
عبادہ را رئیس وخلیفہ خویش می کنیم۔ سعد چوں ایں سخن شنید گفت

---

[1] مجالس المومنین مطبوعہ طہران ص ۱۰۱ ۱۲

من دین خدا را بدنیا نمی فروشم وخدا ورسول را خصم خود نکنم وایں کار قبول
نکنم تا میانِ من ودیگراں پیشِ خدائے تعالیٰ فرقے باشد۔ سعد چنیں گفت
کار ابوبکر قوتے گرفت ومردم میل برآں طرف کردند واز سعد بیعت
طلب نمودند[1] اباکرد وگفت ایں دروغ بخود نخواستم بدیگرے ہم نخواہم
واز برائے خاطر دیگراں بہ دوزخ نروم وسعد برابوبکر بیعت نہ کرد و
بزبان عمر الحاح کرد او قبول نہ کرد واز قوت وکثرت قوم وے با وے
اکراہے نتوانستند کرد و زہرہ اجبار او نداشتند لاجرم با وے بظاہر
می ساختند ودر تحصیل بیعت او میلہا می پرداختند تا آنکہ قیس پسر سعد
روزے عمر را نصیحت کرد وگفت نصیحت من قبول کن واز شفقت
بشنو کہ سعد سوگند یاد کردہ کہ بر شما بیعت نہ کند واز و بجبر بیعت نتواں
گرفت الا بعد از قتل وے وقتل وے منوط است بقتل جملہ خزرج
وقتل خزرج منوط است بقتل اوس وقتل اوس منوط است
بقتل جملہ بطون یمن وایں مقدور شما نباشد وپیش از وسع شماست"

پس اگر جناب امیر عزم جہاد کرتے تو سعد بن عبادہ ضرور ان کے ساتھ
ہوتے اور سعد کی وہ قوت تھی کہ خلفاء باوجود اپنی شان وشوکت کے سعد پر غالب
نہیں ہو سکتے تھے۔ تمام انصار سعد کے ساتھ ہو کر جناب امیر کے شریک ہو جاتے
ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ جناب امیر کے شریک تھے۔
جیسے خالدؓ بن سعیدؓ، مقدادؓ، ابوذرؓ، سلمانؓ، بریدہ اسلمیؓ، عمارؓ، ابوالہیثمؓ بن تیہانؓ

---

[1] ابا بمعنی انکار ۱۲

عثمانؓ[12] بن حنیفؓ، خزیمہؓ[9] بن ثابتؓ، ابیؓ[10] بن کعبؓ، ابو ایوبؓ[11] انصاری، بلالؓ[12]، اسامہ[13] بن زیدؓ، عباسؓ[14] مع تمام بنی ہاشم کے جن میں عباسؓ کے چاروں بیٹے اور جعفرؓ اور حمزہؓ کی اولاد اور عقیلؓ اور ان کی اولاد وغیرہ شامل تھی۔ قنبرؓ اور جناب امیر کے چند غلام جناب امیر کے ساتھ تھے اور ان میں سے ہر ہر شخص کے ساتھ دو چار آدمی تابعین میں سے بھی تھے۔ بنی ہاشم کے غلاموں کی بہت بڑی جماعت تھی۔ ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب میں لکھا ہے کہ بارہ ہزار صحابی ایسے تھے جو محب اہل بیت اور خاص مخلص تھے۔ عبارت اس کی یہ ہے :—

"(ابن بابویہ) بہ سند حسن از حضرت صادق روایت کردہ است کہ اصحاب رسول خدا دوازدہ ہزار نفر بودند۔ ہشت ہزار نفر از مدینہ و دو ہزار از اہل مکہ و دو ہزار از رہا و آوازہ کردہا۔ و یکے از ایشاں قدری نبودند کہ بجبر قابل باشند۔ و مرجی نبودند کہ گویند ایماں ہمہ کس بیک قسم ست۔ و حروری نبودند کہ امیر المومنین را ناسزا گویند و معتزلی نبودند کہ گویند خدا را در عمل بندہ ہیچ دخل نیست و در دین خدا بہ رائے خود سخن نمی گفتند و در شب و روز گریہ می کردند و می گفتند خداوندا روح ہائے ما را قبض کن پیش از انکہ خبر شہادت حضرت امام حسین بشنویم" (حیات القلوب جلد دوم ص۵۸۸)

پس یہ بارہ ہزار آدمی حضرت علیؓ کے ساتھ تھے جن میں سے آٹھ ہزار خاص مدینہ میں موجود تھے۔ علمائے شیعہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان صحابہ کا نام اس وجہ سے معلوم نہیں کہ جن کتابوں میں ان کا ذکر تھا وہ کتابیں مفقود ہوگئیں چنانچہ

مجالس المومنین میں لکھا ہے :—

"متقدمین اصحاب مانند شیخ اعظم محمد بن علی بن الحسین بن بابویہ القمی کتابہا در ذکر رجال اخیار از صحابہ سید مختار نوشتہ اند اگرچہ فی الحال از آنہا اثرے نیست و بواسطہ سوختن و شستن مخالفاں خبرے نہ۔"

(مجالس المومنین مطبوعہ طہران ص۱۱)

یہ سب لوگ فقط اس وجہ سے مجبور ہوگئے کہ جناب امیر پر خلفاء کی ہیبت ایسی چھاگئی تھی کہ باوجود اتنی قدرت کے انھوں نے جہاد پر کمر نہ باندھی۔ گویا چست مدعی سست کا حساب ہوگیا۔

حال آنکہ جناب امیر میں ذاتی شجاعت ایسی تھی کہ وہ تنہا بڑی بڑی فوجوں پر غالب آتے تھے۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جناب امیر کو اپنے بستر پر سلا کر غار ثور میں تشریف لے گئے تو صبح کو تمام کفار قریش نے جمع ہو کر جناب امیر پر حملہ کیا اُس وقت تنہا جناب امیر نے لشکر کفار کو شکست دی اور غالب آئے۔ حیات القلوب میں لکھا ہے :—

"چوں صبح طالع شد کفار قریش ہمہ برخاستند و شمشیر ہا کشیدند و بر سر امیر المومنین دویدند و خالد بن ولید در پیش ایشاں بود۔ پس آں شیر خدا از جا برجست و در روبایشاں دوید و خالد را گرفت و دستش را پیچیدہ و او مانند شتر فریاد مے کرد پس شمشیر خالد را گرفت و در روبر ایشاں آورد و ہمہ گریختند و چوں ہمہ را بیروں کرد شناختند کہ امیر المومنین ست۔ گفتند ما را با تو کارے نیست۔ محمد کجاست؟ حضرت

فرمود کہ شما او را بمن سپردہ بودید شما خواستید کہ او را بیروں کنید
او خود بیروں رفت۔" (حیات القلوب صفحہ ۳۹)

جب کہ اکیلے جناب امیر نے تمام کفار مکہ کو عاجز کر دیا تو اس سے ظاہر ہے کہ اُن کو کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت نہ تھی وہ اگر تنہا بھی لڑتے تو خلفاء پر فتح پا لیتے۔ کفار نے حملہ اس وجہ سے کیا تھا کہ جناب امیر کو پہچانا نہ تھا، اگر جناب امیر اپنی ذات کو ظاہر کر دیتے تو کفار کا گروہ ہٹ جاتا، اُن سے کچھ سروکار نہ کرتا۔ جناب امیر نے بلا ضرورت جنگ کی حالانکہ اس وقت تک جہاد کی اجازت نہیں ہوئی تھی۔ اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر جنگ کے ہجرت کی ورنہ جناب امیر رسولؐ سے زیادہ بہادر نہ تھے رسولؐ کی موجودگی میں کبھی ان کو ایسی جنگ کرنے کا شوق نہ ہوا۔ جناب امیر نے غضب کیا کہ رسولؐ کے باہر چلے جانے کی صاف صاف خبر دیدی جبھی تو کفار نے بیرونِ مکہ رسولؐ کی تلاش شروع کی اس وقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے قریب غار میں موجود تھے۔ اگر جناب امیر ایسی تصریح سے خبر نہ دیتے تو شاید کفار کو یہ گمان ہوتا کہ رسولؐ اسی شہر میں کسی کے گھر ہوں گے باہر کی طرف ان کا خیال کم جاتا۔ اس قسم کی غلطیاں جناب امیر سے اکثر ہوتی تھیں یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے ساتھ نہ لیا اور سفر ہجرت میں رفاقت کے لیے ابوبکرؓ کو منتخب کیا۔ افسوس کہ جناب امیر کو بلا ضرورت تو جنگ ناجائز کا ایسا شوق اور ضرورت کے وقت خلفا کے مقابلہ میں ایسی گریز کہ بی بی جنگ کے لیے گھر سے باہر نکلے اور خود پردہ نشینی اختیار فرما دیں۔

غصب ام کلثوم کے وقت بھی کچھ حس و حرکت نہ کریں بلکہ غصب ام کلثوم کو اس وجہ سے غنیمت اور مصلحت سمجھیں کہ داماد بن جاوینگے تو ان کے بعد عمرؓ جبر نہ کریں گے۔ چنانچہ علامہ شوستری نے مجالس المومنین میں کتاب شافی مصنفہ سید مرتضیٰ سے ابوالحسن علی بن اسمٰعیل کا یہ قول نقل کیا ہے:

"پرسیدند کہ چرا آں حضرت دختر بہ عمر بن الخطاب داد، گفت بواسطہ آنکہ اظہار شہادتین می نمود بہ زبان و اقرار فضل حضرت امیر مے کرد و در آں باب اصلاح غلظت[1] و فظاظت او نیز منظور بود۔"

دیکھیے جناب امیر کی فطرت کہ عمرؓ کو داماد بنا کر راضی کر لیا حالانکہ جن عمرؓ سے جناب امیر ایسے مجبور تھے کہ اب اُن کو داماد بنانے کی ضرورت پڑی یہ وہی عمرؓ ہیں جو جناب امیر سے ایسا ڈرتے تھے کہ ان کی صورت دیکھ کر بدحواس ہو جاتے تھے۔ چنانچہ حیات القلوب[2] میں ہے:

"(علی بن ابراہیم) از ابو واثلہ روایت کردہ است کہ گفت روزے با عمر بن الخطاب براہے می رفتم ناگاہ اضطرابے در او یافتم و صدائے از سینۂ او شنیدم مانند کسیکہ از ترس مدہوش شود گفتم چہ شد ترا اے عمر گفت مگر نمی بینی شیر بیشۂ شجاعت را و معدن کرم و فتوت را و کشندۂ طاغیان و باغیاں را و زنندۂ شمشیر و علمدار صاحب تدبیر را چوں نظر کردم علی بن ابی طالب را دیدم گفتم

---

[1] غلظت بمعنی سختی و فظاظت بمعنی درشت خوی یعنی یہ بھی منظور تھا کہ داماد ہو جانے کی وجہ سے عمرؓ کی سختی اور درشت خوئی کی اصلاح ہو جاوے گی ۱۲ [2] حیات القلوب جلد دوم صفحہ ۳۴۷ ۱۲

اے عمر این علی بن ابی طالب است۔ گفت نزدیک من بیا تا شمہ از شجاعت و دلیری و بسالت او برائے تو بیان کنم۔ بدانکہ حضرت رسولؐ در روز اُحد از ما بیعت گرفت کہ نگریزیم و ہر کہ از ما بگریزد گمراہ باشد و ہر کہ کشتہ شود شہید باشد پیغمبر ضامن بہشت باشد برائے او۔ چوں بجنگ ایستادیم ناگاہ دیدیم کہ صد نفر از شجاعان و صنادید قریش رُو بما آوردند کہ ہر یک صد نفر یا بیشتر از دلیران باخود داشتند پس مارا از جائے خود کندند و ہمہ گریختیم و در آنجا علی را دیدیم کہ مانند شیر زیاں کہ بر کلہ موران حملہ کند بر مشرکاں حملہ مے کرد و از ایشاں پروانمی کرد چوں مارا دید کہ می گریزیم گفت قبیح و پارہ پارہ و بریدہ و خاک آلود باد رو ہائے شما۔ بکجا مے گریزید بسوئے جہنم می شتابید چوں دید کہ ما بر نمی گردیم بر ما حملہ کرد و شمشیر پہنے در دست داشت کہ مرگ ازاں می چکید و گفت بیعت کردید و بیعت را شکستید واللہ کہ شما سزاوار ترید بکشتہ شدن از آنہا کہ من می کشم چوں بدیدہا یش نظر کردیم مانند دو کاسہ روغن زیت کہ آتش درآں افروختہ باشند می درخشید و مانند دو قدح پُر خون از شدت غضب سُرخ شدہ بود من جزم کردم کہ ہمہ را بیک حملہ ہلاک خواہد کرد پس من از سائر گریختگاں بہ نزدیک او رفتم و گفتم ای ابوالحسن بخدا ترا سوگند می دہم کہ دست از ما بر داری زیرا کہ عرب کار شاں این ست گاہ می گریزند و گاہ حملہ می کنند گریختن را

بر طرف می کنند گویا از روئے من شرم کرد و دست از ما برداشت و بہ کافراں حملہ کرد و تا ایں ساعت ترس او از دل من بدر نرفتہ است و ہر گاہ کہ او را می بینم چنیں ہراساں مے شوم۔"

تعجب ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات پاتے ہی وہ ہیبت عمرؓ کے دل سے کیوں نکل گئی بلکہ جو حالت پہلے عمرؓ کی علیؓ کے سامنے ہوتی تھی اب وہ علیؓ کی عمرؓ کے سامنے ہونے لگی اور جناب امیر اس طرح آنکھیں لال پیلی بنا لینے کی تدبیر کیوں بھول گئے جس سے تمام صحابہ پر ہیبت بیٹھ جاتی اور جناب امیر کی خلافت کا کوئی مزاحم نہ ہوتا۔ یہ تو ایسی تدبیر تھی کہ بغیر جنگ کے کام بن جاتا مگر افسوس کہ جناب امیر کے دل پر ایسی ہیبت بیٹھ گئی تھی کہ ان کو اب اس طرح آنکھیں لال بنا لینے پر قدرت نہ رہی۔ دستور ہے کہ جب سپاہی کے اوسان بگڑ جاتے ہیں تو پھر اس سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور سارے حربے جو اس کے پاس ہیں بے کار ہو جاتے ہیں۔

اسی ہیبت زدگی کی حالت میں جب کبھی اپنی پُرانی شجاعت جناب امیر کو یاد آجاتی تھی تو حکم صبر کو فراموش کر کے لپٹ پڑتے تھے اور دشمن کو پچھاڑ لیتے تھے مگر پھر ضعفِ قلب کی وجہ سے ہیبت غالب آجاتی تھی اور حکم صبر کا یاد آجانا جنگ سے گریز کرنے کا حیلہ ہو جاتا تھا۔ اس وجہ سے بنا بنایا کام بگڑ جاتا تھا۔ چنانچہ ملائے مجلسی حق الیقین میں فرماتے ہیں:۔

"پس حضرت امیر المومنین بیتاب شد و بجست و گریبان عمر را گرفت و بزمین زد و گردنش را پیچید کہ آں را بکشد بخاطر آورد وصیتِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم را کہ او را امر بصبر و نہی از مقابلہ ایشاں فرمودہ بود دست برداشت۔"

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جتنی دیر تک جناب امیر عمرؓ سے کشتی لڑتے رہے اُتنی دیر حکم رسولؐ کی مخالفت کے مرتکب تھے شاید اس وقت عصمت زائل ہو گئی ہو گی۔

دوسری بار پھر بھی اتفاق ہوا چنانچہ حق الیقین میں ہے:-

"پس عمر برخاست کہ بر سلمان حملہ کند حضرت امیر المومنین برجست و گریبان آں را گرفت و او را بر زمین زد و گفت اے پسر صہاک حبشہ اگر نہ آں باشد کہ پیش نوشتہ شدہ و عہدے کہ از حضرت رسول پیشتر شدہ ہر آئنہ بتو مے نمودم کہ کیست کہ یاورش ضعیف تراست و عددش کمتر است۔"

اس مرتبہ بھی جناب امیر نے صبر چھوڑا اور حکم رسول کی مخالفت کی حالانکہ عہد یاد تھا پس اس وقت بھی صفت عصمت زائل ہو گئی تھی اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ جناب امیر ظاہری قوت اور عدد رفقا کی کثرت میں بھی اپنے آپ کو بمقابلہ خلفاء کے غالب سمجھتے تھے اور یہ خیال کہ جناب امیر کا کوئی یار و مددگار نہ تھا محض باطل ہے یہ بھی ظاہر ہے کہ صبر کا حکم ضعف اور بے کسی کی صورت میں تھا اور جب قوت حاصل ہو رفقا مدد کے لیے موجود ہوں تو ہرگز صبر کا حکم نہ تھا ورنہ حضرت علیؓ امیر شام کے مقابلہ میں بھی صبر کرتے۔ جناب امیر اگر خلفا کے مقابلے میں عہد صبر پر عمل کرتے تو بار بار کشتی

کیوں لڑتے اس لیے کہ عہد میں یہ بھی تھا کہ غصہ مت کیجیو۔ اصول کافی میں ہے۔[1]

علی الصبر منك علی كظم الغيظ۔	تیری طرف سے صبر چاہیے غصہ کے پی جانے میں۔

پس جب غصہ کرنا بھی منع تھا تو کشتی لڑنا بدرجۂ اولےٰ منع ہو گا۔

اگر روایات شیعہ پر نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہو گا کہ جناب امیر نے بڑی بڑی قوتیں اپنی خلفا کے مقابلے میں ظاہر کی ہیں۔ قطب الدین راوندی نے کتاب الخرائج والجرائح[2] میں لکھا ہے:-

ان ابا بكر امر خالد بن الوليد	ابوبکر نے خالد بن الولید کو یہ حکم کیا تھا کہ
ان يقتل عليا اذا سلم	جب علی فجر کی نماز جماعت سے پڑھ کر
من صلوة الفجر بالناس	سلام پھیریں اُس وقت اُن کو قتل کر دے
فاتی خالد وجلس الی	تو خالد تلوار لے کر علی کے برابر آ بیٹھا پھر ابوبکر
جنب علی ومعه سيف	نے اپنی نماز میں اس کے انجام کی فکر کی تو
فتفكر ابوبكر فی صلوة	اس کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہوا کہ اگر علی
فی عاقبة ذلك فخطر بباله	مارے گئے تو بنی ہاشم مجھ کو قتل کر ڈالیں
ان بنی هاشم يقتلوننی	گے جب ابوبکر تشہد سے فارغ ہوا تو سلام
ان قتل علی فلما فرغ من	پھیرنے سے پہلے خالد کی طرف متوجہ ہوا
التشهد التفت الی خالد	اور کہا کہ میں نے تجھے جو حکم کیا تھا اس پہ
قبل ان يسلم وقال لا تفعل	عمل مت کیجیو۔ اس کے بعد ابوبکر نے

---

[1] اصول کافی ص۱۲۱ - [2] کتاب الخرائج مطبوعہ بمبئی ص۱۲۳

ما امرتك به ثم قال
السلام عليكم فقال علی
لخالد اكنت تريد ان تفعل
ذلك قال نعم فمد يده
الی عنقه وخنقه باصبعيه
حتی كادت عيناه يسقطان
من راسه وناشده بالله
ان يتركه وشفع اليه
الناس فخلاه ثم كان
خالد بعد ذلك يرصد
الفرصة والفجاءة ليقتل
عليا غرة فبعث بعد ذلك
عسكر مع خالد الی موضع
فلما خرجوا من المدينة
وكان خالد مدججا وحوله
شجعان قد امروا ان يفعلوا
كلما يامرهم خالد فرای
عليا يجيئ من ضيعة منفردا
بلا سلاح فلما دنی منه

نماز کا سلام پھیرا۔ پھر علی نے خالد سے
کہا کہ کیا تو ایسا کرنا چاہتا تھا؟ تو خالد نے
کہا کہ ہاں۔ تو علی نے اس کی گردن کی
طرف ہاتھ بڑھایا اور دو انگلیوں سے
اس کا گلا اس زور سے گھونٹا کہ اس کے
سر سے اس کی آنکھیں نکل پڑتی تھیں اور
اس نے اللہ کی قسمیں دلانا شروع کیں کہ
مجھے چھوڑ دو اور لوگوں نے علی کو سفارش
کی تب علی نے اس کو چھوڑا۔ خالد
اس کے بعد موقع اور گھات کا منتظر تھا
کہ علی کو دھوکے میں قتل کرے۔ تو اس کے
بعد خالد کے ساتھ لشکر کسی جگہ کو بھیجا گیا۔
جب شہر سے باہر نکل گئے اور خالد ہتھیار
باندھے ہوئے تھا اور اس کے گرد بہادر
لوگ تھے ان سب کو یہ حکم تھا کہ خالد جو
حکم کرے اسی کی تعمیل کریں۔ تو خالد نے
دیکھا کہ علی اپنے کھیت سے آتے ہیں
اکیلے نہتے اور خالد کے ہاتھ میں لوہے کا
ایک عمود تھا اسے علی کے سر پر مارنے

وكان فی يد خالد عمود
من حديد فرفعه ليضرب
به علی راس علی فانتزعه
علی من يده وجعله فی
عنقه وفتله كالقلادة فرجع
خالد الی ابی بكر فاحتال
القوم فی كسره فلم
يتهيأ لهم ذلك فلما
علموا خالة قالوا علی هو
الذی يخلصه من ذلك
كما جعله فی جيده وقد الان
الله له الحديد كما الانه
لداود فشفع ابو بكر الی علی
فاخذ القلادة وفك بعضه
من بعض باصبعه فبهتوا۔

کے لیے اٹھایا۔ علی نے اس کو خالد کے ہاتھ
سے چھین لیا اور گلو بند کی طرح موڑ کر
خالد کی گردن میں ڈال دیا تو خالد لوٹ کر
ابو بکر کے پاس آیا۔ سب لوگوں نے اس
کے توڑنے کی تدبیر کی مگر وہ نہ ٹوٹ سکا
جب انہوں نے اس کا حال جان لیا تو
یہ کہنے لگے کہ فقط علی وہ شخص ہے کہ اسی
طرح اس کو نکالے گا جیسے خالد کی گردن
میں ڈالا ہے۔ اللہ نے لوہا اس کے ہاتھ
میں ایسا نرم کر دیا ہے جیسا داؤد کے
ہاتھ میں نرم کر دیا تھا۔ ابو بکر نے علی
سے سفارش کی۔ تب علی نے اس
گلو بند کو پکڑا اور ایک انگلی لگا کر
جا بجا سے توڑ دیا تو سب حیران
ہو گئے۔

ف بفرض محال اگر کوئی شخص جناب امیر کے قتل کا حکم دیتا (معاذ اللہ)
تو عمدہ موقع اس کا حالت نماز میں بلکہ عین سجدہ میں تھا۔ اس روایت کے تصنیف
کرنے والے نے سلام پھیرنے کے بعد قتل علیؑ کی تجویز اس لیے تصنیف کی کہ قبل سلام
ابو بکرؓ کی باتیں کرنے کا جوڑ ملا دے۔

یہ قتل کا حکم اُس شخص کی نسبت تصنیف کیا گیا جو نماز میں جناب امیر کا امام تھا اور چونکہ جناب امیر ہرگز مجبور نہ تھے اس لیے یہ اقتدا تقیہ پر محمول نہیں ہو سکتا یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ ابوبکرؓ اپنی خلافت کے زمانے میں بھی بنی ہاشم سے ڈرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ بنی ہاشم علیؓ کے ساتھ ہیں۔

جناب امیر کی وہ قوت تھی کہ دو انگلیوں سے انہوں نے خالد کا گلا گھونٹ دیا مسجد میں بہت سے لوگ موجود تھے خلیفہ بذات خود موجود تھا مگر سب مل کر اپنی قوت سے علی کو دفع نہ کر سکے اور مجبور ہو کر علی کی خوشامد کرنی پڑی نہ اس کے بعد خلیفہ کسی طرح اس کا بدلہ علی سے لے سکا۔

جناب امیر خالد پر اس وقت بھی غالب آئے جب وہ ایک بھاری فوج کے ساتھ تھے اور وہ کل فوج خالد کی مطیع تھی ایسی حالت میں جناب امیر نے لوہے کے عمود کو موڑ کر طوق کی طرح خالد کے گلے میں ڈال دیا جو پھر کسی تدبیر سے نہ نکل سکا۔ آخر مجبور ہو کر ابوبکرؓ خلیفۂ وقت نے جناب امیر کی خوشامد کی تب جناب امیر نے ایک انگلی کے اشارے سے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

اس کے بعد بھی خلیفۂ وقت کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ اپنی خلافت کی قوت کو صرف کر کے اس حرکت کا جناب امیر سے بدلا لیتے۔

اگرچہ قتل کا حکم فسخ ہو چکا تھا مگر پھر بھی جناب امیر نے خالد کا گلا گھونٹ دیا اور حکم صبر کی مخالفت کی۔

کبھی کبھی جناب امیر نے خلفا کے مقابلے میں عصائے موسیٰ سے بھی کام لیا ہے۔ کتاب الخرائج میں ہے:۔

عن سلمان الفارسی رضی اللہ عنہ قال ان علیا بلغہ عن عمر ذکر شیعتہ فاستقبلہ فی بساتین المدینۃ و فی ید علی قوس فقال یا عمر بلغنی عنک ذکرک شیعتی فقال اربع علی ظلعک فقال انک لھا ھنا ثم رمی بالقوس علی الارض فاذا ثعبان کالبعیر فاغل فاہ وقد اقبل نحو عمر لیتعلقہ فصاح عمر اللہ اللہ یا ابا الحسن لاعدت بعدھا فی شی وجعل یتضرع الیہ فضرب بیدہ الی الثعبان فعادت القوس کما کان۔

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ علیؓ کو یہ خبر پہنچی کہ عمرؓ نے علی کے دوستوں کا کچھ ذکر کیا۔ پھر مدینہ کے باغوں میں عمرؓ سے سامنا ہو گیا اور علیؓ کے ہاتھ میں تلوار تھی تو علی نے کہا کہ اے عمر مجھے تیری یہ خبر ملی ہے کہ تو نے میرے دوستوں کا ذکر کیا تو عمر نے کہا کہ اپنے اوپر رحم کرو تو علی نے کہا کہ اسی جگہ ٹھیرے رہو پھر اپنی کمان زمین پر پھینک دی تو دفعتاً وہ ایک اژدھا اونٹ کے برابر بن گئی پھر وہ اژدھا منہ پھیلا کر عمر کی طرف دوڑا کہ اس کو نگل جاوے تو عمر نے چیخنا شروع کیا کہ خدا کے واسطے اے ابوالحسن بچاؤ اب میں کسی امر میں تمہاری مخالفت نہ کروں گا اور علی کے سامنے عاجزی شروع کی تب علی نے اس اژدہے پر ہاتھ مارا تو وہ پھر کمان بن گئی جیسی پہلے تھی۔

پس جب کہ جناب امیر معجزات کی قوت سے بھی خلفا کے مقابلے میں کام لیتے تھے تو پھر ہرگز خلفا سے کمزور نہ تھے۔

تعجب یہ ہے کہ اکیلے عمرؓ کے مقابلے میں ہاتھ پاؤں کی قوت نے کام
نہ دیا اور اپنے آپ کو مغلوب سمجھ لیا تب مجبور ہو کر کمان کو اژدہا بنانا پڑا۔
اس سے بڑھ کر تعجب یہ ہے کہ غصب خلافت اور غصب ام کلثوم
اور غصب فدک کے وقت اس کمان کو اژدہا کیوں نہ بنایا جب گردن میں رسی
باندھ کر کھینچی گئی اس وقت بھی کچھ حس وحرکت نہ کی اور ہیبت کے مارے مُردہ
بدستِ زندہ کی کیفیت ہوگئی۔ آخر جناب سیدہ اپنے بچوں کو لے کر واویلا مچاتی
ہوئی مسجد میں تشریف لائیں اور جناب امیر کی جان بچا کر گھر میں لے گئیں۔ جناب
سیدہ کے شکم پر دروازہ گرایا گیا جو باعث شہادت دو معصوم ہوا (معاذ اللہ منہا)
اُس وقت بھی جناب امیر کمان کو اژدہا بنانے کا عمل بھول گئے۔ جس وقت
مجبور ہو کر ابو بکرؓ کی بیعت کی اُس وقت بھی کمان کا اژدہا نہ بن سکا۔
ان سب قوتوں کے علاوہ جناب امیر کو ایک قوت یہ بھی حاصل
تھی کہ جب چاہتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قبر مبارک سے باہر بُلا
لیتے تھے اور جو چاہتے تھے کہلوا دیتے تھے۔ حیات القلوب میں لکھا ہے:۔

"و ایضاً بسند ہائے بسیار از حضرت صادق روایت کردہ اند
کہ چوں ابوبکر از حضرت امیر المومنین غصب خلافت کرد حضرت باو
گفت کہ آیا رسول خدا ترا امر نہ کرد کہ مرا اطاعت کنی آں گفت نہ
واگر مرا امر کردی کردم حضرت فرمود کہ اگر الحال پیغمبر را ببینی و ترا امر کند

ا باغ مکرھا حیث لم یجد اعوانا یعنی علی کو جب مددگار نہ ملے تو انہوں
نے حالت مجبوری میں بیعت کرلی۔ کتاب الروضہ صفحہ ۶۱۹ ۱۲

باطاعت من آیا خواہی کرد؟ گفت آرے۔ حضرت فرمود کہ بامن
بیا بسوئے مسجد قبا۔ چوں بہ مسجدِ قبا رسیدند ابوبکر دید کہ حضرت
خدا ایستادہ است و نماز می کند چوں حضرت از نماز فارغ شد
حضرت امیر المومنین گفت، یا رسول اللہ ابوبکر انکار می کند کہ تو اورا
امر باطاعتِ من کردہ۔ حضرت رسول با بوبکر گفت کہ من مکرر ترا
امر کردہ ام باطاعتِ او، برو اورا اطاعت کن۔"

(حیات القلوب جلد دوم صفحہ ۲۶۹)

یہ روایت کتاب الخرائج والجرائح میں بھی متعدد سندوں سے مروی ہے
افسوس کہ جناب امیر نے فقط ایک ابو بکرؓ کے سامنے مسجد قبا میں یہ کرشمہ ظاہر
کیا اگر مسجد نبوی میں عام مجمع صحابہ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر
کردیتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس حکم کو سن کر اور اس معجزہ
عجیب کو دیکھ کر تمام صحابہ جناب امیر کے ساتھ ہو جاتے۔
شجاعتِ ذاتی اور معجزات کی جتنی قوتیں تھیں وہ جناب امیر کی طرح
تمام ائمہ کو برابر حاصل تھیں۔ رفقا اور معاونین کی قوتیں بھی باقی ائمہ کو کچھ کم نہ تھیں
اس لیے کہ بار بار سادات خروج کرتے تھے اور ہمیشہ اُن کے ساتھ ایک بھاری
فوج ہوتی تھی۔ پس جناب امیر سے لے کر آخر وقت تک ائمہ کبھی مجبور نہیں ہوئے
تعجب ہے کہ ان ائمہ نے باوجود قوت کے خلافت کیوں نہ طلب کی جس کی
طلب اُن پر واجب تھی۔ اور جھوٹے مسئلے بیان کرکے لوگوں کو کیوں غلطی میں
ڈالا۔ جناب امیر نے ایسی ناگوار باتیں کیوں گوارا کیں۔

حضرت سلمانؓ کی ہی حالت ملاحظہ فرمائیے کہ اُنہوں نے کیسی سختیاں جھیلیں مگر تقیہ نہ کیا۔ حیات القلوب میں تفسیر امام حسن عسکری سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلمانؓ یہودیوں میں پہونچ گئے تھے اُن میں کچھ وعظ و تلقین کی۔ یہودیوں نے کہا کہ ہم تم کو مارتے ہیں تم اپنے رب سے دعا مانگو کہ وہ ہم کو نہ مارنے دے۔ سلمانؓ نے یہ دعا نہ مانگی بلکہ توفیق صبر کی دعا مانگی۔ یہودیوں نے اتنے کوڑے مارے کہ مارتے مارتے تھک گئے۔ آخر تھک کر انہوں نے چھوڑا اور وہ تعجب کرتے تھے کہ اتنی مار پہ سلمانؓ زندہ کیسے رہے؟ تھوڑی دیر کے بعد یہودیوں نے کہا کہ یا تو تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار کر دو ورنہ ہم پھر مارتے ہیں۔ سلمان نے کہا کہ میں ہرگز محمدؐ کا انکار نہ کروں گا۔ پھر یہودیوں نے کوڑے مارنے شروع کیے یہاں تک کہ مارتے مارتے تھک گئے مگر سلمان نے اب بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے انکار نہ کیا۔ تھوڑی دیر ٹھیر کر یہودیوں نے تیسری بار پھر کوڑے مارنے شروع کیے اور اس حالت میں بھی سلمان صبر کی دعا مانگتے رہے۔ آخر یہودیوں نے سلمان سے کہا کہ تم کو محمدؐ نے تقیہ کی اجازت دی ہے تم تقیہ کر کے محمدؐ کا انکار کیوں نہیں کر دیتے اور کوڑوں کی ضرب کیوں جھیلتے ہو؟ تو سلمانؓ نے جواب دیا کہ تقیہ اگرچہ اللہ نے جائز کیا ہے مگر واجب نہیں کیا اور اولیٰ یہی ہے کہ تقیہ نہ کرے صبر کرے اس لیے میں تقیہ نہ کروں گا چنانچہ اصل عبارت حیات القلوب کی یہ ہے:۔

"پس آں کافراں گفتند اے سلمان وائے بر تو۔ آیا محمدؐ ترا رخصت نہ دادہ است کہ از برائے تقیہ از دشمنانِ خود بگوئی کفرے راکہ خلاف

آں چیزیست کہ در خاطر تست و اعتقاد بآں داری پس چرا نمی گوئی آنچہ را جبر می کنیم ترا بآں از برائے تقیہ۔ سلمان گفت کہ خدا مرا رخصت دادہ است کہ در ایں امر تقیہ کنم و بر من واجب نہ گردانیدہ است۔ بلکہ جائز ساختہ است از برائے من کہ بگویم انچہ شما مرا بآں جبر مے نمائید و صبر کنم بر آزارہا و مکروہات شما و ایں را بہتر گردانیدہ از انکہ از روئے تقیہ آنچہ گوئید بگویم و من غیر ازیں اختیار نخواہم کرد۔"

(حیات القلوب جلد دوم ص۶۳)

اس کے بعد پھر یہودیوں نے اتنے کوڑے مارے کہ سلمانؓ کے بدن سے خون جاری ہو گیا پھر وہ ظالم بطور تمسخر کے سلمانؓ سے کہنے لگے کہ نہ تم اللہ سے یہ دعا کرتے ہو کہ ہمارے ضرر سے تمہیں بچاوے نہ بطور تقیہ پیغمبر کے منکر ہوتے ہو کہ ہم تم کو چھوڑ دیں اب تم یہ دعا مانگو کہ ہم ہلاک ہو جاویں۔ اس دعا سے بھی سلمان نے انکار کیا اور کہا کہ شاید تم میں کوئی ایسا ہو جو اس کے بعد ایمان لاوے۔ تب یہودیوں نے کہا کہ تم یوں دعا مانگو کہ اے اللہ جس کو تو یہ جانتا ہو کہ کفر پہ مرے گا، اس کو ہلاک کر دے اُس وقت اس مکان کی ایک دیوار پھٹ گئی اور سلمان نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سامنے موجود ہیں اور سلمان سے کہتے ہیں کہ ان کے ہلاک ہونے کی دعا مانگ۔ آخر سلمان نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بعد اُن کافروں کی خواہش کے بموجب ایسی دعا مانگی کہ ہر شخص کے ہاتھ میں جو کوڑا تھا وہ دو منھ کا سانپ بن گیا ایک منھ سے اس کافر کا سر اور دوسرے منھ سے اُس کا دستِ راست پکڑ کر اس کی ہڈیاں توڑ کر اس کو نگل گیا

اسی طرح وہ سب کافر اُن سانپوں کے پیٹ میں پہونچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی وقت اس قصہ کی صحابہ کو خبر دی وہ سانپ وہاں سے نکل کر مدینہ کی گلی کوچوں میں پھرتے تھے آخر رسولؐ کی دعا سے دوزخ کے سانپوں میں شامل ہوگئے۔

افسوس ائمہ کو وہ صبر و استقلال بھی نصیب نہ ہوا جو حضرت سلمانؓ کو حاصل تھا۔ سلمانؓ نے کیسی ایذا اٹھائی مگر تقیہ کو گوارا نہ کیا اور کلمۂ ناحق زبان سے نہ نکالا۔ ائمہ کو نہ کوئی ایذا دیتا تھا نہ چھری گردن پر رکھتا تھا۔ صرف خیالات اور توہمات کی بنیاد پر اُنہوں نے جھوٹے مسئلے بیان کرنے شروع کر دیے بلکہ ایسی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ اپنے مخلصین شیعہ سے بھی تقیہ کرتے تھے۔ امام جعفر صادق نے سلمہ بن محرز کو بیٹی کی میراث کا مسئلہ غلط بتا دیا حال آنکہ مخلص شیعہ تھا اس وقت کس نے امام پر جبر کیا تھا۔ شکار باز و شاہین کی حرمت میں کوئی وجہ خوف کی نہ تھی جس کو امام باقر علیہ السلام نے حلال کہہ دیا۔ کیا ہر وقت کوئی جلاد شخص چھری لیے ہوئے اُن کے ساتھ رہتا تھا کہ جب شکار باز کو حرام کہیں اسی وقت اُن کو ذبح کر دیا جائے۔ امام جعفر نے اپنی امامت سے انکار کر دیا۔ کیا اُن دونوں سائلوں نے امام پر جبر کیا تھا؟ سلمان پر کوڑے پڑ رہے تھے مگر وہ مستقل تھے ائمہ پر کوئی جبر نہ تھا مگر ڈر کے مارے جھوٹے مسئلے ہر وقت زبان پر جاری تھے حال آنکہ ہر قسم کی قوت ان کو حاصل تھی تقیہ اُن کو جائز بھی نہ تھا۔

سلمان رضی اللہ عنہ نے تقیہ کے مسئلے کی خوب تشریح کر دی کہ حالت اکراہ میں بھی تقیہ واجب نہیں بلکہ جائز و خلاف اولیٰ ہے۔ سلمان کا یہ قول

مع تمام قصہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا اور آپؐ نے سلمانؓ کے اس قول میں کوئی غلطی نہ بتائی پس بہ تقریر رسولؐ حکم مسئلہ تقیہ کا ثابت ہوگیا۔ اور یہ جناب سیدہ اور سلمان اور امام حسین علیہ السلام کا فعل بھی اسی کے مطابق تھا اس لیے کہ سلمان اور امام حسین علیہ السلام نے حالت اکراہ میں تقیہ نہیں کیا اور جب ایسا نازک وقت تھا کہ جناب امیر ڈر کے مارے گھر میں چھپ کر بیٹھے تھے اُس وقت جناب سیدہ نے عمرؓ سے ہاتھا پائی کی اور ہرگز تقیہ نہ کیا۔ چنانچہ اصول کافی میں امام باقر اور امام جعفر علیہما السلام دونوں سے روایت ہے کہ:۔

اخذت بتلابیب عمر ثم جذبتہ الیھا۔ (اصول کافی صفحہ ۲۹)	فاطمہ علیہا السلام نے عمرؓ کا گریبان پکڑ لیا پھر عمرؓ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

اس تحقیق کے بعد ظاہر ہوگیا کہ وجوب یا اولویت تقیہ کا قول صحیح نہیں اور حالتِ اکراہ میں تقیہ جائز ہے مگر افضل یہ ہے کہ تقیہ نہ کرے اور روایاتِ وجوبِ تقیہ اور فضائل تقیہ باطل اور موضوع ہیں۔

جناب امیر کا ایک اور قسم کا تقیہ ہے جو سب سے زیادہ عجیب ہے اور وہ یہ ہے کہ جناب امیر نے اپنی خلافت کے زمانہ میں بھی تقیہ کیا حالانکہ تمام عرب میں ان کی حکومت تھی اور ہزاروں آدمی اُن پر جاں نثاری کے لیے موجود تھے اور اُن کی طرف سے لڑ کر ان کے دشمنوں کو قتل کرتے تھے اور خود بھی قتل ہوتے تھے وہ تقیہ یہ تھا کہ احکام ظلم و جور اور امور منہیہ جو بزعم شیعہ سابق سے جاری تھے اسی طرح جاری رکھے حالانکہ بادشاہ جو عمداً ظلم روا رکھے وہ اُس کے نامۂ اعمال میں لکھا جاتا ہے۔ کافی کی کتاب الروضہ میں ایک طویل خطبہ جناب امیر علیہ السلام کا

منقول ہے جس میں بعد حمد وصلوٰۃ اور بہت سی تمہید اور ذکر فتن کے یہ مذکور ہے:۔

ثم اقبل بوجھہ وحولہ ناس من اھل بیتہ وخاصتہ وشیعتہ

پھر سامنے کیا اپنا رُخ اور اُن کے گرد قومی تھے اُن کے اہل بیت میں سے اور خاصوں میں سے اور شیعوں میں سے۔

ف اس سے ظاہر ہے کہ اصل خطاب جناب امیر کا اپنے اہل بیت اور شیعوں اور خاص لوگوں سے تھا اُنھیں کی جناب امیر کو یہ شکایت تھی کہ اگر میں احکام جور کو مٹا دوں گا تو تم میرا ساتھ چھوڑ کر بھاگ جاؤ گے۔

فقال قد عملت الولاۃ قبلی اعمالا خالفوا فیھا رسول اللہ متعمدین لخلافہ ناقضین لعھدہ مغیرین لسنتہ ولو حملت الناس علی ترکھا وحولتھا الی مواضعھا والی ما کانت فی عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ لتفرق عنی جندی۔ (کتاب الروضہ صفحہ ۲۹)

تو فرمایا کہ جو حکام مجھ سے پہلے تھے انہوں نے ایسے کام کیے ہیں جن میں جان بُوجھ کر رسول کی مخالفت کی اور عہد رسول کو توڑا اور سنت رسول کو بدل دیا اور اگر برانگیختہ کروں میں لوگوں کو اُن اعمال کے چھوڑنے پر اور بدل دوں اُن اعمال کو اُن کے مواقع کی طرف اور اُس طرف جیسے کہ عہد رسول میں تھے تو البتہ میرا لشکر مجھ سے متفرق ہو جائے گا۔

ف اس قول سے ظاہر ہے کہ جناب امیر نے امر معروف اور نہی منکر کا فرض اپنی خلافت کے زمانہ میں چھوڑ دیا تھا اور جو امور مخالف سُنت تھے ان کے ترک کی ترغیب اس وجہ سے نہیں دیتے تھے کہ اُن کے لشکر کے لوگ

اُن سے جُدا ہو جائیں گے تو خلافت چھن جائے گی پس سلطنت کی اُن کو طمع ایسی تھی جس کی وجہ سے حکم سے انہوں نے زبان بند کر لی تھی اور مخالفت رسولؐ اور تغیر سنت کو گوارا کیا تھا۔ (معاذ اللہ)

اس کے بعد جناب امیر نے بہت سے امور کی تفصیل بیان کی ہے کہ اگر میں اُن امور کو بدل دوں تو تم مجھ سے جُدا ہو جاؤ گے۔ ہم اُن میں سے بنظر اختصار بعض احکام کو ذکر کرتے ہیں:۔

لو رددت فدک الی ورثۃ فاطمۃ علیھا السلام وامضیت قطایع اقطعھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ لاقوام لم تمض لھم ولم ینفذ ورددت قضایا من الجور قضی بھا ونزعت نساء تحت رجال بغیر حق فرددتھن الی ازواجھن وحملت الناس علی حکم القرآن ومحوت دواوین العطایا واعطیت کما کان رسول اللہ یعطی بالسویۃ

اگر میں واپس کر دوں فدک کو فاطمہ علیہا السلام کے وارثوں پر اور جاری کر دوں میں جاگیریں جن کو مقرر کر دیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض قوموں کے لیے حالانکہ نہیں جاری ہوئیں اُن کے لیے اور نہ نافذ ہوئیں۔ اور رد کر دوں میں ظلم کے احکام کو جن کا حکم دیا گیا ہے اور نکال لوں میں عورتوں کو جو بطور ناحق کے مردوں کے تحت میں ہیں اور رد کر دوں میں اُن کو اُن کے شوہروں کی طرف اور ترغیب دوں میں آدمیوں کو حکم قرآن پر اور محو کر دوں میں دفتر عطایا کا اور دُوں میں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

وحرمت المسح علی الخفین۔

دیتے تھے برابری کے ساتھ اور حرام کردوں میں موزوں کے مسح کو۔

اذا لتفرقوا عنی واللہ لقد امرت الناس لا یجتمعوا فی شھر رمضان الا فی فریضۃ واعلمتھم ان اجتماعھم فی النوافل بدعۃ فتنادی بعض اھل عسکری ممن یقاتل معی یا اھل الاسلام غیرت سنۃ عمر ینھانا عن الصلوۃ فی شھر رمضان تطوعا۔

اس وقت البتہ تم جُدا ہو جاؤ گے مجھ سے واللہ بے شک حکم کیا میں نے آدمیوں کو کہ نہ جمع ہو ویں رمضان کے مہینے میں مگر فرض نماز کے لیے اور میں نے ان کو بتادیا کہ نوافل کے لیے اُن کا جمع ہونا بدعت ہے تو ندا کی میرے لشکر سے بعض شخصوں نے وہ اُن میں سے ہیں جو میرے ساتھ ہو کر لڑتے ہیں اے مسلمانو عمرؓ کی سنت بدل دی گئی۔ رمضان کی نماز نفل سے ہم کو علیؑ منع کرتے ہیں۔

مجالس المومنین میں لکھا ہے کہ اُس زمانہ کے قاضیوں نے جناب امیر سے یہ پوچھا کہ اب ہم احکام قضا کس طرح جاری کریں؟ تو جناب امیر نے فرمایا:-

اقضوا بما یقضون حتی تکون الناس جماعۃ او اموت کما مات اصحابی۔ (مجالس المومنین ص۲۴)

تم جیسے پہلے حکم دیا کرتے تھے اُسی طرح حکم دیتے رہو اس وقت تک کہ سب آدمی اتفاق کریں یا میں بھی مرجاؤں جیسے میرے اصحاب مر گئے۔

ان روایتوں سے دو فائدے حاصل ہوئے۔

ایک یہ کہ جو احکام ظلم کے پہلے سے جاری تھے وہی جناب امیر نے جاری رکھے فدک کو بھی واپس نہ کیا مسلمانوں کی بیبیاں جو ظالموں نے زبردستی چھین کر اپنے قبضہ میں کر لیں تھیں اُن کو بھی جناب امیر نے واپس نہ کرایا یہاں تک کہ لوگوں کو قرآن کے بموجب عمل کرنے کا حکم بھی جاری نہ کیا۔ موزوں پر مسح کرنے کو بھی حرام نہ کیا۔ قاضیوں کو حکم دیدیا کہ ظلم کے احکام جیسے پہلے جاری کرتے تھے اسی طرح اب بھی جاری کرو۔ بیت المال کا روپیہ جس طرح ناجائز طور پر خرچ ہوتا تھا اسی طرح جاری رکھا۔ یہ تمام امور جناب امیر نے اس لیے اختیار کیے کہ کہیں بادشاہت نہ چھن جائے۔ ایسی حکومت پر خاک کیوں نہ ڈال دی جس میں ظلم کے احکام جاری کرنے پڑتے تھے۔

کیا یہی امام مفترض الطاعت تھے جنہوں نے دنیا کی حکومت کو دین پر ترجیح دی۔ جو بادشاہ اپنے قاضیوں کو احکام ظلم جاری کرنے کا حکم دے وہ خود ظالم ہے (معاذ اللہ منہا) جناب امیر کو حکومت کا ایسا کیا مزا تھا جس کے لیے اجرائے احکام ظلم میں مبتلا ہوئے۔ حال آنکہ بعلم امامت یہ بھی معلوم تھا کہ اسی حالت میں خاتمہ ہونے والا ہے اور باسباب ظاہر بھی اس تقیہ سے باہر نکلنے کی امید نہ تھی اس لیے کہ جو لوگ جناب امیر کے مددگار تھے اور جن کی قوت سے وہ لڑتے تھے وہی ایسے تھے جن کی تالیف کے لیے جناب امیر ظلم کو باقی رکھنے اور ظلم کے احکام جاری کرنے پر مجبور ہوئے۔

یہ تقیہ جناب امیر کا جان کے خوف سے نہ تھا بلکہ حکومت کے لالچ

میں تھا۔ (معاذ اللہ منہا)

دوسرا فائدہ اس روایت سے یہ حاصل ہوا کہ جناب امیر علیہ السلام کے ساتھی سُنتِ خلفا پسند کرتے تھے اور چونکہ اُن میں بہت سے صحابی تھے جنھوں نے بلا واسطہ رسول سے اسی طرح دین حاصل کیا تھا جیسے جناب امیر نے حاصل کیا تھا پس خلفائے ثلٰثہ کی وفات کے بعد جو وہ صحابی سنت خلفا کو پسند کرتے تھے یہ دلیل اس امر کی ہے کہ سنتِ خلفا کو وہ سنت رسول کے مطابق جانتے تھے اور بعض ظلموں کا اُن میں شامل کرنا شیعہ راویوں کا افترا ہے اس لیے کہ جو لوگ جناب امیر کے مناقب اور فضائل کے معتقد ہیں وہ ہرگز اس امر کو قبول نہ کریں گے کہ جناب امیر معاذ اللہ ظلم کو باقی رکھیں۔ یا قاضیوں کو اجرائے احکام ظلم کا حکم دیں بالفرض اگر جناب امیر مجبور رہوتے تو خلافت سے دست بردار ہو کر اُس قوم سے جدا ہو جاتے جیسے امام حسن علیہ السلام جدا ہو گئے تھے۔

درحقیقت ممبران سبائیہ کمیٹی اور بانیان مذہب شیعہ پر جب مسلمانوں نے یہ اعتراض کیا کہ فدک کو اگر خلفا نے (معاذ اللہ منہا) غصب کیا تو جناب امیر نے جناب سیدہ علیہا السلام کے وارثوں کو واپس کیوں نہ کیا اسی طرح اگر موزوں پر مسح کرنے کو اور نماز تراویح کو جناب امیر جائز نہیں سمجھتے تھے تو اپنی خلافت کے زمانہ میں ان چیزوں سے منع کیوں نہ کیا اور سنت سیر خلفائے ثلٰثہ کو اگر جناب امیر پسند نہیں کرتے تھے تو اس کو باقی کیوں رکھا۔ اس سخت مواخذہ کے جواب میں اُن سحر کاروں نے یہ جادو کا فقرہ تصنیف کر لیا کہ فدک اور نماز تراویح اور مسح خفین وغیرہ کا معاملہ تو بڑا سہل تھا۔ جناب امیر نے

تو اپنے ساتھیوں کی تالیف کے لیے بڑے بڑے ظلم باقی رکھے اور قاضیوں کو احکام ظلم کے جاری کرنے کا حکم کیا اگر جناب امیر ایسا نہ کرتے تو ان کی فوج اُن سے جدا ہو جاتی اس لیے کہ ان کے جتنے ساتھی تھے سب سنت سیر شیخین کے معتقد تھے۔

بھلا حضرات شیعہ کے سوا اور کون اس روایت کو قبول کرے گا کہ جو لوگ جناب امیر کے ساتھ ہو کر ان کے دشمنوں کو قتل کریں اور خود بھی قتل ہوں اور اپنی جانیں جناب امیر پر نثار کریں وہ جناب امیر کا حکم نہ مانتے ہوں اگر وہ جناب امیر کے سچے طرفدار نہ ہوتے تو ان کی طرف کیوں آتے امیر شام کی طرف جاتے۔

حضرات شیعہ کو جس قسم کی روایتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُسی قسم کی روایتیں تصنیف کر لیتے ہیں۔ یہاں جناب امیر کے ساتھیوں کو نافرمان بنا دیا اور جب شیعوں کی کثرت ظاہر کرنی منظور ہوئی تو انھیں نافرمانوں کو مخلص شیعہ بنا دیا۔ دروغ گو را حافظہ نباشد کا حساب ہے۔ مجالس المومنین[1] میں مذکور ہے:-

"آں جماعت کہ با حضرت امیر در قتال ناکثین[2] و قاسطین و مارقین
طریق موافقت پیمودہ اند، از دل و جان شیعہ با اخلاص او بودند"

سب سے زیادہ عجیب بات روایات شیعہ سے یہ ثابت ہوتی ہے

---

[1] مجالس المومنین مطبوعہ طہران ص ۱۴۳ [2] ناکثین کے معنی عہد شکن اور اس سے مراد اہل جمل ہیں قاسطین یعنی ظالمین اور اس سے مراد اہل شام ہیں۔ مارقین یعنی خارجین اُس سے مراد خوارج ہیں ۱۲۔

کہ صحابہ رسول میں سے پانچ چار شخص جو شیعوں کے نزدیک مقبول اور صاحب مناقب کثیر ہیں جیسے سلمان اور ابوذر اور مقداد رضی اللہ عنہم ان کے عقائد باہم مختلف تھے مگر ایک دوسرے سے تقیہ کرتے تھے اور اپنا عقیدہ ایک دوسرے سے چھپاتے تھے۔ ظاہر میں ایک تھے مگر دلوں میں اختلاف تھا۔ ابوذرؓ اگر سلمانؓ کے دل کا حال معلوم کر لیتے تو سلمان کو قتل کر دیتے۔ چنانچہ اصول کافی میں مسعدہ سے روایت ہے:۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال ذکرت التقیۃ یوما عند علی بن الحسین علیہما السلام فقال واللہ لو علم ابوذر ما فی قلب سلمان لقتلہ ولقد اٰخا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ بینہما فما ظنک لسائر الخلق ان علم العلماء صعب مستصعب لا یحتملہ الا نبی مرسل او ملک مقرب او عبد مومن امتحن اللہ قلبہ للایمان۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ امام زین العابدین علیہ السلام کے سامنے تقیہ کا ذکر ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ واللہ اگر ابوذر کو معلوم ہو جاتا کہ سلمان کے دل میں کیا ہے تو سلمان کو قتل کر ڈالتا اور البتہ دونوں کو بھائی بنا دیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے پھر کیا گمان ہے تیرا کہ تمام مخلوق میں بے شک علما کا علم مشکل اور سخت ہے نہیں اٹھا سکتا اس کو مگر نبی مرسل یا فرشتہ مقرب یا بندۂ مومن، جس کے دل کا اللہ نے ایمان کے لیے امتحان کر لیا ہو۔

فقال وانما صار سلمان من العلماء لانہ امرؤ منا اہل البیت فلذلک نسبتہ الی العلماء۔ (اصول کافی ص۲۵۴)

پھر فرمایا کہ بے شک ہو گیا سلمان عالموں سے اس لیے کہ وہ ایک شخص ہم اہل بیت میں سے ہے اسی لیے میں نے اُس کو علماء کی طرف منسوب کیا۔

اس روایت سے صاف معلوم ہو گیا کہ سلمانؓ کے اعتقاداتِ باطنی ایسے تھے کہ اگر ابوذرؓ کو اُن کی خبر ہو جاتی تو ابوذرؓ سلمانؓ کو قتل کر ڈالتے۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے دونوں کو بھائی بنا دیا تھا باوجود اخوت کے اُن کے عقائد دلی میں ایسا اختلاف تھا جیسا کہ کفر و اسلام میں ہوتا ہے۔

جب ابوذرؓ کی یہ حالت تھی تو آج کل کے علماء۔ اور مجتہدین اگر سلمانؓ کی باطنی حالت پر مطلع ہو جاویں تو ضرور ان کو مرتد اور لائق قتل سمجھیں (معاذ اللہ منہا)

یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ کاملین بحسب تفاوت مراتب باہم ایک دوسرے سے تقیہ کرتے ہیں اگر ایسا نہ کریں تو ایک دوسرے کو قتل کر ڈالے۔ اس قاعدہ کے بموجب رسول بھی جناب امیر سے ضرور تقیہ کرتے ہوں گے اور اگر خدانخواستہ جناب امیر کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسرار باطنی پر خبر ہو جاتی تو شاید وہی حالت ہوتی جو ابوذر کی حالت سلمان کے ساتھ ہوتی۔

ہر امام بھی اپنے جانشین امام سے ضرور تقیہ کرتا ہو گا ورنہ ہلاکت کا خوف تھا۔ اور جب کہ رسول سے لے کر امام یازدہم تک ایک دوسرے سے تقیہ

کرتے رہے اور ہر امام اپنے اصحاب سے تقیہ کرتا رہا تو ایسی حالت میں مذہب حق کے ثابت ہونے کی کیا صورت ہے؟۔

اس حدیث کا ترجمہ خلیل قزوینی نے صافی شرح کافی میں یوں کیا ہے :—

"اگر می دانست ابوذر آنچہ را کہ در دل سلمان بود ہر آئینہ بکشتن میداد سلمان را بوسیلۂ فاش کردن سرا واز کم حوصلگی"

ابوذر رضی اللہ عنہ کیسے جلیل القدر صحابی ہیں مگر علماء شیعہ کی دلیری دیکھیے کہ اُن کو بھی کم حوصلہ بتا دیا (معاذ اللہ منہا)

خلیل قزوینی بے چارہ کیا کرے خود امام زین العابدین علیہ السلام نے اس حدیث میں ابوذرؓ کی پوری توہین کر دی اور اُن کی کم علمی اور کم فہمی کی طرف اشارہ کر دیا حالانکہ امام زین العابدین علیہ السلام کو تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ کی زیارت بھی نصیب نہیں ہوئی اور ابوذر رضی اللہ عنہ نے تو بہت بڑا حصہ اپنی عمر کا رسولؐ کی خدمت میں صرف کیا ہے۔

قزوینی نے جو تاویل اس حدیث کی کی ہے وہ حد سے زیادہ عجیب ہے اور وہ یہ ہے کہ خلیفۂ ثانی نے سلمانؓ کو مدائن کا عامل مقرر کر کے بھیجا تھا اور خلیفۂ ثانی کو اس امر پر بڑا فخر تھا کہ سلمان ہماری طرف سے عامل ہے اسی وجہ سے وہاں کے خراج کا روپیہ بھی سلمان سے طلب نہیں کرتے تھے۔ مگر

سلمان جناب امیر سے سازش رکھتے تھے اور مدائن کے خراج کا روپیہ جناب امیر کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ابوذر کو یہ راز معلوم نہ تھا اگر ابوذر کو معلوم ہوتا تو اپنی کم حوصلگی کی وجہ سے خلیفۂ ثانی کو خبر کر دیتے اور اس صورت میں خلیفۂ ثانی سلمان کو قتل کر دیتے پس ابوذر اس راز کے فاش کرنے میں گویا سلمان کے قاتل ہو جاتے۔

اہل انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اس جھوٹی کہانی کو اس حدیث سے کیا مناسبت ہے۔ شاید قزوینی حدیث کا مطلب ہی نہیں سمجھے۔ قطع نظر اس کے یہ لازم آیا کہ ابوذرؓ اگر سلمانؓ کے اس راز پر خبر پا لیتے تو اُن کو ہرگز ضبط نہ ہوتا اپنی کم حوصلگی اور کم ظرفی کی وجہ سے فوراً عمرؓ سے چغلی کھا جاتے۔ غور فرمائیے کہ کیسی بُری خصلت ابوذرؓ کی طرف منسوب کی۔ (معاذ اللہ منہا)

اگر جناب امیر کو ایسے مال مغصوبہ کا لینا پسند ہوتا تو سلمانؓ کی طرح اپنی اور اپنی اولاد کے لیے بھی اسی قسم کے منصب حاصل کر کے تمام مال غصب کر سکتے تھے۔

قزوینی کو یہ بھی خبر نہیں کہ سلمانؓ کے قلب کی یہ حالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ سے تھی اور وہ جھوٹی کہانی جو اُس نے نقل کی خلیفۂ ثانی کے عہد کی ہے اور جس طرح سلمان کی دلی حالت پر واقف ہونے سے ابوذر قاتل سلمان بن جاتے اسی طرح اگر مقدادؓ سلمانؓ کے بھید پر واقف ہو جاتے تو مقداد کافر ہو جاتے۔ معاذ اللہ۔ چنانچہ حیات القلوب[1] میں

---

[1] حیات القلوب جلد دوم ص۶۴۳ باب شصت ویکم مناقب مقداد ۱۲

لکھا ہے :-

"(شیخ کشی) بہ سند معتبر از حضرت صادق روایت کردہ است
کہ حضرت رسولؐ فرمود کہ اے سلمان اگر علم ترا عرض کنند بر مقداد
ہر آئینہ کافر خواہد شد۔"

اب حضراتِ شیعہ اس معمہ کو حل کریں کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ سلمانؓ کے دل کی حالت معلوم کرنے سے مقداد کافر ہو جاتے (معاذ اللہ منہا) پس اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کی حالت جناب امیر معلوم کر لیتے تو وہ کیا ہو جاتے اور اگر جناب امیر کے دل کی حالت حسنینؓ یا سلمانؓ وغیرہ معلوم کر لیتے تو کیا بن جاتے اور اگر حسنینؓ کے دل کی حالت باقی ائمہ کو معلوم ہو جاتی تو وہ کیا ہو جاتے اور اگر ائمہ کے دل کی حالت تمام متقدمین و متاخرین شیعہ خصوصاً اس زمانہ کے شیعوں کو معلوم ہو جائے تو وہ کیا ہو جائیں؟ [5]

جن کی ظاہر کی تجلّی سے مسلمان ہوئے
ان کے باطن کی خبر پائیں تو کافر ہو جائیں

اب ہم روایاتِ شیعہ سے اس امر کے قرائن اور آثار ٹٹولتے ہیں جس سے یہ پتا چلے کہ سلمانؓ کے دل میں وہ کیا ارتداد تھا جس پر ابوذر اطلاع پاتے تو سلمانؓ کو قتل کر ڈالتے۔ اگرچہ مخلصین جناب امیر میں سلمانؓ کا مرتبہ سب میں عالی سمجھا جاتا ہے مگر بہت سے قرائن ایسے ہیں کہ یہ سب باتیں ظاہری تھیں اور باطن سلمانؓ کا خلفا کی طرف تھا۔ کسی قدر تغیر حالت سلمان کا تو شیعہ علانیہ تسلیم کرتے ہیں۔ کلینیؒ نے حدیث خطبۃ الطالوتیہ میں روایت

۵ کتاب الروضہ ص۱۶ ۱۲

کی ہے کہ جناب امیر نے جب اپنی بیعت کرنے والوں کو یہ حکم دیا کہ صبح کو سر منڈا کر اظہار زینت پر آویں تو فقط ابوذر اور مقداد اور عمار آئے سلمانؓ ان میں سب سے پیچھے آئے اسی سے ظاہر ہوگیا کہ دل میں وہ جوش نہ تھا کہ اس کام میں سبقت کرتے۔ اور حیات القلوب[1] میں ہے :-

"شیخ کشی بسند معتبر روایت کردہ است کہ ہیچ یک از صحابہ نبود کہ
بعد از حضرت رسول حرکتے نہ کند مگر مقداد بن اسود۔"

اس روایت سے بھی معلوم ہوگیا کہ سلمانؓ ان لوگوں میں تھے جن کو لغزش ہوئی تھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ سلمانؓ کے دل میں یہ لا حل شبہ پیدا ہوگیا تھا کہ جناب امیر اسم اعظم پڑھ کے منافقین کو ہلاک کیوں نہیں کر دیتے چنانچہ حیات القلوب میں ہے :-

"(کشی) بہ سند حسن از حضرت امام باقر روایت کردہ است کہ
صحابہ بعد از حضرت رسول مرتد شدند (معاذ اللہ منہا) مگر سہ نفر
سلمان و ابوذر و مقداد۔ راوی گفت عمار چہ شد۔ حضرت فرمود
کہ اندک میلے کرد و بزودی برگشت۔ پس فرمود کہ اگر کسے را خواہی
کہ ہیچ شک نہ کرد و شبہ او را عارض نہ شد او مقداد است اما سلمان
در دل او عارض شد کہ نزد امیر المومنین اسم اعظم الٰہی است اگر
تکلم نماید بآں ہر آئینہ زمین آں منافقاں را فرو می برد پس چرا

۱ حیات القلوب جلد دوم ص۶۴۳ ۱۲

چنیں مظلوم در دستِ ایشاں ماندہ است چوں در خاطرش گزشت گریبانش راگرفتند و رسنے در گلویش کردند و پیچیدند تا آنکہ کندہ در حلقش بہم رسید۔ حضرت امیر المومنین براو گزشت و باو گفت کہ اے ابو عبد اللہ ایں کندہ گلوئے تو از اں چیز یست کہ در خاطر تو خطور کرد بیعت کن با ابوبکر پس سلمان بیعت کرد۔"

(حیات القلوب جلد دوم ص۶۴۳)

سلمانؓ جناب امیر میں کثرت مزاح اور خوش طبعی کا عیب لگاتے تھے بلکہ انہوں نے جناب امیر کے منہ پر صاف کہہ دیا تھا کہ اسی عیب کی وجہ سے تم خلافت میں سب سے پیچھے ہو گئے چنانچہ خواجہ نصیر الدین طوسی نے اخلاق ناصری میں لکھا ہے :۔

" وامیر المومنین علی رضی اللہ عنہ مزاح بودے تا بحدے کہ مردماں اورا بداں عیب کردند و گفتند لولا[1] دعابۃٌ فیہ" وسلمان فارسی رضی اللہ عنہ اورا گفت در مزاحے کہ با وکرد ہذا[2] اخرک الی الرابعۃ۔"

سلمانؓ کو جناب امیر سے مذہبی مخالفت بھی قدیمی تھی۔ چنانچہ مسئلہ تقیہ میں جناب امیر وجوب کے قائل تھے اور سلمان تقیہ کو خلاف سمجھتے تھے سلمان حدیث پر عمل کرنے والوں کو ملامت کرتے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقولہ حسبنا کتاب اللہ سے موافق تھے۔ چنانچہ حیات القلوب[3] میں کشی کی سند معتبر سے

[1] کاش ان میں مزاح کی عادت نہ ہوتی ۱۲ [2] اسی نے پہونچا دیا تم کو چوتھے نمبر پر ۱۲۔
[3] حیات القلوب جلد دوم ص۶۱ ۱۲

بہ حوالۂ امام باقر علیہ السلام یہ نقل کیا ہے ۔

" سلمان بمردم گفت کہ گریختند از قرآن بہ سوئے حدیث زیراکہ قرآن راکتاب رقیبے یافتند در انجا شمارا حساب مے نمایند بہ نقیر وقطمیر وفتیل یعنی بر امر خوردی وریزہ و برقدر دانۂ خردے پس تنگی کرد برشما احکام قرآن پس گریختند بسوئے احادیثے کہ کار را بر شما کشادہ و آسان کردہ است۔"

سلمانؓ کو خلیفۂ اول کے ساتھ خلوص اور عقیدت قدیمی حاصل تھی اور جس وقت سلمانؓ مسلمان ہوئے تھے تو بہت سے مناقب اور فضائل خلیفۂ اول کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بیان کیے تھے اور یہ کہا تھا کہ ابوبکر مسلمان ہو گئے تو تمام اہل عرب مسلمان ہو جائیں گے۔ چنانچہ مجالس المومنین میں لکھا ہے :۔

" سید المتالہین حیدر بن علی الآملی در کتاب کشکول آوردہ کہ بروایت مشائخ حدیث از عبد اللہ بن حنیف از پدر او مروی است کہ سلمان پیش از ظہور حضرت پیغمبر بمکہ آمدہ بود و دین حق را جستجو می نمود چوں حضرت رسالتؐ مبعوث شد بخدمت آنحضرت آمدہ بشرف اسلام فائز گردید۔ چوں آں حضرت کفایت سلمان را در علم و عمل دید با او مشورت نمود کہ ابتدائے دعوت بکدام یک از اہل مکہ نماید وغرض آں بود کہ مافی الضمیر سلمان از اخلاص ونفاق دراں مشورت ظاہر گردد بعرض رسانید کہ ابتدائے

دعوت برابی الفصیل عبد العزی پسر ابوقحافہ باید نمود کہ درمیان عرب بعلم تعبیر خواب وتاویل منام معروف است وعرب علم تعبیر را نوعے از علم غیب می دانند و اعتقاد تمام بآں دارند واز تواریخ وانساب واحساب ایشاں باخبر است ونیز معلم صبیان ایشان است ودر معاملاتِ خود با در رجوع ومشورت مے نمایند وسادس اورا در قلوب ایشاں اثرے تمام است وہرگاہ ایں چنیں مردے بردستِ شما مسلمان شد وبرسالت شما ایمان آورد آوازہ نبوت شما درمیانہ عرب شائع خواہد شد ومردم از اں اعتبارے گرفتہ قلب ہائے ایشاں نرم شدہ از عصبیت وجاہلیت فرود آمدہ مستعد ہدایت خواہند شد وبعد از اں تصرف در مزاج ایشاں کردہ رواج دین مسلمانی خواہد داد زیرا کہ چوں از کتب سابقہ نبوتِ شما را دانستہ ومحب ریاست وصاحب اخلاق معلمان ومکتب دار انست ومفتون بزرگی وزیادہ طلبی ست بواسطہ طمع در جاہ شما مساعی جمیلہ بظہور خواہد آورد ودر عرب اطاعتِ چنیں کسے را دلیل حقیقت دین شما خواہند دانست واگر ابتدا بہ دعوت از دیگراں کنید او عناد خواہد کرد وچوں مطارقہ[1] ایں رائے باحضرت امیر وابوطالب نمودند ایشاں نیز رائے سلمان را پسندیدند وحضرت رسالتؐ باابوبکر ملاقات نمود وبتدریج

[1] مطارقہ سے موافقت مراد ہے ۱۲۔

تالیف قلب او کردہ تا آنکہ اورا بجانب خود مائل ساخت وخاطر اورا بحصول جاہ وتوسعہ دستگاہ امید وار گردانیدہ تا آنکہ بآں طمع مسلمان شد وحضرت رسول کنیت ونام اورا کہ ابوالفصیل وعبد العزےٰ بود بابوبکر وعبد اللہ تبدیل فرمود وہمیشہ درمیان اصحاب مے گفتند ما سبقکم ابوبکر بصوم ولاصلوٰۃ ولکن بشئ وقر فی صدرہ۔"

(مجالس المومنین مطبوعہ طہران ص۸۹ مجلس سوم ذکر سلمان)

اس حدیث کا ترجمہ یہ ہوا کہ ابوبکرؓ صوم وصلوٰۃ میں تم پر سبقت نہیں لے گیا مگر اس صفت میں سبقت لے گیا ہے جو اس کے سینہ میں قائم ہوگئی ہے۔ یہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تمام صحابہ سے ہے۔ جن میں جناب امیر اور سلمان اور ابوذر اور مقداد اور عمار رضی اللہ عنہم بھی شامل ہیں۔

اہل انصاف اور ارباب عقل سلیم جانتے ہیں کہ اس حدیث سے مدح ابوبکرؓ مقصود ہے اور اس عبارت سے صاف ٹپک رہا ہے کہ ابوبکرؓ کے سینہ میں جو صفت تھی وہ تجلی معرفت الٰہی تھی مگر علامہ شوستری کا تعصب دیکھیے کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ حُبِ ریاست مراد ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب ریاست کا امیدوار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا تھا تو ایسی ریاست کی طلب بھی صفتِ محمود تھی۔ یہ وعدہ رسول کا وعدۂ حصول خلافت تھا جو در حقیقت آیتِ استخلاف کی تفسیر ہے۔

تعجب ہے کہ جناب امیر تو حبِ ریاست میں احکام جور قائم رکھیں اور جاری کریں اور خلیفۂ اول کے لیے حبِ ریاست عیب ہو جائے۔ سلمانؓ نے ابوبکرؓ میں وہ صفتیں بیان کیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ ابوبکرؓ وزیر اور نائب بنانے کے لائق ہیں اور اس رائے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جناب امیر اور ابوطالب کا بھی اتفاق ہو گیا اور اسی قصد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مکہ میں سے سب سے پہلے دعوت اسلام ابوبکرؓ پر پیش کی اور ان کو خلافت کا امیدوار بنایا اور آخر کو ابوبکرؓ میں وہ کمال پایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کو مطلع کر دیا کہ صفات ظاہری میں اگرچہ ابوبکرؓ تمہارے برابر ہے مگر صفات باطنی میں تم سب پر غالب ہے۔

اگر ان سب قرائن پر غور کیا جائے تو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اگرچہ حضرت سلمانؓ بظاہر جناب امیر کے ساتھ تھے مگر دل اُن کا خلفا کے ساتھ تھا۔

شاید جناب امیر نے حضرت ابوذرؓ کو سلمانؓ کی صحبت میں اس لیے متعین کر دیا تھا کہ وہ سلمان کے دل کو خلفا کی طرف سے پھیر کر جناب امیر کی رفاقت کا مشورہ دیتے رہیں لیکن ابوذرؓ کو سلمان کے دل کا حال معلوم نہ تھا اگر معلوم ہو جاتا تو سلمان کو قتل کر ڈالتے۔ سلمانؓ چونکہ ابوذر کی صحبت سے ناراض تھے اس لیے نہایت کج خلقی سے پیش آتے تھے تاکہ ابوذرؓ ان کے پاس آنا چھوڑ دیں۔ ابوذر کے ساتھ جو سلمان کی بدسلوکیاں تھیں ان کے بہت سے قصے منقول ہیں۔ سلمانؓ کی عادت تھی کہ اکثر ابوذرؓ کی ضیافت کرتے

جب وہ کھانے کے لیے آتے تو نہایت ناگوار کھانا پیش کرتے جب انھیں اُس کھانے میں کچھ تامل ہوتا تو سلمانؓ اُن پر بہت خفا ہوتے اور ناشکرا بتا کر ذلیل کرتے۔ ایک مرتبہ دعوت کی اور دو روکھی روٹیاں کچی اُن کے سامنے رکھ دیں ابوذر اس سامان دعوت کو دیکھ کر نہایت حیران ہوئے۔

ففقط دو روکھی روٹیاں وہ بھی کچی ایسی ناگوار اور قلیل طعام کے کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ اگر اپنی طبیعت پر جبر کر کے کھاتے ہیں تو کچی روٹی ہضم نہ ہو گی اگر نہیں کھاتے تو حضرت سلمان قہر نازل کرنے کو تیار۔ ہر طرح مشکل کا سامنا تھا اسی حیرانی میں حضرت ابوذرؓ نے اُن روٹیوں کو الٹنا پلٹنا شروع کیا حضرت سلمان کو تو اس ضیافت سے ابوذر کا ذلیل کرنا مقصود تھا اس لیے ابوذر سے پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے، روٹیوں کو الٹتے پلٹتے کیوں ہو کھاتے کیوں نہیں؟ ابوذرؓ حیران ہوئے کہ اس کا کیا جواب دیں۔ ڈرتے ڈرتے اتنا کہا کہ مجھ کو یہ خوف ہے کہیں یہ روٹیاں کچی نہ ہوں۔ اتنا کہنا تھا کہ حضرت سلمان کو تاب کہاں تھی۔ غضب کا جوش ایسا اٹھا جو کسی طرح ضبط کے قابل نہ تھا۔ اس مضمون کو ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب میں اس طرح لکھا ہے:۔

> "و ابن بابویہ بسند معتبر از حضرت امام محمد تقی روایت کردہ است کہ روزے حضرت سلمان ابوذر را بہ ضیافت طلبید پس دو گردہ نان نزد او حاضر ساخت ابوذر گردہ ہائے نان را بر داشت و می گردانید و در آں نظر می کرد۔ سلمان گفت کہ از برائے چہ کار ایں نانہا را میگردانی۔ گفت می ترسم کہ خوب پختہ نشدہ باشد۔ پس

سلمان بسیار در غضب شد و فرمود کہ چہ بسیار جرات داری کہ ایں نان ہا رامی گردانی و نظر می کنی بخدا سوگند کہ دریں نان کار کردہ است آبے کہ در زیر عرش الٰہی ست و ملائکہ دراں کار کردہ است تا آنکہ آں را در ہوا افگندہ اند و باد در آں عمل کردہ است تا آں را با بر افگندہ است و ابر دراں کار کردہ است تا آنکہ آں را بر زمین افشاندہ است و رعد و ملائکہ در آں ہمہ کار کردہ اند تا آنکہ قطرات آں را در جاہائے خود گذاشتہ اند و عمل کردہ اند در آں زمین و چوب و آہن و چار پایان و آتش و ہیزم و نمک و آنچہ را من احصا نمی توانم کرد زیادہ ازاں است کہ گفتم از کارکناں دریں نان پس چگونہ می توانی بشکر ایں نعمت قیام نمائی۔ پس ابوذر گفت کہ توبہ می کنم بہ سوئے خدا و طلب آمرزش می کنم از آنچہ کردم و بہ سوئے تو عذر مے طلبم از آنچہ تو نخواستی۔"

(جلد دوم حیات القلوب ص۶۱۵)

ابوذر بے چارے کو تو روٹی کے کچے ہونے کا خوف تھا اس کے جواب میں سوال از ریسمان و جواب از آسمان ہوگیا۔ زمین و آسمان کے قلابے ملادیے عرش سے پانی کے اُترنے اور بادل میں پہنچنے اور مینہ برسنے کے عجائبات قدرت اور تمام کھیتی کا سامان بیان ہوگیا۔ گویا ابوذر باوجود صحابی جلیل القدر ہونے کے ان امور سے ناواقف تھے مگر اس طولانی تقریر میں کوئی فقرہ ایسا مذکور نہ ہوا کہ روٹیوں کے کچے ہونے کا شبہ رفع ہوتا۔ ابوذر نے اس غیظ و غضب کو

دیکھ کر بجز توبہ کرنے کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا حالانکہ گناہ بھی نہ تھا وہ کہتے تھے کہ روٹیاں کچی ہیں اور سلمان کہتے تھے کہ پانی عرش سے اُترا ہے۔

سلمانؓ نے اس کے بعد ابوذر کی ایک اور دعوت کی جس کا تکلف پہلی دعوت سے بھی بڑھا ہوا تھا روٹیوں کے سُوکھے ٹکڑے توڑ کر ہمیانی میں بھر لیے جب ابوذر آئے تو سلمان نے ہمیانی جھاڑ کر وہ سوکھے ٹکڑے نکالے اور پانی میں بھگو کے ابوذر کے سامنے رکھ دیے۔ وہ بے چارے اس سامان دعوت کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ پہلی دعوت کا قصہ یاد تھا حضرت سلمانؓ کا مزاج معلوم تھا۔ اتنی تاب کہاں تھی کہ کچھ شکایت کرسکتے مگر مشکل یہ تھی کہ جو ماحضر پیش کیا گیا تھا کھانے کے قابل نہ تھا۔ مجبور ہو کر اول تو اس کھانے کی تعریف کی مگر ڈرتے ڈرتے اتنا بھی کہہ گذرے کہ کاش اس کے ساتھ نمک ہوتا تو بہت خوب ہوتا۔ یہ سُن کر سلمان نے اپنی حرکتوں سے ظاہر کیا کہ یہ فرمائش ان کو بہت ناگوار ہوئی آخر حضرت سلمان اپنا لوٹا لے کر باہر تشریف لے گئے اور اس کو گرو رکھ کر نمک لائے۔ جب حضرت ابوذرؓ نے یہ حالت دیکھی تو وہی وقت یاد آگیا جو پہلے گذر چکا تھا۔ ناچار نمک چھڑک کر ٹکڑوں کو کھانا شروع کیا۔ سُوکھے ٹکڑوں کی شکایت کرتے تو خدا جانے حضرت سلمانؓ کا کیسا غضب نازل ہوتا۔ حضرت ابوذرؓ بھی حد سے زیادہ ظریف تھے اس لیے شکایت کے مضمون کو شکر کے پہلو میں بڑے لطف کے ساتھ ادا کیا اور یوں فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے یہ قناعت دی ہے کہ میں سوکھے ٹکڑے کھا رہا ہوں۔ یہ سنتے ہی حضرت سلمان بگڑ گئے اور فرمایا کہ تجھے قناعت ہوتی

تو میر الوٹا گرو نہ رکھا جاتا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان دونوں پُر تکلف دعوتوں میں کبھی حضرت سلمان بذاتِ خود مہمان عزیز کے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہوئے یہ قصہ بھی حیات القلوب میں روایت سابقہ کے ذیل میں اُسی سند اور حوالہ سے منقول ہے :۔

" وفرمود کہ روزے دیگر سلمان ابوذر را طلبید واز همیان خود چند پارہ نان خشک بیروں آورد وآں نان ہا را تر کردہ از مطہرہ کہ داشت ونزد ابوذر گذاشت پس ابوذر گفت کہ چہ نیکو ست ایں نان کاش نمکے باآں می بود سلمان برخاست و بیروں رفت۔ و مطہرہ خود را گرو گذاشت و نمکے گرفت وبرائے ابوذر آورد پس شروع کرد ابوذر وآں نان ہا را می خوردہ نمک برآں می پاشید ومی گفت حمد می کنم خداوندے را کہ روزی کردہ است مارا چنیں قناعتے۔ سلمان گفت کہ اگر قناعت می داشتی مطہرہ من بگرو نمی رفت۔"

سلمان یہ کج ادائیاں اس لیے کرتے تھے کہ تنگ ہو کر ابوذر ان کے پاس آنا چھوڑ دیں مگر ابوذر کو خبر نہ تھی کہ سلمان کے دل میں کیا ہے اگر خبر ہوتی تو سلمان کو قتل کر دیتے۔ جب سلمان کی یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی اور ابوذر نے ساری ذلتیں جھیلیں مگر آنا نہ چھوڑا تب سلمان نے یہ تدبیر نکالی کہ ابوذر کو ڈرانا شروع کیا۔ یہ ڈرانا اُس دن ہوتا تھا جس دن کوئی مرغن شوربا حضرت سلمان کے باورچی خانہ میں تیار ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ابوذر تشریف لائے

تو سلمان کی دیگ میں جوش آرہا تھا[1] یکایک ہانڈی اُلٹی ہوگئی اور زمین پر نہ شوربا گرا نہ چکنائی گری۔ ابوذرؓ کو یہ حالت دیکھ کر تعجب ہوا۔ اتنے میں حضرت سلمانؓ نے دیگ سیدھی کر دی۔ دوسری بار پھر یہی اتفاق ہوا کہ دیگ اُلٹی ہوگئی اور نہ شوربا زمین پر گرا نہ چکنائی گری۔ یہ تماشا دوبارہ دیکھ کر حضرت ابوذر کے دل میں ایسی ہیبت چھائی کہ ڈر کے مارے بے اختیار اٹھ کر بھاگے۔ چنانچہ حیات القلوب میں لکھا ہے :۔

" وایضاً شیخ کشی وشیخ مفید بسند ہائے معتبر از حضرت امام محمد باقرؑ روایت کردہ اند کہ روزے ابوذر بخانہ سلمان درآمد وقدر[1] سلمان در بار بود پس در اثنائے آنکہ بایک دیگر سخن می گفتند قدر[1] سرنگوں شد وہیچ از مرق[2] وچربی آں بر زمین نہ ریخت پس تعجب ابوذر زیادہ شد واز خانہ سلمان دہشت زدہ بیروں آمد۔"

(حیات القلوب جلد دوم ص ۶۰۹)

اس کے بعد اس روایت میں یہ بھی ہے کہ راستے میں ابوذر کو جناب امیر مل گئے اور تسلی دے کر پھر ان کو سلمان کے پاس واپس لائے اور بلحاظ مصلحت بہت سے مناقب حضرت سلمان کے بیان کر دیے اور حضرت سلمان کو بھی سمجھا دیا کہ ابوذر کو ڈرایا مت کرو۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت ابوذر صحابی جلیل القدر صاحب خوارق وکرامات تھے اگر حضرت سلمان کی ہانڈی اُلٹنے اور شوربا نہ گرنے میں کچھ کرامت کا اثر ہوتا تو حضرت ابوذر ہرگز نہ ڈرتے

[1] دیگ سلمان کی جوش میں تھی۔ [2] مرق۔ شوربا۔

شاید اُنھوں نے اس شعبدے کو کرامت کے اثر سے خالی پایا اسی وجہ سے ہیبت زدہ ہو کر بھاگے۔

ان تمام قرائن پر غور کرنے سے بہت اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ سلمان جس امر کا ابوذر سے تقیہ کرتے تھے اور ابوذر کو باطن سلمان کی خبر ہو جاتی تو سلمان کو قتل کر ڈالتے وہ یہی امر تھا کہ سلمان کا دل خلفا کی طرف تھا اور بظاہر جناب امیر کے ساتھ تھے مگر جو بات دل میں بیٹھی ہوئی تھی اُس کا اثر کسی نہ کسی طرح ہمیشہ ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جناب امیر کی رفاقت میں ان کو سبقت کا جوش نہ تھا احجار زیت پر سب کے پیچھے گئے۔ مقداد کی طرح پورے ثابت قدم نہ نکلے بلکہ اُن صحابہ میں شامل تھے جن کو بعد وفات رسول کے لغزش ہوئی یہ شبہ بھی اُن کو پیش آیا کہ جناب امیر اسم اعظم پڑھ کر منافقوں کو غارت کیوں نہیں کر دیتے۔ جناب امیر سے انھوں نے صاف کہہ دیا کہ تم میں مزاح اور خوش طبعی کا عیب ہے۔ اسی عیب کی وجہ سے تم خلافت میں سب سے پیچھے ہو گئے۔ ابوذرؓ کے ساتھ انھوں نے وہ کج خلقی کی جو حقوق اخوت اور خلق محمدی کے بالکل مخالف تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ جانتے تھے کہ ابوذر کو میرے دل کا بھید معلوم ہو جائے گا تو مجھ کو قتل کر دیں گے اسی لیے وہ ابوذر سے تقیہ کرتے تھے اور ایسی تدبیریں کرتے تھے کہ ابوذر ان کے پاس آنا چھوڑ دیں۔ کبھی دعوت کر کے ذلیل کرتے تھے اور روکھی روٹیاں اور سوکھے ٹکڑے پیش کرتے تھے اور پھر بھی ناشکرا بتاتے تھے اور جب مرغن شوربا پکاتے تو ابوذر کو ڈرا ڈرا کر بھگا دیتے۔ خلیفۂ اول کے ساتھ ان کو قدیمی خلوص تھا۔ چنانچہ جس وقت

حضرت سلمان مسلمان ہوئے اسی وقت خلیفۂ اول کے بہت سے فضائل اور مناقب رسولؐ سے بیان کیے اور صاف کہہ دیا کہ ترقی اسلام ابوبکر کی ذات پر منحصر ہے۔ مقولہ حسبنا کتاب اللہ میں خلیفۂ ثانی سے موافق تھے۔ سلمانؓ نے جو سانپ یہودیوں کے غارت کرنے کے لیے نکالے تھے وہ جناب امیر کی مدد کے لیے نہ نکالے۔ یہ تمام قرائن حضرت سلمان کے دل کا حال بہت اچھی طرح ظاہر کر رہے تھے۔ آخر حضرت سلمان سے ضبط نہ ہو سکا اور تقیہ کا پردہ توڑ کر کھلم کھلا جناب امیر کی رفاقت چھوڑ کر خلیفہ ثانی کے حضور میں پہنچے اور مدائن کی حکومت حاصل کر کے سیدھے چل دیے۔ پھر کبھی جناب امیر کی صورت بھی نہ دیکھی۔ اس کے بعد حضرت ابوذر کو بھی سفر کی ضرورت پیش آئی مگر باوجود بھائی ہونے کے سلمان کے پاس جانا انھوں نے گوارا نہ کیا۔

سب سے زیادہ عجیب ائمہ کی تفسیریں ہیں جن کی بدولت قرآن کی فصاحت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس مختصر رسالے میں ہم ایک آیت کی تفسیر جو جناب امیر سے کافی میں منقول ہے بطور نمونہ نقل کرتے ہیں۔ اول قرآن کی آیت سمجھ لیجیے جو سورۂ لقمان میں ہے:-

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْہِ	اور حکم کیا ہے ہم نے انسان کو ماں باپ
حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ وَھْنًا عَلٰی وَھْنٍ	کے حق کا۔ حمل میں رکھا ہے انسان کو اُس
وَّفِصٰلُہٗ فِیْ عَامَیْنِ اَنِ اشْکُرْ لِیْ	کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر
وَلِوَالِدَیْکَ اِلَیَّ الْمَصِیْرُ ○	اور دودھ چھٹانا اس کا دو برس میں ہے
وَاِنْ جَاھَدٰکَ عَلٰٓی اَنْ	اور یہ کہ شکر کر میرا اور اپنے ماں باپ کا۔

تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○

میری طرف پھر کر آنا ہے اور اگر وہ دونوں تجھ سے جھگڑا کریں اس پر کہ شرک کرے تو میرے ساتھ جس پر تیرے پاس کوئی دلیل نہیں تو اُن دونوں کی اطاعت مت کر اور صحبت رکھ ان سے دنیا میں نیکی کے ساتھ اور پیری کر اُس شخص کے راستے کی جو میری طرف رجوع کرے۔ پھر تم سب کا میری طرف پھر کر آنا ہے تو میں تم کو آگاہ کر دوں گا اس پر جو تم عمل کرتے تھے۔

ف اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے کا حکم کیا ہے کہ ہمارا اور اپنے ماں باپ کا شکر ادا کر۔ ماں کا یہ حق ہے کہ اُس نے ایام حمل میں ضعف پر ضعف اٹھایا ہے اور دو برس تک دودھ پلایا ہے۔ اے انسان اس حکم کو ضرور ادا کر اس لیے کہ آخر کو ہمارے سامنے آنا ہے اور اگر ماں باپ تجھ سے یہ چاہیں کہ تو اللہ کے ساتھ شرک کرے جو بے دلیل حکم ہے اور اس امر پر تجھ سے جھگڑا کریں تو اس امر میں تو ہرگز ان کی اطاعت مت کر۔ مگر دنیا میں اُن کے ساتھ نیکی کر۔ اور اُس کا طریقہ اختیار کر جو اللہ کی طرف رجوع کرے۔

اس ترجمہ و تفسیر کو خوب سمجھ لیجیے صاف مضمون ہے کسی قسم کی پیچیدگی نہیں۔ اب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو اس آیت کی تفسیر بیان کی ہے اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اور حکم کیا ہم نے انسان کو اُن دونوں کے حق کا جنہوں نے علم پیدا کیا ہے اور حکمت کی میراث دی انہیں دونوں کی اطاعت کا اللہ نے سب آدمیوں کو حکم کیا ہے۔

ف یعنی یہ حکم ماں باپ کے لیے نہیں بلکہ اُن دونوں کے لیے ہے جو علم کے والد اور حکمت کے مورث ہیں۔ جناب امیر نے یہ نہ بتایا کہ وہ دونوں کون ہیں؟ مگر خلیل قزوینی نے ترجمہ اصول کافی میں لکھا ہے کہ اُن دونوں کی مراد قرآن اور امام ہیں قرآن ماں ہے اور امام باپ ہے پس یہ دونوں والدین ہوئے۔

اہل انصاف غور فرمائیں کہ اگر یہ تحریف نہیں تو اور کیا ہے؟ —

حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ

اس کی تفسیر خود تو جناب امیر نے کچھ نہ فرمائی مگر علمائے شیعہ نے جناب امیر کے کلام سے استنباط کر کے تفسیر گوئی کا حق ادا کیا ہے جو بعد کو مذکور ہوگی۔

أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ○ یعنی میرا شکر کر۔ اور علم و حکمت سکھانے میں جو والد ہیں اُن کا شکر کر۔ میری طرف پھر کر آنا ہے۔

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا اور اے پیغمبر اگر عمرؓ اور ابوبکرؓ تجھ سے جھگڑا کریں کہ علیؑ کی وصیت میں تو ان کو بھی شریک کر دے اور علی کی اطاعت کا جو تو نے حکم کیا ہے اس میں تو علی کے ساتھ اُن کو بھی برابر کر دے جس کی تیرے پاس کوئی دلیل

نہیں تو اس باب میں تو عمر اور ابوبکر کی اطاعت مت کر۔

مسلمانو خدا کے واسطے انصاف کرو کیا کسی کی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ مضمون اس آیت کی تفسیر ہے بلکہ یقیناً تحریف ہے۔ پہلے سے تو والدین کا ذکر تھا اور جَاهَدَاكَ اور لَا تُطِعْهُمَا میں جو تثنیہ کی دونوں ضمیریں ہیں اللہ نے اپنے کلام میں وہ ضمیریں انسان کے ماں باپ کی طرف پھیری تھیں۔ جناب امیر نے عمرؓ اور ابوبکرؓ کی طرف پھیر دیں۔ جن کا نہ یہاں ذکر تھا نہ کسی قسم کا تعلق اور ربط تھا اَنْ تُشْرِكَ بِيْ میں اللہ کے ساتھ شریک کرنے کا ذکر تھا جناب امیر نے اپنی ولایت میں شریک کرنا مراد لے لیا۔

اس تفسیر میں جو کچھ بوالعجبی ہے وہ تو ظاہر ہے اس کے سوا ایک نکتہ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ آیت حضرت علی کی طرف سے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی نہ کہ اللہ کی طرف سے اور اس میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے کی نہی نہیں بلکہ حضرت علی نے اپنی ولایت میں کسی کو شریک کرنے سے منع فرمایا ہے۔

اب حضرات شیعہ انصاف کریں کہ قرآن کی کیا حالت ہو گئی۔

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا۔ اور علم و حکمت سکھانے میں جو والد ہیں اُن کی ساری دنیا میں تعریف کر۔

ف اس سے پہلے فَلَا تُطِعْهُمَا کی ضمیر عمرؓ اور ابوبکرؓ کی طرف تھی اب صَاحِبْهُمَا کی ضمیر پھر والدین کی طرف پہونچ گئی۔ والدین سے جو کچھ مراد ہے وہ پہلے معلوم ہو چکی اگر صَاحِبْهُمَا سے بھی شیخین مراد ہوتے تو ان کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہو جاتی اس لیے چار و ناچار والدین کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ معروف کے لفظ نے فضیلت اور تعریف کے معنی پیدا کر دیے جو تفسیر جناب امیر سے منقول ہو اُس میں کلام کی فصاحت اور قواعد عربیت کی مطابقت اور الفاظ کی مناسبت کی کوئی ضرورت نہیں۔

اسی تفسیر نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ بے شک ائمہ کے سوا قرآن کی صاف اور واضح آیتوں کو بھی کوئی نہیں سمجھ سکتا اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اگر ایسی ہی تفسیر ہے تو قرآن بے شک حجت نہیں۔

جناب امیر کی عظمت و شان کو غور کرو کیا وہ قرآن کی ایسی ہی تفسیر کریں گے؟ (معاذ اللہ منہا) اب اصل روایت کافی کی بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

عن الاصبغ بن نباتۃ انہ سال امیر المومنین علیہ السلام عن قولہ تعالیٰ ان اشکرلی ولوالدیک الی المصیر فقال الوالدان اللذان اوجب اللہ لھما الشکر ہما اللذان ولدا العلم وورثا الحکم وامر الناس بطاعتھما ثم قال اللہ الی المصیر فمصیر العباد الی اللہ والدلیل علی ذلک

اصبغ بن بناتہ سے روایت ہے کہ اُس نے امیر المومنین علیہ السلام سے آیہ کریمہ ان اشکرلی ولوالدیک الی المصیر کی تفسیر پوچھی تو امیر المومنین نے فرمایا کہ دونوں والدین کا شکر اللہ نے واجب کیا ہے وہی دونوں ہیں جنہوں نے علم پیدا کر دیا اور حکمت کی میراث دی اور سب آدمیوں کو اُن دونوں کی اطاعت کا حکم کیا گیا ہے پھر اللہ نے فرمایا کہ الی المصیر پس رجوع کرنا بندوں کا اللہ کی طرف ہوگا اور والدین

الوالدات ثم عطف القول على ابن حنتمة وصاحبه فقال في الخاص والعام ان جاهداك على ان تشرك بي تقول في الوصية وتعدل ممن امرت بطاعته فلا تطعهما ولا تسمع قولهما ثم عطف القول على الوالدان فقال وصاحبهما في الدنيا معروفا۔ يقول عرف الناس فضلهما وادع الى سبيلهما۔ (اصول کافی ص۲۷)

اس کی دلیل ہیں۔ پھر اللہ نے اپنی بات کو پھیر کر ابن حنتمہ (عمرؓ) اور اس کے ساتھی (ابوبکرؓ) کے ذکر سے ملایا اور خاص و عام میں کہہ دیا وان جاھداک علی ان تشرک بی یعنی اگر عمرؓ اور ابوبکرؓ وصیت میں جھگڑا کریں اور اس بات پر لڑیں کہ تو ان کو اُس شخص کے ساتھ برابر کر دے جس کی اطاعت کا تو نے حکم دیا ہے تو اے پیغمبر تو عمرؓ اور ابوبکرؓ کی بات مت مان اور ان دونوں کا قول مت سُن۔ پھر اللہ نے اپنی بات کو پھیر کر والدین کا ذکر کیا اور فرمایا وصاحبھما فی الدنیا معروفا فرماتا ہے بیان کر آدمیوں میں والدین کی فضیلت اور اُن دونوں کے راستے کی طرف بلا۔

قزوینی نے لکھا ہے۔ حنتمہ بفتح حائے بے نقطہ و سکون نون و فتح تائے دو نقطہ در بالا مادر عمر است و صاحبش ابابکر است یعنی حنتمہ عمرؓ کی ماں کا نام تھا بس ابن حنتمہ سے عمرؓ مراد ہیں اور ان کے ساتھی سے ابوبکرؓ مراد ہیں ترتیب خلافت اس امر کی مقتضی تھی کہ پہلے ابوبکرؓ کا نام ہوتا پھر عمرؓ کا۔ لیکن جناب امیر نے اس عجیب و غریب تفسیر میں اول عمرؓ کا ذکر کیا۔ اس کا نکتہ

خلیل قزوینی نے جو بیان کیا ہے وہ بھی نہایت عجیب ہے۔ چنانچہ قزوینی نے حملتہ امہ وھنا علی وھن کی جو تفسیر کی ہے اُس میں لفظ اُمہ سے قرآن مراد لیا ہے یعنی قرآن نے ضعف بالائے ضعف اٹھایا۔ ایک ضعف خلافت ابوبکرؓ کا اور دوسرا ضعف خلافت عمرؓ کا۔ اس صورت میں ضعف اول جو قرآن میں موخر مذکور ہے خلافت ابوبکرؓ ہے اور اس کے اوپر ضعف ثانی جو قرآن میں اوّل مذکور ہے خلافت عمرؓ ہوئی۔ پس قرآن میں پہلے خلافت عمرؓ کا ذکر تھا اسی لیے جناب امیر نے اول ابن حنتمہ یعنی عمرؓ ذکر کیا۔ مگر قزوینی نے یہ ظاہر نہ کیا کہ حملتہ میں جو ضمیر ہے وہ کدھر کو پھرے گی۔

وفصالہ فی عامین کی تفسیر قزوینی نے یہ کی ہے کہ ابوبکرؓ کی خلافت دو برس میں ختم ہو گئی۔ اس تفسیر سے ظاہر ہو گیا کہ قزوینی مطالب تفسیری کے بیان کرنے میں جناب امیر پر بھی غالب رہے۔ ؎

گر تو تفسیر این چنیں دانی
ببری رونقِ مسلمانی

کافی کی اس حدیث کا ترجمہ ملائے مجلسی نے بھی حیات القلوب[1] میں لکھا ہے اور وہ یہ ہے:-

"در کافی بسند معتبر از اصبغ بن نباتہ روایت کردہ است او سوال کرد از امیر المومنین از تفسیر قول حق تعالی ان اشکرلی ولوالدیک الی المصیر حضرت فرمود کہ والدان کہ خدا شکر

[1] حیات القلوب جلد سوم ص۶۷ ۱۲

ایشاں را واجب گردانیدہ آں دو پدر اند کہ علم از ایشاں متولد
شدہ و حکمت از ایشاں بمیراث ماندہ و مامور شدہ اند مردم باطاعت
ایشاں پس حق تعالیٰ الی المصیر پس بازگشتِ بندگاں بسوئے
خداست و دلیل تاویل لفظ والدانست پس گردانید سخن را بابوبکر
و عمر و فرمود و ان جاھداك علی ان تشرك بی یعنی اگر ابوبکر و عمر
با تو مجادلہ کنند کہ شریک بیاوری یعنی در وصیت شریک گردانی با آں
کسے کہ خدا امر فرمودہ است کہ وصی خود گردانی یعنی علی بن ابی طالب
دیگرے را پس اطاعت ایشاں کن و سخن ایشاں را مشنو۔ پس
گردانید سخن را بسوئے والدین و فرمود وصاحبھما فی الدنیا
معروفا یعنی بمردم شناسان فضیلت ایشاں را و مردم را دعوت
کن براہ متابعت ایشاں۔"

ابو نصر عراقی نے کتاب الامالی میں لکھا ہے کہ ہشام خارجی نے کتب
شیعہ میں علی کی تفسیروں کو دیکھ کر یہ کہا کہ اگر بفرض تسلیم شیعوں کا یہ قول مانا
جاوے کہ خلفا نے علی پر کچھ تشدد کیا تھا تو اس کا غدر علی کی ان تفسیروں سے ظاہر
ہے شاید خلفاء کو علیؓ کی ایسی تفسیروں کی خبر ہو گئی ہوگی جو اہل کتاب کی تحریف سے
بھی بدتر ہیں۔

بھلا خلفاء کو یہ تاب کہاں تھی کہ کوئی ان کے سامنے قرآن کو اس طرح
بگاڑے یہ علی ہی کی رعایت تھی کہ قرآن کو بگاڑنے اور تحریف کرنے کے عوض میں
بھی صرف کسی قدر تنبیہ اور تشدد پر اکتفا کیا ورنہ اگر کوئی اور شخص قرآن کو انکے سامنے

اس طرح بگاڑتا تو بڑی سختی سے قتل کرتے۔

سب سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ روایات شیعہ سے یہ معلوم ہوتا
ہے کہ رسول اپنی اولاد پر ایسے نامہربان تھے کہ انھوں نے مدینہ میں پہنچ جانے
کے بعد اپنی بیٹی رقیہؓ کا نکاح عثمانؓ سے کیا اور جب رقیہ کو (معاذ اللہ منہا) عثمان
نے قتل کر دیا تو عثمانؓ سے قصاص بھی نہ لیا نہ اور کسی قسم کی سزا دی بلکہ فوراً انھیں
عثمانؓ سے اپنی دوسری بیٹی ام کلثوم کا نکاح کر دیا۔ ملائے مجلسی نے حیات القلوب
میں لکھا ہے:۔

"عیاشی روایت کردہ است کہ از حضرت صادق پرسیدند کہ
آیا حضرت رسولؐ دختر خود را بعثمان داد حضرت فرمود کہ بلے او
گفت کہ چوں دختر آں حضرت را شہید کرد بازدخترے دیگر بہ
او داد حضرت فرمود کہ بلے۔" (حیات القلوب جلد دوم ص۵۶۳)

حضرات شیعہ اس موقع پر انصاف فرمائیں کہ جب رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم مدینہ میں پہونچ گئے تو کوئی مجبوری نہ تھی پھر عثمانؓ سے قرابت کیوں
کی جو بزعم شیعہ مومن صادق بھی نہ تھے اور یہ لحاظ کیوں نہ کیا کہ مومنہ متقیہ پر
ایسے شخص کی اطاعت اور صحبت عذاب الیم ہوگی۔ یہ کیسا ظلم تھا کہ اپنی پیاری
بیٹی ایک ایسے شخص کے پھندے میں پھنسا دی جس کے دل میں بقول شیعہ
ایمان بھی نہ تھا اور باایں ہمہ وہ ایسا ظالم تھا کہ اس نے رسول کی بیٹی کو قتل کر دیا

لہ دوم رقیہ گویند کہ اول او را عتبہ پسر ابولہب تزویج نمودہ بود و او را طلاق گفت و در مدینہ
عثمان او را تزویج نمود۔ (حیات القلوب حصہ دوم ص۵۶)

(معاذاللہ منہا) اگر آج کل کوئی شیعہ اپنی بیٹی کو اس طرح مصیبت میں گرفتار کرے تو ساری قوم اس کو کیا کہے گی؟۔

پیغمبرؐ اپنی بیٹی کی حالت سے ایسے بے خبر کیوں ہو گئے تھے کہ ہلاکت تک نوبت پہونچی پہلے سے اس کا تدارک کیوں نہ کیا۔ حالانکہ رقیہؓ نے بار بار اپنی حالت کی خبر بھیجی مگر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ پروانہ کی اگر شوہر کی شکایت ناپسند تھی تو عیادت تو کی ہوتی۔ آخر خبر کی تو اس وقت جب وہ صدمہ لاعلاج ہو گیا تھا۔ حیات القلوب میں لکھا ہے کہ اول عثمانؓ نے اونٹ کے کجاوہ کی لکڑی سے رقیہ بنتِ رسولؐ کو مار مار کر بہت زخمی کیا جب اُنہوں نے رسولؐ کے پاس اطلاع بھیجی تو رسولؐ نے شوہر کی شکایت ناپسند کی اس کے بعد پھر چند مرتبہ رقیہ نے اپنی مصیبت کی خبر بھیجی مگر ہر مرتبہ رسولؐ نے اسی طرح ٹالا۔ چوتھی مرتبہ جب یہ خبر بھیجی کہ اب میں مری تب علیؑ کو بھیجا۔ اصل عبارت حیات القلوب کی یہ ہے:۔

"درچوب جہاز شتر را گرفت وبسیار برا وزد وا ورا خستہ ومجروح گردانید پس آن مظلومہ بخدمت پدر خود فرستاد واز عثمان شکایت کرد وحال خود بآن حضرت عرض کرد۔ حضرت در جواب او فرستاد کہ حیائے خود را نگاہدار کہ بسیار قبیح است کہ زنے کہ صاحب نسب ودین باشد ہر روز شکایت از شوہر خود نماید پس چند مرتبہ دیگر فرستاد بخدمت آنحضرت شکایت کرد ودر ہر مرتبہ حضرت چنیں جواب فرمود تا آنکہ در مرتبہ چہارم فرستاد کہ مرا کشت

ودریں مرتبہ آں حضرت علی بن ابی طالب را طلبید وفرمود کہ شمشیر خود را بردار وبرو بخانہ دختر عم خود واو را بنزد من بیاور واگر عثمان مانع شود نگذارد واو را بشمشیر خود بکش وحضرت بے تابانہ از عقب او روانہ شد واز شدت اندوہ گویا حیران گردیدہ بود۔ چون حضرت رسولؐ بدر خانہ عثمان رسید حضرت امیر المومنین آں شہیدۂ مظلومہ را بیرون آوردہ بود چون نظرش بآں جناب افتاد صدا بگریہ بلند کرد وحضرت نیز از مشاہدۂ حال او بسیار گریست واو را با خود بخانہ خود آورد چون بخانہ داخل شد پشت خود را کشود وبہ پدر بزرگوار خود نمود حضرت دید کہ پشتش تمام سیاہ ومجروح گردیدہ است پس حضرت سہ مرتبہ فرمود کہ چرا ترا کشت واین در روز یکشنبہ بود پس روز دوشنبہ وسہ شنبہ آں مظلومہ بر بستر درد والم خوابید ودر روز چہار شنبہ باعلیٰ درجات شہیداں ملحق گردید۔"

(حیات القلوب جلد دوم ص ۵۶۳)

کیا شریعت میں یہ حکم ہے کہ عورت اپنے شوہر کے ظلم سہ سہ کر ہلاک ہو جاوے اور فریاد نہ کرے اگر کوئی غیر عورت اپنے شوہر کے ظلم کی فریاد کرتی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بے شک اس کی فریاد سُنتے اور انصاف کرتے لیکن اپنی بیٹی کی مصیبت کی خبر پاکر عمداً کئی روز تک بے پروائی کی، مزاج پُرسی کو بھی تشریف نہ لے گئے۔ نواسے کی شہادت جو ان کی وفات سے پچاس برس بعد ہونے والی تھی اُس کا تو ایسا صدمہ تھا کہ اللہ کی بھیجی ہوئی بشارت بار بار رد ہوتی تھی۔ اور

بیٹی کی شہادت کا حادثہ جو ان کے سامنے ہو رہا تھا اُس سے ایسی بے پروائی کی ان واقعات پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر شیعوں کی روایتوں کو سچا فرض کیا جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ پیغمبر نے اپنی بیٹی کی حالت سے ایسی غفلت کی کہ گویا خود اُس کو قتل کرایا۔

سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ رقیہ کے قتل کے بعد قاتل سے نہ قصاص لیا، نہ بطور تعزیر کچھ سزا دی۔ اگر کوئی شخص اپنی بی بی کو اس طرح مار ڈالتا تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کچھ تعزیر ضرور اُس پر جاری کرتے یا خون بہا لیتے مگر پیغمبر کی بیٹی کا خون معاف تھا۔ اُس کے قاتل کے واسطے شریعت میں کوئی سزا مقرر نہیں ہوئی تھی۔

اس سے بھی زیادہ تعجب یہ ہے کہ اس جاں گزا حادثہ کے بعد پیغمبر نے فوراً اپنی دوسری بیٹی کا عثمانؓ کے ساتھ نکاح کر دیا اور جس شخص کی حالت کا ایسا تجربہ ہو چکا تھا۔ اب پھر اُس کو داماد بنا لیا۔ اور دوسری بیٹی ام کلثوم بھی اُس کے حوالے کر دی۔ چنانچہ حیات القلوب میں دختران پیغمبر کی تفصیل میں لکھا ہے:۔

"سوم اُم کلثوم و اورا نیز عثمان بعد از رقیہ تزویج نمود۔"

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عثمانؓ کو اپنا داماد بنایا اور ایک بیٹی کے مرجانے کے بعد دوسری بیٹی کا عثمانؓ کے ساتھ نکاح کیا یہ دلیل واضح نہیں ہے کہ عثمانؓ مومن کامل اور متقی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی حالت کو پسند کرتے تھے۔ اور اگر (معاذ اللہ) عثمانؓ کی وہ حالت ہوتی جو شیعوں نے فرض کر لی اور اس روایت سے ثابت ہوتی ہے تو پیغمبر ہرگز اُن سے قرابت

نہ کرتے اور بالفرض اگر غلطی سے پہلی قرابت ہو گئی تھی اور اُس کا نتیجہ ایسا خراب ظاہر ہوا تھا تو دوسری قرابت نہ کرتے۔ شیعہ جب اس قرابت کی فضیلت کو نہ چھپا سکے تو انہوں نے اپنی عادت کے مطابق یہ افترا کیا کہ رقیہ بنتِ رسولؐ کو عثمانؓ نے اتنا مارا کہ وہ اس صدمہ سے ہلاک ہو گئیں۔

رُواۃِ شیعہ کو اس کی کیا پروا تھی کہ اس روایت کی بدولت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنے الزام قائم ہو گئے۔ حضرات شیعہ کتنا ہی حق کے بگاڑنے میں کوشش کریں مگر عقل سلیم شاہد ہے کہ رسولؐ نے دوبارہ جو عثمانؓ سے قرابت کی اس سے بہت بڑی فضیلت عثمانؓ کی ثابت ہوئی جس کو حضرات شیعہ کسی طرح نہیں چھپا سکتے۔

آسمان سے جو ہر شام کو یہ ندا ہوتی ہے کہ عثمانؓ اور ان کے گروہ والے نجات پانے والے ہیں۔ اور صبح کو یہ ندا ہوتی ہے کہ علیؓ اور ان کے گروہ والے نجات پانے والے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دونوں رسولؐ کے داماد ہیں۔ اسی لیے ندا میں ان دونوں کی تخصیص ہوئی۔ عثمانؓ کا وہ مرتبہ تھا کہ واقعہ حدیبیہ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ منظور ہوا کہ مکہ میں جو ضعفائے

---

۱ بعض شیعہ عثمانؓ کی دامادی کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ رقیہ اور ام کلثوم پیغمبرؐ کی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ خدیجہ کی بیٹیاں پہلے شوہر سے تھیں مگر یہ قول احادیث صحیحہ کے خلاف ہے۔
نہج البلاغت میں ہے کہ جب جناب امیر بعض دادخواہوں کی طرف سے وکیل بن کر عثمانؓ کو سمجھانے گئے اور اس وقت عثمانؓ کے بہت سے مناقب بیان کیے تو من جملہ ان کے یہ بھی فرمایا وقد نلت من صهره ما لم ينالا اور بے شک پایا تو نے شرف رسول کی

مومنین کافروں کے گروہ میں گھرے ہوئے تھے ان کے پاس یہ بشارت بھیجیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۹) دامادی کا جو شیخین نے نہ پایا تھا۔ یہ کلام جناب امیر کا شرح ابن میثم، مطبوعہ طہران کے جزو ۱۲ پر مرقوم ہے پس جناب امیر کے کلام سے عثمانؓ کا داماد رسول ہونا ثابت ہوگیا اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ یہ دامادی ان کی بہت بڑی فضیلت تھی اس لیے کہ جناب امیر نے اس فضیلت میں ان کو شیخین پر ترجیح دی۔ ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب کی جلد ثانی کے باب پنجاہ ویکم میں لکھا ہے کہ کتاب قرب الاسناد میں بسند معتبر امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ ام کلثوم اور رقیہ بطن خدیجہ سے پیغمبر کی بیٹیاں تھیں اور ابن بابویہ نے بھی بسند معتبر یہی روایت کی ہے کہ یہ دونوں بیٹیاں پیغمبر کی تھیں۔ پھر لکھا ہے کہ مشہور یہی ہے کہ پیغمبر کی چار بیٹیاں تھیں اول زینبؓ دوسری ام کلثومؓ تیسری رقیہؓ۔ پھر لکھا ہے کہ "جمعے از علمائے خاصہ و عامہ را اعتقاد آنست کہ رقیہ وام کلثوم دختران خدیجہ بودند از شوہر دیگر و بعضے گفتہ اند کہ دختران ہالہ خواہر خدیجہ بودہ اند بر نفی ایں دو قول روایات معتبرہ دلالت می کند" بعض علمائے خاصہ اور عامہ سے ایک گروہ کا یہ اعتقاد ہے کہ رقیہ اور ام کلثوم خدیجہؓ کی بیٹیاں دوسرے شوہر سے تھیں اور بعض کا قول ہے کہ ہالہ کی بیٹیاں تھیں جو خدیجہؓ کی بہن تھی ان دونوں قولوں کو بہت سی معتبر روایتیں رد کرتی ہیں۔ ملائے مجلسی کا یہ افترا ہے کہ اس قول کو عامہ یعنی اہل سنت کی طرف منسوب کر دیا۔ اصول کافی میں باب مولد النبی میں لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدیجہؓ سے بیس برس سے زیادہ عمر میں نکاح کیا تھا اور قبل رسالت پیغمبرؐ کی خدیجہؓ سے قاسم اور رقیہ اور زینب اور ام کلثوم پیدا ہوئے اور بعد رسالت کے طیب اور طاہر اور فاطمہؓ۔ خلیل قزوینی نے صافی شرح کافی میں لکھا ہے "زادہ شد برائے او از خدیجہؓ پیش از رسالت او قاسم و رقیہ و زینب و ام کلثوم ۱۲۔

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سفارت کے منصب پر مقرر ہو کر اس نازک وقت میں کہ جان کا خوف تھا مکہ میں گئے اور سفارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ادا کی۔ اگر عثمانؓ مومن کامل نہ ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنی طرف سے ایسے وقت میں سفیر مقرر کر کے کیوں بھیجتے؟ حیات القلوب[1] میں لکھا ہے:۔

"پس حضرت بہ نزد عثمانؓ فرستاد کہ برد بہ سوئے قوم خود از مومناں و بشارت دہ ایشاں را بآنچہ وعدہ دادہ است مرا خدا از فتح مکہ پس عثمان داخل شد و رسالت حضرت را رسانید"

اس سے بڑھ کر فضیلت عثمانؓ کی یہ ہے کہ اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہونچی کہ مشرکین نے عثمانؓ کو قید کر لیا تو اس وقت آپؐ نے مشرکین سے لڑنے کا قصد کیا اور ایک درخت سے تکیہ لگا کر صحابہ سے بیعت لی اس بیعت کا نام بیعت رضوان ہے۔ اس بیعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر مارا اور یہ فرمایا کہ یہ عثمان کی طرف سے بیعت ہے۔ حیات القلوب[2] میں ہے:۔

"و بروایت شیخ طبرسی چوں مشرکان عثمان را حبس کردند خبر بحضرت رسید کہ او را کشتند۔ حضرت فرمود کہ ازیں جا حرکت نمی کنم تا با ایشاں قتال کنم و مردم را بسوئے بیعت دعوت نمائیم و برخاست و پشت مبارک بدرخت داد و تکیہ کرد و صحابہ بآں حضرتؐ بیعت کردند

---

[1] حیات القلوب۔ جلد دوم ص۴۰۴ [2] ایضاً ص۴۰۴

کہ با مشرکان جہاد کنند و نگریزند. و بہ روایت کلینی حضرت یک دستِ خود را بر دستِ دیگر زد و برائے عثمان بیعت گرفت۔"

کافی کی کتاب[1] میں منقول ہے:۔

وبایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسلمین وضرب باحدی یدیہ علی الاخری لعثمان۔	اور بیعت لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے اور مارا ایک ہاتھ اپنا دوسرے ہاتھ پر واسطے عثمان کے۔

یہ بیعت درحقیقت اس امر کا معاہدہ تھا کہ اس جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شریک ہو کر مشرکین سے لڑیں گے اور منہ نہ پھیریں گے۔ یہ معاہدہ ہر شخص اپنے اختیار سے کرتا ہے۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بغیر اجازت عثمانؓ کے عثمانؓ کی طرف سے معاہدہ کیا یہ دلیل اس امر کی ہے کہ عثمانؓ کو مومن کامل سمجھتے تھے اور اُن پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ اپنے ہاتھ کو عثمانؓ کا ہاتھ بنایا یہ دلیل اس امر کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عثمانؓ کے ساتھ ایسا اتحاد تھا کہ گویا اپنی ذات کو ان کی ذات کے ساتھ متحد سمجھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ ہمارا معاہدہ بعینہٖ عثمانؓ کا معاہدہ ہے اور ہمارا ہاتھ گویا عثمانؓ کا ہاتھ ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عثمانؓ کی طرف سے بیعت کرنے کا اختیار کیا تھا اور جو بیعت بغیر اجازت عثمان کے ہوئی تھی وہ عثمانؓ پر لازم کیوں ہوتی؟۔

حضرات شیعہ آیت وانفسنا وانفسکم سے استدلال کر کے

[1] کتاب الروضہ ص ۱۵۱

اتحاد جناب امیر کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ تکلف ثابت کرتے ہیں حالانکہ وہاں اتحاد اور عینیت مراد نہیں بلکہ قرابت مراد ہے اس لیے کہ وانفسنا وانفسکم کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے قرابت والوں کو بلاؤ ہم اپنے قرابت والوں کو بلائیں۔ پھر اس سے اتحاد اور عینیت کیوں کر ثابت ہوئی۔ لیکن انصاف کرو تو مضمون اتحاد مثل عینیت کے اس فعل رسولؐ سے عثمانؓ کے لیے بے تکلف ثابت ہوا اس لیے کہ رسول نے بغیر اجازت عثمانؓ کے عثمانؓ کی طرف سے وہ معاہدہ کیا جس میں جان دینے کا وعدہ تھا۔ پس کمال اتحاد کی وجہ سے بذاتِ خود قائم مقام عثمانؓ کے بنے۔ یہیں سے سمجھ لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عثمانؓ پر کیسا کامل بھروسہ تھا۔ اگرچہ مضمون اتحاد کا قول رسول سے جناب امیر کے لیے بھی ثابت ہے مگر لفظی قول میں مجاز اور استعارہ کو بھی دخل ہوتا ہے اور جو کمال اتحاد رسولؐ کو عثمانؓ کے ساتھ تھا اس کو رسول نے اپنے فعل سے بھی ثابت کر دیا۔ اس فعل سے رسول کا مقصود یہ تھا کہ اگرچہ عثمانؓ موجود نہیں مگر وہ بھی اصحاب بیعتِ رضوان میں شامل ہو جاویں جن کی نسبت اللہ نے صاف فرما دیا ہے کہ ہم اُن سے راضی ہو گئے یہ آیت سورۂ فتح میں ہے:۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ	بے شک اللہ راضی ہو گیا مومنوں سے جب کہ بیعت کرتے تھے تجھ سے درخت کے نیچے تو جان لیا اللہ نے جو اُن کے دلوں میں ہے پھر اُتار دی اُن پر تسکین۔

اس آیت سے ثابت ہو گیا کہ اللہ اُن مومنین سے راضی ہو گیا کہ

جنهوں نے یہ بیعت کی اُن کے دلوں کا اخلاص بھی اللہ جانتا تھا اُن پر اللہ نے
تسکین بھی نازل کی۔ جب رسولؐ نے اپنے ہاتھ سے بیعت کرکے عثمانؓ کو اس بیعت
والوں میں شامل کرلیا تو یہ تینوں فضیلتیں عثمانؓ کو بھی حاصل ہوگئیں۔
شیعہ کہتے ہیں کہ عثمانؓ مومن نہ تھے اس لیے اس آیت کی فضیلت
میں داخل نہیں ہوسکتے۔ جواب یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے مدینہ میں پہونچنے کے بعد یکے
بعد دیگرے دو بیٹیوں کا اُن سے نکاح کیا۔ سفارت پر مقرر کرکے بہت نازک
وقت میں مکہ میں بھیجا جب ان کے قید ہوجانے کی خبر آئی تو اہل مکہ سے لڑنے کو
تیار ہوگئے۔ بیعت کرنے میں خود عثمانؓ کے نائب بنے اور عثمانؓ پر ایسا بھروسہ
کیا کہ بغیر اجازت عثمانؓ کے اُن کی طرف سے جان دینے کا معاہدہ کرلیا۔
ہر شام آسمان سے آواز آتی ہے کہ عثمانؓ اور اُن کے ساتھی مُراد پانے
والے ہیں۔ پھر ایسے شخص کو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مومن نہ تھے۔ اگر وہ مومن نہ
ہوتے تو رسولؐ اُن کی طرف سے بیعت کیوں کرتے؟ ان سب مناقب سے
قطع نظر کرکے ہم پوچھتے ہیں کہ اگر عثمانؓ (معاذ اللہ) مومن نہ تھے تو یہ لازم
آوے گا کہ پیغمبرؐ نے مدینہ میں پہونچنے کے بعد اپنی دو بیٹیوں کا نکاح کافر سے
کیا۔ اگر یہ فرض کرو کہ منافق تھے پس اگر منافق سے یہ مراد ہے کہ اللہ اور رسول
کو مانتے تھے مگر مسئلہ امامت علیؓ کے منکر تھے جیسا کہ شیعہ تمام صحابہؓ کی نسبت
کہتے ہیں تو قرآن میں مسئلہ امامت کا پتہ بھی نہیں نہ اس معنی میں منافق کا لفظ
قرآن میں آیا۔ قطع نظر اس کے واقعہ حدیبیہ تک وہ نص بھی نازل نہیں ہوئی تھی
جس کو شیعہ نص امامت کہتے ہیں اُس وقت تک تو فقط توحید اور رسالت

اور قرآن کو ماننا ایمان تھا اور اگر منافق سے یہ مراد ہے کہ عثمانؓ ظاہر میں ایمان
کا اقرار کرتے تھے دل میں (معاذ اللہ منہا) تصدیق نہ تھی بلکہ کفر تھا تو اب فرمائیے
کہ انھوں نے اپنا گھر اور اہل وعیال اور عزیز و اقربا چھوڑ کر اول حبشہ کو پھر مدینہ
کو ہجرت کیوں کی؟ مشرکین کے ساتھ کیوں نہ شریک رہے جو اپنے گھر فراغت
سے بیٹھے رہتے۔ قبائل انصار میں سے تو بعض لوگ اس وجہ سے منافق بنے تھے
کہ مسلمانوں سے ڈرتے تھے۔ قریش مکہ کو کیا ضرورت تھی کہ باوجود اعتقاد کفر کے
اقرار ایمان کریں اور جلا وطنی کی سختیاں اٹھاویں۔ رسولؐ نے ہمیشہ سفر اور حضر
میں ان کو اپنا رفیق اور مشیر کیوں بنایا اور اُن سے قرابت کیوں کی؟ اس لیے کہ
رسول کو اُن کا باطنی کفر ضرور معلوم ہوگا۔ اور اگر رسول کو معلوم نہ تھا تو آج شیعوں
کو کیوں کر معلوم ہوگیا اور اس صورت میں تو عثمانؓ کے ساتھ رسولؐ کی بیٹیوں
کا نکاح بھی صحیح نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ظاہر حال پر حکم اس وقت ہوتا ہے جب
باطن کی حقیقت یقیناً معلوم نہ ہو اور جس شخص کی باطنی حالت یقیناً معلوم ہو
اس کا ظاہری قول معتبر نہیں ہوتا۔ کبھی بعض کفار بطور تمسخر کے مسلمانوں کے
سامنے اقرار ایمان کرلیا کرتے ہیں مگر چونکہ ان کے دل کی حالت ہم خوب جانتے
ہیں اس لیے اُن پر احکام ایمان جاری نہیں کرتے۔ کافی کی روایتوں سے ظاہر
ہے کہ ائمہ اپنے دوست دشمن کو پہچان لیتے تھے پس رسول تو بدرجۂ اولیٰ پہچان
لیتے ہوں گے۔ اگر یہ بھی فرض کرو کہ ایسی صورت میں بھی نکاح جائز تھا تو خلافِ
اولیٰ تو ضرور ہوگا اور پیغمبرؐ کے حق میں تو خلافِ اولیٰ بھی گناہ کے حکم میں تھا۔
پھر بعد پیغمبرؐ کے وہ اسی دین پر کیوں نہ چلے گئے جو ان کے دل میں تھا

حالانکہ (بزعم شیعہ) تمام عرب مخالفتِ حکم خدا و رسول میں اُن کے ساتھ تھا چنانچہ اُن کی وجہ سے نص امامت کے سب منکر ہو گئے۔ باایں ہمہ انھیں خلفانے اپنی کوشش سے رُوئے زمین کے اکثر حصہ کو مومن بنا دیا۔ حضرات شیعہ کے سوا اور کون کہہ سکتا ہے کہ جنہوں نے تمام جہان کو مومن بنایا وہ خود مومن نہ تھے۔

اقوال ائمہ سے ثابت ہوتا ہے کہ طلحہؓ اور زبیرؓ وغیرہ اصحاب جمل جو بصرہ میں جناب امیرؓ سے لڑے تھے وہ بھی مومن تھے پس خلفاء ثلٰثہ بدرجۂ اولیٰ مومن ہوں گے۔ اس لیے کہ ان تینوں نے جناب امیر سے قتال نہیں کیا اس کے بیان کو پہلے قرآن کی ایک آیت پر غور کر لیجیے۔

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا ج فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ ج فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

اور اگر دو گروہ مومنین کے آپس میں لڑیں تو ان دونوں میں صلح کرا دو۔ پھر اگر سرکشی کرے ایک ان دونوں میں سے دوسرے پر تو باغی گروہ سے لڑو اُس وقت تک کہ اللہ کے حکم کی طرف آجاوے پس رجوع ہو جاوے تو اُن میں عدل کے ساتھ اصلاح کر دو اور انصاف کرو اللہ منصفوں کو پسند کرتا ہے۔ بے شک مومنین بھائی ہیں تو اصلاح کرا دو اپنے بھائیوں میں اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم ہو۔

اللہ نے لڑنے والے دونوں گروہوں کو مومن کہا اور سب مسلمانوں کو یہ حکم کیا کہ ان میں صلح کرا دو اور اگر ان دونوں مومن گروہوں میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ سے سرکشی کرے تو اس سے اُس وقت تک لڑو جب تک کہ وہ اللہ کی طرف آجاوے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ سرکش گروہ بھی مومنین سے خارج نہیں کیونکہ دونوں گروہوں کو اللہ نے مومن کہا ہے اس کے بعد اللہ نے اس کی تاکید کی کہ یہ حکم اُن مومنین کے لیے ہے جو آپس میں لڑتے ہوں اور فرمایا کہ سب مومنین بھائی ہیں تم اپنے بھائیوں میں صلح کرا دو۔

اب اس آیت سے متعلق جو امام معصوم کا قول ہے اس پر غور کیجیے کلینی نے کتاب الروضہ میں ایک حدیث طویل روایت کی ہے کہ ابوبصیر نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے بعض آیتوں کے معنی پوچھے ہیں اور امام نے ان کی تفسیر بیان کی ہے من جملہ ان کے یہ بھی ہے:۔

قلت وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰھُمَا عَلَی الْاُخْرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰی تَفِیْٓءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا بِالْعَدْلِ قال الفئتان انما جاء تاویل ھذہ الاٰیۃ

ابوبصیر کہتا ہے کہ میں نے آیت وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ الخ کو پوچھا تو امام علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ دونوں گروہ۔ بے شک اس کے معنے جنگ بصرہ کے دن ظاہر ہو گئے اور وہی لوگ اس آیت کے اہل تھے اور انہوں نے ہی امیر المومنین علیہ السلام پر بغاوت کی تھی۔

یوم البصرۃ وھم اھل ھذہ الآیۃ وھم الذین بغوا علی امیر المومنین علیہ السلام فکان الواجب علیہ قتالھم فی ما انزل اللہ۔

پس جناب امیر المومنین پر اس آیت کے بموجب ان سے لڑنا واجب تھا۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ طلحہؓ اور زبیرؓ وغیرہ اہل جمل جو بصرہ میں جناب امیر المومنین علیہ السلام سے لڑے تھے مصداق اس آیت کے تھے پس اگرچہ باغی تھے مگر مومن بھی تھے۔ اس لیے کہ اس آیت میں حکم انہیں لڑنے والوں کا ہے کہ دونوں گروہ مومن ہوں اور جب وہ لوگ مومن تھے جنہوں نے جناب امیر سے مقابلہ کیا تھا تو وہ لوگ مومن کیوں نہ ہوں گے جنہوں نے قتال نہیں کیا۔

اب جناب امیر کے اس قول کو بغور دیکھیے جو انہوں نے امیر معاویہؓ اور اُن کے گروہ کی نسبت فرمایا۔ نہج البلاغت میں ہے:۔

ومن کتاب لہ علیہ السلام کتبہ الی اھل الامصار یقتص فیہ ماجری بینہ وبین اھل صفین وکان بدء امرنا انا التقینا والقوم من اھل الشام والظاھر ان ربنا واحد

اور جناب امیر کا مکتوب ہے جو انہوں نے سب شہروں کو لکھا اُس میں وہ ماجرا ظاہر کرتے ہیں جو ان کے اور اہل صفین کے درمیان میں واقع ہوا۔ اور ابتدا اس معاملہ کی یہ ہوئی کہ ہم اور اہل شام کا گروہ مقابل ہوئے اور یہ ظاہر ہے کہ ہم دونوں کا رب بھی ایک تھا

ونبینا واحد ودعوتنا فی الاسلام واحدۃ لا نستزیدھم فی الایمان باللہ والتصدیق برسولہ ولا یستزیدوننا فالامر واحد، الا ما اختلفنا فیہ من دم عثمان ونحن منہ براء۔ (نہج البلاغت مطبوعہ مصر)

اور ہمارا نبی بھی ایک تھا اور دعوے ہمارا اسلام میں ایک تھا۔ نہ ہم بڑھانا چاہتے تھے ان کو اللہ کے ایمان اور رسول کی تصدیق میں اور نہ وہ ہم کو بڑھاتے تھے۔ پس ہم دونوں کا معاملہ واحد تھا مگر اس میں اختلاف پڑ گیا خون عثمانؓ کی وجہ سے اور ہم اس سے بری ہیں۔

یہ وہ مکتوب ہے جو جناب امیر کی طرف سے تمام ملکوں میں شایع ہوا تھا اس میں اُنہوں نے صاف ظاہر کر دیا کہ ہمارا اور امیر معاویہؓ وغیرہ کا کسی امر دینی میں اختلاف نہ تھا بلکہ قتل عثمان پر جھگڑا تھا یہی باعث جنگ ہوا اس قول میں جناب امیر نے ایمان کی حقیقت بتادی اور یہ بھی کہہ دیا کہ ہمارا اُن کا دین ایک تھا۔ پس جب امیر معاویہؓ مومن تھے تو خلفائے ثلثہ بدرجہ اولیٰ مومن ہوں گے۔

شیعوں کی یہ عادت ہے کہ جن آیتوں میں صحابہ کے مناقب ہیں ان سے خلفائے ثلثہ کو یہ کہہ کر خارج کرتے ہیں کہ وہ مومن نہ تھے اور اگر کوئی قصور صحابہ کا قرآن میں مذکور ہے تو اس کو خواہ مخواہ خلفائے ثلثہ کے ذمہ لگاتے ہیں مگر اُسی سے اُن کا مومن ہونا بھی ثابت ہوجاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ انفال میں جہاں غزوۂ بدر کا ذکر ہے اللہ نے فرمایا ہے:۔

کَمَآ اَخْرَجَکَ رَبُّکَ مِنْۢ بَیْتِکَ بِالْحَقِّ وَ

جیسے کہ نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے حق کے ساتھ اور

إِنَّ فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ ۝ مومنین کا ایک گروہ اس کو ناگوار خیال کرتا تھا۔

ف یعنی بعض مومن ایسے بھی تھے کہ غزوہ بدر میں شریک ہونا ان کے نفس پر شاق تھا۔ اہل سنت کے نزدیک خلفائے ثلثہ اس گروہ میں ہرگز شامل نہ تھے بلکہ اُن کے مخالف تھے مگر شیعوں نے بہت سی روایتیں تصنیف کر لی ہیں کہ یہ حالت اُنھیں خلفا کی تھی۔ حیات القلوب[1] میں ملائے مجلسی اس آیت[2] اور اس کے بعد کی آیت کا ترجمہ نقل کرکے فرماتے ہیں :۔

"موافق روایات سابق معلوم است کہ ایں کنایات با ابوبکر و عمر ست کہ کارہ بودند جہاد را۔"

جن آیات سے شیعوں نے خلفا پر اس قصور کا الزام لگایا تھا اُسی سے اُن کا مومن ہونا ثابت ہوگیا۔ قرآن میں اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں کہ خلفا پر کوئی الزام لگانے کے لیے اُن کا مصداق زبردستی خلفا کو ٹھیراتے ہیں اور اُنھیں سے اُن کا ایمان ثابت ہوتا ہے۔

اسی طرح جن روایتوں سے خلفا پر طعن کرتے ہیں ان میں بھی اکثر ایسی ہیں کہ خلفا کے مناقب بھی اُنھیں میں موجود ہیں۔ مثلاً غزوہ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دن ابوبکرؓ کو اور دوسرے دن عمرؓ کو سردار بنایا اول یہی دونوں منتخب ہوئے ان کے بعد تیسرے دن علیؓ کو علم ملا پس یہ کیوں کر ہو سکتا ہے

[1] حیات القلوب جلد دوم صفحہ ۲۲۹ ۔ [2] اس آیت کا ترجمہ حیات القلوب میں یہ ہے۔ چنانچہ بیروں آورد ترا پروردگار تو بحق و راستی و بتحقیق کہ گروہے از مومناں ہر آئینہ کارہ بودند با بیروں رفتن ۱۲

کہ جن لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فوج کی سرداری کے لیے علیؓ پر بھی مقدم کریں وہ پورے مومن بھی نہ ہوں۔ کیا دو دن تک ایسے لوگوں کو مومنین کی فوج کا سردار بنایا تھا جن کے دل میں کفر تھا (معاذ اللہ منہا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شک ان کو اسی مرتبہ کے لائق سمجھا تھا جب ہی تو اس کام کے لیے علیؓ سے پہلے منتخب کیا تھا۔ فتح نہ ان خلفاؓ کے اختیار میں تھی نہ رسولؐ کے نہ علیؓ کے بلکہ اُس وقت پر موقوف تھا جو اللہ نے اس کام کے لیے مقرر کیا تھا۔ اور اگر اسباب ظاہر پر نظر کی جاوے تب بھی انصاف یہ ہے کہ اول دو دن کی لڑائیوں نے کافروں کو ایسا ضعیف کر دیا تھا کہ تیسرے دن مغلوب ہوگئے۔ اگر پہلے یا دوسرے دن علیؓ جاتے تو وہ بھی بغیر فتح کے واپس ہوتے اور تیسرے دن ابوبکرؓ یا عمرؓ جاتے تو وہ بھی فتح پاتے۔

اگر نظر انصاف سے دیکھو تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ جتنے مشکل اور نازک کام تھے اُن پر خلفا ہی مقرر ہوتے تھے۔ چنانچہ معیت سفر ہجرت اور رفاقت غار کے لیے رسولؐ نے علیؓ کو چھوڑ کر ابوبکرؓ کو منتخب کیا۔ ہر مردے و ہر کارے ؎

یہ غار میں محبوبِ الٰہی کی سپر تھے
وہ بستر آرام پہ بے خوف و خطر تھے

مجالس[1] المومنین میں عبد الجلیل قزوینی کا یہ قول نقل کیا ہے :۔

"و بہمہ حال رفتن محمد و بردن ابوبکرؓ بے فرمانِ خدا نہ بودہ"

[1] مجلس پنجم صفحہ ۲۱۰ ۔ عبد الجلیل فاضل شیعی کے بہت سے مناقب مجالس المومنین میں مذکور ہیں ۱۲

کیا یہی انصاف ہے کہ جن ابوبکرؓ کو رسولؐ نے ایسے نازک وقت میں ساتھ لیا وہ مومن بھی نہ تھے۔

تبلیغ سورۂ برأت[1] کے لیے سب سے پہلے ابوبکرؓ ہی منتخب ہوئے تھے نہ علیؓ۔ کیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایسے عظیم الشان کام کے لیے ایسے شخص کو منتخب کرتے جو مومن بھی نہ ہو (معاذ اللہ) بلکہ علیؓ کو چھوڑ ا اور اُن کو منتخب کیا یہ دلیل اس امر کی ہے کہ اس کام میں ان کی لیاقت اعلیٰ سمجھی تھی مگر اس کے بعد یہ مصلحت بطور خود یا بذریعۂ وحی معلوم ہوئی کہ اہل عرب کا زمانہ جاہلیت سے یہ دستور ہے کہ جو سردار مخالف گروہ سے کوئی معاہدہ کرے یا معاہدہ کو فسخ کرے وہ اس عہد یا فسخ عہد کا مضمون یا تو خود پہونچاوے یا اس پیغام کو ادا کرنے کے لیے کسی اپنے قرابت والے کو بھیجے اور چونکہ یہ شرط شریعت کی طرف سے نہ تھی بلکہ اہل جاہلیت کا قدیم سے یہ دستور تھا اس لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے اس شرط کا خیال نہ رہا۔ اب ابوبکرؓ کے بھیجنے کے بعد یہ دستور اہل عرب یاد آیا تب بہ مجبوری یہ کام ابوبکرؓ سے نکال کر علیؓ کے سپرد کیا۔ اس تبدّل سے ابوبکرؓ کی اُس لیاقت میں کچھ فرق نہیں آیا جس کی وجہ سے ان کا اول انتخاب ہوا تھا ورنہ رسولؐ کی خطا کا اقرار کرنا پڑے گا کہ پہلے ایسے شخص کو منتخب کیا تھا کہ جو مومن کامل نہ تھا (معاذ اللہ منہا)

اگر اس تقرر کے بعد ابوبکرؓ سے کوئی قصور ہوا ہوتا اور اُس کی وجہ سے یہ تبدّل ہوتا تب البتہ طعن کی گنجایش تھی۔

ابوبکرؓ کے تبدّل میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ اسی سورت میں آیتِ غار بھی ہے جس میں ابوبکرؓ کی مدح ہے پس اس سورت کی ابتدائی آیتیں اُن کی مدح کی تمہید میں تھیں اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اُن کی مدح کی تمہید کوئی دوسرا بیان کرے۔

جب غزوۂ حدیبیہ کے وقت مکہ میں ضعفائے مسلمین کے پاس سفارت بھیجنے کی ضرورت پڑی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اس وقت اول عمرؓ کا انتخاب ہوا انہوں نے عثمانؓ کا مشورہ دیا تو عثمانؓ بھیجے گئے اس مشکل کام کے وقت علیؓ کا ذکر بھی نہ آیا۔

بعض روایاتِ شیعہ میں یہ بھی ہے کہ یہ سفارت خاص مشرکین کی طرف تھی۔ حیات القلوب کی جلد سوم میں ہے :-

"این آیہ اشارہ است بہ بیعتِ رضوان کہ در عمرۂ حدیبیہ واقع شدہ و حضرت رسولؐ بقصد عمرہ رفتہ بودہ کفار قریش مانع شدند حضرت را از داخل شدن مکہ و حضرت رسول عثمان را برسالت بہ نزد ایشان فرستادہ و مذکور شد کہ ایشان او را حبس کردند حضرت اصحابِ خود را زیر درخت خارے یا درخت سدرے جمع کردہ از

---

[1] اس سورت میں یہ بیان تھا کہ جن مشرکین سے عہد صلح ہوا تھا اب وہ فسخ کیا جاتا ہے۔ چار مہینے اور مہلت ہے اس کے بعد ان کو امن نہ ہوگا۔ اسی لیے یہ سورت موسم حج میں سُنائی گئی تھی۔ اگر اس سورۃ کو ابوبکرؓ سُناتے تو شاید چار مہینے کے بعد مشرکین یہ کہتے کہ عہد صلح باضابطہ فسخ نہیں ہوا اس لیے کہ فسخ عہد کا اعلان ابوبکرؓ نے کیا تھا جو اہل بیتِ رسولؐ سے نہ تھے ۱۲

ایشاں بیعت گرفت کہ با کافران قریش جنگ کنند و نہ گریزند پس
ایں آیت نازل شد"

تطبیق ان دونوں روایتوں میں یوں ہوسکتی ہے کہ یہ سفارت دونوں کی طرف ہوگی مگر ہر ایک کو پیغام جدا جدا ہوگا اب فرمائیے کہ کیا ایسے کام پر وہ شخص مقرر ہوا تھا جو مومن نہ تھا۔

دوسرا اعتراض شیعوں کا یہ ہے کہ آیتِ رضوان میں جس رضامندی کی خبر ہے وہ خاص اس فعل سے رضا تھی نہ رضائے دائمی۔

جواب یہ ہے کہ اللہ کی رضامندی کو اجر اخروی لازم ہے اور اگر آخرت میں اجر نہ ملا تو اللہ کی رضامندی کا نتیجہ کیا ہوا؟۔

جن لوگوں کا انجام بُرا ہونے والا ہے اُن کا کوئی نیک کام مقبول نہیں ہوتا اور یہ بیعت ایسی مقبول ہوئی کہ قرآن میں اُس سے رضامندی کی خبر دی گئی۔

اللہ عالم الغیب ہے اُن لوگوں سے کبھی راضی نہیں ہوتا جن سے آخر کو ناراض ہونے والا ہے۔

اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے اُن کے دلوں کا حال جان لیا اور ان پر سکینہ نازل کیا اس سے ثابت ہوا کہ ان لوگوں کا ایمان عند اللہ ثابت اور کامل تھا اگر یہی فرض کر لو کہ وہ مومن تو تھے مگر مومن کامل نہ تھے تو اللہ نے تنزیل سکینہ سے اُن کا ایمان کامل کر دیا۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے یہ بیعت توڑی اس لیے اس بیعت

کی فضیلت سے خارج ہو گئے۔

جواب یہ ہے کہ جس جنگ کے لیے یہ بیعت ہوئی تھی وہ جنگ ہی نہیں ہوئی پھر بیعت ٹوٹنے کی کیا صورت؟ عثمانؓ کی طرف سے رسول نے اپنے ہاتھ سے بیعت کی تھی کیا رسولؐ کے ہاتھ میں اتنی برکت بھی نہ ہوگی کہ وہ بیعت قائم رہے۔

جن لوگوں پر اللہ نے سکینہ نازل کیا وہ ضرور مومن کامل ہیں اور بیعت کا توڑنا مومن کامل کی شان نہیں پس ان صحابہ پر بیعت توڑنے کا الزام محض افترا ہے

شیعہ کہتے ہیں اللہ نے یہ جو فرما دیا کہ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ یعنی جو کوئی عہد توڑے گا تو اُس کا وبال اُس کی جان پر آوے گا اس سے معلوم ہوا کہ بعض بیعت کرنے والے اس بیعت کو ضرور توڑیں گے۔

جواب یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ آیت ہے اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں پر ہے۔ قرآن کے لفظوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ ذکر بیعتِ رضوان سے مختص ہے جو درخت کے نیچے ہوئی تھی بلکہ عام بیعت کا ذکر ہے اور اس کے ساتھ بیعت توڑنے کا گناہ اور پورا کرنے کا ثواب بیان ہوا ہے۔

پس اللہ نے اس بیعت کے متعلق اول عام حکم بیان کیا اور اُس کے بعد آیتِ رضوان میں وہ حکم بیان کیا جو اُس بیعت سے مختص تھا علاوہ

اس کے فَمَنۡ نَّكَثَ الخ بطور شرط و جزا کے ہے اور وہ وقوع کو بلکہ امکان و توقع کو بھی مستلزم نہیں مثلاً اللہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر تو شرک کرے گا تو تیرے اعمال حبط ہو جائیں گے حالانکہ پیغمبرؐ سے شرک ممکن نہ تھا۔ اسی طرح اللہ نے یہ فرمادیا کہ اگر کوئی بیعت توڑے گا تو عذاب پاوے گا۔ حالانکہ اہل بیعت رضوان سے بیعت توڑنا ممکن نہ تھا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ صحابہؓ معصوم ہو گئے تھے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اُن سے اللہ راضی ہو گیا تھا جس کے اجر میں وہ جنت پائیں گے بالفرض اگر بمقتضائے بشریت کوئی خطا اُن سے ہوئی ہو تو اللہ نے توبہ کی توفیق دی ہوگی یا معاف کر دیا ہوگا۔ بہر حال ان کی نیکیاں غالب ہوں گی اور اللہ کو یہ بھی اختیار ہے کہ کسی مومن کے ایک عمل سے راضی ہو جائے اور اس کے بعد اس کے گناہ اگرچہ بے انتہا ہوں اپنے فضل سے بخش دے وَيُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّـَٔاتِكُمۡ بھی خیر صحابہؓ کے حق میں وارد ہے۔

صحابہؓ کا وہ مرتبہ تھا کہ اگر کبھی خطا کی طرف اُن کا میل ہوتا تھا تو اللہ اُن کو سنبھالتا تھا۔ غزوۂ حنین میں بعض صحابہ کے پاؤں اُکھڑے تھے کہ اللہ نے اُن کی مدد کی چنانچہ ان کا ذکر قرآن میں سورۂ براءت میں مذکور ہے:۔

لَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيۡ مَوَاطِنَ	بے شک اللہ نے تمہاری مدد کی بہت
كَثِيۡرَةٍ وَّيَوۡمَ حُنَيۡنٍ	سے مقاموں میں اور حنین کے دن جب کہ
اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ	پسند آئی تھی تم کو اپنی کثرت تو فائدہ نہ دیا
فَلَمۡ تُغۡنِ عَنۡكُمۡ شَيۡـًٔا	تم کو کچھ بھی اور تنگ ہو گئی تم پر زمین

وَّضَاقَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡاَرۡضُ بِمَا	باوجود وسعت کے تو تم پھر گئے
رَحُبَتۡ ثُمَّ وَلَّيۡتُمۡ مُّدۡبِرِيۡنَ ۝	پیٹھ پھیر کر۔

ف اس آیت میں اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے تمہاری مدد بہت سے مقاموں میں کی حنین میں اس وقت مدد کی جب کہ تم کو اپنی کثرت پر ناز ہوا تھا مگر تمہاری کثرت کچھ کام نہ آئی اور تمہاری یہ حالت ہو گئی کہ زمین تم پر تنگ ہو گئی اور تم نے پیٹھ پھیری۔

دیکھو جنھوں نے پیٹھ پھیری تھی ان کی اللہ نے مدد کی یعنی بھاگنے سے بچا لیا اور انہوں نے پھر پلٹ کر لڑائی فتح کی۔ تعجب ہے کہ اللہ تو ان کی مدد کرے اور بھاگنے سے بچالے اور حضرات شیعہ یہ فرمادیں کہ بھاگے اور بیعتِ رضوان توڑ دی۔

اللہ نے اُنھیں لوگوں سے جن سے یہ کہا تھا کہ تم نے جب پیٹھ پھیری تھی اُس وقت ہم نے تمہاری مدد کی تھی یہ بھی فرمایا کہ ہم نے بہت سے مقاموں میں تمہاری مدد کی تھی۔ اب غور فرمائیے کہ اللہ نے تو اُن کی تمام غزوات میں مدد کی اور شیعہ ان کو ہر جگہ بھاگ جانے کا الزام لگا دیں۔

غزوۂ اُحد میں جو بعض صحابہ سے لغزش[1] ہوئی تھی اللہ نے اُس میں

---

[1] درحقیقت یہ فرار ناجائز نہ تھا اس لیے کہ ان صحابہؓ نے یہ سُن لیا تھا کہ محمدؐ قتل ہو گئے اور یہ سمجھ گئے تھے کہ تمام لشکر اسلام ختم ہو چکا اس وقت ان کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں ٹھیرنا اپنے اختیار سے ہلاک ہونا ہے لہذا تدبیر جنگ یہ سمجھی کہ مدینہ میں جلد پہونچیں اور دوبارہ سامانِ جہاد کریں مگر چونکہ اتنی بات بھی ایک قسم کی غلطی تھی اس لیے اللہ نے اس سے بھی ان کو [illegible]

معافی کا اتنا بڑا اہتمام کیا کہ قرآن میں اُس معافی کی خبر نازل کی اس سے مقصود یہی تھا کہ آیندہ صحابۂ رسولؐ پر کسی کو طعن کا موقع نہ رہے۔

غزوۂ بدر کے واقعات جو قرآن میں مذکور ہیں اگر سورۂ انفال کو سامنے رکھ کر اُن پر غور کرو تو بہت اچھی طرح حق واضح ہو جاوے۔

صحابہؓ کو اللہ نے اگرچہ بہت بڑا مرتبہ دیا تھا مگر پھر بشر تھے اور جو امور مقتضائے بشریت ہیں وہ اُن پر بھی عارض ہوتے تھے۔ بعض صحابہ کے نفس کو بمقتضائے بشریت کافروں سے لڑنا ناگوار تھا اور اپنی قلت اور کافروں کی کثرت دیکھ کر اُن کی یہ حالت ہو گئی تھی جیسے کوئی موت کی طرف کھینچا جاوے اگرچہ حق اُن پر ظاہر ہو چکا تھا مگر پھر بھی وہ پیغمبرؐ سے اس لیے بحث کرتے تھے کہ یہ لڑائی ان کو دشوار معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ یہ حالت تھی مگر بااین ہمہ پیغمبرؐ سے جُدا نہیں ہوئے ساتھ رہے گو دل میں کیسا ہی خوف تھا مگر انہوں نے یہ نہیں کیا کہ پیغمبرؐ کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اب اگر کسی کو وہم ہو کہ ایسی ہیبت اُن پر کیوں تھی؟ تو ہم کہہ چکے ہیں کہ بمقتضائے بشریت تھی جیسے رسولؐ نے جب یہ سُنا کہ اُن کے نواسے کو اُن کی اُمّت شہید کرے گی تو اس کی بشارت جو خدا کی طرف سے جبریلؑ لے کر آئے تھے بار بار رد کر دی اور یہی جناب سیدہؓ نے کیا۔ اور جب مشکل سے جناب سیدہ راضی ہوئیں تو اس کے بعد رضامندی کا وعدہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۸) پاک کر دیا۔ اُن کے گناہ کی معافی سورۂ آل عمران میں جزو چہارم کے نصف پر اس طرح مذکور ہے وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اور بے شک اللہ نے معاف کیا اُن سے ۱۲

توڑ دیا اور حمل حسین بھی ناگوار ہو گیا۔ یا جیسے جناب امیر نے جب جبریلؑ سے یہ سُنا کہ اُن کا سر زخمی ہوگا اور خون سے داڑھی سُرخ ہو جاوے گی تو ایسی ہیبت چھائی کہ غش کھا کر[1] مُنہ کے بل گر پڑے حالانکہ یہ معاملہ برسوں کے بعد ہونے والا تھا۔ یا جیسے کہ ائمہ پر ایسی ہیبت چھائی ہوئی تھی کہ جھوٹے مسئلے بیان کرتے تھے اور اپنے اصحاب میں اختلاف ڈالتے تھے لوگوں کے سامنے کچھ کہتے تھے پیچھے کچھ کہتے تھے۔ اپنی امامت سے بھی انکار کرتے تھے۔ اور امام زین العابدین علیہ السلام نے یزید کے سامنے غلامی کا اقرار کیا۔ حالانکہ ان ائمہ کو بہ علم امامت یعنی بذریعۂ نجوم وغیرہ اپنی موت کا وقت اور تمام حوادثِ تقدیری معلوم تھے اور قبل از وقت کچھ خوف نہ تھا یا جیسے کہ ہشام اور صاحب الطاق جو اجلّۂ اصحاب امام سے تھے امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات کے بعد مذہب اہل بیت کو چھوڑ کر اول مرجیہ پھر قدریہ پھر زیدیہ پھر معتزلہ پھر خارجی ہو جانے[2] کا ارادہ کیا تھا۔ یا جیسے کہ حضرت سلمانؓ کو یہ شبہ ہوا تھا کہ جناب امیر اسم اعظم پڑھ کر مخالفوں کو غارت کیوں نہیں کر دیتے یا جیسے کہ حضرت ابوذرؓ سلمانؓ کی اُلٹی ہانڈی کا کرشمہ دیکھ کر ہیبت زدہ ہو کر بھاگے۔

پس اگر صحابۂ رسولؐ پر بھی بمقتضائے بشریت یہ حالت طاری ہو گئی تو طعن کا کیا موقع ہے؟ اب غور کرو کہ انھیں صحابہؓ کو جن کی یہ حالت ہو گئی تھی اللہ نے مومن کہا اور اُن کے خیالات کی اصلاح کے لیے کیا کیا سامان کیے اُن کو سُلا دیا تا کہ آرام پالیں اور ہیبت دور ہو، مینھ برسا دیا کہ ریت جم جاوے اور

[1] اصول کافی ص۲۹۱ مطبوعہ لکھنؤ۔ [2] ایضاً ص۲۲۱ ۱۲

زمین چلنے کے قابل ہو جاوے، ان کی ہمت بڑھانے کے لیے فرشتے نازل کیے، پھر اللہ نے کافروں کو باوجود کثرت کے اُن کی نگاہوں میں تھوڑا کر دیا اگر یہ نہ ہوتا تو وہ بُزدلی کرتے اور جھگڑتے ولکن اللہ سلّم اور لیکن اللہ نے سلامت رکھا۔ یہ تمام حالات سورۂ انفال کی آیتوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔

اب غور کیجیے کہ اللہ کی تو اُن پر ایسی عنایت تھی کہ جو خیالات بمقتضائے بشریت ان کے دلوں میں پیدا ہوتے تھے اُن سے محفوظ رکھنے کے لیے کیا کیا سامان کیے اور بُزدلی اور اختلاف سے اُن کو سلامت رکھا اب شیعوں نے انھیں صحابہ کو ایسا موردِ طعن بنایا یہ کیسا ظلم ہے۔ اے حضراتِ شیعہ، قرآن کو مقدم رکھو اور جو روایتیں قرآن کے خلاف ہوں خواہ کسی فریق کی ہوں اُن کو جھوٹا سمجھ لو۔[1]

خیبر تین دن میں فتح ہوا پہلے دو[2] دن جو فتح نہ ہوا اُس کا نام شیعوں نے بھاگنا رکھا ہے۔ کافروں سے لڑ کر جو صحابہ پھر اپنے مقام میں واپس آتے تھے اُس کے معنی فرار تجویز کیے۔ اِتنا نہیں سمجھتے کہ پہلے دو دن کی جنگ نے کافروں کی قوت توڑ دی جبھی تو تیسرے دن فتح ہوئی اور جب فتح انسان کے اختیار میں نہیں تو بغیر فتح واپس آنا کوئی عیب نہیں ہو سکتا۔ امام حسن علیہ السلام نے تو اس سے بڑھ کر کیا کہ خلافت امیرِ شام کے حوالے کر کے چلے آئے حالانکہ یہ جہاد جناب امیر کے زمانہ سے قائم تھا۔

اس مقام پر علمائے شیعہ ایک روایت بحوالہ کنز العمال کے پیش کیا کرتے ہیں جس کے یہ لفظ ہیں کہ:-

هزموا عمر واصحابه	(اہل خیبر) نے شکست دی عمرؓ کو اور
فجاء يجبنهم ويجبنونه	اصحاب عمر کو تو آئے عمرؓ کہ بُزدلا کہتے تھے

فساء ذلك	اپنے ساتھیوں کو اور اُن کے ساتھی بُزدلا کہتے
رسول الله ۔	تھے عمرؓ کو۔ تو یہ ناگوار ہوا رسول اللہ کو۔

یہ روایت کتب صحاح کی نہیں۔ راوی اس کے مجہول ہیں اس لیے قابل استدلال نہیں۔ تعجب یہ ہے کہ حضرات شیعہ تو اپنی اصح الکتب یعنی کافی کی[1] بہت سی حدیثوں کو بمقابلہ اہل سنت جھوٹا کہتے ہیں اور سنیوں کے الزام کے لیے ایسی ضعیف حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ بفرض تسلیم فرار اس روایت سے بھی ثابت نہیں ہوتا۔ ہزیمت کے معنی شکست کے ہیں نہ فرار کے۔ بغیر فتح واپس آنے کو ہزیمت سے تعبیر کیا اور بعض لوگوں نے جو بُزدلی کا الزام عمرؓ پر لگایا تھا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بُرا معلوم ہوا۔

بیان مذکورۂ بالا سے بخوبی واضح ہو گیا کہ صحابہ نے کبھی بیعت نہیں توڑی اللہ ان کی مدد کرتا تھا۔

چوتھا اعتراض شیعوں کا یہ ہے کہ براء بن عازبؓ سے کسی نے کہا تھا کہ تمہیں مبارک ہو کہ تم صحابی ہوا اور صاحب بیعتِ رضوان ہو تو انہوں نے جواب میں کہا کہ تمھیں کیا معلوم ہے کہ رسولؐ کے بعد ہم نے کیا کیا گناہ کیے اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ اس بیعت کو باعثِ مغفرت نہیں سمجھتے تھے۔

جواب یہ ہے کہ یہ کہنا اُن کا بمقتضائے خوفِ الٰہی تھا جو مقربین

---

[1] جیسے تحریف قرآن کی بہت سی روایتیں۔ رقیہؓ اور ام کلثومؓ کا اولاد رسول ہونا نکاح ام کلثوم کی روایتیں، جن کے لیے کافی میں خاص ایک باب ہے۔ اس کے علاوہ بیان عدت میں بھی اس کی روایتیں ہیں ۱۲۔

خصوصًا انبیا کے دلوں میں زیادہ ہوتا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اپنی مغفرت کی دعا مانگا کرتے تھے۔

اصول[1] کافی میں امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ امام حسنؑ علیہ السلام بوقت وفات روتے تھے اُن سے کہا گیا کہ تمہارے مناقب بہت ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لیے بہت مراتب بیان کر گئے ہیں تم کیوں روتے ہو۔ تو آپ نے فرمایا:-

انما ابکی لخصلتین	میں دو باتوں کے لیے روتا ہوں۔ جو
لهول المطلع وفراق	حالت آنے والی ہے اس کی ہیبت اور
الاحبة	دوستوں کی جدائی سے۔

عثمان رضی کی طرف سے جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت کی اس کا جواب حضرات شیعہ یوں دیتے ہیں کہ یہ بیعت اس لیے کی تھی کہ عثمانؓ کا گناہ بڑھے اور بیعت توڑنے کا وبال بھی اُن کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے۔

مگر یہ کیسی ناانصافی کی بات ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمۃ للعالمین تھے وہ کسی کے لیے وبال بڑھانے کا سامان کیوں کرتے خصوصًا اپنے پیارے داماد کے لیے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بغیر اجازت عثمانؓ کے بیعت کی تھی وہ عثمانؓ پر لازم کیوں ہوگی۔ پھر بیعت ٹوٹنے کی کیا صورت تھی۔ عثمانؓ نے یا اور کسی صحابی نے ہرگز یہ بیعت نہیں توڑی۔ پھر وبال کیسا؟

[1] اصول کافی ص۱۹۳۔

ایک شیعہ مصنف نے یہ بھی لکھ دیا کہ شاید یہ ہاتھ پہ ہاتھ مارنا افسوس کے لیے ہوگا کہ عثمان قید یا قتل ہوگئے یا اس بیعت میں شریک نہ ہوئے۔

لیکن اتنا غور کرنا چاہیے تھا کہ اس صورت میں لعثمان نہ ہوتا بلکہ علیٰ عثمان ہوتا۔ اسی لیے تمام علمائے شیعہ اس کا ترجمہ سمجھتے ہیں۔ حیات القلوب کی عبارت ہم اوپر نقل کر چکے۔

تعجب ہے کہ آج کل کے شیعہ رافضی کے لقب سے بُرا مانتے ہیں حالانکہ یہ مبارک لقب اُن کو اللہ نے عنایت کیا ہے۔ اللہ کے عنایت کردہ خطاب سے بُرا ماننا کفرانِ نعمت ہے۔

کافی کی کتاب الروضہ[1] میں ہے کہ سلیمان نے امام جعفر صادق سے شکایت کی کہ مخالفین نے ہمارا نام بہت سخت رکھا ہے۔

فقال ابو عبد الله علیه	تو فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے رافضی؟
السلام الرافضة قال	تو میں نے کہا کہ ہاں۔ امام نے فرمایا کہ واللہ یہ
قلت نعم. قال لا والله ما	نام تمہارا مخالفوں نے نہیں رکھا بلکہ اللہ نے
سموکم بل الله سماکم۔	تمہارا یہ نام رکھا ہے۔

اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس نام کے بہت سے مناقب بیان کیے ہیں۔ من جملہ اس کے یہ بھی ہے کہ جو ساحر حضرت موسیٰؑ پر ایمان لائے تھے اُن کا نام بھی اللہ نے رافضی رکھا تھا۔

نہایت عجیب بات یہ ہے کہ حضرات شیعہ کی روایتوں میں ائمہ سے

[1] کتاب الروضہ ص۱۶

یہ بھی منقول ہے کہ جو شیعہ سنیوں کی جماعت نماز میں شریک ہو کر سنی امام کے پیچھے نماز پڑھ لے اُس کو اتنا بڑا ثواب ملے گا کہ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے میں ملتا۔ چنانچہ کتاب من لا یحضرہ الفقیہ کے باب الجماعت میں مذکور ہے۔

وروی عن عمر بن یزید انہ قال ما منکم احد یصلی صلوٰۃ فریضۃ فی وقتھا ثم یصلی معھم صلوٰۃ تقیۃ وھو متوضی الا کتب اللہ بھا خمسا وعشرین درجۃ فارغبوا فی ذلک	اور روایت کی ہے امام جعفر صادق علیہ السلام سے عمر بن یزید نے کہ امام نے فرمایا ہے کہ نہیں کوئی تم میں کا کہ پڑھ لے فرض نماز اپنے وقت میں پھر ان کے ساتھ باوضو بطور تقیہ کے نماز پڑھے تو لکھے جائیں گے اس کے پچیس درجے اب تم کو چاہیے کہ اس کام کی طرف رغبت کرو۔
وروی عن حماد بن عثمان انہ قال من صلی معھم فی الصف الاول کمن صلی خلف رسول اللہ فی الصف الاول۔	اور امام سے روایت کی ہے حماد بن عثمان نے کہ امام نے فرمایا ہے کہ جو کوئی ان کے ساتھ صف اول میں نماز پڑھے وہ ایسا ہے کہ گویا اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے صف اول میں نماز پڑھی۔

اب حضرات شیعہ اہل سنت کے مراتب کو ملاحظہ فرمائیں کہ اُن کے پیچھے نماز پڑھنے میں شیعوں کو اتنا ثواب ملتا ہے جیسا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے میں ملتا۔

تمت

اسکے ساتھ اسی کتاب کا ص۵ دیکھئے

تکملہ نصیحت الشیعہ جلد اول

باسمہ تعالیٰ حامداً و مصلیاً مسلماً

اس جلد اول میں دو بحث ایسے ہیں کہ ان کی تکمیل زیادہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ایک بحث تقیہ کا اور دوسرا بحث قاتلان حسینؑ کا۔

اگرچہ ان دونوں بحثوں پر میرے مستقل رسائل موجود ہیں۔ بحث تقیہ کے متعلق الثانی من المائتین ہر سہ نمبر اور دوسرے بحث کے متعلق "قاتلان حسین کی خانہ تلاشی" ان دونوں کتابوں کے بعد اب کچھ لکھنے کی حاجت باقی نہیں رہتی تاہم بغرض تکمیل کتاب ہذا کچھ لکھا جاتا ہے فلیات من کان لہ قلب۔

مبحث تقیہ

تقیہ کے متعلق سب سے پہلے تین باتوں کے معلوم کرنے کی ضرورت ہے:—

اوّل یہ کہ تقیہ کے معنی کیا ہیں؟ آیا جو معنی اس لفظ کے لغت میں ہیں وہی، یا شیعوں نے کوئی خاص معنی اس لفظ کے قرار دیے ہیں۔

دوم یہ کہ تقیہ کے شرائط کیا ہیں؟

سوم یہ کہ تقیہ کا حکم کیا ہے یعنی از روئے مذہب شیعہ وہ محض جواز ہی کی حد میں ہے یا مستحب ہے یا فرض وواجب ہے۔

الحمد للہ کہ یہ تینوں باتیں ہم کو ائمہ معصومین کے ارشادات سے معلوم ہوجاتی ہیں جن کے بعد کسی شیعہ مجتہد کی موشگافیوں کی حاجت نہیں رہتی نہ کسی کا قول قابل سماعت ہوسکتا ہے۔

سُنیے اِسی کتاب اصول کافی سے میں تین حدیثیں پیش کیے دیتا ہوں جن سے یہ تینوں باتیں روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہیں۔

حدیث اوّل جس کو مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کتاب ہذا کے صفحہ ۱۲ میں نقل کیا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ یوسف پیغمبر نے قافلے والوں کو چور کہا تھا حالانکہ اللہ کی قسم انھوں نے کچھ چرایا نہ تھا۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہوگیا کہ تقیہ کے معنی جھوٹ بولنے کے ہیں تمام دنیا جانتی ہے کہ جس نے چوری نہیں کی اس کو چور کہنا اسی کا نام جھوٹ ہے بلکہ یہ جھوٹ کی بدترین قسم ہے جس کو افترا اور بہتان کہتے ہیں۔

حدیث دوم یہ حدیث بھی مصنف نے ص۳۶ میں نقل کی ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے کُل دین کو دس حصوں میں تقسیم کیا ان میں سے نو حصے تقیہ میں بتائے اور تارک تقیہ کو بے دین کہا۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تقیہ محض جائز ہی نہیں مستحب نہیں بلکہ فرض ہے اور فرض بھی ایسا تاکیدی فرض کہ اس کا تارک بے دین ہوجاتا ہے اور اسی کتاب اصول کافی کے ص۴۸۴ میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ انھوں نے تارک تقیہ کو بے ایمان فرمایا۔

حدیث سوم اصول کافی ص۴۸۴ میں امام باقر علیہ السلام سے منقول

ہے کہ انہوں نے فرمایا:۔

التقیۃ فی کل ضرورۃ وصاحبہا اعلم بہا حین تنزل بہ	تقیہ ہر ضرورت میں ہے اور صاحب ضرورت اپنی ضرورت سے خوب واقف ہوتا ہے جب وہ پیش آتی ہے۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہوگیا کہ تقیہ کے لیے نہ خوف جان کی شرط ہے نہ خوف عزت و آبرو کی بلکہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ ہر ضرورت میں تقیہ کرنا فرض ہے اور شریعت کی طرف سے ضرورت کی تحدید بھی نہیں ہے بلکہ ہر شخص کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس کے بعد اب ائمہ کے تقیہ کے مواقع دیکھو تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ تقیہ ایسی عبادت ہے کہ اس کے لیے ہرگز کسی خوف کی شرط نہیں۔

شیعوں کی کتاب استبصار کی سیر کرو جو اُن کے اصول اربعہ میں داخل ہے تو سیکڑوں تقیہ اماموں کے تم کو ایسے ملیں گے کہ وہاں کسی قسم کا مطلق خوف نہیں۔ اماموں کے تقیہ کے بہت سے مواقع الثالث من المائتین میں نقل کردیے گئے ہیں۔

ان تینوں باتوں کے معلوم ہوجانے سے یہ چیز خوب منقح ہوگئی کہ مذہب شیعہ میں جھوٹ بولنا اعلیٰ درجہ کا فرض اور اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے جو جھوٹ نہ بولے وہ بے دین و بے ایمان ہے اور اس کے لیے کچھ شرائط بھی نہیں ہیں۔

بعضے شیعہ جو گھبرا کر کہہ بیٹھتے ہیں کہ اہل سنت کی فلاں کتاب میں بھی تو تقیہ کو جائز لکھا ہے اس کا شافی اور مفصل جواب "الثالث من المائتین"

میں ہے خلاصہ یہ کہ شیعوں کا تقیہ اہل سنت کی کسی کتاب سے ہرگز ثابت نہیں ہو سکتا۔

اب یہ بھی سمجھ لو کہ شیعوں کو تقیہ کے ایجاد کی ضرورت کیا پیش آئی؟

ضرورت ظاہر ہے کہ جن ائمہ کی طرف وہ اپنا مذہب منسوب کرنا چاہتے تھے وہ ائمہ علانیہ مذہب اہل سنت پر کاربند تھے اور مذہب شیعہ کی برملا تکذیب کیا کرتے تھے۔ لہٰذا ضرورت ہوئی کہ اُن کو تقیہ باز قرار دے کر یہ کہا جائے کہ وہ علانیہ تو بے شک یہی باتیں کہتے تھے مگر خفیہ طور پر انھوں نے ہم کو مذہب شیعہ کی تعلیم دی اور اُن کا اصلی مذہب یہی تھا۔

خیر یہ مقصد شیعوں کا حاصل ہوا یا نہ ہوا مگر تقیہ کی وجہ سے ایک بڑی مصیبت بھی شیعوں پر پیش آگئی جس کا احساس اُس وقت ہوا جب اُن کی افترائی ہوئی روایتیں سب ایک جگہ جمع ہوئیں اور ہر ہر مسئلہ میں ائمہ کے مختلف و متضاد اقوال ملے اب ان میں سے کس کو ائمہ کا اصلی مذہب کہا جائے اور کس کو تقیہ پر محمول کیا جائے علمائے شیعہ کی جان ضیق میں ہوگی آخر مولوی دلدار علی مجتہد اعظم نے اساس الاصول میں لکھ دیا کہ ائمہ کے ہر دو مختلف قولوں میں سبب اختلاف کا معلوم کرنا انسانی طاقت سے باہر ہے اور یہ بھی لکھ دیا کہ ہمارے یہاں کے اس (غیر محدود) اختلاف کو دیکھ کر بہت لوگ مذہب شیعہ سے منحرف ہو گئے۔

مبحث قاتلان حسین

"قاتلان حسین کی خانہ تلاشی" ایک مختصر رسالہ ہے جس کو دیکھ کر یہ چند امور کتب شیعہ سے ناقابل انکار طریقے سے ثابت ہو جاتے ہیں۔

(۱) ہر امام کو خدا کی طرف سے ایک رجسٹر ملتا ہے جس میں اس کے شیعوں کے نام بقید ولدیت لکھے ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوئی غیر شیعہ کسی امام کو دھوکا دے کر اپنا شیعہ ہونا باور نہیں کرا سکتا۔

(۲) امام حسین کو جن کوفیوں نے خط لکھ کر بُلایا اور امام نے ان کے خطوط پر اعتبار کر کے باوجود اعزہ و اقارب کے بے حد منع کرنے کے سفر اختیار کیا ان سب کوفیوں نے اپنے کو شیعہ لکھا تھا۔

(۳) ابن زیاد کے لشکر میں جس قدر سردار اور بڑے بڑے لوگ تھے وہ سب وہی تھے جنہوں نے خط لکھ کر بُلایا تھا۔

(۴) امام حسین نے لشکر ابن زیاد سے فرمایا کہ تم ہی لوگوں نے مجھے خط لکھ کر بُلایا۔

(۵) بعد قتل امام حسین کے شیعوں نے ماتم حسین برپا کیا اور سب سے پہلا ماتم یزید کے گھر میں ہوا مگر امام زین العابدین نے اور حضرت زینب نے صاف کہدیا کہ تمہیں لوگوں نے امام حسین کو بلایا اور شہید کیا اور اب ماتم کر کے ہم کو فریب دینا چاہتے ہو۔

(۶) بعد قتل امام حسین کے شیعوں نے توبہ کی اور اپنا لقب توابین مشہور کیا جو آج بھی کتب تاریخ میں موجود ہے۔
(۷) ان توابین نے صاف صاف اقرار کیا کہ ہم ہی نے امام حسین کو بلایا اور اُن پر تلوار کھینچی
(۸) قتل اہل بیت سے تشیع میں خلل نہیں آتا بشرطیکہ کسی دنیاوی طمع سے قتل کرے۔ یہ سب باتیں شیعوں کی معتبر کتابوں سے رسالہ مذکورہ میں نقل کی گئی ہیں۔ اصلی عبارتیں ان کی کتابوں کی اردو ترجمہ کے ساتھ اسی رسالہ میں درج ہیں

اس کامل تحقیق کے بعد شیعوں کے لیے دو راستے رہ جاتے ہیں کوئی تیسرا راستہ قطعاً و یقیناً ہرگز نہیں نکل سکتا۔

اول یہ کہ صاف اقرار کریں کہ بے شک ہم ہی لوگ قاتل حسین ہیں اور اس خون ناحق کے چھپانے کے لیے ہم ہر سال یہ شور و غل کیا کرتے ہیں۔

دوم یہ کہ اپنی معتبر کتابوں کو جھٹلا کر مضامین مذکورۂ بالا کا انکار کر جائیں اور کہہ دیں کہ اُس زمانہ میں لفظ شیعہ کسی مذہب کا نام نہ تھا۔ مذہب شیعہ تو اس کے بہت دنوں بعد ایجاد ہوا ہے۔

ان دونوں راستوں میں سے جس راستہ کو وہ اختیار کریں ہمارا مقصد حاصل ہے۔ یعنی اُن کے مذہب کا باطل و بے بنیاد ہونا خود انھیں کے اقرار سے ثابت ہوا جاتا ہے۔ ؎

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

تمت

نصیحۃ الشیعہ

جلد ۲ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

بندۂ مسکین محمد احتشام الدین مرادآبادی غفر اللہ لہٗ و لوالدیہ مسلمانوں کی خدمت میں التماس کرتا ہے کہ نصیحۃ الشیعہ کی جلد اول تمام ہونے کے بعد متوکلاً علی اللہ شروع ماہ صفر ۱۳۱۲ھ میں جلدِ ثانی کا لکھنا میں نے شروع کیا ہے اللہ اس کو قبول کرے اور ذریعۂ ہدایت بنا دے۔

امامت

شیعہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جناب امیرؑ کو اور ان کے بعد ائمہ کو امام معصوم اور مفترض الطاعۃ بتلاتے ہیں۔

اہل سنت کہتے ہیں کہ رسولؐ کے بعد نہ کوئی معصوم ہے اور نہ کسی کی

اطاعت فرض. ہاں اصلاح امور انتظامی کے لیے کسی شخص کو اپنا بادشاہ مقرر کر لینا مسلمانوں کا کام تھا۔ اسی بادشاہ اسلام کو خلیفہ کہتے ہیں۔

اب ہم شیعوں کے دلائل پر غور کرتے ہیں :۔

سب سے اوّل قرآن ہے جتنے عقائد ضروری ہیں اور جن پر نجاتِ اُخروی موقوف ہے وہ قرآن میں بنص صریح اس طرح مذکور ہیں کہ ہر شخص اُن سے وہی مطلب سمجھتا ہے۔ مثلاً لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وغیرہ بیسیوں نصوص قرآنی اللہ کی توحید اس طرح ظاہر کرتی ہیں کہ بغیر کسی تاویل یا روایت کے شامل کرنے کے مسئلہ توحید اُس سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح رسالت کا مسئلہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وغیرہ نصوص سے بے تکلف ظاہر ہے۔ امامت کے مسئلہ کا اول سے آخر تک قرآن میں پتہ بھی نہیں۔

مگر شیعہ بہت سی آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں مسئلہ امامت بہ نص صریح مذکور ہے۔ لیکن وہ الفاظ قرآنِ موجودہ میں نہیں ملتے جو شیعہ کہتے ہیں کہ ائمہ کی زبان پر تھے یا اُس قرآن میں ہوں گے جس کو جناب صاحب الامر ہم سے چھپا کر غار میں لے پہنچے۔

بہر حال ائمہ جن آیتوں کی خبر دے گئے ہیں بطور نمونہ ہم ان کی بعضی روایتیں نقل کرتے ہیں۔ اصول کافی ص۲۶۲ میں ہے :۔

عن ابی بصیر عن ابی عبداللہ علیہ السلام فی قول اللہ عزوجل ومن یطع اللہ و	ابو بصیر امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتا ہے اللہ کے اس قول میں (اور جو کوئی اطاعت کرے اللہ کی اور

رسولہ فی ولایۃ علیٍّ والائمۃ من بعدہ فقد فاز فوزا عظیما هکذا انزلت۔	اس کے رسول کی ولایت علی اور ولایت ائمہ میں جو علی کے بعد ہوں گے تو پہنچا بڑی مراد پر) یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے۔

یہ آیت سورۂ احزاب میں اس طرح مذکور ہے :۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝

اور جو کوئی اطاعت کرے اللہ کی اور اُس کے رسول کی تو پہونچا بڑی مُراد کو۔

مگر اس روایت سے معلوم ہوا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ خبر دی ہے کہ اس کے درمیان میں الفاظ فی ولایۃ علی والائمۃ من بعدہ بھی تھے اور مع ان الفاظ کے یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ پس چونکہ قرآنِ موجودہ میں یہ الفاظ موجود نہیں تو نتیجہ یہ نکلا کہ قرآنِ موجودہ صحیح نہیں بلکہ اس میں تحریف ہو گئی۔

عن عبد اللہ بن سنان عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قولہ ولقد عهدنا الی آدم من قبل کلمات فی محمد وعلی وفاطمۃ والحسن والحسین والائمۃ من ذریتهم فنسی هكذا واللہ انزلت علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم	عبداللہ بن سنان امام جعفر صادق علیہ السلام سے اللہ کے اس قول میں روایت کرتا ہے (اور بیشک عہد لیا ہم نے آدم سے پہلے سے چند کلمات میں محمد اور علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین اور ان کی اولاد کے ائمہ کے باب میں تو بھول گیا) اسی طرح واللہ نازل کیا گیا ہے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر۔ (اصول کافی ص۲۶۳)

یہ آیت سورۂ طٰہٰ میں اس طرح ہے:-

وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا ؏

مگر یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ امام جعفر صادق نے قسم کھا کر یہ خبر دی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تھی تو اس کے درمیان میں لفظ (من قبل) کے بعد اور لفظ (فنسی) سے پہلے یہ الفاظ بھی تھے (کلمات فی محمد وعلی وفاطمة والحسن والحسین والائمة من ذریتهم)

ف اس روایت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ایک لغزش تو مشہور ہی تھی کہ درخت ممنوع کا پھل انہوں نے کھایا تھا جس کا ذکر قرآن میں کئی جگہ ہے۔ اس کے سوا دوسری خطا آدمؑ سے یہ سرزد ہوئی کہ وہ محمدؐ اور ان کے اہل بیت کے عہد کو بھول گئے اور اس پر مضبوط و مستقل نہ رہے۔

اصول کافی میں اس حدیث سے پہلے جو روایت مذکور ہے اس میں امام باقر علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر بھی منقول ہے چنانچہ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا کی تفسیر میں وہ فرماتے ہیں:-

عهدنا الیه فی محمد والائمة من بعده فترك ولم یكن له عزم انهم هكذا وانما

عہد کیا تھا ہم نے آدم کی طرف محمدؐ اور ائمہ کا جو محمدؐ کے بعد ہیں تو آدم نے اس عہد کو ترک کر دیا اور اس کو یقین نہ تھا کہ وہ سب

؏ اور بیشک عہد کیا تھا ہم نے آدم کو پہلے سو تو بھول گیا اور نہ پایا ہم نے اس کے لیے استقلال۔ وہ عہد یہ تھا کہ درخت کا پھل مت کھائیو۔ یہ قصہ قرآن میں کئی جگہ ہے۔

سمی اولو العزم اولی العزم لانه عهد الیهم فی محمد والاوصیاء من بعده والمهدی وسیرته فاجمع عزمهم علی ان ذلك كذلك والاقرار به

(یعنی محمدؐ اور ائمہ ایسے ہیں اور انبیاء اُولوالعزم کا نام اولی العزم اس لیے ہوا کہ اللہ نے محمدؐ اور اوصیاء اور مہدی اور اس کی سیرت کے باب میں اُن انبیاء سے عہد لیا تھا اور ان کا یقین اس پر جمع ہو گیا تھا کہ یہ اسی طرح ہے اور اس کے اقرار پر۔

اب تو صاف کھل گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام بھولے نہ تھے بلکہ اس عہد کو انہوں نے عمداً ترک کر دیا تھا اور ان کو یہ یقین نہ آیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اہل بیت ایسے ہوں گے اور حضرت آدم کے علاوہ جتنے انبیاء غیر اولی العزم ہیں سب کی یہی حالت ہوئی۔

شیعوں کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ انبیاء قبل نبوت بھی معصوم ہوتے ہیں اور حضرت آدم سے جو درخت ممنوع کے پھل کھا لینے میں لغزش ہوئی تھی وہ فقط ترک اولیٰ تھا۔ اب فرمائیے کہ ترک عہد اور انکار محمد اور اہل بیت کا کفر ل انداز عصمت تھا یا نہیں (معاذ اللہ منہا) صحابہؓ نے بعد رسول کے نہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کیا تھا نہ فضیلت اہل بیت کا انکار کیا۔ شیعہ انکار مسئلہ ت فرض کر کے ان کو مرتد کہتے ہیں (معاذ اللہ) اب خدا جانے حضرت آدم ت سے انبیاء علیہم السلام کو کیا کہیں گے جن کا گناہ بمقابلہ گناہ صحابہؓ کے ت سخت ہے کہ انھوں نے باوجود نبی ہونے کے اللہ کا عہد جو بذریعۂ وحی تھا ترک کیا اور اہل بیت کے ساتھ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی انکار کر دیا نبوت

اور امامت تو ایک طرف فضیلت کے بھی منکر ہوئے اور یہ اُن کو یقین
کہ وہ ایسے ہیں جیسا کہ اللہ نے ان کو بتایا تھا۔ (معاذ اللہ منہا)

اصول کافی صفحہ ۲۶۳ میں ہے:-

عن جابر عن ابی جعفر علیہ السلام قال نزل جبرئیل بهذه الآية على محمد صلى الله عليه واله بئسما اشتروا به انفسهم ان يكفروا بما انزل الله في علي بغيا۔

جابر امام باقر علیہ السلام سے روایت کر ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ جبرئیل نے م صلی اللہ علیہ وآلہ پر یہ آیت نازل کی "بُری چیز ہے وہ جس کے بدلے انہو اپنی جانوں کو بیچ ڈالا کہ انکار کریں اس جس کو اللہ نے علیؑ کے باب میں اُتارا سرکشی کے۔"

یہ آیت سُورہ بقر کی گیارھویں رکوع میں موجود ہے لفظ فی علی
اُس میں پتہ بھی نہیں۔ مگر امام کے بیان سے معلوم ہوا کہ جب یہ آیت نازل ہو
تھی تو یہ لفظ موجود تھا۔ اس آیت سے مع اس ضمیمہ کے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نص
خم سے پہلے ہی تمام مراتب طے ہو گئے تھے اور نص امامت بتصریح بہت
آیات میں نازل ہو چکی تھی اور لوگ اس کو اسی طرح رد کر چکے تھے جیسے حضر
آدم علیہ السلام اور تمام انبیاء غیر اولی العزم نے رد کیا تھا۔ اُنھیں کا اس آ
میں ذکر ہے۔

اصول کافی صفحہ ۲۶۴ میں جابر اُسی سند یعنی امام باقر علیہ السلام
روایت کرتے ہیں:-

قال نزل جبرئيل بهذه الآية على محمد صلى الله عليه واله هكذا ان كنتم في ريب مما نزلنا على عبدنا في علي فاتوا بسورة من مثله

جابر کہتے ہیں کہ جبرئیل نے یہ آیت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر اس طرح نازل کی تھی (اگر تم شک میں ہو اُس سے جو ہم نے اپنے بندے پر علی کے باب میں نازل کیا ہے تو ایک سورۃ مثل اس کے بنا دو)

یہ آیت سورۂ بقر میں موجود ہے لفظ فی علی کا اُس میں پتا بھی نہیں مگر جابر امام باقر علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں کہ اس آیت میں فی علی کا لفظ بھی داخل تھا۔ اس صورت میں اس آیت کا خطاب مسلمانوں سے مختص ہو گا۔ اس لیے کہ مشرکین اول مسئلہ توحید و رسالت کو مان لیں تب مسئلہ امامت ان کے سامنے پیش ہو۔

پس ثابت ہو گیا کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا معجزہ مشرکین کے سامنے پیش نہیں کیا گیا بلکہ مسلمانوں کو اس کی فصاحت و بلاغت سے عاجز کیا گیا تھا۔

دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ فصاحت کا معجزہ تمام قرآن میں نہیں بلکہ انھیں آیات میں ہے جو علیؑ کے باب میں نازل ہوئی تھیں اس لیے کہ اس ضمیمہ کی صورت میں آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم کو اُن آیتوں میں شک ہے جو علیؑ کے باب میں نازل ہوئی ہیں تو اُن آیتوں کی مثل کچھ عبارت بنا دو۔ پس اگر فصاحت و بلاغت تمام قرآن میں ہوتی تو معارضہ ان آیتوں سے مختص نہ ہوتا

اور چونکہ قرآن موجودہ میں ایک آیت میں بھی بنص صریح علیؓ کا ذکر نہیں ہے اور نہ کوئی آیت[۱] ایسی ہے جس میں کسی یقینی دلیل سے معلوم ہو جائے کہ یہ آیت حضرت علیؓ کے باب میں نازل ہوئی ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن موجودہ میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں یقینا فصاحت و بلاغت کا ایسا معجزہ ہو کہ اس کی مثل بنانا ممکن نہ ہو۔

اب غور فرمائیے کہ جس شخص نے اس آیت میں (فی علی) کا لفظ بڑھایا اور اس آیت کی تفسیر اس معنی میں کی اُس نے اصل مقصود جو اس آیت کا تھا بالکل بدل دیا کہ نہیں؟ اللہ نے کافروں سے خطاب کیا تھا اور قرآن کی فصاحت و بلاغت سے مشرکین کو عاجز کیا تھا اب وہ معارضہ مسلمانوں سے ہو گیا۔ اللہ نے قرآن کی ہر ہر آیت میں فصاحت کا معجزہ رکھا تھا اور ہر ہر آیت کا معارضہ کافروں سے طلب کیا تھا مگر اب قرآن کی فصاحت کا معجزہ اور معارضہ انہیں آیتوں سے مختص ہو گیا جو علیؓ کے باب میں نازل ہوئی تھیں اس سے بڑھ کر اور تحریف کیا ہو گی۔

اصول کافی صـ ۲۶۴ میں ہے:۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال نزل جبریل

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے اُنھوں نے فرمایا کہ جبریل نے محمدؐ

۱؎ البتہ ابوبکرؓ کے حق میں آیت غار ایسی ہے جس پر فریقین کا یقین ہے کہ رفیق غار ابوبکرؓ تھے اور ان اللہ معنا سے اللہ کی معیت جیسی رسول کے لیے ثابت ہے اسی طرح ابوبکرؓ کے لیے بھی ثابت ہے ۱۲

علی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ بھذہ الآیۃ ھکذا یا ایھا الذین اوتوا الکتاب اٰمنوا بما نزلنا فی علی نورًا مبینا

صلی اللہ علیہ و آلہ پر یہ آیت اس طرح نازل کی تھی۔ اے اہل کتاب ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے علیؓ کے باب میں روشن نور اُتارا ہے۔

یہ آیت پانچویں پارہ کے ربع اول میں اس طرح مذکور ہے:۔

۲؎ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ

امام جعفر صادق علیہ السلام کے قول سے معلوم ہوا کہ جبریل نے جب یہ آیت نازل کی تھی تو اس میں لفظ فی علی نورا مبینا بھی تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اہل کتاب محمد صلی اللہ علیہ و آلہ کی رسالت اور قرآن کو تو مانتے نہ تھے جو سب سے مقدم ہے۔ بااین ہمہ امامت کا مسئلہ اُن کے سامنے پیش ہو گیا اور کل قرآن پر ایمان لانے کا حکم نہ ہوا فقط اُن آیات پر ایمان لانے کا حکم ہوا جو علیؓ کے باب میں ہیں۔

اصول کافی صـ ۲۶۴ میں ہے:۔

عن ابی جعفر علیہ السلام قال نزل جبریل بھذہ الآیۃ علی محمد صلی اللہ علیہ

امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے اُنھوں نے فرمایا کہ اُتاری تھی جبریل نے یہ آیت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ پر اس طرح

۲؎ اے اہل کتاب ایمان لاؤ اُس پر جو ہم نے نازل کیا ہے جو تصدیق کرتا ہے اُس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے۔ ف۔ مراد یہ ہے کہ کل قرآن پر ایمان لاؤ۔

والہ ھکذا فبدل الذین
ظلموا ال محمد حقھم
قولا غیر الذی قیل لھم
فانزلنا علی الذین ظلموا
ال محمد حقھم رجزًا من
السماء بما کانوا یفسقون ○

تو بدل دیا اُنہوں نے جنھوں نے ظلم کیا
آل محمد کے حق کو ایسے قول سے کہ خلاف
اُس قول کے تھا جو اُن سے کہا گیا تھا تو
اُتارا ہم نے اُن پر جنھوں نے آل محمدؐ کے
حق پر ظلم کیا تھا عذاب آسمان سے ان کے
فسق کی وجہ سے۔

اصل آیت سُورۂ بقرہ میں مذکور ہے۔ قصّہ یہ ہے کہ حضرت موسٰیؑ کے
زمانے میں بنی اسرائیل کو حکم ہوا تھا کہ شہر عمالقہ میں داخل ہو اور وہاں فراغت
سے ہر چیز کھاؤ اور دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور لپنے گناہوں
کی مغفرت کی دعا مانگو تو ہم تمھاری خطائیں بخش دیں گے اور نیکی کرنے والوں کو
زیادہ اجر دیں گے۔ مگر جو ظالم تھے اُنھوں نے قول دعائے مغفرت کو جو اُنھیں
بتایا گیا تھا بدل دیا اس پر ہم نے آسمان سے اُن پر عذاب نازل کیا۔ چنانچہ الفاظ
اس آیت کے مع آیتِ سابقہ کے یہ ہیں :۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ
فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ
رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا
وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ
خَطٰيٰكُمْ وَسَنَزِيْدُ
الْمُحْسِنِيْنَ ○

اور جب کہ حکم کیا ہم نے کہ اس بستی میں
داخل ہو۔ اور اس میں جہاں چاہو فراغت
سے کھاؤ اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے
داخل ہو اور کہو (دعای) مغفرت تو ہم تمہاری
خطائیں بخش دیں گے اور نیکی کرنے والوں کے
لیے زیادتی کریں گے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا
غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ
فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ○

تو بدل دیا ظالموں نے ایسا قول کہ خلاف
اُس قول کے تھا جو اُن سے کہا گیا تھا تو
اُتارا ہم نے ظالموں پر عذاب آسمان
سے اُن کے فسق کی وجہ سے۔

اس آیت میں قصّہ بنی اسرائیل کا ہے اس میں (وظلموا ال محمد
حقھم) کا کہیں پتا بھی نہیں مگر جو روایت کافی کی ہم نے نقل کی اُس سے ظاہر
ہوتا ہے کہ امام معصوم نے یہ فرمایا ہے کہ اس آیت میں دو جگہ یہ لفظ ہے اب
ان الفاظ کو شامل مان کر جو اس کے معنی پر غور کیا جاتا ہے تو پہلی آیت سے اس کو
کوئی ربط باقی نہیں رہتا۔ علاوہ اس کے جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس
وقت تک آل محمد کا حق کس نے چھینا تھا؟ وہ نص امامت جو غدیر خم میں اُتری
تھی اُس وقت تک نازل بھی نہیں ہوئی تھی پس اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کون
لوگ تھے جنھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے آل محمدؐ کا حق چھینا تھا
اور جو قول اُن سے کہا گیا تھا اُس کو بدلا تھا کیونکہ آیت کے مضمون سے تو یہ
معلوم ہوتا ہے کہ یہ امور واقع ہو چکے اب سوائے اس کے اور کیا چارہ ہے
کہ ان لوگوں سے حضرت آدم علیہ السلام اور انبیاء غیر اولی العزم مراد ہوں
جنھوں نے محمد اور آل محمد کی بابت اللہ کے عہد کو ترک کیا تھا انھیں پر اُس کی
سزا میں آسمان سے عذاب بھی نازل ہوا ہوگا (معاذ اللہ منہا)
کتب شیعہ میں اس قسم کی روایتیں بے انتہا ہیں جن سے یہ ثابت

ہوتا ہے کہ مسئلہ امامت اور اسمائے ائمہ بتصریح قرآن کی آیتوں میں نازل ہوئی تھی مگر وہ قرآن ہمیشہ ائمہ کے صندوقوں میں بند رہا۔ انہوں نے مخلصین شیعہ کو بھی نہ دیا اور کیوں دیتے اپنے اصحاب پر ان کو اعتماد نہ تھا بلکہ فساد کا خوف تھا۔

ایک مرتبہ امام باقر علیہ السلام سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ انہوں نے زرارہ کو اپنا مخلص سمجھ لیا تھا اور یہاں تک اُس پر اعتماد کیا تھا کہ اس سے تقیہ توڑ اتحاد تخلیہ میں اُس سے باتیں کیا کرتے تھے۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ ایک دن کتاب علیؑ اس کو دکھا دی اُس کو دیکھ کر زرارہ منکر ہو گیا اور اُس کتاب کو باطل بتایا[1] اور امام سے جھگڑا کیا۔ خدا جانے ایسے لوگوں کو قرآن دیا جاتا تو کیا نتیجہ ہوتا۔

یہ[2] بھی ائمہ کو معلوم تھا کہ شیعہ صدق اور امانت اور وفا سے محروم ہیں اور یہ صفتیں اہل سنت سے مختص ہیں پھر شیعوں کو قرآن کیوں دیتے

پھر ان اصحاب ائمہ کی یہ بھی عادت تھی کہ اکثر مرتد ہو جایا کرتے تھے مجالس[3] المومنین میں لکھا ہے :-

"از حضرت امام زین العابدین روایت کردہ اند کہ می فرمود کہ تمام مردم بعد از قتل حسین مرتد شدند الا پنج کس۔ ابو خالد کابلی و یحییٰ بن ام الطویل و جبیر بن مطعم و جابر بن عبد اللہ و شبکہ کہ حرم محترم حضرت امام حسین بود۔"

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادت حسین کے بعد جتنے

---

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول ۱۲ [2] ایضاً ۱۲
[3] مجالس المومنین مطبوعہ طہران صفحہ ۱۴۴ مجلس پنجم ترجمہ یحییٰ ۱۲

شیعہ تھے سب مرتد ہو گئے تھے مگر پانچ آدمی سلامت رہے تھے جن میں چار مرد تھے اور ایک عورت شبکہ جو امام حسین علیہ السلام کی بی بی تھیں۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ امام حسین کی دوسری بیبیوں کا بھی ایمان ثابت نہ رہا۔

افسوس کہ امام زین العابدین کی ماں حضرت شہر بانو بھی ان پانچ میں شامل نہ رہیں خدا جانے حضرت زینب اور امام حسین کی تینوں بیٹیاں اور حضرت عباس علمدار سقائے حرم کی بیبیاں اور اولاد اور حضرت امام حسن علیہ السلام کی اولاد خصوصاً حضرت امام حسن مثنیٰ علیہ السلام اور ان کی بہن جو حضرت امام زین العابدین کی بی بی تھیں کس فریق میں رہیں۔

ان پانچ میں اہل بیت اور حرم سرائے اہل بیت میں سے سوائے شبکہ کے کسی کا ذکر نہیں۔

اب فرمایئے کہ عقائد مذہب شیعہ اور نص امامت کا تواتر کیوں کر ثابت ہو گا اس لیے کہ اُس زمانے میں فقط امام زین العابدین اور چار مرد ان کی ہاں میں ہاں ملانے والے تھے اور یہ سب کے سب نقاب تقیہ میں رو پوش تھے۔ فقط ایک امام زین العابدین علیہ السلام اپنے منہ سے اپنا اور اپنے اصول و فروع کا امام معصوم مفترض الطاعت ہونا بیان کرتے ہوں گے اور چاروں مرد آمنا و صدقنا کہنے والے ہوں گے۔ پھر رسول تک اس مذہب کی نقل متواتر پہنچنے کا کیا سلسلہ ہے ؟

اسی طرح ہشام اور صاحب الطاق اور دیگر اصحاب امام جعفر صادق

علیہ السلام نے ان کی وفات کے بعد اس امر پر اتفاق کیا تھا کہ مذہب شیعہ کو ترک کر دو اور یہ مشورہ کرتے تھے کہ کون سا مذہب اختیار کریں اور سب سے آخر میں خارجی ہونے کا خیال کیا تھا۔ (اصول کافی صفحہ ۲۲۱)

ائمہ ہمیشہ اپنے اصحاب کو مصلحتاً جھوٹے وعدوں میں بہلا بہلا کر روکا کرتے تھے ورنہ وہ تو ہر وقت مرتد ہو جانے کو تیار رہتے تھے۔ اس موقع پر یہ لطیفہ بھی سننے کے قابل ہے کہ ایک شخص یقطین نامی خلفائے عباسیہ کا طرف دار تھا اور اپنے آپ کو اسی فریق میں شامل کرتا تھا۔ اس کا بیٹا علی بن یقطین مخلصین شیعہ اور اصحاب ائمہ سے تھا۔ اس سبب سے باپ بیٹوں میں ہمیشہ مخالفت رہتی تھی۔ علی بن یقطین یہ کہتا تھا کہ امام موسیٰ کاظم نے یہ خبر دی ہے کہ سنہ دو سو سے شیعوں کی کامیابی کا زمانہ شروع ہو جائے گا۔ جب یہ خبر جھوٹی ہو گئی تو یقطین نے کہا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہمارے فریق یعنی عباسیوں کی کامیابی کی جتنی خبریں ہوتی ہیں وہ تو سچی ہو جاتی ہیں اور روز بروز عباسیوں کی شان و شوکت بڑھتی جاتی ہے اور شیعوں کی کامیابی کی جتنی خبریں ہوتی ہیں سب جھوٹی ہو جاتی ہیں۔ علی بن یقطین نے اس کے جواب میں کہا کہ ائمہ شیعوں کے خوش کرنے کو ان سے کہدیا کرتے ہیں کہ تمہاری کامیابی کا وقت قریب ہے اگر ایسا نہ کریں تو سب مرتد ہو جاویں۔ چنانچہ اصول کافی[1] میں ہے کہ علی بن یقطین کہتا تھا:-

قال لی ابوالحسن علیہ السلام — امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا

۱؎ اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۲۳۳ باب کراہۃ التوقیت ۱۲

الشیعۃ تربی بالامانی منذ مائتی سنۃ قال یقطین لابنہ فکان وقیل لکم فلم یکن فقال لہ علی ان الذی قیل لنا ولکم کان من مخرج واحد غیر ان امرکم حضر فکان کما قیل وان امرنا لم یحضر فعللنا بالامانی فلو قیل لنا ان ھذا الامر لا یکون الا الی مائتی سنۃ او ثلثمائۃ لقست القلوب ولرجع عامۃ الناس عن الاسلام ولکن قالوا ما اسرعہ وما اقربہ تالیفا لقلوب الناس وتقریبا للفرج۔

کہ شیعہ شادکام ہوں گے اپنی آرزوؤں میں سنہ دو سو سے۔ یقطین نے اپنے بیٹے علی بن یقطین سے کہا کہ یہ کیا وجہ ہے کہ جو ہمارے لیے (یعنی عباسیہ کے لیے) کہا جاتا ہے وہ تو پورا ہو جاتا ہے اور جو تمہارے لیے (یعنی شیعوں کے لیے) کہا جاتا ہے وہ پورا نہیں ہوتا۔ تو علی نے کہا کہ جو ہمارے لیے کہا گیا ہے اور جو تمہارے لیے کہا گیا ہے سب کا مخرج ایک ہے (یعنی سب خبریں ائمہ نے بیان کی ہیں) مگر بات یہ ہے کہ تمہارا وقت آگیا ہے اس لیے جو خبر دی جاتی ہے وہ واقع ہو جاتی ہے اور بے شک ہمارے کام کا وقت نہیں آیا تو ہم کو بہلایا گیا آرزوؤں میں پس اگر ہم سے کہا جاتا کہ یہ امر (یعنی خروج مہدی اور کامیابی شیعہ) نہ ہو گا مگر دو سو برس تک یا تین سو برس تک تو البتہ سخت ہو جاتے دل اور پھر جاتے سب لوگ اسلام سے اور لیکن ائمہ نے کہدیا کہ بہت جلد ہے وہ وقت اور بہت

قریب ہے وہ وقت لوگوں کی تالیف قلوب
کے لیے اور خوشی قریب بتا دینے کے لیے۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ ائمہ مصلحتاً جھوٹی خوش خبریاں سُنا سُنا کر اپنے اصحاب کو بہلایا کرتے تھے اگر ائمہ ایسا نہ کرتے تو وہ لوگ دین اسلام سے بھی پھر جاتے۔

ائمہ کی یہ حکمت عملی جناب امیر کے وقت سے جاری تھی کہ شیعوں کو ارتداد سے روکنے کے لیے کہہ دیا کرتے تھے کہ مہدی بہت جلد آنے والے ہیں بلکہ اُس کا وقت بھی مقرر کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ سنہ سترؔ جناب امیر نے مقرر کیا تھا۔

علامہ طوسی نے کتاب[1] الغیبۃ میں لکھا ہے :-

عن ابی حمزۃ الثمانی	ابی حمزہ ثمانی سے روایت ہے وہ کہتا ہے
قال قلت لابی جعفر علیہ	کہ میں نے ابوجعفر علیہ السلام سے پوچھا کہ علی علیہ
السلام ان علیا کان یقول	السلام فرماتے تھے کہ سنہ ستر تک بلا ہے.
الی السبعین بلاء وکان	اور یہ بھی فرماتے تھے کہ بلا کے بعد آسانی
یقول بعد البلاء رخاء و	ہے اور سنہ ستر گزر گیا اور ہم نے
قد مضت السبعون ولم	آسانی نہ دیکھی۔
نورخاء	

[1] یہ روایت مع مابعد کی روایت کے خلیل قزوینی نے صافی شرح کافی میں باب کراہۃ التوقیت میں نقل کی ہے ۱۲

سنہ سترؔ گزر جانے کے بعد شیعوں سے یوں بات بنا دی گئی کہ
ین کے قتل کی وجہ سے اللہ ناراض ہوگیا اس لیے اُس نے اپنی رائے بدل
ی اور سنہ ستر کا وقت ملتوی کرکے سنہ ایک سو چالیس مقرر کر دیا جب
سنہ ایک سو چالیس آگئے تو وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کا زمانہ تھا پھر شیعوں
ں ارتداد کے مادّہ نے جوش کیا آخر امام کو کہنا پڑا کہ اللہ نے مجھ ہی کو مہدی مقرر
یا تھا مگر اب یہ وقت بھی ٹال دیا۔ چنانچہ علامہ طوسی نے کتاب الغیبۃ میں
لکھا ہے :-

عن عثمان بن النواء قال	عثمان بن النواء سے روایت ہے وہ کہتا
سمعت اباعبد اللہ علیہ	ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام
السلام یقول کان ھذا الامر	سے سُنا کہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ امر (یعنی مہدی
فی فاخرہ اللہ ویفعل اللہ	ہونا) میری ذات میں تھا مگر اللہ نے اُس کو
بعد فی ذریتی مایشاء۔	ٹال دیا اب اللہ میری اولاد میں جو چاہے گا
	وہ کرے گا۔

یہ مشکلات ائمہ کو اس وجہ سے پیش آتی تھیں کہ اگر اس طرح جھوٹی
وش خبریاں نہ سُناتے تو اُن کے اصحاب فوراً مرتد ہو جاتے۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اس قدیمی حکمتِ عملی کے مطابق
سنہ دو سو مقرر کر دیے تھے اور چاہا تھا کہ اسی تدبیر سے اپنے گروہ کے فساد
ر دکیں مگر شیعوں کو اُن کے قول کا یقین نہ ہوا اور جو مادّہ اُن کی طینت میں تھا

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول ۱۲

وہ اسی طرح جوش کرتا رہا آخر یہاں تک نوبت پہونچی کہ سنہ[1] ایک سو تہتر میں شیعوں پر اللہ کا غضب نازل ہونے والا تھا تب امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنی جان فدیہ میں دے کر دنیاوی عذاب سے ان کو بچایا۔

ائمہ جانتے تھے کہ یہ جھوٹی خبریں جو شیعوں کی تالیف کے لیے بیان کی جاتی ہیں ہرگز سچی نہیں ہو سکتیں اور آخر میں نتیجہ ندامت ہو اس لیے وہ کبھی کبھی ایسی باتیں بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ کچھ تاویل کی گنجائش بھی باقی رہے وہ باتیں بھی عجیب لطیفہ ہوتی تھیں۔ اصول کافی ص۲۳۳ میں ہے:۔

عن الفضل بن یسار عن	فضل بن یسار امام باقر علیہ السلام سے
ابی جعفر علیہ السلام	روایت کرتا ہے کہ میں نے پوچھا کہ کیا اس
قال قلت لھذا الامر وقت	امر کے لیے کوئی وقت ہے؟ امام نے فرمایا
فقال کذب الوقاتون	کہ جھوٹ بولا تھا وقت مقرر کرنے والوں نے
کذب الوقاتون کذب	جھوٹ بولا تھا وقت مقرر کرنے والوں نے
الوقاتون۔	جھوٹ بولا تھا وقت مقرر کرنے والوں نے

ف وقت مقرر کرنے والے جناب امیر سے لے کر جناب امام باقر تک سب یہی ائمہ تھے اول سنہ ستر پھر سنہ ایک سو چالیس انھیں سب نے مقرر کیے تھے باایں ہمہ امام باقر علیہ السلام نے فرما دیا کہ وقت مقرر کرنے والوں نے جھوٹ بولا تھا۔

پس امام باقر علیہ السلام نے ان سب ائمہ معصومین کو صاف صاف

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول ۱۲

جھوٹا کہہ دیا مگر اشارات کلام میں یہ مضمون ظاہر کیا کہ ان ائمہ[1] نے اپنی طرف سے جھوٹ نہیں بولا بلکہ جو کچھ کہا تھا وہ خدا کی طرف سے کہا تھا وہیں سے معاملہ دگرگوں ہو گیا۔ چنانچہ اس قصہ کی مثال میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ نقل کر دیا:۔

اِنّ موسیٰ علیہ السلام	بے شک موسیٰ علیہ السلام جب نکلے قصد
لما خرج وافدا الی ربہ	کرنے والے اپنے رب کی طرف تو قوم سے
واعدھم ثلثین یوما	تیس[30] دن کا وعدہ کیا تھا تو جب بڑھا دیے
فلما زاد اللہ علی الثلثین	موسیٰ کے لیے اللہ نے تیس پر دس دن
عشرا قال قومہ قد اخلفنا	تو موسیٰ کی قوم نے کہا کہ ہم سے وعدہ خلافی کی
موسی فصنعوا ما صنعوا۔	موسیٰ نے تو کیا انہوں نے جو کیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ تم کوہ طور پر آؤ تیس دن کے بعد تم کو نعمتیں ملیں گی وہ نعمتیں یہ تھیں کہ مقامات قرب الٰہی میں ترقی ہو گی، اللہ سے کلام ہوگا، توریت ملے گی چنانچہ حضرت موسیٰ کوہ طور پر گئے اور تیس دن کے بعد سے اس وعدہ کا ظہور شروع ہو گیا یہ نعمتیں دس دن تک ملتی رہیں اور چالیس دن میں سب پوری ہو گئیں۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں اللہ نے یوں فرمایا ہے:۔

[1] اصول کافی میں امام صادق کا یہ قول بھی ہے کہ ہم اہل بیت وقت مقرر نہیں کرتے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اپنی طرف سے وقت مقرر نہیں کرتے جو کچھ کہتے ہیں اللہ کی طرف سے کہتے ہیں۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ — اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس دن کا اور تمام کیا اس کو دس دن میں۔

ف اس مضمون سے صاف ظاہر ہے کہ تیس دن کے بعد سے اللہ کی نعمتیں ملنا شروع ہو گئیں اور دس دن میں سب مل چکیں۔

فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً — تو پوری ہو گئی میعاد اُس کے رب کی چالیس دن میں۔

ف اس سے ثابت ہو گیا کہ پہلے سے اللہ نے تکمیل کی مدت چالیس دن مقرر کر دی تھی۔ چنانچہ سورۂ بقر میں بھی چالیس دن کا وعدہ بالتصریح مذکور ہے اور اللہ یوں فرماتا ہے:۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً — اور جب کہ وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے چالیس دن کا۔

ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ سورۂ بقر میں فقط تکمیل کی مدت مذکور ہے اور سورۂ اعراف میں وعدہ کی تفصیل ہے کہ تیس دن کے بعد سے انعام شروع ہوگا اور چالیس دن میں پورا ہو جائے گا۔ اور جب حضرت موسیٰ کو معلوم تھا کہ فراغت چالیس دن میں ہوگی۔ پھر بھلا اپنی قوم سے تیس دن کا وعدہ کیوں کرتے؟ پس ائمہ کی پیشین گوئیوں کی حالت حضرت موسیٰ کے قصہ سے کیوں کر مطابق ہو سکتی ہے۔ مگر امام باقر علیہ السلام نے اپنے اصحاب[1] کے سامنے اپنی بات بنالی کیونکہ وہ لوگ قرآن سے بالکل جاہل تھے

[1] اگر اُن میں کوئی حافظ ہوتا تب بھی یہ مغالطہ نہ چلتا ۱۲

ان کو کیا خبر تھی کہ سورۂ بقر میں چالیس دن کا وعدہ مذکور ہے اگر خبر ہوتی تو امام باقر علیہ السلام پر اعتراض کرتے کہ حضرت موسیٰ کو چالیس دن کی میعاد معلوم تھی پھر تیس دن کا وعدہ کیوں کیا۔

اس حدیث کا آخری جملہ عجب چلتا فقرہ ہے یعنی امام نے اُن سے یہ کہہ دیا کہ ہماری پیشین گوئیاں غلط ہو جایا کریں تو بھی تم بداعتقاد نہ ہوا کرو اس میں تم کو دُونا اجر ملے گا۔

چنانچہ کافی کی عبارت یہ ہے:۔

واذا حدثناكم الحديث فجاء على ما حدثناكم فقولوا صدق الله واذا حدثناكم الحديث فجاء على خلاف ما حدثناكم فقولوا صدق الله توجروا مرتين۔

اور جب بیان کریں ہم تم سے کوئی حدیث اور ہو جاوے مطابق اُس کے جو ہم نے کہا تھا تو تم کہو اللہ نے سچ کہا تھا۔ اور جب ہم تم سے کوئی بات بیان کریں اور وہ ہماری خبر کے خلاف واقع ہو تو تم یوں کہو کہ اللہ نے سچ کہا تھا تو تم کو دُونا اجر ملے گا۔

مطلب یہ ہوا کہ ہم نے جو خبر بیان کی تھی وہ اللہ کی طرف سے بیان کی تھی اب جو وہ خبر جھوٹی ہو گئی تو در حقیقت اللہ کا قول جھوٹا ہو گیا مگر اللہ کو جھوٹا کہنا خلاف ادب ہے اس لیے جب اللہ کی خبر جھوٹی ہو جائے تو تم زبان سے یہی کہو کہ اللہ نے سچ کہا تھا اس میں تم کو دُونا اجر ملے گا۔

اس میں یہ اشارہ ہو گیا کہ ہم جھوٹی خبریں اس لیے بیان کیا کرتے ہیں

کہ تم کو دُونا اجر ملے۔

یہ حکمت عملی ائمہ کی پیشین گوئیوں سے مختص نہ تھی بلکہ قرآن کی تفسیریں بھی ہر شخص کے سامنے اُس کے مناسب بیان کر دیا کرتے تھے۔ اصول کافی ص۱۶۳ میں روایت ہے

عن موسی بن اشیم قال کنت عند ابی عبد اللہ علیہ السلام فسالہ رجل عن اٰیۃ من کتاب اللہ عز وجل فاخبرہ بہا ثم دخل علیہ داخل فسالہ عن تلک الاٰیۃ فاخبرہ بخلاف ما اخبر الاول فدخلنی من ذلک ماشاء اللہ حتی کان قلبی یشرح بالسکاکین فقلت فی نفسی ترکت ابا قتادۃ بالشام لا یخطی فی الواو وشبہہ وجئت الی ھذا یخطی ھذا الخطاء کلہ۔ فبینا انا کذلک اذ دخل آخر فسالہ عن تلک الاٰیۃ

موسی بن اشیم سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس تھا۔ تو اُن سے سوال کیا ایک شخص نے قرآن کی ایک آیت کا۔ امام نے اس کے معنی اُس کو بتائے پھر ایک اور شخص آیا اُس نے بھی یہی آیت پوچھی تو اُس سے ایسے معنی بیان کیے جو مخالف تھے اُس کے جو پہلے شخص سے بیان کیے تھے تو پیدا ہوا اس سے مجھ کو شک جو چاہا اللہ نے یہاں تک کہ میرا دل چھریوں سے کٹا جاتا تھا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں نے ابو قتادہ کو شام میں چھوڑا کہ وہ ایک حرف واو یا اس کی مثل میں غلطی نہیں کرتا تھا اور اب میں اس شخص کے پاس آگیا ہوں جو ایسی پوری خطائیں کرتا ہے۔ ہم اسی حال میں تھے کہ ایک اور شخص آگیا اور اُس نے بھی یہی آیت پوچھی تو اُس سے

فاخبرہ بخلاف ما اخبرنی واخبر صاحبی فسکنت فعلمت ان ذلک منہ تقیۃ۔

ایسے معنی بیان کر دیے جو مخالف تھے اُن تفسیروں کے جو مجھ سے اور میرے دونوں ساتھیوں سے بیان کی تھیں تو میرا دل ٹھیر گیا اور میں نے جان لیا کہ یہ ان کا تقیہ ہے

اس کے بعد اس روایت میں یہ مضمون ہے کہ امام نے مجھ سے کہا کہ اللہ نے ہم کو اختیار دیدیا ہے کہ ہم جو چاہیں وہ کہدیں۔

اس روایت سے اصحاب ائمہ کی خوش اعتقادی بخوبی معلوم ہوگئی مگر وہ کیا کریں ائمہ کی باتیں ہی ایسی تھیں کہ ایک بات پر اُن کو قرار نہ تھا۔ حق کہنے والا ہمیشہ ایک بات کہتا ہے اور جو شخص لوگوں کو راضی کرنے کے لیے ہر شخص سے اس کی مرضی کے موافق باتیں کرتا ہے بھلا اُس کے معتقدین کو بد اعتقادی کیوں نہ پیدا ہو۔

افسوس کہ ائمہ قرآن کی تفسیر میں بھی ایک قول حق پر قائم نہ تھے ہر قسم کے مسائل ائمہ مصلحت وقت کے مطابق بیان کیا کرتے تھے کسی قدر تفصیل اُس کی جلد اول[1] میں گزر چکی۔

امام ابو حنیفہؒ کے سامنے[2] قسم کھا کر ان کی تعریف کر دی جب وہ اٹھے تو محمد بن مسلم کی خاطر سے ان کی ہجو کر دی۔ اہل سنت کے سامنے سُنی بن جاتے شیعوں کے سامنے شیعوں کے امام تھے۔ سُنیوں سے کہہ دیتے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ شیعوں سے کہہ دیتے کہ سچی باتیں یہی ہیں جو تم سے کہتے ہیں اور اس کے

---

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول ۱۲ [2] ایضاً

خلاف جو اوروں سے کہتے ہیں وہ جھوٹ ہے۔ صحابہ[۱] کی کبھی تعریف کر دیتے۔ کبھی برائی بیان کر دیتے تھے۔

اصول کافی میں ہے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام جب لڑکے تھے تو عیسیٰ شلقان نے اُن سے امام جعفر صادق علیہ السلام کی شکایت کی اور یہ کہا

یا غلام ما تری ما یصنع ابوك یامرنا بالشئ ثم ینھانا عنہ امرنا ان نتولی ابا الخطاب ثم امرنا ان نتبرء منہ	اے لڑکے تو نہیں دیکھتا کہ تیرے باپ کی کیا حرکتیں ہیں ہم کو ایک چیز کا حکم کرتا ہے پھر اُس سے منع کر دیتا ہے۔ ہم کو ابو الخطاب سے محبت رکھنے کا حکم کیا تھا پھر اُن سے بیزاری کا حکم دیا۔

دیکھو ائمہ نے اپنے شیعوں کو راضی رکھنے اور ارتداد سے روکنے کے لیے اپنی عصمت کا بھی تو لحاظ نہ رکھا اور کیسی کیسی ناجائز باتیں گوارا کیں مگر اصحاب ائمہ کی یہ حالت تھی کہ وہ اُن کے روکے سے نہیں رکتے تھے اور ہمیشہ نافرمانی اور سرکشی کرتے تھے۔

یہی امام جعفر صادق علیہ السلام جنھوں نے اپنے اصحاب کی تالیف کے لیے اُن حکمت عملیوں کا شیوہ اختیار کیا تھا جن کا ابھی ذکر ہو چکا ہے آخر میں جو انہوں نے اپنے اصحاب کا حال بیان کیا ہے وہ اصول کافی ص۴۹۶[۲] میں منقول ہے۔

عن ابن رباب قال سمعت	ابن رباب سے روایت ہے وہ کہتا ہے

---

۱ نصیحۃ الشیعہ جلد اول ۲ ایضاً ۱۲

اباعبد اللہ علیہ السلام یقول لابی بصیر اما واللہ لو انی اجد منکم ثلاثۃ مومنین یکتمون حدیثی ما استحللت ان اکتمھم حدیثا۔	کہ میں نے امام باقر علیہ السلام سے سنا کہ ابو بصیر سے فرماتے تھے کہ واللہ اگر میں تم میں سے تین مومن ایسے پاؤں جو میری حدیث کو چھپا دیں تو پھر میں تم سے اپنی حدیث چھپانا روا نہ رکھوں۔

اور اس کے بعد دوسری روایت میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ اگر میرے شیعہ پورے سترہ ہوتے تو میں جہاد کرتا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ میرا مطیع اور فرمانبردار فقط ایک ہے۔ چنانچہ مجالس المومنین مجلس پنجم ص۱۴۴ میں ہے:۔

وکشی روایت نمودہ از حضرت امام موسےٰ کاظم کہ مے فرمودند:۔	اور کشی نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ وہ فرماتے تھے
ما وجدت احدا یقبل وصیتی ویطیع امری الا عبد اللہ بن یعفور	نہ پایا میں نے کسی کو جو میری نصیحت کو قبول کرتا ہو اور میرے حکم کی اطاعت کرتا ہو مگر عبد اللہ بن یعفور کو۔

یہاں سے یہ معلوم ہو گیا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو اپنے اصحاب میں تین شخص بھی ایسے نہ ملے جو اُن کے مطیع اور فرمانبردار ہوتے بلکہ سب سرکش اور نافرمان تھے۔

اس تمام بیان سے بخوبی واضح ہو گیا کہ ان کی سرشت میں ارتداد کا

مادہ بھرا ہوا تھا۔ اور ائمہ نے اُن کے روکنے کے لیے ایسی ایسی ناجائز حکمت عملیوں کا ارتکاب کیا تب بھی وہ نہ رُکے۔

عبداللہ بن یعفور نے جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے بہت بڑا اپنا تعجب ظاہر کیا تھا کہ مجھ کو اپنے تجربے سے معلوم ہو گیا کہ جو لوگ تمہاری ولایت کو مانتے ہیں اُن میں صدق اور امانت اور وفا نہیں ہے۔ اس قول کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس قول کو ملاؤ کہ تین مومن بھی امین اور مطیع نہیں تو خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ کل اصحاب امام کا وہی حال تھا جو عبداللہ بن یعفور نے بیان کیا تھا۔ اس قول میں بھی اتنا احتمال باقی تھا کہ شاید دو شخص صادق اور امین اور مطیع ہوں مگر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام[1] نے اس کی بھی توضیح کر دی کہ فقط ایک ہی ہے۔ درحقیقت یہ بھی ان کی غلط فہمی تھی ایک بھی نہ تھا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام تمام اصحاب سے اپنی حدیثیں چھپاتے تھے۔ پس جو اقوال ان کے شیعہ راویوں نے

---

[1] دوسری روایت میں امام موسیٰ کاظم نے صاف سب کو مرتد بتا دیا۔ چنانچہ کلینی کے کتاب الروضہ ص۱۰۷ میں روایت کی ہے:- قال ابو الحسن علیہ السلام لو میزت شیعتی ماوجدتهم الا واصفة ولو امتحنتهم لما وجدتهم الا مرتدین فرمایا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اگر منتخب کروں اپنے شیعوں کو نہ پاؤں میں اُن کو مگر فقط زبان سے دعویٰ کرنے والے اور اگر امتحان کروں میں اُن کا نہ پاؤں میں اُن کو مگر مُرتد ۱۲

نقل کیے ہیں وہ اُن کا اصلی مذہب نہیں۔ کیونکہ وہ تو اُن سے اپنی اصلی حدیثیں چھپاتے تھے اور جب ان سے حدیثیں چھپاتے تھے تو بھلا اصلی قرآن اُن کو کیوں کر دیتے۔

اصحاب ائمہ ائمہ پر افترا بھی کیا کرتے تھے چنانچہ عبداللہ بن یعفور[1] وغیرہ نے کوفہ میں یہ افترا کیا تھا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام امام مفترض الطاعت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ سن کر امام کو بہت غصہ آیا اور صاف فرما دیا کہ میں نے اُن کو یہ حکم نہیں کیا۔

پس جہاں تک غور کیا جاتا ہے شیعوں کی طرف سے اس کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہو سکتا کہ ائمہ نے اصلی قرآن اس لیے نہ دیا کہ اصحاب ائمہ کی یہ حالت تھی جو اوپر مذکور ہوئی اب وہ قرآن کس کو دیتے۔

اب غور کرو کہ شیعوں کی روایتوں کے بموجب قرآن کی کیا حالت ہو گئی اور جب اس طرح اس میں تحریف ہوئی اور مسئلہ امامت نکال ڈالا گیا تو قرآن کا کیا اعتبار رہا۔ خدا جانے کتنے مسئلے نکل گئے ہوں گے۔

اللہ نے جو قرآن کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا وہ اس طرح پورا کیا اہل سنت کو توفیق دی کہ سینہ اور سفینہ میں قرآن کی حفاظت کرتے رہے اسی وجہ سے شیعوں کو یہ مجال نہ ہوئی کہ جو آیتیں اُنہوں نے بنائی تھیں اُن کو قرآن میں داخل کر سکتے۔ مجبور ہو کر اُن آیتوں کو کافی وغیرہ کی روایتوں میں شامل کیا اگر اہلِ سُنت

---

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول ۱۲

کی طرف سے قرآن کی ایسی حفاظت نہ ہوتی تو شیعہ قرآن کی وہی حالت
کر دیتے جو توریت و انجیل وغیرہ کی ہوگئی۔ بہر حال نمونہ شیعوں کی طینت کا بہت
اچھی طرح ظاہر ہو گیا۔

شیعوں کے اعتقاد میں جو لوگ اصحاب ائمہ کہلاتے ہیں وہ درحقیقت
مذہب اسلام کے معتقد نہ تھے اس لیے جس طرح اُنھوں نے تمام مذہب شیعہ
تصنیف کیا اور ائمہ پر افترا کیے اسی طرح انھوں نے تحریف قرآن کی سیکڑوں
روایتیں تصنیف کر کے ائمہ کی طرف منسوب کر دیں۔ اُنھیں اس سے کیا غرض
کہ جب قرآن میں تحریف مانی جاوے گی تو مذہب اسلام میں کیسے شکوک پیدا
ہوں گے اور مخالفین کو طعن کرنے کی کیسی گنجائش ہوگی۔ اپنے نزدیک طعن
مخالفین کے جواب کے لیے انھوں نے یہ مسئلہ ایجاد کیا تھا کہ شیعوں کے نزدیک
قرآن حجت نہیں امامؑ کا قول حجت ہے۔ پس جب قرآن حجت نہیں تو اگر قرآن
میں تحریف ہو تو اُن کا کیا حرج؟۔

متقدمین شیعہ کا اس مسئلہ پر اجماع و اتفاق تھا کہ قرآن میں تحریف
ہوئی اور بہت سی روایتیں ائمہ کی اس مضمون کو صاف صاف ثابت کرتی تھیں
جو حد تواتر کو پہنچی ہیں۔[1]

متقدمین یہ کہتے تھے کہ جب ائمہ نے تحریف کی خبر دی اور بعض الفاظ
بھی بتا دیئے جو نکال ڈالے گئے اور یہ مضمون ائمہ سے باسانیدِ صحیحہ بہت سے
طرق سے ثابت ہو گیا تو تحریفِ قرآن کا انکار نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ائمہ کے

[1] اصول کافی کی کتاب الحجۃ میں سب سے پہلے یہی مضمون بڑی تفصیل سے مذکور ہے۔

اقوال پر یقین کرنا واجب ہے۔ اب اگر ائمہ کے اقوال سے مذہب اسلام پر کچھ
اعتراض آویں تو ائمہ کی مخالفت کسی حالت میں جائز نہیں۔

متاخرین شیعہ میں ایک نیا فرقہ پیدا ہوا جس نے اہل سنت سے
یہ مسئلہ سیکھا کہ قرآن میں تحریف نہیں ہوئی اور پورا قرآن یہی ہے جو اب
موجود ہے۔

شریف مرتضیٰ اور ابن بابویہ صاحب رسالہ اعتقادیہ اس مسئلے
کے موجد ہیں۔ اور طبرسی صاحب تفسیر مجمع البیان نے بھی یہی قول اختیار
کیا ہے۔

اس فرقۂ جدیدہ کو قرآن میں تحریف بتاتے ہوئے شرم آئی اس لیے
انھوں نے ائمہ کے اقوال کو علانیہ رد کر دیا اور اپنے متقدمین کو اس مسئلہ میں
گمراہ بتایا۔

اب شیعہ اس مسئلہ میں مذبذب ہیں۔ مطاعن صحابہ کی بحث میں
قول قدیم اختیار کرتے ہیں اور عثمانؓ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُنھوں نے
مسئلہ امامت قرآن سے نکال ڈالا۔ چنانچہ ملائے مجلسی نے حق الیقین میں مطاعن
عثمانؓ کی بحث میں لکھا ہے:۔

"طعن ہفتم آں کہ جمع کرد مردم را بر قرارت زید بن ثابت و بس
برائے آں کہ عثمانی بود و دشمن امیر المومنین و چوں خواست مناقب
اہل بیت و مثالب اعدائے ایشاں را بیندازد اورا برائے جمع
قرآن اختیار کرد۔"

اور جب تحریف قرآن کے قول پر بے اعتباری قرآن کا اعتراض پیش ہوتا ہے تو کہتے ہیں ہرگز تحریف نہیں ہوئی اور قرآن کے الفاظ اسی قدر تھے جواب موجود ہیں اور ابن بابویہ اور شریف مرتضیٰ اور صاحب مجمع البیان کے اقوال پیش کرتے ہیں۔

اب حضرات شیعہ سے کوئی پوچھے کہ ابن بابویہ وغیرہ کو ائمہ کے قول رد کرنے کا کیا اختیار تھا اور جب انھوں نے اقوال ائمہ کی ایسی کھلم کھلا مخالفت کی تو پھر شیعوں نے اپنے فرقہ سے ان کو خارج کیوں نہ کیا اور اب شیعوں کا یہ دعویٰ بالکل ٹوٹ گیا کہ ان کا تمام مذہب ائمہ سے ماخوذ ہے۔ بھلا ائمہ کے اقوال سے تو یہ ثابت کر دیں کہ قرآن موجودہ میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور وہ سب اسی قدر ہے جو مسلمانوں کے پاس ہے بلکہ اس کے خلاف ائمہ کے بہت سے اقوال موجود ہیں جن میں سے چند روایتیں اول مذکور ہو چکیں۔

اصول[1] کافی میں امام جعفر سے مذکور ہے کہ جبریلؑ نے جو قرآن نازل کیا تھا اس میں سترہ ہزار آیتیں تھیں۔ اسی سے ثابت ہوگیا کہ بہت سا قرآن ساقط ہوگیا۔ اس لیے کہ قرآن موجودہ میں پوری سات ہزار بھی آیتیں نہیں۔

اور نیز اصول کافی میں ہے کہ محمد بن ابی النصر کہتا تھا کہ امام رضا علیہ السلام نے ایک قرآن مجھ کو دیا تھا اس میں سورہ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ

[1] اصول کافی میں یہ سب روایتیں کتاب فضل القرآن کے باب النوادر میں مذکور ہیں۔ ۱۲

کَفَرُوْا جو میں نے پڑھی تو اس میں قریش کے ستر آدمیوں کے نام مع ولدیت کے مذکور تھے۔ مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اس کو دیکھنا مت۔ پھر وہ قرآن مانگ لیا دیکھیے یہ شخص کیسا نافرمان تھا کہ امام نے اس قرآن کے دیکھنے سے منع کیا تھا مگر اس نے ایک سورۃ پڑھ ہی لی۔

اصول کافی میں سالم بن سلمہ سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ :۔

قرء رجل علی ابی عبد اللہ	امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے
علیہ السلام حروفا من	ایک شخص نے الفاظ قرآن کے پڑھے وہ
القران لیس علی ما یقرءہ	اس قرآن کے مطابق نہ تھے جس کو لوگ
الناس فقال ابو عبد اللہ	پڑھتے ہیں۔ تو امام جعفر صادق علیہ
علیہ السلام کف عن ھذا	السلام نے فرمایا کہ اس قرات سے باز
القراءۃ اقرء کما یقرء الناس	رہ اسی طرح پڑھ جیسے کہ اور لوگ پڑھتے
حتی یقوم القائم فاذا قام	ہیں اس وقت تک کہ قائم ظاہر ہو۔ تو
القائم قرء کتاب اللہ	اللہ عز و جل کی کتاب کو اس کی حد کے مطابق
عز وجل علی حدہ واخرج	پڑھے گا۔ اور اس قرآن کو نکالے گا جس کو
المصحف الذی کتبہ	علیؓ نے لکھا تھا۔ اور فرمایا امام نے کہ نکالا
علی وقال اخرجہ علی علیہ	تھا اس قرآن کو علی علیہ السلام نے آدمیوں
السلام الی الناس حین فرغ	کی طرف جب کہ اس سے فارغ ہوئے
منہ وکتبہ فقال لھم ھذا	تھے اور لکھ چکے تھے پھر علی نے ان سے
کتاب اللہ عز وجل کما	کہا کہ یہ اللہ عز و جل کی کتاب ہے جس طرح

انزله الله علی محمد صلی الله علیه و اله قد جمعته من اللوحین فقالوا هو ذا عندنا مصحف جامع فیه القران لاحاجة لنا فیه فقال اما والله لا ترونه بعد یومکم هذا ابدا انما کان علی ان اخبرکم حین جمعته لتقرؤه۔

اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر نازل کی تھی۔ میں نے اس کو دو لوحوں سے جمع کیا ہے (یعنی لوح مکتوب سے اور لوح دل سے) تو انھوں نے کہا کہ وہ ہمارے پاس مصحف ہے۔ جمع ہے اُس میں قرآن ہم کو اس کی حاجت نہیں تو علیؑ نے فرمایا کہ واللہ اس دن کے بعد تم اس کو کبھی نہ دیکھو گے۔ بے شک مجھ پر واجب تھا کہ میں تم کو آگاہ کر دوں جب کہ میں نے اس کو جمع کر لیا تھا۔ تاکہ تم اس کو پڑھو۔

اس روایت سے یہ چند باتیں ثابت ہوئیں۔

حضرت علیؓ کو اپنے حفظ پر اعتماد نہ تھا اسی لیے مکتوب سے اُس کی مطابقت کرتے تھے۔ حضرت علیؓ پر واجب تھا کہ اپنا جمع کیا ہوا قرآن لوگوں کو دیں تاکہ اُسی کو پڑھا کریں۔ اور اس سے ظاہر ہوگیا کہ مسلمانوں پر بھی حضرت علیؓ کے قرآن کا پڑھنا واجب تھا نہ کہ قرآن محرف کا۔

جب حضرت علیؓ پر اپنے مخالفوں کو قرآن دینا واجب تھا تو شیعوں کو قرآن دینا بدرجۂ اولیٰ واجب ہوگا پھر ائمہ نے جو اصلی قرآن کے پڑھنے سے منع کیا اور اپنے شیعوں کو قرآن نہ دیا تارک واجب ہوئے۔

اگر حضرت علیؓ کے پاس پہلے سے موافق ترتیب نزول کے قرآن

مکتوب یا محفوظ تھا تو پہلے سے مرتب تھا پھر حضرت علیؓ نے کیا جمع کیا۔ حالانکہ اس روایت سے ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک مدت تک قرآن جمع کیا اور پھر پیش کیا۔

اور اگر موافق ترتیب کے محفوظ اور مکتوب نہ تھا تو پھر ترتیب نزول کیوں کر معلوم ہوئی؟

دوسری روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بتا گئے تھے کہ قرآن میرے بچھونے کے پیچھے مختلف پرچوں میں ہے تم اس کو جمع کر لینا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ترتیب نزول نہیں بتائی تھی قرآن کا مختلف پرچوں میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ متفرق اور غیر مرتب تھا۔

تفسیر صافی[1] میں لکھا ہے:-

روی علی بن ابراهیم القمی فی تفسیره باسناده عن ابی عبد الله قال ان رسول الله قال لعلی یا علی ان القرآن خلف فراشی فی الصحف والحریر والقراطیس فخذوه واجمعوه ولا تضیعوه

علی بن ابراہیم قمی نے اپنی تفسیر میں اپنی اسناد سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے علیؓ سے کہا تھا کہ اے علی قرآن میرے بستر کے نیچے ہے صحیفوں میں اور کپڑوں اور کاغذوں میں۔ تم سب اس کو لے لینا اور جمع کر لینا اور ضائع

[1] تفسیر صافی مطبوعہ طہران مقدمہ سادسہ صفحہ ۱۲

کما ضیعت الیہود التورات   جیسے کہ یہود نے تورات کو ضائع کر دیا۔

یہ خطاب فقط ایک علیؓ سے نہ تھا بلکہ تمام صحابہ سے تھا اسی لیے جمع کے صیغے بولے اور ضائع نہ کرنے کی تاکید بھی اسی کی دلیل ہے اس لیے کہ جناب امیر تو معصوم تھے اُن سے اس تاکید کی ضرورت کیا تھی اور اس صورت میں اس روایت کے معنے یہ ہوئے کہ علیؓ کو یہ حکم تھا کہ سب صحابہ کے ساتھ مل کر قرآن کو جمع کریں۔ مگر علیؓ نے اس حکم کی پوری تعمیل نہ کی بلکہ مخالفت کی کہ اصل قرآن کے پرچے صحابہ کو نہ دیے اور نہ جمع قرآن میں ان کو شریک کیا۔ بلکہ بطور خود تنہا تمام قرآن کو مرتب کر کے ان کے سامنے پیش کیا۔ پھر بھلا ایک شخص کی رائے پر صحابہ کیسے اعتماد کرتے ان کو تو منظور یہ تھا کہ سب متفق ہو کر اس کام کو کریں تاکہ کوئی غلطی باقی نہ رہے۔ تمام صحابہ کو انھوں نے اس کام میں شریک کیا تھا اور سب سے تحقیق کرتے تھے۔ چنانچہ تفسیر صافی میں ایک طویل حدیث جناب امیر کی احتجاج طبرسی سے منقول ہے جس میں اُنھوں نے ایک زندیق کے مقابلہ میں قرآن کے متعلق بہت سے مطالب ارشاد فرمائے ہیں اور صحابہ نے جس طور پر قرآن جمع کیا ہے اُس کے تذکرہ میں یہ بھی فرمایا ہے:-

فصرخ منادیھم من کان   تو پکارا منادی اُن کا کہ جس کے پاس
عندہ شیٔ من القران   قرآن میں سے کچھ ہو وہ ہمارے پاس
فلیاتنا بہ   لاوے۔

قرآن موجودہ سے تحریف کا طعن شیعوں کے اصول اور روایات کے بموجب کسی طرح نہیں اُٹھ سکتا اور بے انتہا روایتیں اثبات تحریف کی

...ائمہ معصومین سے منقول ہیں وہ متاخرین غیر معصومین کے اختراعی قول سے ...نہیں ہوسکتیں۔

جن صحابہؓ نے قرآن موجودہ کو جمع کیا ہے وہ شیعوں کے اعتقاد ...ثقہ نہ تھے بلکہ خائن تھے اور تمام صحابہ ارتداد میں اُن کے ساتھ شریک تھے (معاذ اللہ منہا) حضرت علیؓ کو جرأت نہ تھی کہ اُن کی خیانت کو روک سکتے ...اب پتہ تو صاف مل گیا کہ مسئلہ امامت اور اسماء ائمہ اور اسماء اعداء ائمہ ...ان میں سے خارج کر دیے گئے اس کے سوا اور ارکان دین خدا جانے کیا کیا نکل ...گئے ہوں گے۔

یہ بھی تو احتمال ہو سکتا ہے کہ شاید مسئلہ امامت کو اللہ نے بطور بدا ...منسوخ کر دیا ہو اور حکم ناسخ اُس قرآن میں ہو جو ساقط ہو گیا۔

کیا عجب ہے کہ انھوں نے قرآن میں کچھ بڑھا دیا ہو جیسے اہل ...کتاب نے توریت و انجیل وغیرہ میں بڑھا دیا اگر یہ کہا جائے کہ آیۃ فَأْتُوا ...بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے مثل کوئی عبارت ...نہیں بنا سکتا پھر کسی کی عبارت قرآن میں کیسے مل سکتی تھی؟ تو اس کا جواب ...یہ ہے کہ شاید یہ آیت بھی محرفین کی بنائی ہوئی ہو کلام الٰہی نہ ہو۔ اور اگر اس ...آیت کو بھی کلام الٰہی مانا جاوے تو بیان سابقہ میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن ...کا معجزہ اُن آیات سے مختص تھا جو ولایت علیؓ کے بیان میں تھیں۔

جناب امیر کو اپنی خلافت کے زمانہ میں بھی اصلی قرآن ظاہر کرنے ...کی جرأت نہیں ہوئی۔ ائمہ کو بھی شاید خوف کی وجہ سے یہ موقع نہ ملا۔ بہرحال جو

تصرفات صحابہ نے قرآن میں کیے ہوں گے آج تک اسی طرح موجود رہے کہ عجب ہے کہ مہاجرین اور انصار کی تعریفیں اور صحابہؓ کے مناقب اور ازواج رسول کا امہات المومنین ہونا اور آیتِ غار اور آیتِ رضوان وغیرہ انہیں کی تصنیفات سے ہوں۔ جب تک جامعین قرآن کو ثقہ نہ مانا جائے اُس وقت تک کیوں کر یہ مانا جاسکتا ہے کہ اُنھوں نے قرآن میں کچھ بڑھایا نہیں حالانکہ وہ اپنی حکومت کے زمانہ میں سب کچھ کر سکتے تھے۔

قرآن میں کچھ بڑھا دینے کا احتمال محض فرضی نہیں ہے بلکہ اقوال ائمہ سے بھی یہ خبر ملی ہے کہ محرفین نے اپنی طرف سے بھی بڑھایا ہے چنانچہ تفسیر صافی[1] میں مذکور ہے:—

وفی تفسیر العیاشی عن ابی جعفر قال لولا انہ زید فی کتاب اللہ ونقص ما خفی حقنا علی ذی حجی	اور تفسیر عیاشی میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ اگر نہ ہوتا یہ امر کہ بڑھایا گیا ہے قرآن میں اور گھٹایا گیا ہے تو ہمارا حق کسی عقلمند پر چھپا نہ

پھر تفسیر[2] صافی میں احتجاج طبرسی سے ایک طویل روایت میں یہ قصہ منقول ہے کہ ایک زندیق نے حضرت علیؓ سے قرآن کے متعلق بہت سے سوالات کیے تھے من جملہ ان کے یہ سوال بھی تھا کہ اللہ نے قرآن میں ظالموں کے نام صاف صاف کیوں نہ بتا دیے اشاروں کنایوں میں ان کا ذکر کیوں کیا؟ اس کا جواب خود جناب امیر نے یہ دیا ہے کہ اللہ نے صاف صاف نام ذکر کیے تھے تحریف

[1] تفسیر صافی مطبوعہ طہران ص۱۱ مقدمہ سادسہ [2] ایضاً ص۱۱ ۱۲

کرنے والوں نے وہ نام نکال ڈالے۔ پھر قرآن میں تحریف کرنے والوں کے ذکر میں جو آیتیں مذکور ہیں وہ جناب امیر نے ذکر کیں۔ چنانچہ آیت يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ[1] کو پڑھکر جناب امیر نے اس کی تفسیر میں یہ فرمایا۔ یعنی

انھم اثبتوا فی الکتاب مالم یقل اللہ لیلبسوا علی الخلیقۃ	یعنی انھوں نے لکھ دیا کتاب میں ایسا کلام جو اللہ نے نہیں فرمایا تاکہ شبہ ڈال دیں مخلوق میں۔

پھر جناب امیر نے یہ آیت پڑھی فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۖ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ[2] اس کی تفسیر میں فرمایا:—

فاما الزبد فی ھذا الموضع کلام الملحدین الذین اثبتوہ فی القرآن۔	پس "جھاگ" اس موضع میں ملحدوں کا کلام ہے جو انھوں نے بنا دیا ہے قرآن میں۔

پھر جناب امیر نے اثناء تقریر میں یہ بھی فرمایا:—

[1] چاہتے ہیں کہ بجھا دیں اللہ کے نور کو اپنے مونہوں سے ۱۲ [2] اول سے اللہ نے حق و باطل کی مثال بارش کے پانی سے اس طرح دی ہے کہ باطل مثل جھاگ کے ہوتا ہے جو پانی کے اوپر آجاتے ہیں اور حق مثل پانی کے ہوتا ہے اس کے بعد یہ آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جو جھاگ ہے وہ فنا ہو جاتا ہے اور بے کار ہو جاتا ہے اور جو نفع دینے والا ہے وہ ٹھیرتا ہے زمین میں۔ یہ آیت تیرھویں پارہ میں سورۂ رعد میں مذکور ہے ۱۲

ولیس یسوغ مع عموم التقیۃ التصریح باسماء المبدلین ولا الزیادۃ فی آیاتہ علی ما اثبتوہ من تلقائہم فی الکتاب

اور ممکن نہیں ہے عموم تقیہ کے وقت میں تصریح اُن کے ناموں کی جنھوں نے قرآن میں تبدیلی کی اور اُس زیادتی کی قرآن کی آیتوں میں جو انھوں نے اپنی طرف سے لکھ دی ہیں۔

یعنی تقیہ کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ جو لوگ قرآن میں تبدیلی کرنے والے ہیں اُن کے نام بتادیے جائیں یا وہ آیتیں بتادی جائیں جو انھوں نے اپنی طرف سے بڑھادی ہیں۔ اس طویل حدیث میں جناب امیر نے جا بجا یہ تصریح کی ہے کہ قرآن میں زیادتی ہوئی ہے اور آیت[1] اَلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ بِاَیْدِیْھِمْ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ ھٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ کا مصداق بھی اُنھیں لوگوں کو بتایا ہے جنھوں نے قرآن میں بڑھادیا ہے۔

پھر جناب امیر نے یہ بھی فرمادیا

وزادوا فیہ ما ظھر تناکرہ وتنافرہ

اور بڑھادیا قرآن میں وہ مضمون کہ ظاہر ہے بُرائی اُس کی اور قابل نفرت ہونا اس کا

اور اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ اللہ نے یہ جو فرمایا ہے وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ اور اگر تم کو یہ خوف ہو کہ انصاف نہ کرسکو گے یتیموں کے حق میں

[1] ایسے لوگ جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھوں سے اور کہہ دیتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے۔

تو نکاح کرلو جس کو پسند کرو عورتوں سے۔

اس پر اُس نے یہ اعتراض کیا تھا کہ یتیموں کی حق تلفی کا نکاح سے کیا ربط ہے؟ اس کا جواب جناب امیر علیہ السلام نے یہ دیا:-

فھو مما قدمت ذکرہ من اسقاط المنافقین من القرآن وبین القول فی الیتمی وبین نکاح النساء من الخطاب والقصص اکثر من ثلث القرآن

پس وہ اسی قسم سے ہے جس کا ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں کہ منافقین نے قرآن سے آیتیں نکال ڈالیں اور درمیان قول (فی الیتمٰی) اور (نکاح النساء) کی آیات خطاب اور قصص (جو) ثلث قرآن سے زیادہ تھیں۔

یعنی اس آیت میں لفظ (فی الیتمی) کے بعد اور لفظ (فانکحوا) سے پہلے اتنی آیتیں تھیں جو بقدر ثلث قرآن کے ہوتیں وہ سب آیتیں تحریف کرنے والوں نے نکال ڈالیں اسی وجہ سے یہ کلام بے ربط ہوگیا۔

افسوس کہ جناب امیر نے ایک زندیق مخالف اسلام کے مقابلہ میں تحریف قرآن کی آڑ میں پناہ لی اور اس آیت کے ربط دینے سے عاجز ہوگئے کیا یہی نائب رسول اور امام مفترض الطاعت تھے جو قرآن کو اتنا بھی نہیں سمجھتے تھے۔

کاش وہ زندیق کسی اور صحابی سے اس آیت کو پوچھتا تو وہ سمجھا دیتے کہ اللہ یہ فرماتا ہے یتیم لڑکیوں سے اُسی صورت میں نکاح کرو جب تم کو اپنے اوپر یہ اعتماد ہو کہ اُن کے حقوق ادا کرسکو گے اور اگر تمہاری دوسری بیبیاں

اس کے سوا ہوں تو ایسی صورت میں اُس یتیمہ کے حقوق دوسری بیبیوں کے برابر رکھو گے اس کی حق تلفی نہ کروگے۔ اور اگر تم کو یہ خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ نکاح کرنے میں اُن کے حقوق تم سے ادا نہ ہوں گے تو دوسری عورتیں نکاح کے لیے پسند کر لو یتیم لڑکیوں سے نکاح مت کرو اس لیے کہ ان کا باپ نہیں جو ان کے حق کے لیے کوشش کرتا اور خود وہ صغیر سن ہیں اپنے لیے کوشش نہیں کر سکتیں۔

بالفرض اگر اس موقع سے ایک ثلث قرآن ساقط ہو گیا تب بھی تو حالتِ موجودہ میں بہت اچھا ربط پیدا ہو گیا تھا۔ مگر جناب امیر علیہ السلام کی سمجھ میں نہ آیا آخر تحریف کرنے والے بھی تو ایسے کامل تھے جو خدا کے کلام میں اپنا کلام ملاتے تھے بھلا اُن کے تصرف سے کلام بے ربط کیسے ہو سکتا تھا۔

اُس زندیق نے جتنے اعتراض قرآن پر کیے جناب امیر سے ایک کا جواب بھی نہ دیا گیا اور ہر سوال کے جواب میں یہی فرما دیا کہ یہاں قرآن میں تحریف ہو گئی ہے۔

یہ جواب بھی اپنی عیب پوشی کا عجیب حیلہ ہے جہاں مخالفین نے طعن کیا اور جہاں جواب نہ بنا وہیں تحریف بتا دی۔

ایک یہ لطیفہ بھی سُننے کے قابل ہے کہ اللہ کو قرآن میں آلِ محمدؐ پر سلام کہنا منظور تھا مگر اللہ جانتا تھا کہ سلام علیٰ آلِ محمد کہے گا تو تحریف کرنے والے اس کو نکال ڈالیں گے اس لیے اللہ نے اپنے پیغمبر کا نام یٰسین رکھا اور سلام علیٰ آلِ یٰسین فرمایا محسن کاشی نے تفسیر صافی[1] میں تفسیر سورۂ والصافات

[1] تفسیر صافی مطبوعہ طہران صفحہ ۴۲۲

میں لکھا ہے:-

وفی الاحتجاج عن امیر المومنین قال ان اللہ سمی النبی بھذا الاسم حیث قال یٰس والقران الحکیم لعلمہ انھم یسقطون سلام علیٰ اٰل محمد کما اسقطوا غیرھا۔

اور احتجاج میں امیر المومنین علیہ السلام سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا ہے کہ اللہ نے اپنی نبی کا نام یٰسین رکھا چنانچہ فرمایا یٰس والقران الحکیم اس لیے کہ اللہ جانتا تھا کہ اگر سلام علیٰ آل محمد کہے گا تو وہ نکال ڈالیں گے جیسے اور آیتیں نکال ڈالیں۔

محرفین کا خوف اللہ پر بھی ایسا غالب تھا کہ اُس نے پیغمبر کا نام بدل کر آلِ پیغمبر پر سلام کہا تاکہ محرفین کی سمجھ میں نہ آوے اور اگر سمجھ جاتے تو ضرور نکال ڈالتے۔ پس جس اللہ نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا اس کو ایسی ہی مجبوری درپیش تھی تو اب قرآن کی حفاظت کی کیا صورت تھی۔ معاذ اللہ منہا۔

تفسیر صافی میں قصۂ زندیق کے نقل کرنے کے بعد فاضل شیعی محسن کاشی نے یہ نتیجہ نکالا ہے:-

المستفاد من جمیع ھذہ الاخبار وغیرھا من الروایات من طریق اھل البیت ان القران الذی بین اظھرنا لیس بتمامہ کما انزل علی محمد

حاصل ان خبروں کا اور ان کے سوا اور روایتوں کا جو طریقۂ اہل بیت سے ہیں یہ ہے کہ بے شک جو قرآن ہمارے سامنے ہے نہیں ہے پورا قرآن اسی طرح جیسے کہ نازل ہوا ہے محمدؐ پر۔

بل فیہ ما ھو خلاف ما انزل اللہ ومنہ ما ھو مغیر محرف وانہ قد حذف عنہ اشیاء کثیرۃ منہا۔ اسم علی فی کثیر من المواضع ومنہا لفظۃ آل محمد غیر مرۃ ومنہا اسماء المنافقین فی مواضعہا ومنہا غیر ذلک وانہ لیس علی الترتیب المرضی عند اللہ ورسولہ وبہ قال علی بن ابراھیم۔ [1]

بلکہ اُس میں ایسا بھی ہے جو اُس مضمون کے مخالف ہے جو اللہ نے نازل کیا تھا۔ اور اس میں وہ بھی ہے جو بدلا گیا ہے اور تحریف کیا گیا ہے اور بے شک حذف کر دی گئی ہیں اُس میں سے بہت سی چیزیں۔ اس میں سے علیؓ کا نام ہے بہت جگہ اور اُن میں سے لفظ آل محمد کا ہے بہت جگہ اور اُس میں سے منافقین کے نام ہیں اپنے مقاموں پر۔ اور اُس محذوف میں اس کے سوا اور مطالب بھی تھے اور وہ نہیں ہے اُس ترتیب پر جو اللہ اور رسول کے نزدیک پسند تھی۔ اور یہی قول ہے علی بن ابراہیم کا۔

ائمہ نے صاف صاف خبر دی ہے کہ قرآن موجودہ میں بعضی آیتیں خلاف ما انزل اللہ بھی ہیں اُن میں ایسی تحریف ہوئی ہے کہ جو اللہ کا مقصود تھا اُس کے خلاف معنی پیدا ہو گئے۔ مثلاً اللہ کے نزدیک یہ امت سب امتوں میں بدتر اور شریر تھی اور محرفین نے قرآن کی آیت یوں بنا دی كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ

[1] تفسیر صافی مقدمہ سادسہ مطبوعہ طہران صفحہ ۱۲۰ ۱۲

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ط ہو تم بہتر امت کے جو ظاہر کی گئی ہے آدمیوں میں حکم کرتے ہو نیکی کا اور منع کرتے ہو بُرائی سے اور ایمان لاتے ہو اللہ پر۔ تفسیر صافی میں لکھا ہے:—

قال علی بن ابراھیم فی تفسیرہ واما ما کان خلاف ما انزل اللہ فھو قولہ تعالی کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ فقال ابو عبد اللہ لقاری ھذہ الآیۃ خیر امۃ تقتلون امیر المومنین والحسین بن علی فقیل لہ کیف نزلت یا ابن رسول اللہ فقال انما نزلت خیر ائمۃ اخرجت للناس۔

علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جو حصہ قرآن کا خلاف اُس مضمون کے ہے جو اللہ نے نازل کیا تھا اُس میں سے اللہ کا یہ قول ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ۔ فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک شخص سے جو اس آیت کو پڑھتا تھا کہ "بہتر امت ہیں قتل کرتے ہیں امیر المومنین اور حسین بن علی کو"۔ تب اُن سے پوچھا گیا کہ اے ابن رسول اللہ یہ آیت کس طرح نازل ہوئی ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ بے شک نازل ہوا ہے خیر ائمۃ اخرجت للناس۔

(تفسیر صافی مطبوعہ طہران صفحہ ۱۲)

یعنی اصل تنزیل میں لفظ (ائمۃ) تھا جو امام کی جمع ہے۔ پس معنی یہ ہوئے کہ تم اچھے امام ہو الخ اور اس صورت میں یہ امت کی تعریف نہ رہی،

بلکہ خاص ائمہ کی تعریف ہوگئی۔

اسی آیت سے مذہب شیعہ کی جڑ اکھڑتی ہے اس لیے کہ شیعوں کی روایتوں کے بموجب ائمہ ہمیشہ تقیہ کی حالت میں رہے اُن کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نصیب ہی نہیں ہوا۔

علی بن ابراہیم نے اس کے بعد اور بہت سی آیتیں ذکر کی ہیں جن کو اس کے نزدیک محرفین نے خلاف ما انزل اللہ بنا دیا (معاذ اللہ منہا)

پھر اس کے بعد وہ آیتیں لکھی ہیں جن میں سے محرفین نے کچھ حذف کر دیا ہے۔ من جملہ اس کے یہ آیت بھی لکھی ہے:۔

وقولہ یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ	اور اسی قسم تحریف سے قول اللہ کا ہے کہ اے
مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ	رسول پہنچا دے جو تجھ پر تیرے رب کی
"فِیْ عَلِیٍّ" وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ	طرف سے نازل ہوا ہے علی کے باب
فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَہٗ	میں اور اگر تو نہ کرے تو تو نے اس کی
	رسالت نہ پہونچائی۔

اس قول سے ظاہر ہوگیا کہ اس آیت میں بھی (فی علی) کا لفظ تھا جو قرآن موجودہ میں نہیں ہے۔

یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ جو قرآن علیؓ نے جمع کیا تھا اُس میں مہاجرین و انصار کی برائیاں مذکور تھیں۔ چنانچہ تفسیر صافی میں ابوذر غفاریؓ کی ایک روایت بحوالہ احتجاج طبرسی کے مذکور ہے اُس میں یہ ہے کہ ابوبکرؓ نے جب علیؓ کے قرآن کو واپس کر دیا تو عمرؓ نے زید بن ثابتؓ کو بُلایا اور یہ کہا:۔

ان علیاً جاءنا بالقران و	بے شک علی لائے تھے ہمارے پاس
فیہ فضائح المہاجرین و	قرآن اُس میں برائیاں تھیں مہاجرین اور
الانصار وقد اردنا ان	انصار کی اور بے شک ہم نے یہ ارادہ کیا
تؤلف لنا القران وتسقط منہ	ہے کہ جمع کر دے تو ہمارے لیے قرآن اور
ما کان فیہ فضیحۃ و	نکال دے اُس سے وہ حصہ جس میں مہاجرین
ھتک للمہاجرین والانصار	اور انصار کی فضیحت اور ہتک ہو۔

اس روایت سے واضح ہوگیا کہ قرآن علی میں مہاجرین و انصار کی مذمت تھی اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن موجودہ میں جو مہاجرین و انصار کی تعریف ہے وہ محرفین کی بنائی ہوئی ہے۔

ایک اور روایت تحریف کی خبر صاف دے رہی ہے۔ اول سورہ نحل کی اس آیت کو سمجھ لیجیے اللہ قسم توڑنے والوں اور بدعہدوں کی مذمت میں فرماتا ہے:۔

تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلًاۢ	تم اپنی قسموں کو آپس میں دھوکا دینے والی
بَیْنَکُمْ اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ ھِیَ	بناتے ہو جب کوئی قوم کسی قوم سے بڑھی
اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ	ہوئی ہوتی ہے۔

ف یعنی تمہاری یہ حالت ہے کہ ایک قوم کے ساتھ عہد و پیمان کر لیتے ہو اور جب دوسری قوم غالب تم کو مل جاتی ہے تو پہلی قوم کے ساتھ جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑ کر دوسری قوم کے ساتھ ہو جاتے ہو۔ اس آیت میں جو لفظ (اربیٰ) ہے اُس کے معنے غالب اور بڑھا ہوا ہیں اور لفظ امت کے معنی

قوم اور جماعت کے ہیں۔

تفسیر صافی میں اس آیت کے تحت میں لکھا ہے:۔

فی الکافی والقمی عنہ انہ قرء ان تکون ائمۃ ھی ازکی من ائمتکم فقیل انا نقرءھا ھی اربی من امۃ فقال وما اربی واومی بیدہ فطرحھا

(تفسیر صافی مطبوعہ طہران)

کافی میں اور تفسیر قمی میں امام صادق کی روایت ہے کہ انھوں نے یوں پڑھا ان تکون ائمۃ ھی ازکی من ائمتکم یعنی ذکر ہو وہیں ائمہ جو زیادہ پاک ہوں تمہارے ائمہ سے) تو امام سے کسی نے کہا کہ ہم تو یوں پڑھتے ہیں (ھی اربی من امۃ) تو امام نے فرمایا کہ اربی کیا اور اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا پھر ہاتھ کو ڈال دیا

اس روایت سے ظاہر ہو گیا کہ قرآن موجودہ میں جو یہ لفظ ہیں (امۃ ھی اربی من امۃ) اس کو امام نے غلط بتایا بلکہ اربیٰ کے لفظ پر تعجب کے ساتھ طعن کیا اور یوں پڑھا ائمۃ ھی ازکی من ائمتکم۔

ایک مثال ایسی تحریف کی جس میں اصل کلام الٰہی کی مخالفت ہو گئی یہ بھی ہے جو سورۂ فرقان میں مذکور ہے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا یعنی اے اللہ بنا دے ہم کو متقیوں کا امام۔

ف اس موقع پر قرآن میں ان نیک لوگوں کی صفتیں ذکر ہوئی ہیں جن کو جنت میں اعلیٰ مرتبہ ملے گا۔ من جملہ ان کے اللہ نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے اللہ تو ہم کو متقیوں کا امام بنا دے۔

محسن کاشی نے تفسیر[1] صافی میں بحوالہ تفسیر قمی کے لکھا ہے:۔

قرء علی بن عبد اللہ واجعلنا للمتقین اماما فقال ابو عبد اللہ لقد سألوا اللہ عظیما ان یجعلھم للمتقین اماما۔ فقیل لہ یا ابن رسول اللہ کیف نزلت فقال انما نزلت واجعل لنا من المتقین اماما

(تفسیر صافی مطبوعہ طہران ص۱۲)

پڑھی گئی امام جعفر صادق علیہ السلام کے سامنے آیت واجعلنا للمتقین اماما تو انھوں نے فرمایا کہ اللہ سے بڑی بات مانگی کہ ان کو متقیوں کا امام بنا دے۔ کسی نے پوچھا کہ اے ابن رسول اللہ یہ آیت کس طرح نازل ہوئی تھی؟ تو امام نے فرمایا کہ نہیں نازل ہوئی مگر اس طرح (و اجعل لنا من المتقین اماما) اور بنا دے ہمارے لیے متقیوں میں سے امام۔

یہ عبارت تفسیر صافی کے مقدمہ سادسہ کی ہے دوبارہ سورۂ فرقان کی تفسیر میں بھی اس آیت کے تحت میں یہ روایت نقل کی ہے اور اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے:۔

وفی الجوامع عنہ مایقرب منہ

اور جوامع میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اسی مضمون کے قریب روایت ہے۔

یعنی تفسیر قمی کی اس روایت کی تائید جوامع کی روایت سے ثابت ہوتی ہے۔

---

[1] تفسیر صافی مطبوعہ طہران ص۲۱۔ ۱۲ منہ

اس روایت سے صاف صاف یہ ظاہر ہو گیا کہ اللہ نے نیک لوگوں کی صفات میں یوں فرمایا تھا کہ وہ دعا مانگا کرتے ہیں واجعل لنا من المتقین اماما اے اللہ بنا دے ہمارے لیے متقیوں سے امام۔ مگر محرفین نے یوں بنا دیا کہ اللہ ہم کو متقیوں کا امام بنا دے۔ پس جو کچھ اللہ نے فرمایا تھا اُس کے مخالف مضمون ہو گیا۔

امام علیہ السلام نے بطور طعن کے فرمایا کہ اللہ سے ایسا بڑا سوال کیا کہ ان کو امام بنا دے۔ یہ سوال قابل طعن اس لیے تھا کہ حصول امامت کی دعا مانگنا ایسی ہے جیسے حصول نبوت کی دعا مانگنا۔

ایک اور لطیفہ بھی سُننے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۂ رعد میں یہ آیت مذکور ہے لَہٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۢ بَیۡنِ یَدَیۡہِ وَمِنۡ خَلۡفِہٖ یَحۡفَظُوۡنَہٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰہِ ؕ یعنی انسان کے لیے محافظ پے درپے آنے والے ہیں سامنے اُس کے اور پیچھے اُس کے حفاظت کرتے ہیں اُس کی بحکم خدا۔

ف اس آیت میں اللہ فرماتا ہے کہ انسان کے لیے فرشتے محافظ ہوتے ہیں جو انسان کے آگے بھی ہوتے ہیں اور پیچھے بھی ہوتے ہیں اور بحکم الٰہی ان کی محافظت کرتے ہیں۔

لفظ معقّبات کے معنی ہیں نوبت بہ نوبت آنے والے۔ چونکہ وہ محافظ فرشتے بھی نوبت بہ نوبت بدلتے رہتے ہیں اسی لیے اللہ نے ان کو معقبات فرمایا۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کو اس آیت کے ترجمہ میں دو مشکلیں

پیش آئیں۔

ایک یہ کہ لفظ معقبات کے یہ معنی ان کو معلوم نہ تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ معقبات پیچھے رہنے والے کو کہتے ہیں اور چونکہ آیت میں یہ مذکور تھا کہ معقبات سامنے بھی ہوتے ہیں پس اُن کو یہ شبہ پیدا ہوا کہ جو فرشتے سامنے ہوں ان کو معقبات کہنا صحیح نہیں۔

دوسری مشکل ان کو یہ پیش آئی کہ یحفظونہ من امر اللہ کے معنی میں دھوکا ہو گیا۔ درحقیقت اس جگہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حفاظت کرتے ہیں اس کی بحکم خدا۔ امام کو یہ معلوم نہ تھا کہ لفظ (من) بمعنی (با) بھی مستعمل ہوتا ہے اس لیے اس کے معنی اُن کی سمجھ میں یوں آئے کہ اللہ کے حکم یعنی اُس کی تقدیری سے بچاتے ہیں اور جو آفتیں انسان پر اللہ بھیجتا ہے اُن آفتوں کو وہ فرشتے دفع کر دیتے ہیں یہ معنی کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتے تھے اس لیے کہ یہ فرشتوں میں قدرت نہیں کہ اللہ کے حکم کو ٹال سکے۔

یہ دونو مشکلیں امام علیہ السلام کے لیے لاحل ہو گئی تھیں لہٰذا انھوں نے اس آیت میں تحریف بتا دی اور اپنے طور پر اس کی اصلاح کر لی۔

تفسیر صافی[۱] میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:۔

والقمی عن الصادق ان	تفسیر قمی میں امام صادق علیہ السلام سے روایت
من ہ الاٰیۃ قرئت عندہ	ہے کہ یہ آیت اُن کے سامنے پڑھی گئی تو امام
فقال لقارئہا الستم عربا۔	نے اس آیت کے پڑھنے والے کو کہا کیا تم عرب

[۱] تفسیر سورۂ رعد ص۲۵۷

نہیں ہو؟

فکیف یکون المعقبات من بین یدیہ وانما المعقب من خلفہ فقال الرجل جعلت فداک لہ معقبات من خلفہ ورقیب بین یدیہ یحفظونہ بامراللہ

پس کیسے ہو سکتے ہیں معقبات سامنے اور نہیں ہوتا ہے معقب مگر وہ جو پیچھے ہو تو اُس شخص نے کہا کہ میں آپ کے قربان ہو جاؤں یہ آیت کس طرح نازل ہوئی ہے تو امام نے فرمایا کہ نہیں نازل ہوئی مگر اس طرح لہ معقبات من خلفہ رقیب من بین یدیہ یحفظونہ بامراللہ یعنی اس کے لیے معقبات ہیں پیچھے اس اور نگہبان ہیں سامنے اُس کے حفاظت کرتے ہیں اس کی بامر اللہ۔

ومن ذاالذی یقدران یحفظ الشئ من امراللہ۔

اور کون شخص یہ قدرت رکھتا ہے کہ کسی کو اللہ کے حکم سے بچا سکے۔

ومثلہ العیاشی عنہ

اور اسی روایت کے مثل عیاشی نے بھی امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی

یعنی جس طرح اس مضمون کی امام سے قمی نے روایت کی ہے اسی طرح عیاشی نے بھی روایت کی اور ایک روایت کی دوسری روایت سے تائید ہوئی۔

امام علیہ السلام کے خیال کے بموجب محرفین نے اس آیت کو

اُس مطلب کے خلاف بنا دیا جو اللہ نے نازل کیا تھا اور بہت بڑی دو غلطیاں قرآن میں قائم کر دیں۔ پہلی غلطی امام نے ایسی بتائی جو عربی زبان کی غلطی ہے اور قرآن کی فصاحت تو درکنار زبان کی صحت بھی باقی نہ رہی اور دوسری غلطی تو ایسی بڑی غلطی ہے جس سے کفر کے معنی پیدا ہو گئے۔

پس جب قرآن میں ایسی آیتیں بھی موجود ہوں جن کے معنی کفر ہیں تو اب قرآن کا پڑھنا اور اس پر عمل کرنا کیوں کر جائز ہو گا اور نماز میں اس آیت کے پڑھنے سے نماز کیوں کر ادا ہو گی؟ کیا یہی امام معصوم مفترض الطاعت تھے کیا انھیں کا قول حجت ہے اور قرآن حجت نہیں، کیا یہی وہ امام تھے جن کے سوا قرآن کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ حالانکہ ایسی صاف آیت کا صحیح ترجمہ نہ کر سکے اور اپنی ناسمجھی کی وجہ سے ایسی مشکل میں پڑے کہ اس آیت میں تحریف بتا دی اور اللہ کے کلام میں اصلاح دی (معاذ اللہ منہا)

علی بن ابراہیم قمی نے چند مثالیں اُن آیات کی لکھی ہیں جن میں ایسی تحریف ہوئی کہ ان کا مطلب اس مطلب کے مخالف ہو گیا جو اللہ نے نازل کیا تھا۔ اس کے بعد تفسیر قمی میں لکھا ہے ومثلہ کثیرا اور مثل اس کے بہت ہے۔ یعنی یہ چند روایتیں بطور مثال کے مذکور ہوئی ہیں ایسی تحریف قرآن میں بہت ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ بہت سی آیتیں قرآن میں ایسی ہیں جو خلاف ماانزل اللہ ہو گئیں۔ اب فرمائیے کہ ایسے قرآن کا پڑھنا گناہ کیوں نہ ہو گا۔ اور اس کا پڑھنا کیوں کر جائز ہو گا؟۔

کافی کی کتاب الروضہ ص۱۷۴ میں ہے:۔

عن الرضا علیہ السلام فانزل اللہ سکینتہ علیٰ رسولہ وعلیٰ وایدہ بجنود لم تروھا۔ قلت ھکذا قال ھکذا نقرؤھا وھکذا تنزیلھا۔

امام رضا علیہ السلام سے آیت غار اس طرح منقول ہے (پس اُتاری اللہ نے تسکین اپنے رسول پر اور علی پر اور مدد کی اُس کی ایسے لشکر سے کہ تم نے اس کو نہیں دیکھا)۔ (راوی کہتا ہے) کہ میں نے پوچھا کہ یہ آیت اسی طرح ہے؟ تو امام نے فرمایا کہ اسی طرح ہم اس کو پڑھتے ہیں اور اسی طرح وہ نازل ہوئی ہے۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ نے تسکین رسولؐ اور علیؑ پر نازل کی تھی۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ رفیق غار تو ابوبکرؓ ہوں اور اُنھیں کو رسولؐ اس طرح تسکین دے رہے تھے کہ (تو غم مت کھا اللہ ہمارے ساتھ ہے) اور تسکین نازل ہوئی علیؑ پر جو مکہ میں رسولؐ کے گھر موجود تھے اور سپر تقیہ اُن کی محافظ تھی۔

قرآن موجودہ میں یہ آیت یوں ہے فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا اس صورت میں (علیہ) کی ضمیر صاحب رسول یعنی ابوبکرؓ کی طرف ہوگئی اور معنی یہ ہوگئے کہ ابوبکرؓ پر تسکین نازل کی لیکن کافی کی روایت سے جو معنی اس آیۃ کے ثابت ہوئے اس کے خلاف معنی ہوگئے۔

؎ تو اُتاری اللہ نے تسکین اپنی اُس پر اور مدد کی اُس کی ایسے لشکر سے جسے تم نے نہیں دیکھا۔

پوری آیت سورۂ توبہ میں یوں ہے:-

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى ۔

(اے مومنو) اگر تم اُس کی مدد نہ کروگے تو بے شک اللہ نے اُس کی مدد کی تھی اُس وقت جب کہ نکالا تھا اُس کو کافروں نے کہ پیغمبر دوسرا تھا دو میں کا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے۔ جب کہ پیغمبر اپنے ساتھی سے کہتا تھا کہ تو غم مت کر بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اُتاری اللہ نے تسکین اپنی اس پر اور مدد کی اُس کی ایسے لشکر سے کہ تم نے اس کو نہیں دیکھا۔ اور کافروں کی بات نیچی کر دی

اس آیت میں اُس حالت کا بیان ہے جب مشرکین مکہ نے پیغمبرؐ کے ل کا ارادہ کیا تھا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ نے ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ہجرت کی اور ین شب جبل ثور کے غار میں مقام کیا۔

شیعہ کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ کو پیغمبرؐ نے اپنی رضامندی سے ساتھ نہیں لیا ادہ راستے میں مل گئے تھے اور زبردستی ساتھ ہو لیے تھے۔

لیکن یہ ایسی ناانصافی کی بات ہے کہ جس کو عقل سلیم کسی طرح قبول نہیں ں۔ ابوبکرؓ کو کیا خبر تھی کہ پیغمبرؐ اس وقت ہجرت کر کے مکہ سے رخصت ہوتے اگر اتفاقاً ابوبکرؓ راستے میں مل گئے تھے تو پیغمبرؐ بہت سی تدبیریں ایسی کر سکتے کہ ابوبکرؓ سے جدا ہو جاتے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس وقت گھر کو واپس آجاتے

اور پھر دوسرے راستے سے چلے جاتے۔ غرض یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ پیغمبرؐ ابوبکرؓ سے ایسے مجبور ہو گئے تھے کہ کسی طرح ابوبکرؓ سے نہ بچ سکے اور ابوبکرؓ بغیر ان کی رضامندی کے غار میں بھی داخل ہو گئے اور رفیق سفر بھی بن گئے۔

درحقیقت یہ شبہ ایسا پوچ ہے کہ محققین شیعہ نے خود ہی اس کو رد کر دیا ہے۔ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں عبد الجلیل قزوینی کو شیخ اجل لکھا ہے اور یہ اقرار کیا ہے کہ وہ علمائے اسلام اور مشائخ کرام سے تھے پھر یہ قصہ نقل کیا ہے کہ ان کے زمانہ میں کسی فاضل سُنی نے شیعوں کے رد میں ایک کتاب لکھی تھی جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ شیعہ کہتے ہیں کہ رسولؐ اس لیے ابوبکرؓ کو غار میں اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ ان کو یہ خوف تھا کہ ابوبکرؓ کوئی شر نہ پیدا کر دیں۔ اس کا جواب جو عبد الجلیل قزوینی نے دیا ہے اس کو مجالس المومنین میں نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے:-

جناب شیخ در جواب بنوشتہ کہ ایں کلمات نہ مذہب علمائے شیعہ است بلکہ عوام و اوباش بطریق استہزا گویند اگر رسولؐ شب غار از ابوبکر می ترسید از عمرؓ و عثمانؓ ہم می ترسید۔ پس بایستے کہ ہر سہ را با خود ببردے پس چنانکہ پیغمبر پنہانے دیگراں می رفت پنہانے ابوبکر نیز می رفت و بہمہ حال

جناب شیخ (عبد الجلیل قزوینی) نے جواب میں لکھا کہ یہ کلمات علمائے شیعہ کا مذہب نہیں بلکہ عوام اور اوباش دل لگی کے طور پر اپنی طرف سے کہا کرتے ہیں اگر شب غار میں رسولؐ ابوبکرؓ سے ڈرتے تھے تو عمرؓ اور عثمانؓ سے بھی ڈرتے تھے تو چاہیے تھا کہ تینوں کو اپنے ساتھ لے جاتے، پس جس طرح پیغمبرؐ اوروں سے پوشیدہ جاسکتے تھے ابوبکرؓ سے بھی

رفتن محمدؐ و بردن ابوبکر بے فرمان خدا نبودہ۔ (مجالس المومنین مطبوعہ طہران صفحہ ۲۱ مجلس پنجم)

پوشیدہ جاسکتے تھے اور ہر صورت میں محمدؐ کا جانا اور ابوبکرؓ کا لے جانا بغیر حکم خدا کے نہ تھا۔

عبد الجلیل قزوینی نے اس امر کا صاف اقرار کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوقت ہجرت اگر ابوبکرؓ سے بچنا چاہتے تو بچ سکتے تھے اور ابوبکرؓ بغیر رضامندی پیغمبرؐ کے غار میں نہیں گئے بلکہ پیغمبرؐ ان کو قصداً بحکم خدا ساتھ لے گئے۔

تفسیر امام حسن عسکری علیہ السلام میں یہ مضمون موجود ہے کہ ابوبکرؓ کو بحکم الٰہی ساتھ لیا تھا۔ اس روایت کا ترجمہ بڑی خیانت کے ساتھ ملائی مجلسی نے حیات القلوب میں کیا ہے مگر پھر بھی اس میں اتنا موجود ہے کہ جبریل نے پیغمبرؐ کو اللہ کا یہ پیغام پہونچایا:-

ترا امر کردہ است کہ ابوبکر را ہمراہ خود ببری۔ (حیات القلوب جلد دوم صفحہ ۳۱)

اے پیغمبر اللہ نے تجھ کو یہ حکم کیا ہے کہ ابوبکرؓ کو اپنے ہمراہ لو۔

علاوہ اس کے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ نے ہجرت کی ہے تو مشرکین ان کا دروازہ گھیرے ہوئے تھے مگر پیغمبرؐ ان مشرکین کے سامنے سے اس طرح نکل گئے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوئی۔ چنانچہ حیات القلوب میں ہے:-

جبرئیل آمد و دست آں حضرتؐ را گرفت و از خانہ بیروں آورد و دراں وقت قریش دور خانہ آں حضرت را فرو گرفتہ بودند و حضرت ایں آیت را

جبریل آئے اور حضرت کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے باہر لائے اس وقت قریش نے گرداگرد حضرت کے مکان کا گھیر لیا تھا اور حضرتؐ نے یہ آیت پڑھی وَجَعَلْنَا

خواند وجعلنا من بین ایدیھم سدا ومن خلفھم سدا فاغشینھم فھم لا یبصرون ۝ وحق تعالیٰ خواب را بر ایشاں مسلط کرد کہ ایشان از بیروں رفتنِ آں حضرت مطلع نہ شدند وکفِ خاکے برداشت وبر روہائے ایشاں پاشید وگفت شاہت الوجوہ۔

من بین ایدیھم سدا ومن خلفھم سدا فاغشینھم فھم لا یبصرون ۝ تو بنا دی ہم نے سامنے ان کے دیوار اور پیچھے ان کے دیوار تو اندھا کر دیا پس وہ نہیں دیکھتے! اور حق تعالیٰ نے نیند کو ان پر غالب کر دیا کہ وہ حضرت کے باہر جانے سے مطلع نہ ہوئے اور مٹھی خاک کی اٹھا کر ان کے منہ پر ماری اور فرمایا شاھت الوجوہ یعنی بگڑ جاویں تمہارے مُنہ۔

وبروایتِ دیگر بیدار بودند وحق تعالےٰ دیدہائے ایشاں را پوشید کہ آنحضرت را ندیدند (حیات القلوب جلد۲ صفحہ ۳۱۰)

اور دوسری روایت میں ہے کہ وہ جاگتے تھے اور حق تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو ڈھک لیا کہ آنحضرت کو نہ دیکھا۔

یہاں سے ظاہر ہے کہ اگر ابوبکرؓ بغیر مرضی پیغمبرؐ کے ساتھ ہوتے تو یہی معاملہ اُن کے ساتھ ہوتا۔

پس یہ کہنا کہ ابوبکرؓ بغیر مرضی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے ساتھ ہو لیے تھے انصاف کا خون کرنا ہے۔

اب ابوبکرؓ کے اُن مناقب پر غور کیجیے جو اس آیت سے ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ نے یہ جو فرمایا کہ ہم نے ایسے وقت میں پیغمبر کی مدد کی تھی جب وہ

دونوں غار میں تھے اس سے ظاہر ہے کہ پیغمبر کے لیے وہ بڑا مشکل وقت تھا۔ ایسے مشکل وقت میں رسولؐ نے ابوبکر کو اپنا رفیق بنایا۔ اس سے ثابت ہوا کہ رسول کو ان کے ایمان اور جاں نثاری اور شجاعت پر کامل بھروسہ تھا۔ اور اُس وقت تک جتنے لوگ ایمان لائے تھے ان میں بلحاظ ان صفات کے قابل انتخاب یہی تھے۔

یہ جو فرمایا کہ "غار میں پیغمبر دوسرا تھا دو میں کا" اس سے ثابت ہوا کہ اُس وقت کی جو مشکل تھی وہ انھیں دونوں سے مختص تھی کوئی تیسرا اُس میں شریک نہ تھا پس ایسے مشکل عمل کا جو کچھ اجر ہوگا وہ بھی بعد پیغمبرؐ کے ابوبکرؓ سے مختص ہوگا، کوئی اور شخص اس میں شریک نہ ہوگا۔

کافروں نے پیغمبرؐ کو نکالا تھا نہ ابوبکرؓ کو۔ پس ابوبکر نے جو اپنے آرام اور وطن اور اہل وعیال اور ساری قوم کو چھوڑ کر اس مشکل میں پیغمبرؐ کی، رفاقت اختیار کی یہ اُن کے کمال ایمان اور اخلاص کا مقتضا تھا۔

اللہ کو اس محل میں اتنی بات ظاہر کرنا منظور تھی کہ ہم نے پیغمبرؐ کی اس مشکل کے وقت میں مدد کی تھی جب وہ غار میں تھا اس سے زائد جو ابوبکر کی رفاقت کا ذکر کیا یہ ابوبکرؓ کی فضیلت ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

ابوبکرؓ کے اس عمل خیر کا قرآن میں مذکور ہونا اور ابوبکر کی کسی بُرائی کی طرف اشارہ نہ ہونا دلیل اس عمل کی مقبولیت کی ہے اور اس آیت کے ہر لفظ میں ابوبکرؓ کی فضیلت کی طرف اشارہ ہونا مزید برآں۔

صاحبہ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ ابوبکرؓ پیغمبرؐ کے ساتھی تھے

اور جو لوگ پیغمبرؐ کے ساتھی تھے اُن کی نسبت دوسری جگہ اللہ نے یوں فرمایا ہے :-

والذین معہ اشداء	اور جو لوگ محمدؐ کے ساتھ ہیں سخت ہیں کافروں
علی الکفار رحماء بینھم	پر، مہربان ہیں باہم۔ تو ان کو دیکھے گا کوع
تراھم رکعا سجدا یبتغون	کرنے والے سجدہ کرنے والے۔ طلب
فضلا من اللہ ورضوانا	کرتے ہیں اللہ کا فضل اور رضامندی۔
سیماھم فی وجوھھم من	ان کی علامت ہے ان کے چہروں پر
اثر السجود	سجدوں کا نشان۔

یہ آیت سورۂ فتح میں ہے۔ ہم نے اس آیت کا ایک ٹکڑا نقل کر دیا آخر تک یہ آیت رسولؐ کے ساتھ والوں کے مناقب میں ہے۔

یہ فضیلت جیسے وثوق اور یقین کے ساتھ ابوبکرؓ کے لیے ثابت ہے کسی اور کے لیے نہیں۔ اس لیے کہ ابوبکرؓ کے لیے پیغمبر کا ساتھی ہونا قرآن سے ثابت ہوا ہے کسی اور کی نسبت قرآن سے ثابت نہیں ہوا البتہ غیر قرآن سے ثابت ہوا ہے۔

رسول کے ساتھیوں کی جو فضیلت ہے اُس کے مراتب مطابق مراتب صحابہ کے متفاوت ہیں مگر سب سے اعلیٰ درجہ اس فضیلت کا ابوبکرؓ کے لیے ثابت ہوگا اس لیے کہ انھوں نے ایسے وقت میں بھی ساتھ دیا ہے جس کی نسبت اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے ایسے وقت میں پیغمبر کی مدد کی جب وہ دونوں غار میں تھے۔

ابوبکرؓ سے پیغمبرؐ نے یوں فرمایا کہ تو غم مت کر۔ غم فعل قلب ہے منافی شجاعت نہیں۔ یہ غم ابوبکرؓ کو اپنی جان کے لیے ہوتا تو پیغمبرؐ کے ساتھ غار میں کیوں جاتے؟ اول ہی رفاقت سے انکار کر دیتے یا غار میں پہنچنے کے بعد کسی طرح نکل آتے۔ بلکہ یہ غم رسولؐ کے لیے تھا اور یہ ان کی جاں نثاری اور وفاداری اور محبت رسولؐ کا مقتضا تھا۔

رسولؐ نے ابوبکرؓ کا غم دفع کرنے کے لیے فرمایا کہ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسولؐ ابوبکرؓ کو جانتے تھے کہ یہ ہماری رسالت پر ایمان لایا ہے اور اگر رسولؐ کو ابوبکرؓ کے مومن ہونے پر یقین نہ ہوتا تو وہ اپنی زبان سے کلمۂ ان اللہ معنا کہدینے کو ابوبکرؓ کی تسکین کے لیے کافی نہ سمجھتے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جمع کے صیغہ سے (معنا) فرمایا اس کے دو شخص مراد ہیں ایک[1] رسولؐ دوسرے[2] ابوبکر رضی اللہ عنہ اس لیے کہ کوئی تیسرا غار میں موجود نہ تھا۔ پس اللہ کی معیت ابوبکرؓ کے لیے یقیناً ثابت ہوئی۔ بعد رسولؐ کے ابوبکرؓ کے سوا کوئی شخص ایسا نہیں جس کی ذات معین کے لیے اللہ کی معیت قرآن سے ثابت ہوئی ہو البتہ عام لفظوں میں مومنین اور متقین کے لیے اللہ کی معیت ثابت ہے۔

قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ مومنوں اور متقیوں کے ساتھ ہوتا ہے پس چونکہ ابوبکرؓ کے ساتھ اللہ تھا اس لیے ابوبکرؓ مومن اور متقی تھے۔ یہ فضیلت بھی ابوبکرؓ سے مختص ہے کہ ان کا مومن اور متقی ہونا قرآن سے ثابت ہوا۔

لا تحزن ان اللہ معنا جو رسولؐ نے فرمایا یہ کمال شفقت کا کلمہ ہے اور رسول کی شفقت اللہ کی رحمت کی نشانی ہے اور چونکہ رسول کی یہ شفقت اور عنایت قرآن میں مذکور ہوئی اس سے ثابت ہوگیا کہ ابوبکرؓ پر اللہ کی رحمت یقیناً نازل تھی۔

اللہ کی معیت کے مراتب بھی متفاوت ہیں ان اللہ معنا سے ابوبکرؓ اللہ کی اس معیت میں شامل کیے گئے جو رسول کے لیے تھی۔

(فانزل اللہ سکینتہ علیہ) تو اُتار دی اللہ نے تسکین اپنی اس پر۔ اس میں یہ بحث ہے کہ کس پر تسکین نازل کی اور حق یہ ہے کہ لفظی اور معنوی قرائن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ابوبکرؓ پر تسکین نازل کی۔

لفظی قرینہ یہ ہے کہ قریب مرجع اس کا لفظ (صاحبہ) ہی جس سے ابوبکرؓ مراد ہیں۔

معنوی قرینہ یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں تسکین نازل کرنا چاہتے تھے اور اس غرض سے کلمۂ (لا تحزن ان اللہ معنا) فرماتے تھے پس اللہ نے رسولؐ کی غرض پوری کر دی اور اُس پر تسکین نازل کر دی جس پر رسول تسکین نازل کرنا چاہتے تھے۔ دفع حزن کے لیے ابوبکرؓ کو سمجھانا رسول کا کام تھا اور سمجھانے میں دفع حزن کا اثر پیدا کرنا اور تسکین دیدینا اللہ کا کام تھا جو رسول کا کام تھا وہ رسول نے کیا اور جو اللہ کا کام تھا وہ اللہ نے کیا۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس سے پہلے جو ضمیریں ہیں وہ رسول کی

طرف پھرتی ہیں تو جواب یہ ہے کہ (علیہ) سے پہلے جو (سکینتہ) کی ضمیر ہے وہ اللہ کی طرف پھرتی ہے۔

اگر یہ شبہ ہو کہ اس کے بعد (ایدہ) کی ضمیر رسول کی طرف پھرتی ہے تو جواب یہ ہے کہ (ایدہ) کا عطف (نصرہ اللہ) پر ہے اور اس صورت میں تقدیر آیت کی یوں ہوگئی کہ اے مومنو اگر تم پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو ہم نے اُس کی مدد اُس وقت کی تھی جب وہ دونوں غار میں تھے اور جب پیغمبر اپنے ساتھی کو یوں سمجھاتے تھے کہ تو غم مت کر اللہ ہمارے ساتھ ہے تو اُتاری اللہ نے اپنی تسکین پیغمبر کے ساتھی پر اور اے مومنو اگر تم پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو ہم نے پیغمبر کی مدد ایسے لشکر سے کی ہے جس کو تم نے نہیں دیکھا۔ اس لشکر سے وہ لشکر ملائکہ مراد ہے جو غزوۂ بدر وغیرہ میں نازل ہوا تھا پس (ایدہ) کی ضمیر کا ربط (نصرہ اللہ) کی ضمیر سے ہوگیا۔

بڑا قرینہ اس عطف کا یہ ہے کہ اگر (ایدہ) کو غار کی حالت سے متعلق سمجھیں تو کلام میں یہ نقصان رہے گا کہ جو صفت لشکر ملائکہ کی ہے وہ واضح نہ ہوگی اس لیے کہ لشکر ملائکہ سے جو صفت مختص ہے وہ یہ ہے کہ نزول ملائکہ کے مقام پر دیکھنے والے موجود ہوں اور ملائکہ نظر نہ آویں اور غار میں وہ لوگ موجود نہ تھے جن سے اللہ خطاب فرماتا ہے کہ تم نے وہ لشکر نہیں دیکھا پس یہ احتمال باقی رہے گا کہ شاید نہ دیکھنا اس وجہ سے ہو کہ دیکھنے والے موجود نہ تھے اور اس صورت میں یہ متعین نہ ہوا کہ لشکر ملائکہ سے تائید کی تھی اور غزوۂ بدر میں مخاطبین موجود تھے اور اکثر نے ملائکہ کو دیکھا

پس جو صفت ملائکہ کی تھی وہ بخوبی واضح ہو گئی اور کلام نے اصل مقصود کو پورے
طور پر ادا کیا پس یہاں غزوۂ بدر مراد لینا اولیٰ ہے۔

دوسرا قرینہ اس عطف کا یہ ہے کہ اس کے بعد جو اللہ نے فرمایا ہے
کہ کافروں کی بات نیچی کر دی۔ یہ مضمون بھی غزوۂ بدر کے زیادہ مناسب
ہے اس لیے کہ کافروں کو شکست اول وہیں ہوئی تھی۔

تعجب یہ ہے کہ حضرات شیعہ اس آیت میں تو ضمیروں کے ربط
پر محض بے سود بڑا زور دیتے ہیں اور حضرت علیؓ نے جو سورۂ لقمان کی آیت
حقوق والدین کی تفسیر کی ہے جس کو ہم جلد اول میں ذکر کر چکے ہیں وہاں
نہیں دیکھتے کہ جناب امیر علیہ السلام نے ضمیروں کا کیا حال کر دیا۔

اب اگر ہم یہ بھی فرض کر لیں کہ (ایدہ) کا عطف (فانزل اللہ)
پر ہے اور وہی تائید مراد ہے جو غار میں ہوئی تھی تب بھی تو (ایدہ) کی ضمیر
(صاحبہ) کی طرف پھرے گی۔ یعنی اللہ نے ابوبکرؓ پر تسکین نازل کی اور
دفع حزن میں لشکر ملائکہ سے ابوبکرؓ کی مدد کی پس (علیہ) اور (ایدہ) کی
ضمیروں کا ربط بھی باقی رہا اور دونوں ضمیریں قریب کے مرجع کی طرف راجع
ہو گئیں۔

جب شیعوں نے دیکھا کہ اس آیت سے خواہ مخواہ یہی ثابت ہو کہ ابوبکر
پر نزول سکینہ ہوا تب انھوں نے تحریف قرآن پر کمر باندھی اور لفظ (علیہ)
کی جگہ لفظ (علیٰ رسولہ وعلیٰ) بنایا مگر اللہ نے سُنیوں کے سینوں اور
سفینوں میں قرآن کی ایسی حفاظت کی کہ شیعوں نے یہ قدرت نہ پائی کہ قرآن

میں اپنی محرفہ آیتوں کو داخل کر سکتے۔ ناچار کافی وغیرہ کتب حدیث شیعہ
میں الفاظ تحریفی کو گنجائش ملی۔ بعض متعصب شیعوں نے یہ جرأت بھی کی کہ
قرآن کے نسخے بھی اپنی تحریفات کے مطابق لکھے۔ پٹنہ کے مشہور کتب خانہ میں
ایک نسخہ قرآن کا راقم الحروف کی نظر سے گذرا جس کی ترتیب بھی قرآن مروجہ
کی ترتیب کے مطابق نہیں اور تحریفی الفاظ جن جن آیتوں کی نسبت احادیث
شیعہ میں مذکور ہیں وہ بھی اس میں شامل ہیں اور بعض سورتیں قرآن موجودہ
سے زائد بھی ہیں جس کا جی چاہے پٹنہ کے کتب خانہ میں اُس قرآن کو دیکھ لے
اور غور کرے کہ حضرات شیعہ نے قرآن کو کس طرح بگاڑنا چاہا مگر ایسے قرآن
مقبول نہ ہوئے اور کسی نے ان کو نہ مانا۔ فَاللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظًا۔

یہ چند روایتیں بطور نمونہ لکھی گئی ہیں شیعوں کی کتابوں میں
ان کے علاوہ اور بہت سی روایتیں اسی مضمون کی موجود ہیں اور ان سب
پر غور کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ تحریف قرآن کی خبر اس تفصیل سے
دے گئے ہیں کہ قرآن میں کمی بھی ہوئی اور زیادتی بھی ہوئی اور ایسی تبدیلی بھی
ہوئی کہ بعض آیتیں اُس مضمون کے خلاف ہو گئیں جو اللہ نے نازل کیا۔

اس صورت میں ہر آیت میں یہ احتمال ہے کہ شاید اس میں کچھ کمی
بیشی ہوئی ہو یا اس کو بدل کر اللہ کے مقصود کے مخالف بنا دیا ہو یا پوری آیت
محرفین کی تصنیف ہو۔

زمانۂ ائمہ کے بعد قدمائے شیعہ کا بھی یہی اعتقاد تھا۔ چنانچہ تفسیر صافی
ص۱۳ میں لکھا ہے:-

واما اعتقاد مشائخنا في ذلك فالظاهر من ثقة الاسلام محمد بن يعقوب الكليني انه كان يعتقد التحريف والنقصان. لانه روى روايات في هذا المعنى في كتابه الكافي ولم يتعرض بقدح فيها مع ذكره في اول الكتاب انه كان يثق بما رواه فيه وكذلك استاذه علي بن ابراهيم القمي فان تفسيره مملوء منه وله غلو فيه وكذلك الشيخ احمد بن ابي طالب الطبرسي فانه ايضا نسج على منوالهما في كتاب الاحتجاج.

اور لیکن ہمارے مشائخ کا اعتقاد تحریف قرآن کے باب میں یہ ہے کہ ظاہر ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی کا مذہب یہ تھا کہ وہ قرآن میں تحریف اور نقصان کا معتقد تھا اس لیے کہ اُس نے نقل کی ہیں روایتیں اس معنی کی اپنی کتاب کافی میں۔ اور نہیں بیان کیا کوئی ضعف اُن میں حالانکہ شروع کتاب میں اُس نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ اس کتاب میں جو روایت ذکر کرتا ہے اس کو صحیح سمجھتا ہے۔ اور یہی قول ہے کلینی کے استاد علی بن ابراہیم قمی کا بس بے شک تفسیر اس کی بھری ہوئی ہے ذکر تحریف سے اور اس کو اس مسئلہ میں غلو ہے اور یہی قول ہے شیخ احمد بن ابی طالب طبرسی کا بس وہ بھی اُنہیں دونوں کے طریقے پر چلا ہے کتاب احتجاج میں۔

علی بن ابراہیم قمی امام حسن عسکری علیہ السلام کا شاگرد ہے۔ پس اُس نے تحریف قرآن کا مسئلہ بھی امام سے سیکھا ہوگا۔

فہرست طوسی میں اس کی نسبت لکھا ہے:۔[1]

علي بن ابراهيم بن هاشم القمي ابو الحسن ثقة في الحديث ثبت معتمد صحيح المذهب

علی بن ابراہیم بن ہاشم قمی ابو الحسن حدیث میں ثقہ ہے، پکا ہے، معتمد ہے، صحیح المذہب ہے۔

محمد بن یعقوب کلینی علی بن ابراہیم قمی کا شاگرد ہے اُس کی ولادت امام حسن عسکری کے زمانہ میں ہوئی تھی بہت سے اصحاب ائمہ کو اُس نے دیکھا ہے اور حضرت صاحب الامر[2] کے سفیروں سے بھی ملاقات کی ہے۔ ایک قول

[1] فہرست طوسی مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۲۰۹ ۱۲

[2] جب امام حسن عسکری علیہ السلام لاولد مرگئے تو شیعوں نے یوں کہہ دیا کہ ان کا ایک بچہ تھا جو نرگس کے بطن سے پیدا ہوا تھا وہ ان کی وفات سے دس دن پہلے غائب ہوگیا وہ صاحب الامر اور مہدی اور قائم ہے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں معلوم کہ جب غائب ہوا تھا تو اس کی عمر کیا تھی؟ کوئی چار برس کوئی دو برس کہتا ہے۔ خلیفۂ وقت نے امام عسکری کی وفات کے وقت ہر چند تفتیش کی کہ اُن کے کوئی اولاد ہے یا ان کی کوئی باندی حاملہ ہے مگر یہی تحقیق ہوا کہ نہ ان کے کوئی اولاد ہے نہ ان کی کوئی باندی حاملہ ہے۔ امام عسکری کا بھائی جعفر بھی یہی کہتا تھا کہ امام کے ہرگز کوئی اولاد نہیں اسی وجہ سے شیعوں نے اُس کا نام کذاب رکھا۔ یہاں تعظیم اہل بیت بالائے طاق ہوگئی۔ خلیفۂ وقت نے تمام مکان ڈھونڈا تہ خانے کھدوائے۔ مکان کی موریاں کھدوا کر دیکھیں کہیں کسی بچہ کا پتا نہ ملا نہ کسی نے یہ خبر دی کہ اُن کے بیٹا پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ امام کی میراث بھی ان کی ماں اور بھائی جعفر پر تقسیم ہوئی۔ مگر شیعوں نے ایک خیالی وجود مان کر صاحب الامر غائب فرض کرلیا۔ بعض آدمی اُس بچۂ غائب شدہ کے

یہ بھی ہے کہ سفیروں کے توسط سے اس کی کتاب کافی حضرت صاحب الامر کی نظر سے گذری ہے۔ غیبت صغریٰ کا پورا زمانہ اُس نے پایا ہے پس قرب زمان ائمہ کی وجہ سے جو ذریعے اس مسئلہ کی تحقیق کے قمی اور کلینی کو میسر تھے متاخرین کو ہرگز میسر نہیں ہو سکتے۔

(بقیہ صفحہ ۲۸۵) وکیل بنے اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ ہم سے ملا کرتے ہیں۔ وہ حضرت صاحب الامر کے خطوط لوگوں کو پہنچاتے تھے اور پیغاموں کا جواب لادیتے تھے ان وکیلوں نے یہ چالاکی کی کہ صاحب الامر کے نام سے روپیہ لوگوں سے وصول کرنا شروع کیا اور روپیہ کی رسید حضرت صاحب الامر کی طرف سے لادیتے تھے۔ اُنھتر ۶۹ برس کے عرصہ میں یکے بعد دیگرے چار سفیر ہوئے اور بے انتہا روپیہ شیعوں سے امام غائب کے پاس پہنچانے کے لیے وصول کیا۔ چوتھا سفیر جس کا نام علی بن محمد تھا ۳۲۹ھ میں مرا اُسی سال کلینی کا انتقال ہوا یہ ۶۹ برس کا زمانہ غیبت صغریٰ کہلاتا ہے۔ آخر میں حکام کو اس چالاکی کی خبر ہو گئی۔ اُنھوں نے دریافت کیا کہ کون کون شخص امام غائب کے نام سے روپیہ وصول کرتا ہے اُس وقت سب نے انکار کر دیا اُس وقت یہ سلسلہ بند ہو کر غیبت کبریٰ کا زمانہ شروع ہو گیا۔ ظاہرا یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت بڑا حصہ مذہب شیعہ کا انھیں سفیروں نے روپیہ وصول کرنے کے واسطے تصنیف کیا۔ بھلا اُس بچۂ غائب کو گوشۂ تنہائی میں اس بے انتہا روپیہ کی کیا ضرورت تھی؟ اصول کافی کے باب الغیبۃ میں حضرت علی علیہ السلام کا یہ قول مذکور ہے کہ صاحب الامر کی غیبت چھ دن یا چھ مہینے یا چھ برس ہوگی مگر ہزار برس سے زیادہ ہو گئی اب تک حضرت صاحب الامر نے جلوہ نہ دکھایا۔ اس پیشین گوئی کا بھی وہی حال ہو گیا جو سنہ ستر کی پیشین گوئی کا ہوا تھا۔ بڑی حیرت یہ ہے کہ حضرت صاحب الامر (بقیہ صفحہ ۲۸۷)

غیبت صغریٰ کے آخر زمانہ تک تحریف قرآن کے اعتقاد پر بلااختلاف شیعوں کا اجماع اور اتفاق تھا اس لیے کہ ائمہ کی تعلیم یہی تھی۔

جن نازک خیال مصنفین نے مذہب شیعہ کو تصنیف کیا اور اس پیرایہ میں مذہب اسلام کو بالکل بدل ڈالا اُنھوں نے جزو اعظم اس مذہب کا تحریف قرآن کے اعتقاد کو ٹھیرایا تھا۔ اور اس سے ان کی کئی غرضیں تھیں۔

اول یہ کہ مسئلہ امامت پر بہت بڑا اعتراض یہ وارد ہوتا تھا کہ عقائد

(بقیہ صفحہ ۲۸۶) کیوں روپوش ہیں اور ظہور کا مانع کیا ہے؟ اصول کافی کے باب الغیبۃ میں زرارہ سے روایت ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا ہے کہ قائم کے لیے قائم ہونے سے پہلے غیبت ہوگی۔ زرارہ کہتا ہے کہ میں نے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوگا؟ تو امام نے فرمایا کہ اس کو خوف ہوگا پھر اشارہ سے سمجھایا کہ قتل کا خوف ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ غیبت کے وقت سے اس وقت تک جتنے شیعہ پیدا ہوئے امام غائب نے ان کو اپنا مخلص نہ سمجھا اور اُنھیں سے اُن کو قتل کا خوف ہوا۔ مگر امام کے لیے کچھ دلاوری بھی تو شرط ہے۔ کیا اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ تھوڑی دیر کے لیے دل مضبوط کر لیں اور خوف کو اپنے جی سے دور کریں اور اللہ پر توکل کر کے ظاہر ہو جاویں۔ آخر یہ بھی تو معلوم ہو چکا ہے کہ کوئی ان پر غالب نہیں ہو سکتا پھر کیا خوف ہے۔ قوت معجزات اور عصائے موسےٰ اور رسولؐ کے ہتیار اور خاتم سلیمان بھی تو ان کے پاس ہے اس تمام سامان کو کیوں بے کار کر رکھا ہے۔ شاید روپوشی کی وجہ یہ ندامت بھی ہے کہ بمقتضائے کم سنی اصلی قرآن بھی لے گئے کتاب علیؑ بھی لے گئے اب کیا منہ دکھائیں۔ ۱۲ منہ

اور ایمان کے تمام ضروری مسائل بنص صریح قرآن میں مذکور ہیں مگر مسئلہ امامت کا کہیں ذکر نہیں۔ اس مشکل لاحل کو انھوں نے تحریف قرآن کے مسئلہ سے حل کر لیا اور یوں کہدیا کہ یہ مسئلہ قرآن کی بیسیوں آیتوں میں بتصریح مذکور تھا مگر محرفین نے وہ آیتیں قرآن سے نکال ڈالیں۔

دوسرے یہ کہ مہاجرین اور انصار اور عموماً تمام صحابہ کے مناقب قرآن میں مذکور ہیں اور اس امت کو اللہ نے خیر امت کہا ہے۔ یہ مضامین مذہب شیعہ کی جڑ اکھیڑتے ہیں اس لیے کہ وہ عموماً قریب قریب تمام صحابہ کو مرتد بتاتے ہیں (معاذ اللہ منہا)

اس اعتراض کا جواب بھی تحریف قرآن کے پردہ میں بہت اچھی طرح ادا ہو گیا یعنی یہ کہدینے کا موقع مل گیا کہ محرفین نے بہت سی آیتیں اپنی طرف سے بڑھا دی ہیں اور بہت سی آیتیں خلاف ما انزل اللہ بنا دی ہیں۔

تیسرے[۳] یہ کہ خلفائے ثلاثہ خصوصاً عثمانؓ پر بڑا سخت طعن عائد کرنا مقصود تھا کہ انھوں نے قرآن میں گھٹایا بھی اور بڑھایا بھی اور خلاف ما انزل اللہ بھی بنا دیا تاکہ عوام سادہ لوح کو ان کی طرف سے بدظن بنا دیں۔ (معاذ اللہ منہا)

چنانچہ مطاعن عثمانؓ میں اس مسئلہ کا بڑے شد و مد سے ذکر ہوتا ہے۔ کمال الدین میثم بحرانی نے شرح نہج البلاغت[ل] میں عثمانؓ پر دس طعن

[ل] شرح نہج البلاغت میثم مطبوعہ طہران ورق اول جزء دیازدہم ۱۲

ذکر کیے ہیں۔ من جملہ ان کے یہ بھی لکھا ہے:۔

السابعۃ انہ جمع الناس علی قراءۃ زید بن ثابت خاصۃ واحرق المصاحف وابطل ما لاشك انہ من القران المنزل۔	ساتواں طعن[ل] عثمانؓ پر یہ ہے کہ انھوں نے جمع کر دیا آدمیوں کو فقط زید بن ثابت کی قرارت پر اور جلا دیا قرآنوں کو اور باطل کر دیا اس کو جس میں شک نہیں کہ وہ قرآن منزل سے تھا۔

[ل] یہ ایک طعن مجموعہ تین مطاعن کا ہے۔ اول یہ کہ فقط وہ قرأت باقی رکھی جو زید بن ثابتؓ پڑھتے تھے اس کے سوا اور قرائتیں جو مطابق تنزیل کے تھیں وہ چھوڑ دیں۔ دوسرے یہ کہ قرآنوں کو جلا دیا تیسرے یہ کہ جو آیتیں یقیناً قرآن میں سے تھیں وہ دور کر دیں۔ ان کا جواب اہل سنت کے اصول کے مطابق یہ ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ عثمانؓ نے اور قرائتیں چھوڑ دیں بلکہ انھوں نے متعدد نسخے لکھے اور جن آیتوں میں مختلف قرائتیں تھیں وہاں انھوں نے کوئی قرأت کسی نسخہ میں لکھی اور کوئی قرارت کسی نسخہ میں لکھی اس طرح جتنی قرائتیں ثابت ہوئیں سب لے لیں وہی نسخے جابجا بھیجے جو مصحف شامی اور کوفی اور مکی اور مدنی وغیرہ کہلاتے ہیں۔ کتب تفاسیر وغیرہ میں یہ پتہ بھی ملتا ہے کہ یہ قرارت مصحف شامی میں تھی اور یہ قرأت مصحف مکی میں تھی۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اسی وجہ سے علماء نے تصریح کی ہے کہ جو قرارت کسی مصحف عثمانی سے مطابق نہ ہو وہ مقبول نہیں۔ یہ تمام مطالب اتقان میں بہت تفصیل سے مذکور ہیں۔

دوسرے طعن کا جواب یہ ہے کہ اگر مراد یہ ہے کہ عثمانؓ نے صحیح قرآن جلا دیے تو غلط ہے ہرگز ثابت نہیں اور اگر مراد یہ ہے کہ صحیح قرآن کے سوا جو عبارتیں غلطی سے قرآن سمجھی گئی تھیں وہ پھاڑ پھاڑ کر جلا دیں تو صحیح ہے اور اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ جب عثمانؓ باتفاق و مشورہ اکثر (بقیہ)

میسم بحرانی نے تمام مطاعن عثمانؓ ذکر کرکے یہ بھی لکھا ہے :-

وقد اجاب الناصرون لعثمان عن هذه الاحداث باجوبة مستحسنة وهي مذكورة في المطولات -

اور بے شک جواب دیے ہیں عثمانؓ کے طرف داروں نے ان مطاعن کے پسندیدہ جواب اور وہ بڑی کتابوں میں مذکور ہیں -

(بقیہ صـــ۲۸۹) صحابہ صحیح قرآن جمع کر چکے اور یہ اعتماد اور یقین ہو گیا کہ اصلی قرآن نہ اس سے زیادہ ہے نہ اس سے کم ہے تب انھوں نے وہ عبارتیں پھاڑ کر جلا دیں جو قرآن نہ تھیں اور غلطی سے آیات قرآنی میں شامل ہو گئی تھیں صاحب مجمع البحار نے لفظ (حرق) کے تحت میں جو لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ حدیث میں یہ وارد ہے کہ (امران یحرق بما سواه) یعنی عثمانؓ نے یہ حکم دیا کہ جلایا جاوے جو اس کے سوا ہے۔ اور بعضی روایتوں میں (یُخرق) بخائے معجمہ ہے یعنی پھاڑا جائے جو اس کے سوا ہے۔ ان دونوں روایتوں کے ملانے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جلانا بعد پھاڑنے کے ہوا اور یہ جلانا جائز تھا اس لیے کہ اُن عبارتوں کو جلا دیا جو منسوخ التلاوت تھیں یا اُنہیں تفسیری الفاظ یا غیر قریش کی محاورے شامل ہو گئے تھے یا ایسی قرأتیں تھیں جو ثابت نہیں ہوئیں -

تیسرا طعن یہ کہ ایسی آیتوں کو نکال ڈالا جو یقیناً قرآن سے تھیں محض افترا ہے۔

اب اصول شیعہ کے بموجب ان مطاعن کا جواب یہ ہے کہ شیعوں کے نزدیک اختلاف قرأت ثابت نہیں ایک ہی قرأت ہے پس پہلا طعن محض لغو ہے۔ قطع نظر اس کے شریف مرتضیٰ کا قول جو آئندہ مذکور ہوگا اُس سے ثابت ہے کہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتب ہو گیا تھا اور وہی قرآن بعینہ آج تک موجود ہے پھر عثمانؓ نے (بقیہ صـــ۲۹۱ پر)

اب بہ نظر انصاف ملاحظہ فرمائیے کہ فاضل میسم بحرانی جانتے تھے [تم]ام مطاعن کے بہت معقول جواب ہیں مگر پھر بھی ذکر مطاعن سے باز نہ رہے۔ [ا]س سے سمجھ لو کہ حضرات شیعہ کی یہ عادت ہے کہ جن مطاعن کے جواب معقول پا چکے [ہی]ں پھر ان کو خواہ مخواہ ذکر کیا کرتے ہیں تاکہ اُن عوام کو بہکا دیں جو ان کے جوابوں سے ناواقف ہیں۔

بانیان مذہب شیعہ نے بہت سی مصلحتوں کی وجہ سے قرآن میں [تح]ریف کا دعویٰ کیا تھا اور ائمہ سے صدہا روایتیں اسی قسم کی نقل کی تھیں اور خاتمہ [غی]بت صغریٰ کے زمانہ تک بالاتفاق شیعوں کا یہی مذہب رہا بلکہ غیبت کبریٰ [کے] شروع ہونے کے بعد بھی پچاس برس سے زائد تک بلا خلاف یہی قول اور اعتقاد [ر]ہا جس کا حاصل یہ ہوگا کہ سنہ چار سو ہجری تک شیعوں کا تحریف قرآن کے مسئلہ [پر ا]جماع رہا۔ بڑی وجہ اس کی یہ تھی کہ اس وقت جو لوگ مذہب شیعہ رکھتے تھے

(بقیہ صـــ۲۹۰) کیا تصرف کیا اور چونکہ اصلی قرآن یہی تھا جس کے نسخے عثمانؓ نے جا بجا بھیجے اور اسی کو شریف مرتضیٰ یہ کہتے ہیں کہ رسول کے زمانہ میں مرتب ہو گیا تھا۔ پس اگر عثمانؓ نے اس کے سوا جو قرآن سمجھا جاتا تھا اور در حقیقت وہ قرآن نہ تھا اس کو جلوا دیا تو کیا گناہ کیا [ا]ب حضرات شیعہ ملاحظہ فرمائیں کہ عثمانؓ نے تو غلط عبارتیں جلا کر فنا کر دیں اور اصلی قرآن کو مسلمانوں میں رواج دیا۔ مگر قدمائے شیعہ کے اعتقاد کے بموجب ان کے ائمہ نے اصلی قرآن کو چھپایا اور محرف قرآن کو رواج دیا۔ پس عثمانؓ نے تو جو کچھ کیا وہ عین مصلحت تھا۔ البتہ ائمہ کے اس فعل کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جلانے اور چھپانے کا نتیجہ ایک ہے پس ائمہ کا قرآن چھپانا بھی گویا جلانا ہے ۱۲

علم سے بے بہرہ تھے وہ یہ نہ سمجھتے تھے کہ جب قرآن میں تحریف مانیں گے تو مذہب اسلام کیوں کر ثابت ہوگا؟ قطع نظر اس کے شوکت اسلام کی وجہ سے مخالفین کی زبان بند تھی اس لیے حضراتِ شیعہ کو یہ خبر ہرگز نہ تھی کہ تحریف قرآن کا قول مخالفوں کو مذہب اسلام پر طعن کرنے کا کیا کیا موقع دے گا۔

اتنے زمانے کے بعد شریف مرتضیٰ اتنی بات سمجھ گئے کہ جو لوگ قرآن موجودہ کو محرّف مانیں گے وہ مذہب اسلام کس دلیل سے ثابت کریں گے علاوہ اس کے ثقلین کے ساتھ تمسک کس طرح ہوگا اس لیے کہ ثقلین میں اول قرآن ہے وہ محرف ہے۔ اہل بیت کے اقوال بھی اسی وقت معتبر ہوتے ہیں کہ قرآن سے ان کی مطابقت ہو جائے اور جب قرآن نہیں تو مطابقت کس سے کی جائے؟

اس قسم کی خرابیوں کو سمجھ لینے کے بعد شریف مرتضیٰ نے تحریف قرآن کے مذہب قدیم کو اپنی رائے سے منسوخ کر دیا۔ ائمہ کی صدہا حدیثیں جو مثبت تحریف تھیں علانیہ رد کر دیں۔ شریف مرتضیٰ کا یہ قول مشہور رہے ہم اس کو تفسیر صافی سے نقل کرتے ہیں۔

ان القران كان على عهد رسول الله مجموعا مولفا على ما هو عليه الآن واستدل على ذلك بان القران كان يدرس ويحفظ جميعه في ذلك الزمان حتى عين	بے شک قرآن رسول اللہ کے عہد میں جمع کیا ہوا اور تالیف کیا ہوا اسی طرح پر تھا جس طرز پر وہ آج ہے اور استدلال کیا گیا ہے اس پر اس طرح کہ قرآن پڑھا جاتا تھا اور یاد کیا جاتا تھا پورا قرآن اس زمانہ میں یہاں تک کہ معیّن ہوئی تھی صحابہؓ کی

جماعة من الصحابة في حفظهم له۔	ایک جماعت قرآن کے یاد کرنے کے لیے۔
وان كان يعرض على النبیؐ ويتلى عليه وان جماعة من الصحابة مثل عبد الله بن مسعود و ابی بن كعب وغيرها ختموا القران على النبی عدة ختمات وكل ذلك يدل بادنى تامل على انه كان مجموعا مرتبا غير مبتور و لا مبثوث۔	اور وہ پیش کیا جاتا تھا نبی پر اور پڑھا جاتا تھا نبی کے سامنے اور بے شک صحابہ کی ایک جماعت جیسے عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعب وغیرہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بہت بار قرآن ختم کیا اور یہ سب باتیں ذرا سوچنے سے اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ قرآن جمع کیا ہوا مرتب تھا ٹکڑے ٹکڑے اور متفرق نہ تھا۔
ومن خالف في ذلك من الامامية والحشوية لا يعتد بخلافهم فان الخلاف في ذلك مضاف الى قوم من اصحاب الحديث نقلوا اخبارا ضعيفة ظنوا صحتها۔	اور جس نے خلاف کیا ہے اس میں امامیہ سے اور حشویہ سے ان کے خلاف کا اعتبار نہیں کیا جاوے گا۔ بے شک خلاف اس مسئلہ میں منسوب ہے ایک گروہ کی طرف اصحاب حدیث سے کہ انہوں نے ضعیف خبریں نقل کیں اور ان کو صحیح سمجھ لیا۔

اس فرقۂ جدیدہ کے جو تحریف قرآن کا منکر ہے شریف مرتضیٰ سرغنہ اور موجد ہیں اور ان کے بعد ملا باقر داماد اور علامہ طوسی اور ابن بابویہ قمی وغیرہ

نے ان کی تقلید کی۔

شریف مرتضیٰ کے اس قول سے بخوبی ثابت ہوگیا کہ قرآن جس ترتیب سے آج موجود ہے اسی ترتیب سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مرتب تھا پس ترتیب موجودہ حجت ہے۔

جہاں تک غور کیا جاتا ہے شیعوں کے اصول کے بموجب شریف مرتضیٰ کا قول کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا اس لیے کہ شریف مرتضیٰ نے اپنے قول کی دلیل میں کسی امام معصوم کا قول نقل نہیں کیا اور جو مذہب ائمہ سے منقول نہ ہو وہ شیعوں کے نزدیک یقیناً باطل ہے۔ خصوصاً اس مسئلہ میں تو شریف مرتضیٰ نے ائمہ کی کھلم کھلا مخالفت کی اور بہت سی حدیثیں ائمہ کی جن سے تحریف ثابت ہوتی تھی نہایت بے باکی کے ساتھ رد کر دیں۔ اور جناب امیر کا یہ فرمانا کہ اب یہ قرآن قائم کے وقت تک ظاہر نہ ہوگا محدثین شیعہ کے نزدیک ایسا مشہور قصہ ہے جو بہت سی روایات صحیحہ سے ثابت ہے۔ مگر شریف مرتضیٰ کے قول سے وہ سب روایتیں غلط ہوگئیں۔ کلینی نے اصول کافی میں ایک باب اس بیان میں لکھا ہے کہ پورا قرآن ائمہ کے سوا کسی کے پاس نہیں یہ قول بھی باطل ہوگیا۔

شریف مرتضیٰ اور ان کے مقلدین نے اثبات تحریف کی حدیثوں کو بے دلیل ضعیف کہدیا مگر یہ مجال نہ ہوئی کہ وجہ ضعف بیان کر سکتے۔ جب خود شریف مرتضیٰ کو یہ اقرار ہے کہ اصحاب حدیث تحریف کی روایتوں کو صحیح سمجھتے ہیں پھر وہ ضعیف کیسے ہوسکتی ہیں بالفرض اگر ضعیف بھی ہوتیں تو ہر ہر حدیث ضعیف ہوتی مگر سب مل کر اثبات تحریف کے لیے قوی ہو جائیں گی۔

یہ مضمون بھی شریف مرتضیٰ نے اہل سُنت کی روایتوں سے لیا ہے کہ بہت سے صحابہ پورے قرآن کے حافظ تھے۔ شیعوں کی روایتوں سے حضرت علیؓ کے سوا کسی صحابی کی نسبت پورے قرآن کا حافظ ہونا ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

صاحب تفسیر صافی نے فرقۂ جدیدہ کی ہر ہر دلیل کو رد کیا ہے شریف مرتضیٰ کے قول کی نسبت اس[1] نے یہ لکھ دیا

واماکونہ مجموعاً فی عھد النبی علی ما ھو علیہ الآن فلم یثبت۔	اور لیکن قرآن کا عہد نبوی میں اسی طرح مرتب ہونا جیسا کہ اب ہے پس ثابت نہیں ہوا۔

خلیل قزوینی نے صافی[2] ترجمۂ کافی میں لکھا ہے :۔

دعویٰ ایں کہ قرآن ہمین ست کہ در مصاحف مشہورہ است خالی از اشکال نیست۔ و استدلال بریں باہتمام صحابہ واہل اسلام بہ ضبط قرآن بغایت رکیک است بعد از اطلاع بر عمل ابی بکر و عمر و عثمان۔	یہ دعویٰ کہ قرآن اسی قدر ہے جو مصاحف مشہورہ میں ہے اعتراض سے خالی نہیں ہے، اور یہ دلیل لانا کہ اصحاب اور اہل اسلام کو قرآن یاد کرنے کا اہتمام تھا نہایت پوچ ہے بعد اطلاع پالینے کے عمل ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ پر۔

فرقۂ جدیدہ کو بہت بڑی کوشش اس امر کی تھی کہ کسی طرح مخالفت اقوال ائمہ کا الزام ان کے ذمہ سے اُتر جائے اور کسی امام کا قول بھی ایسا مل جائے جس سے

---

[1] تفسیر صافی مطبوعہ طہران ص۱۴ ۱۲

[2] صافی ترجمہ کافی کتاب فضل القرآن جزو ششم ص۷۵ ۱۲ منہ۔

انکار تحریف ثابت ہوتا ہو۔ آخر اُنھوں نے امام باقر علیہ السلام کا ایک فقرہ ڈھونڈ کر نکالا روضۂ کافی میں امام باقر علیہ السلام کا ایک خط سعد الخیر کے نام مذکور ہے اُسی میں یہ بھی ہے :-

اقاموا حروف الکتاب وحرفوا حدودہ۔ قائم رکھے حروف کتاب کے اور بدل دیے اس کے معانی۔

فرقۂ جدیدہ اس قول سے ثابت کرتا ہے کہ امام باقر نے یہ خبر دی ہے کہ کتاب کے حروف باقی رکھے اس سے ثابت ہوا کہ تحریف لفظی نہیں کی۔

مگر یہ استدلال صحیح نہیں اس لیے کہ اس قول میں بعض حروف کا قائم رکھنا مراد ہے نہ کل حروف کا۔

اوّل اس لیے کہ یہی لفظ اُس خط میں اس سے پہلے گذشتہ امتوں کی نسبت بھی لکھے ہیں کہ انھوں نے کتاب کو اس طرح چھوڑا کہ اُس کے حروف باقی رکھے اور حدود بدل دیے۔ حالانکہ شیعوں کا یہ اتفاقی مسئلہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے توریت و انجیل میں ہر طرح کی تحریف کی تھی اگر اس مسئلہ میں اختلاف ہے تو سُنیوں میں ہے نہ شیعوں میں اور ائمہ سے بہت سی روایتیں بھی اسی مضمون کی موجود ہیں کہ بنی اسرائیل نے ہر طرح کی تحریف کی تھی۔ ایسی حالت میں معنی اس قول کے یہ ماننے پڑیں گے کہ بعض حروف جو باقی رکھے اُس کے معنی بدل دیے اور یہ مراد نہ ہوگی کہ امم سابقہ نے کل حروف توریت کے باقی رکھے تھے۔ پس اس طرح دوسری جگہ بھی جو یہی لفظ اس امت کی نسبت لکھے ہیں وہاں بھی یہی مراد ہوگی کہ بعض لفظ باقی رکھے مگر ان کے معنی بدل دیے یہ مراد نہ ہوگی کہ کل لفظ قرآن کے باقی رکھے اس لیے کہ ان دونوں قولوں کا مطلب

امام کا یہ ہے کہ جو پہلی امتوں نے کیا تھا وہی اس امت نے کیا۔

دوسرے اس لیے کہ روایات کثیرہ سے تحریف کی خبر مل چکی ہے اور جناب امیر سے لے کر آخر تک تمام ائمہ نہایت تفصیل کے ساتھ تحریف کی خبریں دے گئے ہیں جن کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا پس اگر اس قول میں تمام حروف قرآن کا باقی رکھنا مراد ہوگا تو اُن روایات کے مقابلہ میں یہ قول قابل رد ہو جائے گا پس ضرور ہے کہ بعض حروف کی حفاظت مراد ہو تا کہ اُن روایات سے اس قول کی تطبیق ہو جائے حالانکہ یہ قول فقط ایک طریقہ سے مروی ہے اور دوسرا طریقہ جو حسین بن محمد کا ہے وہ جہالت راوی کی وجہ سے کالعدم ہے پس ایسی خبر واحد جو فقط ایک طریقہ سے مروی ہے تحریف کی خبروں کے مقابلہ میں جو حکم متواتر میں ہیں کیا وقعت رکھتی ہے۔

تیسرے اس لیے کہ جس کلینی نے اس خط کی روایت کی ہے وہ خود معتقد تحریف تھا پس ضرور ہے کہ اُس نے اس قول سے بعض حروف کی حفاظت مراد لی ہے نہ کل کی۔

چوتھے اس لیے کہ ائمہ خود یہ تعلیم کر گئے ہیں کہ اختلاف حدیث کی صورت میں جو خبر روایاتِ عامہ سے مطابق ہو اس کو رد کر دو پس اگر اس قول میں کل حروف کی حفاظت مراد ہوگی تو یہ قول عامہ کے قول سے مطابق ہو جائے گا اس لیے ضرور رد کرنے کے قابل ہوگا۔

یہ بھی عجیب ہے کہ اتنے بڑے خط کی عبارت راوی کو یاد کیوں کر رہی ؟۔

یہ بھی تعجب ہے کہ اس خط پر اطلاع کیوں کر ہوئی حالانکہ ائمہ کو امور دین کے

چھپانے میں بڑا اہتمام تھا۔ امام کے ہر قول میں تقیہ کا احتمال ہے بالخصوص تحریروں میں زیادہ تر ہے۔ اور خاص اس مسئلہ میں تقیہ کی سخت ضرورت تھی اس لیے کہ شیعوں کے سوا سب مسلمان تحریف قرآن کے قول کو باطل سمجھتے تھے اور جن کی اس زمانہ میں حکومت تھی ان کو بھی تحریف کا قول ناگوار تھا پس بوجوہ مذکورۂ بالا ثابت ہوگیا کہ یہ قول کسی طرح قابل استدلال نہیں اور صدہا روایات مثبت تحریف کو چھوڑنا اور اس قول سے استدلال کرنا ظلم صریح ہے۔

فرقۂ قدیمہ اور جدیدہ میں قرآن کی بابت باہم یہ اختلاف ہے کہ فرقۂ قدیمہ قرآن میں کلام محرفین کو شامل سمجھتا ہے اور بہت سی آیتوں کو خلاف ما انزل اللہ جانتا ہے اور کلام الٰہی اور کلام محرفین کو باہم ایسا خلط ملط سمجھتا ہے کہ امتیاز باقی نہ رہا پس فرقۂ قدیمہ کے قول کا حاصل یہ ہوا کہ بعض آیتوں کا مخالفِ حق ہونا یقینی ہے اور ہر آیت میں مخالفِ حق ہونے کا احتمال موجود ہے۔

فرقۂ جدیدہ نے بعض مصلحتوں سے یہ قول ایجاد کیا کہ اول سے آخر تک قرآن حق ہے نہ کم ہوا نہ زیادہ ہوا اور ہمارے ہاتھوں میں اسی ترتیب سے موجود ہے جس ترتیب سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مرتب ہوا تھا۔ پس اول فرقہ جو متبع اقوال ائمہ ہے منکر حقیت تمام قرآن ہے۔ اور دوسرا فرقہ بظاہر مدعی حقیت تمام قرآن ہے۔ یہ اختلاف درحقیقت کفر و اسلام کا اختلاف ہے پس ضرور تھا کہ فرقہ جدیدہ جو قرآن کی ہر ہر آیت کو منزل من اللہ جانتا ہے فرقۂ قدیمہ کے لوگوں کو کافر اور ملحد سمجھتا جو قرآن کی اکثر آیتوں کو خلاف ما انزل اللہ سمجھتے ہیں بخلاف اس کے فرقۂ جدیدہ کے لوگ فرقۂ قدیمہ کو مومن صحیح الاعتقاد بلکہ اپنا پیشوا

اور مقتدا جانتے ہیں مثلاً علی بن ابراہیم قمی اور احمد بن ابی طالب طبرسی صاحب احتجاج کو جو قرآن میں آیات خلاف ما انزل اللہ اور کلام محرفین بھی شامل سمجھتے ہیں فرقۂ جدیدہ کے لوگ کافر اور ملحد نہیں جانتے بلکہ مومن صحیح الاعتقاد اور اکابر مشائخ سے سمجھتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ فرقۂ جدیدہ کے لوگ بھی انکار تحریف کے قول کو ضروریات دین سے نہیں سمجھتے بلکہ جیسے کہ مسائل اختلافیہ میں مجتہدین کے اختلافات ہوتے ہیں وہی حالت اس اختلاف کی سمجھتے ہیں۔

شریف مرتضیٰ وغیرہ یہ چاہتے تھے کہ انکار تحریف کا قول اختیار کر کے شیعوں کو اسلامی فرقوں میں شامل کر دیں مگر اس کوشش میں وہ ایسے ناکام رہے کہ خود بھی دائرۂ اسلام میں قدم نہ رکھ سکے اس لیے کہ جس طرح وہ شخص مسلمان نہیں جو قرآن موجودہ کی بہت سی آیتوں کو مخالف حق اور خلاف ما انزل اللہ جانتا ہو اسی طرح وہ بھی مسلمان نہیں جو ایسے شخص کو مومن صحیح الاعتقاد سمجھے جو قرآن موجود کی بہت سی آیتوں کو مخالفِ حق اور خلاف ما انزل اللہ جانتا ہو۔

اگر تفسیر قمی وغیرہ تفاسیر شیعہ کو اول سے آخر تک دیکھا جائے تو یہ ظاہر ہوگا کہ قرآن نصف سے زیادہ ایسا ہوگیا جس کی آیتیں بدل کر اس مضمون کی مخالف ہوگئیں جو اللہ نے نازل کیا تھا۔ ایسی چند روایتیں بطور نمونہ ہم ذکر کر چکے ہیں لیکن اس موقع پر ایک اور روایت کا ذکر بھی مناسب سمجھتے ہیں۔

سورۂ توبہ میں ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ — اے نبی جہاد کر کافروں پر اور منافقوں پر۔

اس آیت کے تحت میں تفسیر صافی[1] میں لکھا ہے :-

وفی المجمع فی قراءة اهل البیت جاهد الکفار بالمنافقین	اور مجمع البیان میں ہے کہ اہل بیت کی قرأت یُوں ہے جاھد الکفار بالمنافقین جہاد کر کافروں پر منافقین کے ساتھ ۔
وفیه عن الصادق انه قرء جاهد الکفار بالمنافقین قال ان رسول الله لم یقاتل منافقاً قط انما کان یتألفهم۔	اور اُسی کتاب میں صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ انھوں نے پڑھا جاھد الکفار بالمنافقین امام نے فرمایا کہ بے شک رسول اللہ نے کبھی کسی منافق سے قتال نہیں کیا بے شک ان کی تالیف کیا کرتے تھے ۔
والقمی ایضاً انما نزلت یایها النبی جاهد الکفار بالمنافقین۔	اور قمی نے بھی لکھا ہے کہ نہیں نازل ہوا مگر یا یھا النبی جاھد الکفار بالمنافقین

ان روایتوں سے ظاہر ہوگیا کہ اللہ کا حکم منافقین پر جہاد کرنے کا نہ تھا بلکہ یہ حکم تھا کہ منافقین کی فوج ساتھ لے کر کافروں سے جہاد کرو یعنی منافقین[2] کو

---

[1] تفسیر صافی صفحہ ۲۱۴ ۱۲ منہ

[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ رسولؐ کے ساتھ شریک ہو کر جہاد میں کافروں سے لڑتے تھے وہ اکثر منافق ہوں گے اور انھیں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ تر میدان جنگ میں بھیجتے ہوں گے اس لیے کہ اللہ کا حکم یہی تھا۔ شاید اس میں یہ مصلحت تھی کہ دونوں فریقوں میں سے جو مارا جائے بہتر ہے۔ اب شہداء بدر و اُحد کے ایمان کا بھی اعتبار نہ رہا (معاذ اللہ منہا) جناب امیر کے معرکوں کو بھی (بقیہ صفحہ ۳۰۱ پر)

کافروں سے لڑاؤ اور قرآن موجودہ میں جو اس آیت کے لفظ ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکم یہ تھا کہ کافروں پر بھی جہاد کر اور منافقین پر بھی جہاد کر۔ اس صورت میں یہ آیت بھی خلاف ما انزل اللہ ہوگئی۔

اب حضرات شیعہ کی ایک بحث باقی رہی جو نہایت لطیف ہے اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ ائمہ تحریف قرآن کی خبر دے گئے بایں ہمہ شیعوں کو محرف قرآن پڑھنے کا حکم دیا اس کی کیا وجہ ہے؟ اگر حضرات شیعہ اپنے اصول کے مطابق ہم سے اس کا جواب چاہیں تو دو طرح یہ عقدہ حل ہو سکتا ہے۔

ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ محرفین کی اصلاح اللہ کو پسند آئی اس لیے ائمہ کو حکم دیا کہ اصلی قرآن کو چھپالو اور اصلاح شدہ قرآن کو رائج کردو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ائمہ نے یہ تو ظاہر کر دیا کہ جو کوئی ائمہ کا قرآن نہ پڑھے وہ گمراہ ہے۔ چنانچہ اصول[1] کافی میں ہے :-

قال ابوعبد الله علیه السلام ان کان ابن مسعود لا یقرء علی قراءتنا فهو ضال فقال ربیعة ضال فقال نعم ضال	فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہ اگر ابن مسعود ہماری قرأت کے مطابق نہیں پڑھتا تھا تو وہ گمراہ تھا۔ ربیعہ نے کہا کہ "گمراہ"؟ امام نے فرمایا کہ ہاں گمراہ تھا۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ جو کوئی ائمہ کی قرأت کے مطابق

(بقیہ صفحہ ۳۰۰) بھول جانا چاہیے ورنہ بدگمانی کی گنجائش ہوگی ۱۲

[1] اصول کافی کتاب فضل القرآن باب النوادر ۱۲

قرآن نہ پڑھے وہ گمراہ ہے۔

خلیل قزوینی نے اس روایت کا ترجمہ یوں کیا ہے :-

"گفت امام جعفر صادق علیہ السلام اگر عبداللہ بن مسعود باوجود آنکہ از بندگان مہاجران اصحاب رسول علیہ السلام بود نمی خواندہ است قرآن را بر نہج قرات ما اہل بیت رسول پس او گمراہ بودہ چہ جائے دیگراں"

یعنی عبداللہ بن مسعودؓ اگرچہ مہاجرین اصحاب تھے لیکن اگر وہ بھی قرات اہل بیت کے مطابق قرآن نہ پڑھتے ہوں تو گمراہ تھے۔ جب عبداللہ بن مسعود کی نسبت امام نے یہ فرمایا تو پھر اوروں کا کیا ذکر۔

پس ائمہ نے جو اپنے اصحاب کو اپنا قرآن نہ دیا اور اپنی قرات کے مطابق قرآن پڑھنے کا حکم نہ کیا بلکہ قرآن محرف کو پڑھنے کا حکم کیا اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ائمہ نے اپنے اصحاب کو عمداً گمراہ بنایا۔ چنانچہ اصول کافی میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ امام ایک ہی مسئلہ ایک شخص کو کچھ بتاتے ہیں دوسرے کو اس کے خلاف بتاتے ہیں تیسرے کو ان دونوں کے خلاف بتاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ امام ہر شخص کی صورت دیکھ کر یا دیوار کے پیچھے سے اس کی آواز سن کر اس کا حال معلوم کر لیتے ہیں کہ وہ نجات پانے والا ہے یا ہلاک ہونے والا ہے اور اسی کے مطابق اس کو جواب دیتے ہیں چنانچہ اس روایت کے آخر کا جملہ یہ ہے :-

فلیس یسمع شیئا من الامر   پس امام نہیں سنتا ہے کوئی خبر کسی امر کی

ینطق بہ الا عرفہ ناج او ھالک فلذلک یجیبھم بالذی یجیبھم (اصول کافی ص۲۷۷)

جسے کوئی شخص بیان کرے مگر امام اس شخص کو پہچان لیتا ہے کہ وہ نجات پانے والا ہے یا ہلاک ہونے والا ہے۔ اسی وجہ سے ان کو ایسے مختلف جواب دیتا ہے۔

حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ ائمہ ہر شخص کو پہچان لیتے تھے جس کو نجات پانے والا سمجھتے تھے اس کو ہدایت کرتے تھے اور دین حق سکھاتے تھے۔ جس کو ہلاک ہونے والا معلوم کر لیتے تھے اس کو گمراہ بناتے تھے۔ شاید ائمہ نے اپنے اصحاب کو معلوم کر لیا کہ وہ ہلاک ہونے والے ہیں اسی لیے قرآن صحیح ان کو نہ دیا اور قرآن محرف پڑھنے کا حکم کر دیا۔ ان کی تو یہ عادت تھی کہ جیسا کوئی شخص ہوتا تھا اس کو ویسا ہی دین سکھاتے تھے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کو اسلام اور کافروں کو کفر اور مشرکوں کو شرک سکھاتے ہوں گے جس میں جیسا مادہ پایا ویسا ہی پنتھ سکھا دیا۔ بڑی دلیل اس کی یہ ہے کہ شیعوں سے کہہ گئے کہ علم نجوم حق ہے اور ہندوستان کے جوتشی پنڈتوں کا معتقد بنا گئے۔

یہ بھی تعلیم کیا کہ آگے ہاتھ رکھ لو اور بالکل برہنہ ہو جاؤ پیچھے ہاتھ رکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ بھی سکھا دیا کہ کافروں کو برہنہ دیکھنا جائز ہے۔ محض بے وجہ بحیلۂ ماتم رونا پیٹنا بہت کچھ سکھا دیا جو احکام صبر کے علانیہ مخالف ہے پس ائمہ کی تعلیمیں جو شیعوں سے مختص ہیں ہمارے بیان کی پوری تصدیق کرتی ہیں

سیکھے معشوقی کے سب ڈھنگ نرالے تم نے
جیسی طینت تھی وہی رنگ نکالے تم نے

شیعوں کا یہ ضروری مسئلہ ہے کہ جو چیز ائمہ معصومین کے واسطے سے نہ پہونچے وہ ہرگز قابل اعتماد نہیں۔ اب ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی طرح یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ قرآن موجودہ شیعوں کو ائمہ نے دیا ہے البتہ یہ ثابت ہے کہ ائمہ کا قرآن اس قرآن سے جدا تھا۔ پس ان کے اصول کے بموجب وہ ہرگز قابل اعتماد نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ائمہ کے واسطہ سے نہیں پہنچا۔

اس زمانہ میں حضرات شیعہ نے عجیب شیوہ اختیار کیا ہے جب اہل سنت ترتیب قرآن سے استدلال کرتے ہیں مثلاً یوں کہتے ہیں کہ آیت تطہیر جو سورۂ احزاب میں ہے ازواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں ہے ...... اور اس سے پہلے اور اس کے بعد رسولؐ کی بیبیوں سے خطاب ہے پس ترتیب قرآن اور سیاق کلام سے ثابت ہے کہ لفظ اہل بیت سے رسولؐ کی بیبیاں[1] مراد ہیں۔ حضرت علی اور فاطمہ اور حسنین رضی اللہ عنہم کا نہ وہاں پہلے سے کچھ ذکر ہے نہ اس کے بعد۔

---

[1] آیت تطہیر میں ازواج رسولؐ کے ضرور داخل ہونے پر قرآن سے تین طرح استدلال ہے۔ اوّل یہ کہ اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد ازواج رسولؐ سے خطاب ہے پس سیاق کلام اور ترتیب قرآن سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس آیت میں بھی ازواج نبی سے خطاب ہے۔ دوسرے یہ کہ معنی لفظ اہل بیت میں بیبیاں بدرجۂ اولیٰ داخل ہیں۔ اس لیے کہ اہل بیت گھر والوں کو کہتے ہیں اور بیبیاں بے شک رسولؐ کی گھر والی تھیں۔ تیسرے یہ کہ سورۂ ہود کی آیت سے ظاہر ہو گیا کہ استعمال قرآن میں دوسری جگہ بھی لفظ اہل بیت سے بی بی مراد ہے۔ بعض اخبار احاد میں جو یہ وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دیکھو ص ۳۰۵)

اس کے جواب میں شیعہ حضرات فرماتے ہیں کہ ترتیب قرآن حجت [نہیں] محرفین نے یہ آیت ازواج رسولؐ کے ذکر میں شامل کر دی ہے۔

([حا]شیہ بقیہ ص ۳۰۴) حضرت علی اور فاطمہ اور حسنین رضی اللہ عنہم کو ایک چادر میں داخل کر کے [فر]مایا کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں تو ان کو پاک کر دے۔ یہ درحقیقت دعا ہے اس دعا [سے] رسولؐ نے ان چاروں کو بھی اسی فضیلت میں شامل کر لیا جو ازواج کے لیے ثابت تھی اور [یوں] اس آیت میں یہ دونوں فریق شامل ہو گئے۔ بعضی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ اسی طرح [رس]ول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کو بھی اہل بیت میں شامل کر لیا [پس] یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور عنایت تھی کہ سب کے لیے یہی دعا کرتے تھے کہ اس آیت کی فضیلت میں شامل ہو جائیں مگر اصل خطاب اس آیت میں ازواج [ر]سولؐ سے تھا اسی وجہ سے جب ام سلمہؓ چادر میں آنے لگیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انت الی خیر یعنی تیری حالت اس حالت سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ تو ازواج [می]ں شامل ہے جن سے اصل خطاب ہے۔ پس تجھ کو یہ فضیلت پہلے سے حاصل ہے اب اس چادر میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟۔ جو لوگ معنی لفظ اہل بیت میں داخل ہیں وہ ان [ا]خبار احاد کی وجہ سے خارج نہیں ہو سکتے اور یہ روایتیں ان کو خارج بھی نہیں کرتیں البتہ ان کے سوا اوروں کو داخل کرتی ہیں اگر اس آیت میں اللہ کی مراد یہی چاروں شخص تھے تو پیغمبر ان چاروں کی نسبت یہ کیوں کہتے کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں ان کو پاک کر دے جب انھیں کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی تھی تو پھر اس دعا کی کیا ضرورت تھی؟ حالانکہ یہ [دو]نوں فریقین کی روایتوں میں موجود ہے۔ شیعوں کی یہ روایتیں تفسیر صافی میں لکھی ہوئی ہیں۔ [شی]عوں کی طرف سے بڑا شبہ یہ پیش ہوتا ہے کہ پہلے سے مونث کی ضمیریں ہیں۔ (دیکھو ص ۳۰۶)

اور جب اہل سنت سورۂ ہود کی آیت پیش کرتے ہیں جس میں اُس وقت کا بیان ہے کہ جب ملائکہ نے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی بشارت دی تو ان کی بی بی سارہ نے تعجب کیا۔ اس وقت فرشتوں نے سارہ سے خطاب کرکے یوں کہا:۔

(بقیہ ۳۰۵) اور اس آیت میں لفظ (کم) سے خطاب ہوا جو تذکیر کی ضمیر ہے۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ اس ضمیر کے بدلنے سے معنی نہیں بدلے اس لیے کہ لفظ اہل کا استعمال تذکیر کے ساتھ خواہ اُس سے مونث مراد ہو یا مذکر۔ سورۂ ہود کی آیت میں اول لفظ (تعجبین) ہے یعنی (تعجب کرتی ہے تو) یہ صیغہ ایک عورت کے لیے بولا جاتا ہے۔ پھر اسی سورت کے خطاب میں (کم) کہہ دیا آیت تطہیر میں تو فقط تذکیر و تانیث کا فرق ہوا تھا۔ سورۂ ہود کی آیت میں دو فرق پڑے ایک تذکیر و تانیث کا دوسرے واحد اور جمع کا۔ شیعہ کہتے ہیں زید بن ارقمؓ صحابی کہتے تھے کہ اس آیت میں بی بیاں شامل نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب دلائل مذکورہ سے ثابت ہو گیا کہ بیبیاں شامل ہیں پس وہ دلائل زید کے کہنے سے رد نہیں ہو سکتے۔ اور زید بن ارقم کا قول یہ تھا کہ کل بنی ہاشم جن پر صدقہ حرام ہے اہل بیت ہیں اس صورت میں باتفاق فریقین ان کا قول غلط ٹھیرا۔ ان کے مقابلے میں ابن عباسؓ کا قول یہ تھا کہ یہ آیت خاص بیبیوں کے حق میں ہی نازل ہوئی ہے۔ شیعوں کی روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ائمہ اگرچہ اس آیت سے ازواج کو خارج کرتے تھے مگر اس امر کو بعید از عقل بھی جانتے تھے۔

تفسیر صافی میں اس آیت کے تحت میں لکھا ہے:۔ العیاشی عن الباقر لیس شیء ابعد من عقول الرجال من تفسیر القرآن ان الآیۃ ینزل اولھا فی شیء واوسطھا

قالوا اتعجبین من امر اللہ رحمت اللہ وبرکتہ علیکم اھل البیت ۰ انہ حمید مجید ۰

فرشتوں نے کہا کہ کیا تو اللہ کے حکم سے تعجب کرتی ہے اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تم پر ہوں اے اہل بیت وہ ہے مستحق حمد صاحب عظمت۔

وآخرھا فی شیء ثم قال انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس الخ یعنی عیاشی نے امام باقر سے روایت کی ہے کہ کوئی چیز آدمیوں کی سمجھ سے تفسیر قرآن سے زیادہ بعید نہیں بے شک نازل ہوتی ہے آیت کہ اول اُس کا اور چیز کے ذکر میں ہوتا ہے اور اوسط اس کا اور چیز کے ذکر میں ہوتا ہے اور آخر اس کا اور چیز کے ذکر میں ہوتا ہے اور پھر امام نے آیت انما یرید اللہ آخر تک پڑھی اس روایت سے صاف ظاہر ہو گیا کہ امام اس آیت کی تفسیر میں حیران تھے۔ اور اس امر کو لوگوں کی سمجھ سے بہت بعید جانتے تھے کہ کسی آیت کا اول اور چیز کے ذکر میں اور اوسط اور چیز کے ذکر میں ہو اور آخر اور چیز کے ذکر میں ہو۔ یہ مشکل امام کو اس غلطی کی وجہ سے پیش آئی تھی کہ انھوں نے ازواج کو اہل بیت سے خارج کیا تھا اگر غلطی رفع ہو جاتی تو یہ حیرانی بھی رفع ہو جاتی۔ قرآن کی ایسی تفسیر کیوں کی جائے جو آدمیوں کی سمجھ سے بعید ہے۔

کافی میں امام جعفر صادق سے منقول ہے کہ اس آیت میں ائمہ اور ان کی ولایت مراد ہے۔ جو کوئی ائمہ کی ولایت میں داخل ہوا اہل بیت نبی میں داخل ہو گیا اس تفسیر کے بموجب اُن چاروں کی جو چادر میں لے گئے تھے تخصیص نہ رہی بلکہ تمام شیعے جو مدعی ولایت ہیں اہل بیت میں داخل ہو گئے اور معصوم بھی بن گئے۔ یہ تفسیر شیعوں نے اس لیے تصنیف کی اگر آیت کے ظاہری معنی لیے جاویں یعنی بیت سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے (بقیہ ۳۰۸)

اس آیت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بی بی سے خطاب ہے اُسی کو اہل بیت کہا ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ استعمال قرآنی میں لفظ اہل بیت سے بی بی مراد ہے۔ اسی طرح آیت تطہیر میں بی بیاں مراد ہوں گی۔ اس کے جواب میں حضرات شیعہ اس آیت میں تحریف کا احتمال نکالتے ہیں اور شریف مرتضیٰ کے قول کو باطل سمجھتے ہیں۔ لیکن جب عیسائیوں کی طرف سے قرآن پر تحریف کا طعن پیش ہوتا ہے تو ان کے مقابلے میں تحریف کا انکار ہوتا ہے۔ اور اہل سنت کے دامن میں پناہ لی جاتی ہے۔ اتقان کی روایتیں پیش ہوتی ہیں شریف مرتضیٰ کا قول بڑے زور وشور سے پیش کیا جاتا ہے اور یہ اقرار کیا جاتا ہے کہ ترتیب موجودہ وہی ترتیب ہے جو رسولؐ کے سامنے ہوگئی تھی۔

غرض آج تک پورے قرآن مرتب کی حقیت پر شیعوں کا اتفاق نہیں ہر شخص نئی بولی بولتا ہے۔

علماء شیعہ تحریف قرآن کی بحث میں بمقابلہ اہل سنت عاجز ہو کر جب کوئی جواب نہیں دے سکتے تو انھوں نے اپنی ندامت کم کرنے کے لیے یہ جواب تجویز کیا ہے کہ سُنیوں کی روایتوں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بعض آیتیں نازل ہوئی تھیں اور قرآن موجودہ میں داخل نہیں ہوئیں لیکن اگر حضرات شیعہ انصاف فرمائیں تو ظاہر ہو جائے کہ قرآن کی تحریف کا قول شیعوں کی روایات اور تصریحات سے بخوبی ثابت ہے اور بہت سی وجوہ اس امر پر قائم ہیں کہ اہل سنت کی روایتوں سے تحریف قرآن کا نتیجہ نکالنا ہرگز صحیح نہیں۔

(بقیہ ص ۳۰۷) رہنے کا گھر مراد ہو تو رسول اور ان کی بیبیوں کے سوا اس کے حکم میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔

اوّل یہ کہ اہل سنت کی روایات میں یہ مضمون نہیں کہ جو قرآن رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات کے وقت چھوڑا تھا اس میں بعد وفات رسولؐ کے کچھ کمی کی گئی یا بدل کر خلاف ما انزل اللہ بنایا گیا یا تحریف کرنے والوں نے اپنا کلام اُس میں بڑھایا اور شیعوں کی روایتوں سے ثابت ہے کہ جو قرآن رسولؐ نے وقت وفات چھوڑا تھا اُس میں بعد وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ سب کچھ ہوا۔

دوسرے یہ کہ شیعوں کی روایتیں ائمہ معصومین کے اقوال ہیں اور شیعہ جو روایتیں سُنیوں کی پیش کرتے ہیں وہ غیر معصومین کے اقوال ہیں پھر الزام میں برابری کیوں کر ہوگی۔ سُنی کہہ سکتے ہیں کہ جو لوگ معصوم نہ تھے اُن کو غلط فہمی ہوئی کیا شیعہ بھی اپنے ائمہ کی نسبت یہی کہدیں گے؟

تیسرے یہ کہ الزامی جواب فقط اہل سنت کے مقابلہ میں ہوگا۔ منکرین اسلام جب روایات شیعہ سے تمسک کر کے تحریف قرآن کا اعتراض پیش کریں گے تو کیا جواب ہے؟

چوتھے یہ کہ اہل سنت کے اصول کے بموجب یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ کسی نے بدنیتی سے قرآن میں تحریف کی یا کوئی خائن قرآن کے جمع کرنے میں شریک تھا یا کسی بے دین نے کوئی مسئلہ قرآن سے نکال ڈالا اور شیعوں کے اصول کے بموجب یہ سب کچھ ثابت ہوتا ہے۔

اب اصلی حالت اُن روایتوں کی یہ ہے کہ کتب صحاح میں دو تین روایتیں اس مضمون کی ہیں کہ بعض آیتیں جو نازل ہوئی تھیں یاد نہ رہیں یہ آیتیں

اُس قسم میں داخل ہیں جن کی نسبت اللہ نے فرمایا ہے:۔

ما ننسخ من اٰیۃ او ننسھا	جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بُھلا
نات بخیر منھا او مثلھا	دیتے ہیں اُس کو، لاتے ہیں ہم اُس سے بہتر یا اُس کی مثل۔

ف یعنی اگر ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بُھلا دیتے ہیں تو دوسری آیت ایسی نازل کرتے ہیں جو اُس سے بہتر ہو یا اس کے برابر ہو پس جن آیتوں کا اُن روایتوں میں ذکر ہے وہ من جملہ اُنھیں آیتوں کے ہیں جو بُھلا دی گئیں۔

و دوسری جگہ اللہ نے فرمایا ہے:۔

سنقرئك فلا تنسی	ہم پڑھا دیں گے تجھ کو کہ نہ بھولے گا تُو مگر
الا ما شاء اللہ	جو چاہے اللہ۔

ف اس آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ اے پیغمبر جن آیتوں کو اللہ بُھلانا چاہے گا ان کو تو بُھول جائے گا۔

مفسر شیعی محسن کاشی صاحب تفسیر صافی نے (او ننسھا) کی تفسیر میں لکھا ہے:۔

بان نرفع رسمھا و نبلی عن	یعنی اس طرح بُھلا دیں کہ اُس کی کتابت
القلوب حفظھا و عن قلبك	بھی اُٹھا دیں اور دلوں سے اُس کی یاد دور
یا محمد کما قال سنقرئك	کر دیں اور تیرے دل سے بھی اے محمدؐ
فلا تنسی الا ما شاء اللہ	اس کی یاد مٹا دیں جیسے کہ اللہ نے کہا ہے
ان ینسیك فرفع عن قلبك	کہ پڑھا دیں گے ہم تجھ کو پھر نہیں بھولے گا تُو
ذکرہ۔	مگر وہ جس کو چاہے اللہ کہ بُھلا دے تجھ کو تو اُٹھا وے تیرے دل سے اُس کی یاد۔

ان بھولی ہوئی آیتوں میں سے بعض مضامین کسی کو یاد رہ جاتے تھے اور اُن کو وہ ایسے الفاظ میں ادا کرتا تھا جن کی نسبت اُس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ اس بُھولی ہوئی آیت کے یہی لفظ تھے۔ پس اہل سنت کی روایتوں میں جو مذکور ہوتا ہے کہ کسی آیت کا ذکر کسی صحابی نے کیا کہ یہ آیت نازل ہوئی تھی اور اب قرآن میں نہیں وہ اسی قسم کی آیتیں ہیں۔ بعض روایتیں ایسی بھی ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی آیت کو پڑھ کر اپنی طرف سے بعض الفاظ بطور تفسیر بیان فرمائے تھے سامعین میں سے کسی نے اپنی غلط فہمی سے اُن الفاظ تفسیر کو بھی من جملہ قرآن سمجھ لیا۔

بعض روایتوں میں وہ الفاظ مذکور ہیں جو اختلاف قراءت کی وجہ سے مختلف ہیں وہ سب الفاظ مطابق تنزیل سمجھے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ اہل سنت کی صحیح روایات سے ثابت ہوا ہے کہ جبریلؑ نے وہ سب لفظ نازل کیے ہیں۔ نہ اس اختلاف سے قرآن کا مطلب بدلتا ہے نہ کوئی مسئلہ خارج یا داخل ہوتا ہے۔

شیعہ جتنی روایتیں اہل سنت کی کتابوں کی تحریف قرآن کے الزام میں پیش کرتے ہیں اور اس طعن میں برابری کرنا چاہتے ہیں وہ ان تین قسموں سے ہرگز خارج نہیں۔ پس قرآن کی کمی اہل سنت کی روایتوں سے ثابت نہیں ہو سکتی۔ اگر حضرات شیعہ کو اہل سنت کے الزام دینے اور ان کی روایتوں سے

کمی قرآن ثابت کرنے کا دعویٰ باقی ہو تو ایسی روایتیں اہل سنت کی ذکر کریں جو ان تینوں قسموں میں داخل نہ ہو سکیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس قسم کی روایتیں اہل سنت کی صحاح میں بہت تھوڑی ہیں جن کی تعداد پانچ چار روایتوں سے زیادہ نہ ہوگی اور بہت سی روایتیں جو حضرات شیعہ پیش کرتے ہیں وہ ایسی ضعیف کتابوں کی ہیں جن میں ہر قسم کی روایتیں بلکہ موضوعات بھی شامل ہیں اس قسم کی بہت سی موضوع روایتیں تفسیر درمنثور میں بھری ہوئی ہیں۔

شیعوں کی روایتیں ان تینوں قسموں میں سے کسی قسم میں داخل نہیں ہو سکتیں تفصیل اس کی یہ ہے :-

قسم اول وہ آیتیں ہیں جن کو اللہ نے بھلا دیا جب وہ پیغمبر کے سینہ سے محو ہو گئیں تو ائمہ کو کیسے یاد ہو گئیں اور جب اللہ نے اُن کو قرآن سے نکال دیا تو پھر ائمہ نے کیوں داخل کیا ؟

قسم دوم درحقیقت تفسیری حدیثیں ہیں جن کو کسی نے غلطی سے قرآن سمجھ لیا تھا ایسی غلطی ائمہ معصومین سے ممکن نہیں۔

قسم سوم اختلاف قرات ہے۔ اہل سنت کی صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ بعض آیتوں کی نسبت جبریل نے بتا دیا تھا کہ ان کو کئی طرح پڑھنا جائز ہے۔ پس جتنی قراتیں متواتر ہیں اور مصاحف عثمانیہ میں شامل ہیں سب قرآن سمجھی جاتی ہیں۔

شیعہ جو نئے الفاظ بعض آیات کے ائمہ کے قرآن سے نقل کرتے ہیں

وہ اختلاف قرات کے تحت میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس کے کئی سبب ہیں

اول یہ کہ شیعہ اختلاف قرات کے منکر ہیں۔ چنانچہ اصول کافی کی کتاب فضل القرآن باب النوادر میں مذکور ہے :-

عن ابی جعفر قال ان القرآن واحد نزل من عند واحد ولکن الاختلاف یجیئ من قبل الرواۃ	امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ قرآن واحد ہی نازل ہوا ہے واحد کے پاس سے اور اختلاف پیدا ہوا ہے راویوں کی طرف سے۔

اس کے بعد دوسری روایت یہ لکھی ہے :-

قلت لابی عبد اللہ ان الناس یقولون ان القرآن نزل علی سبعۃ احرف فقال کذب اعداء اللہ و لکنہ نزل علی حرف واحد من عند الواحد۔	راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ آدمی کہتے ہیں کہ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے تو امام نے فرمایا کہ اللہ کے دشمنوں نے جھوٹ بولا لیکن قرآن نازل ہوا ہے ایک حرف پر ایک اللہ کی طرف سے۔

ان دونوں روایتوں سے ثابت ہو گیا کہ شیعوں کے نزدیک اختلاف قرات صحیح نہیں۔ چنانچہ خلیل قزوینی نے ترجمہ کافی میں اسی مقام پر اپنے خیال کے مطابق اختلاف قرات کے ابطال پر دو برہانیں بھی قائم کی ہیں۔

دوسری دلیل اس کی کہ جو نئے الفاظ ائمہ کے قرآن میں تھے وہ اختلاف قرات کے تحت میں داخل نہیں ہو سکتے یہ ہے کہ اختلاف قرات کی

صورت میں ہر قرارت کا پڑھنا جائز ہوتا ہے اور ائمہ نے یہ کہہ دیا تھا کہ جو کوئی ہماری قرارت کے خلاف قرآن پڑھے وہ گمراہ ہے۔ چنانچہ اصول کافی کی کتاب فضل القرآن باب النوادر میں ہے:۔

عن عبد اللہ بن فرقد و المعلی بن خنیس قالا کنا عند ابی عبد اللہ علیہ السلام ومعنا ربیعۃ الرای فذکرنا فضل القران فقال ابو عبد اللہ علیہ السلام ان کان ابن مسعود لا یقرء علی قراءتنا فھو ضال فقال ربیعۃ ضال فقال نعم ضال ثم قال ابو عبد اللہ اما نحن فنقرء علی قراءۃ اُبَیٍّ۔	عبد اللہ بن فرقد اور معلی بن خنیس سے روایت ہے وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہم امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس تھے اور ہمارے پاس ربیعۃ الرائے بھی تھا تو ہم نے قرآن کی فضیلت کا ذکر کیا تو امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر ابن مسعود ہماری قرارت کے مطابق نہ پڑھتا ہو تو وہ گمراہ ہے تو ربیعہ نے پوچھا کہ کیا گمراہ ہے؟ تو امام نے فرمایا کہ ہاں گمراہ ہے۔ پھر فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے لیکن ہم قرآن پڑھتے ہیں قرارت ابی بن کعب پر۔

اس روایت سے یہ ثابت ہوگیا کہ جو کوئی امام کی قرارت کے مطابق قرآن نہ پڑھے وہ گمراہ ہے۔ اب اختلاف قرارت کی صورت باقی نہ رہی بلکہ یہ ثابت ہوگیا کہ صحیح قرآن وہ ہے جو امام کے پاس تھا اور قرآن موجودہ محرف اور غلط ہے۔

پس قرآن میں تحریف کی خبر جو ائمہ نے دی وہ فرقۂ جدیدہ کے چھپائے

سے چھپ نہیں سکتی اور اس باب میں حضرات شیعہ جتنی کوشش کرتے ہیں وہ اُن کے لیے اور زیادہ مضر ہے اس لیے کہ جب ایسی خبر جو بیسیوں روایتوں سے ثابت ہے غلط ہو جائے تو شیعوں کی تمام روایتیں اعتبار سے ساقط ہو جائیں گی جتنے مسائل اصول و فروع مذہب شیعہ کے ہیں سب انھیں راویوں اور انھیں سندوں انھیں کتابوں سے ثابت ہوئے ہیں پس جب تحریف کی روایتیں غلط ہوگئیں تو اور اصول و فروع شیعہ کی روایتیں کب صحیح رہیں گی۔ پھر مضمون بھی اکثر روایتوں کا ایسا صاف صاف ہے کہ کسی طرح تاویل کی گنجائش نہیں پس شیعوں کو اپنے اصول اور روایات کے بموجب تحریف قرآن کا انکار کرنا ظلم ہے اور جب شیعوں کے پاس اصل قرآن نہیں تو ظاہر ہے کہ ایمان و اسلام بھی نہیں

اب یہ لطیفہ بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ امام نے یہ فرما دیا کہ ہم تو قرآن اُبی بن کعب کی قرارت کے بموجب پڑھتے ہیں۔ پس یہ جو خیال باندھا جاتا تھا کہ ائمہ حضرت علیؓ کا قرآن پڑھتے تھے غلط ہوگیا۔

محسن کاشی نے تفسیر صافی کے مقدمہ ثانیہ میں اس روایت کو لکھ کر یہ لکھا کہ امام نے ربیعہ سے تقیہ کیا تھا اسی لیے ایسا کہہ دیا۔ اور ابن مسعودؓ کی نسبت جو سخت کلمہ زبان سے نکل گیا تھا اس کے تدارک میں صحابیؓ کی مراعات کر دی ورنہ ائمہ اپنے باپ دادوں کے سوا اور کسی کی پیروی نہیں کرتے تھے۔ پس محسن کاشی کی تاویل کا حاصل یہ ہوا کہ امام نے یہ جو کہہ دیا کہ ہم اُبیؓ کی قرارت پڑھتے ہیں یہ ربیعہ کے سامنے مصلحتاً جھوٹ بولا۔ مگر اس کا کیا جواب کہ اگر امام کو ربیعۃ الرائے فقیہ مخالف سے تقیہ منظور تھا تو پہلے سے

عبداللہ بن مسعودؓ کی نسبت ایسا سخت کلمہ کیوں کہا اور اپنے قرآن کو صحیح کیوں بتایا اگر پہلے سے ہی سوچ سمجھ کر گفتگو کرتے تو جھوٹ بولنا نہ پڑتا۔

محسن کاشی نے معنی حدیث میں تاویل کی تھی الفاظ حدیث کو بعینہ باقی رکھا تھا مگر خلیل قزوینی نے ترجمہ کافی میں غضب کیا کہ الفاظ حدیث کے تحریف کرکے یوں بنا لیے :۔

(ما نحن فتقرء علی قراءة آبی) یعنی (اے ربیعہ) کیا تو میل نہیں کرتا کہ پڑھے میرے باپ کی قرات کے مطابق

اب اس قول محرف کا حاصل یہ ہوگیا کہ امام نے ربیعہ کو ترغیب دی تھی کہ ہمارے باپ کی قرارت کے مطابق قرآن پڑھا کر۔ مگر یہ معنی ہرگز صحیح نہیں ہوسکتے۔ اس لیے کہ امام اپنے مخلصین شیعہ کو بھی اپنی قرارت پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے پھر ربیعہ کو ایسا حکم کیوں کرتے جو سُنی مذہب تھا۔

شیعوں نے ائمہ پر افترا باندھ کر آیات قرآنی میں خود تحریف کی اور صحابۂ رسولؐ پر تحریف کی تہمت لگائی۔ مگر حافظِ حقیقی کی شانِ حفاظت دیکھو کہ اسی گروہ شیعہ میں سے ایک فرقۂ جدیدہ ایسا پیدا کر دیا جس نے اپنے متقدمین کا جھوٹ علانیہ کھول دیا اور جو الفاظ متقدمین شیعہ نے قرآن میں بڑھانے چاہے تھے اُنھیں کو متاخرین شیعہ کی زبانی جھوٹ کہلوا دیا۔ متقدمین نے تحریف قرآن میں کوئی کمی نہیں کی تھی مگر متاخرین نے اپنے قدما کی تمام کوشش بے کار کر دی۔

اے حضرات شیعہ جب اس مسئلہ میں اتنا بڑا جھوٹ اس

مذہب کا کھل گیا تو انصاف کا بہت بڑا ذریعہ ہاتھ آگیا۔ تمام مذہب اسی نمونہ پر قیاس ہوسکتا ہے اہل بصیرت کے لیے اتنی تنبیہ بہت کافی ہے جب اتنا بھید کھل گیا تو پھر اب کیا شبہ باقی رہا۔

آمدم برسر مطلب اگرچہ تحریف قرآن کی بحث میں بہت تطویل ہوگئی مگر اس میں عوام کو بہت سے فائدے حاصل ہوں گے اس لیے کہ یہ ظاہر ہو جائے گا کہ قرآن موجودہ کی نسبت شیعوں کا کیا اعتقاد ہے۔

اس بحث پہ اول سے آخر تک غور کرنے سے بخوبی واضح ہوگیا کہ مسئلہ امامت خیالی شیعہ کا قرآن میں نام ونشان نہیں حالانکہ تمام مسائل اعتقادیہ و ایمانیہ قرآن میں تصریح کے ساتھ مذکور ہیں۔ پس یہیں سے اس مسئلہ کا باطل ہونا بخوبی ثابت ہوگیا۔ اس لیے کہ اگر یہ مسئلہ ضروریات ایمان سے ہوتا تو مثل اور مسائل ایمانیہ کے اسی تصریح کے ساتھ قرآن میں مذکور رہتا جس کو ہر شخص بے تکلف سمجھ لیتا۔

جب تصریح کے ساتھ مسئلہ امامت کا نام ونشان قرآن میں نہ ملا اور اس مسئلہ کو قرآن میں داخل کرنے کے لیے تحریف لفظی کی جس قدر کوشش متقدمین شیعہ نے کی تھی اُس کو بھی فرقۂ جدیدہ نے برباد کر دیا۔ تب مجبور ہو کر تحریف معنوی پہ کمر باندھی۔ اس تحریف میں فرقۂ جدیدہ فرقۂ قدیمہ کے ساتھ ہم زبان اور ہم قدم رہا اور قرآن کی بعضی آیتوں کے صاف اور سیدھے معنی چھوڑ کر زبردستی اُن سے مسئلہ امامت ثابت کرنے لگے۔ حالانکہ اگر تعصب کو چھوڑ کر انصاف سے دیکھیں تو اُن آیتوں کو مسئلہ امامت سے کچھ بھی تعلق نہیں۔ اس

سم کی آیتوں میں سب سے زیادہ زور حضرات شیعہ کا آیت اطیعوا اللہ
اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم پر ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ اس آیت
ں لفظ اولی الامر سے علی اور باقی ائمہ مراد ہیں۔ اسی وجہ سے حضرات شیعہ
ے جس امام کو غائب فرض کیا ہے اُس کا نام صاحب الامر رکھ لیا۔ یہ آیت
ورۂ نساء میں جزو پنجم میں قریب ربع کے واقع ہے۔ ہم اس آیت کو مع
ں کے ماقبل و مابعد کے نقل کرتے ہیں:۔

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ ۖ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ

اور جب حکم کرو تم آدمیوں میں تو حکم کرو انصاف کے ساتھ بے شک اللہ جس چیز کی تم کو نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہے۔ بیشک اللہ سننے والا ہے دیکھنے والا ہے۔ اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور حکومت والے کی جو تم میں سے ہو پس اگر جھگڑو تم کسی چیز میں تو رجوع کرو اُس میں طرف اللہ اور رسول کے۔ اگر ہو تم ایمان لانے والے اللہ پر اور قیامت کے دن پر۔

اس آیت میں اول اللہ نے حکومت والوں کو یہ حکم کیا کہ انصاف
ہ ساتھ حکومت کریں پھر مومنین کو یہ حکم کیا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت

کریں اور حکومت والے کی اطاعت کریں پھر یہ حکم کیا کہ اگر تم میں اختلاف ہو تو
اللہ اور رسول کے قول کی طرف رجوع کر کے اس اختلاف کا فیصلہ کر لو۔

اب بحث طلب یہ بات ہے کہ اللہ نے جن اولی الامر کی اطاعت کا
حکم کیا ہے وہ کون ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ باعتبار لغت اور استعمال
زبان عرب کے اولی الامر کے معنی صاحب حکومت کے ہیں جس کو حاکم کہتے ہیں
پس اس لفظ کے جو معنی حقیقی ہیں اسی معنی میں اس لفظ کو باقی رکھنا چاہیے۔ اگر یہ
تردد ہو کہ وہ حکومت والے کون ہیں جن کی اطاعت کا حکم ہوا تو یہ عقدہ بھی بہت
آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ملک عرب کی بڑی بڑی
بستیوں میں اپنی طرف سے حکام مقرر کر کے بھیجا کرتے تھے اور وہاں کے لوگوں کو
اُن حکام کی اطاعت کا حکم ہوتا تھا اور جس جہاد میں بذات خود تشریف نہ لے جاتے
تھے تو کسی صحابی کو امیر لشکر مقرر کرتے تھے اور تمام لشکر اسلام کو امیر لشکر کی اطاعت
کا حکم کرتے تھے۔ جب کبھی مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے تو مدینہ میں کسی
کو حاکم مقرر کر جاتے تھے۔ یہ سب لوگ چونکہ حاکم ہوتے تھے اس لیے اولوا الامر
ہوتے تھے ان سب کی اطاعت اُن کے ماتحتوں پر واجب ہوتی تھی۔ حضرات
شیعہ نہ اُن حکام کے اولوا الامر ہونے کا انکار کر سکتے ہیں نہ اُن کی اطاعت کے
وجوب میں کوئی خلل ڈال سکتے ہیں۔ پس آیت کے معنی بے تکلف واضح ہو گئے کہ
وہ یہی حکام ہیں جن کی اطاعت کا اس آیت میں اللہ نے حکم کیا۔ بڑا قرینہ اس کا
یہ ہے کہ اللہ نے اول حکام کو انصاف کرنے کا حکم کیا اسی کے ساتھ مومنین کو
ان کی اطاعت کا حکم کیا پس پہلی آیت سے بھی اس کا ربط بہت اچھی طرح واضح

ہوگیا۔ اسی طرح بعد کی آیت سے بھی یہی معنی مربوط ہیں اس لیے کہ حکام کی اطاعت اُسی حد تک واجب ہے کہ جب تک ان کا حکم خدا اور رسول کے حکم کے مخالف نہ ہو اور جب اُن کا حکم اللہ اور رسول کے حکم کے مخالف ہو اس وقت ان کی اطاعت واجب نہیں ہوتی۔ اسی لیے اللہ نے یہ حکم دیا کہ اگر تم میں کوئی نزاع واقع ہو یعنی اولوا لامر کے کسی حکم کو اُس کے ماتحت خلاف حق سمجھیں تو اس وقت اولوا لامر اور اس کے ماتحتوں پر واجب ہے کہ دونوں فریق اللہ اور رسول کے قول کی طرف رجوع کریں اور جس کا قول اللہ اور رسولؐ کے قول کے مخالف ثابت ہو اس کو غلط سمجھ لیں۔

شیعہ کہتے ہیں کہ اللہ اور رسول کے قول سے فیصلہ کرنے کا حکم اُس نزاع میں ہے جو باہم مومنین میں واقع ہو نہ اُس نزاع میں جو اولی الامر کے ساتھ واقع ہو۔ مگر اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ نے جو یہ حکم کیا ہے کہ (اگر تم میں نزاع واقع ہو تو اللہ اور رسول کے قول سے فیصلہ کرو) اس میں اولوالامر اور غیر اولوالامر یعنی حاکم اور محکوم خواہ اہل بیت میں سے ہو خواہ غیر اہل بیت میں سے ہو سب شامل ہیں یعنی جس طرح اور مومنین کو یہ حکم ہے کہ نزاع کی صورت میں اللہ اور رسول کے قول سے فیصلہ کرو اسی طرح اولوالامر کو بھی یہی حکم ہے اس لیے کہ یہ حکم سب مومنین کے لیے ہے اور اولی الامر بھی بے شک مومنین میں داخل ہے۔

قطع نظر اس کے اگر اولوالامر اس خطاب سے خارج ہوتا اور اُس کا قول ہر صورت میں حجت ہوتا تو اللہ یوں فرماتا کہ اے مومنین تم نزاع کی صورت میں

[اللہ] اور رسول اور اولوا الامر کے قول کی طرف رجوع کرو مگر چونکہ اولوا الامر کے قول کی [ط]رف رجوع کرنے کا حکم نہ کیا اس سے ظاہر ہوگیا کہ اولوا الامر کا قول حجت نہیں اللہ [اور ر]سول اللہ کا قول حجت ہے۔

حضرات شیعہ کو اس موقع پر سخت مجبوری پیش آئی مگر فرقۂ قدیمہ کے [لیے] ان مشکلات کا علاج بہت سہل تھا اس لیے کہ یہ بات اُن کے اختیار میں تھی [ج]و مضمون چاہا قرآن میں بڑھا لیا اور کسی امام سے ایک روایت تصنیف کرلی کہ یہ [آی]ت اسی طرح نازل ہوئی تھی چنانچہ اس آیت میں بھی انھوں نے یہ کہدیا کہ اللہ [کی] طرف سے یہی حکم نازل ہوا تھا کہ نزاع کی صورت میں اللہ اور رسول اور اولی الامر [کی] طرف رجوع کرو مگر محرفین نے اس آیت سے اولی الامر کا لفظ نکال ڈالا چنانچہ [تف]سیر صافی میں اس آیت کے تحت میں لکھا ہے:—

القمی عن الصادق قال نزل [ف]ان تنازعتم فی شیٔ فردوہ [ا]لی اللہ والی الرسول والی اولی [الا]مر منکم

تفسیر صافی صفحہ ۲۱۶ مطبوعہ طہران

قمی نے امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ یہ آیت اس طرح نازل ہوئی تھی۔ (فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والی الرسول و الی اولی الامر منکم) یعنی پس اگر اختلاف کرو تم کسی امر میں تو رد کرو اس کو اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اور اولی الامر کی طرف جو تم میں سے ہو۔

والعیاشی عن الباقر انہ تلا [ه]ذہ الآیۃ ھکذا فان خفتم

اور کافی میں اور عیاشی میں امام باقر سے روایت ہے کہ انہوں نے پڑھا اس آیت یا

تنازعا فی امر فردوہ الی اللہ والی الرسول والی اولی الامر منکم	اس طرح (فان خفتم تنازعا فی امر فردوہ الی اللہ والی الرسول والی اولی الامر منکم یعنی اگر خوف کرو تم تنازع کا کسی امر میں تو رجوع کرو تم اللہ کی طرف اور رسول کی طرف اور حاکم کی طرف جو تم میں سے ہو۔
قال کذا انزلت وکیف یامرھم اللہ عزوجل بطاعۃ ولاۃ الامر ویرخص فی منازعتھم۔	امام نے فرمایا کہ یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے اور کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اللہ عزوجل مومنین کو صاحبان حکومت کی اطاعت کا حکم کرے اور ان کے ساتھ جھگڑا کرنے کی بھی اجازت دے۔

امام باقر علیہ السلام نے اس قول میں یہ اشارہ کر دیا کہ اگر اس آیت میں الی اولی الامر کا لفظ نہ بڑھایا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اولی الامر کے ساتھ تنازع کی صورت میں بھی اللہ اور رسول کے قول سے فیصلہ کرنا چاہیے۔ پس اس معنی کو بدلنے کے لیے (الی اولی الامر) کا لفظ بڑھانا ضرور رہی ورنہ آیت کے معنی خلاف ما انزل اللہ ہو جائیں گے۔ پس یہاں سے ثابت ہو گیا کہ اسی مجبوری سے حضرات شیعہ نے قرآن میں تحریف کر کے لفظ مذکورہ کے بڑھانے کا قصد کیا۔

---

[1] قرآن موجودہ میں فان تنازعتم فی شئ ہے مگر امام باقر علیہ السلام نے (فان خفتم تنازعاً فی شئ) پڑھا یہ بھی تحریف ہے ۱۲

بیان مذکورۂ بالا سے بخوبی واضح ہو گیا کہ آیت (اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول واولی الامر منکم) میں لفظ اولی الامر سے جو معنی حاکم ہو وہ حاکم مراد ہے جس کو رسول کی طرف سے کسی لشکر یا کسی شہر کی حکومت ملی ہو اس کی اطاعت اس کے ماتحتوں پر اس وقت تک واجب ہوتی تھی جب تک اس کا حکم اللہ اور رسول کے قول کے مخالف نہ ہو اور جب اس کے حکم کو اس کے ماتحت مخالف حق سمجھیں تو اللہ اور رسول کے قول سے حق کا فیصلہ کرنے کا حکم تھا اور جب اولی الامر کا لفظ بمعنی حاکم ہے تو ان احکام کو بھی شامل ہے جن کو بعد رسول کے حکومت ملی۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کبھی کبھی اُن حکومتوں پر خلیفہ اول رضؓ اور خلیفہ ثانی رضؓ بھی مقرر ہوئے ہیں بلکہ روایات شیعہ سے ثابت ہے کہ ان کا تقرر ان حکومت پر اللہ کے حکم سے ہوا تھا۔ چنانچہ حیات القلوب میں علی بن ابراہیم اور شیخ مفید اور شیخ طوسی اور شیخ طبرسی اور قطب راوندی کی روایت سے غزوۂ ذات السلاسل کے بیان میں حضرت صادق اور ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ میدان یابس میں بارہ ہزار سوار کافروں کے جمع ہوئے تھے اور انھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور علی رضؓ کو قتل کر دیں۔ اس کے بعد حیات القلوب[1] کی عبارت یہ ہے:-

پس جبرئیل نازل شدہ وقصۂ ایشاں را برائے آں حضرت نقل کردہ واز جانب خدا مامور گردانید آنحضرت را کہ ابوبکر را	پس جبرئیل نازل ہوئے اور ان کا قصہ حضرت سے بیان کیا اور خدا کی طرف سے حضرتؐ کو مامور کیا کہ ابوبکرؓ کو چار ہزار سوار

---

[1] حیات القلوب جلد دوم ص۴۲۵ ۱۲

باچہار ہزار سوار مہاجران وانصار بہ جنگ ایشاں بفرستد۔ — مہاجرین اور انصار کے ساتھ اُن سے لڑنے کے لیے بھیجیں۔

اس کے بعد یہ قصہ مذکور ہے کہ ابوبکرؓ اُن سے ڈر کر بغیر جنگ کے واپس آئے پھر اللہ کا حکم آیا کہ عمرؓ کو بھیجو چنانچہ حیات القلوب میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا :-

واینک جبرئیل مرا از جانب خدا امر می کند کہ عمر را بجائے او بفرستم۔ — اور اب جبرئیل مجھ کو خدا کی طرف سے یہ حکم کرتا ہے کہ ابوبکرؓ کی جگہ عمرؓ کو بھیجوں۔

پھر عمرؓ کی نسبت بھی یہی مذکور ہے کہ وہ ڈر گئے اور بغیر جنگ کے واپس آئے۔

اہل سنت کے نزدیک یہ بیان کہ یہ دونوں بغیر جنگ کے واپس آگئے محض افترا ہے مگر اس روایت سے دو باتیں ثابت ہوگئیں۔ ایک یہ کہ یہ دونوں بنص الٰہی اس جہاد میں امام متقرر ہوئے تھے پس امام منصوص تھے دوسرے یہ کہ امام منصوص کے لیے معصوم ہونا ضرور نہیں۔

(۱) منصوص کے لیے معصوم ہونا ضروری نہیں۔

جو معنی اس آیت کے ہم نے بیان کیے یہی مضمون جناب امیر علیہ السلام کے کلام سے بھی ظاہر ہے چنانچہ نہج البلاغت میں جناب امیر کا کلام اس وقت جب کہ بعد شہادت عثمانؓ کے لوگوں نے اُن سے بیعت کرنے کی خواہش کی یہ مذکور ہے :-

ومن کلام لہ لما ارید — اور جناب امیر کے کلام سے ہے جب کہ

ﻟﻪ منقول از شرح میسم مطبوعۂ طہران جلد ۱۶ - ۱۲

[علی] البیعۃ بعد قتل عثمان — ارادہ کیا گیا بیعت کا بعد قتل عثمانؓ کے

[د]عونی والتمسوا غیری — "مجھے چھوڑ دو اور میرے سوا کسی دوسرے کو ڈھونڈھ لو"

اس سے ظاہر ہوگیا کہ جناب امیر اپنے آپ کو اولوا الامر منصوص نہیں سمجھتے تھے ورنہ یہ نہ کہتے کہ مجھے چھوڑ دو اور نیز جناب امیر خلافت کو مشورۂ مومنین پر موقوف سمجھتے تھے نہ نص پر جبھی تو فرمایا کہ کسی اور کو ڈھونڈھ لو اس کلام کے آخر کا فقرہ یہ ہے :-

ان ترکتمونی فانا کاحدکم ولعلی اسمعکم واطوعکم لمن ولیتموہ امرکم وانا لکم وزیرا خیر منی لکم امیرا — اگر تم مجھ کو چھوڑ دوگے تو میں بھی مثل ایک کے تم میں سے ہوں گا اور شاید تم سے زیادہ حکم ماننے والا اور زیادہ اطاعت کرنے والا اس کا ہوں گا جس کو تم اپنا اولی الامر بناؤگے اور میں تمہارے لیے وزیر بن کر بہتر ہوں اُس حالت سے کہ تمہارا امیر بنوں۔

یعنی اگر تم مجھ کو چھوڑ کر کسی اور کو اولی الامر بناؤگے تو جس طرح تم میں سے ہر ایک اُس کی اطاعت کرے گا اسی طرح میں بھی اس کی اطاعت کروں گا بلکہ میں تم سے زیادہ اس کی اطاعت کروں گا۔

اس سے بھی ظاہر ہوگیا کہ جناب امیر اپنے آپ کو اولی الامر منصوص نہیں جانتے تھے بلکہ یہ کہتے تھے کہ تم جس کو اولوا الامر بناؤگے میں بھی تمہاری طرح اس کی اطاعت کروں گا بلکہ شاید تم سے زیادہ اطاعت کروں گا۔

فاضل میثم نے اس کی شرح میں لکھا ہے :۔

ای کنت کاحدکم فی الطاعۃ	یعنی ہوں گا میں بھی مثل ایک کے تم میں سے
لامیرکم بل لعلی اکون	اطاعت میں تمہارے امیر کی بلکہ شاید
اطوعکم لہ ای لقوۃ علمہ	ہوں میں تم سے زیادہ اطاعت کرنے والا
بوجوب طاعۃ الامام۔	اس کا یعنی واسطے زیادتی علم جناب امیر کے
	ساتھ وجوب اطاعت امام کے۔

مطلب یہ ہے کہ جناب امیر سب سے زیادہ اس مسئلہ کو جانتے تھے کہ امام کی اطاعت واجب ہے۔ اسی لیے انہوں نے فرمایا کہ تم جس کو امام مقرر کرلوگے میں تم سے زیادہ اس کی اطاعت کروں گا اور اس کی فرماں برداری جو مجھ پر واجب ہوگی تم سے زیادہ ادا کروں گا۔

جناب امیر کے اس بیان سے بخوبی واضح ہوگیا کہ امام اولوالامر کا مقرر کرنا مسلمانوں کی رائے پر موقوف تھا چنانچہ جناب امیر یہ فرماتے تھے کہ میرے سوا کسی اور کو امام اولوالامر مقرر کرلو تو میں تم سے زیادہ اُس کی اطاعت کروں گا اس لیے کہ اطاعت امام کا حکم تم سے زیادہ مجھ کو معلوم ہے اور آیہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم کو میں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔

یہاں ایک اور نکتہ بھی سمجھنے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ جب اولوالامر کی اطاعت واجب تھی تو جناب امیر کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ ضرور میں تم سے زیادہ اُس کی اطاعت کروں گا۔ مگر انہوں نے یہ نہ کہا بلکہ یوں کہا کہ شاید میں تم سے زیادہ اُس کی اطاعت کروں۔ اس کا سبب شارح میثم نے یہ لکھا ہے۔

وانما قال لعلی لانہ علی	اور جناب امیر نے (شاید) اس لیے کہا کہ
تقدیر ان یولوا احدا	اگر ایسی صورت ہوتی کہ وہ ایسے شخص کو اولوا
یخالف امر اللہ لایکون	الامر مقرر کردیتے جو اللہ کے حکم کی مخالفت
اطوعھم بل اعصاھم	کرتا تو اُس وقت جناب امیر سب سے زیادہ
	اطاعت کرنے والے نہ بنتے بلکہ سب سے
	زیادہ مخالفت کرنے والے بنتے۔

یعنی جناب امیر اسی وقت تک اولی الامر کی اطاعت کرتے جب تک کہ اولوالامر کا حکم اللہ کے حکم کے مخالف نہ ہوتا اور جب اولوالامر کا حکم اللہ کے حکم کے مخالف ہوتا تو اُس وقت جناب امیر سب سے زیادہ اس کی مخالفت کرتے اور اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرتے۔ یہاں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جناب امیر بھی آیت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم کا مطلب یہی سمجھتے تھے کہ اولی الامر کی اطاعت کا حکم اسی وقت تک ہے جب تک اس کا حکم مخالف حکم الٰہی نہ ہو اور اگر اولی الامر کے ساتھ اختلاف ہو تو اللہ اور رسول کے قول کی طرف رجوع کرنے کا حکم ہے۔

آخر میں جناب امیر نے صاف صاف فرمادیا کہ میرے امیر بننے سے میرا وزیر بننا بہتر ہے۔ پس اگر وہ خود ہی اولوالامر منصوص ہوتے تو امیر نہ بننے کی حالت کو بہتر کیوں کہتے اس لیے کہ حکم الٰہی کی مخالفت ہرگز بہتر نہیں ہوتی اب اگر حضرت علی علیہ السلام کو امیر نہ بنانا ایسا جرم تھا جس کی وجہ سے شیعہ تمام صحابہؓ کو مرتد کہتے ہیں (معاذ اللہ منہا) تو اس جرم میں خود حضرت علیؓ بھی شریک تھے

اس لیے کہ وہ تو خود کہتے تھے کہ مجھے امیر بنانا بہتر نہیں کسی اور کو امیر بنالو۔ یہاں سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ خلفائے ثلاثہ اور تمام صحابہ نے وہی کیا جو جناب امیر کی رائے تھی یعنی اُن کو امیر نہ بنایا بلکہ ایسا وزیر بنایا کہ جناب امیر کو یہ اختیار تھا کہ خلفاکے جس حکم کو چاہتے تھے منسوخ کر دیتے تھے۔ خلفاکے قیدیوں کو اپنے حکم سے چھوڑ دیتے تھے۔ خلفانے اپنے اہل کاروں کو یہ حکم دیدیا تھا کہ حضرت علیؓ جو حکم دیں فوراً اس کی تعمیل کرو ان کا حکم ہرگز رد مت کرو۔ ہم اس موقع پر کافی کی ایک روایت کا مضمون نقل کرتے ہیں جس سے یہ تمام مطالب بخوبی ثابت ہوتے ہیں۔

فروع کافی کی جلد ثالث میں کتاب القضایا والاحکام کے باب النوادر ص ۲۳۱ میں ایک طویل روایت منقول ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ مدینہ میں ایک لڑکا کہہ رہا تھا کہ اے اللہ مجھ میں اور میری ماں میں انصاف کر دے۔ عمر بن خطابؓ نے اُس سے پوچھا کہ اے لڑکے اپنی ماں کے واسطے ایسی دعا کیوں کرتا ہے؟ اُس لڑکے نے کہا کہ اے امیر المومنین میری ماں نے نو مہینے مجھے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو برس مجھ کو دودھ پلایا جب مجھے کچھ تمیز ہوئی تو مجھے نکال دیا۔ اب وہ کہتی ہے کہ میں تجھے نہیں پہچانتی کہ تو کون ہے۔ عمرؓ نے اس کی ماں کو بلایا اُس کے ساتھ اس کے چار بھائی اور چالیس آدمی قرابت والے آئے اُن سب نے کہا کہ یہ لڑکا بڑا ظالم ہے اس عورت پر تہمت لگاتا ہے اور رسوا کرنا چاہتا ہے۔ درحقیقت یہ عورت اب تک کنواری ہے اس کا نکاح نہیں ہوا پھر بیٹا کیسے پیدا ہوتا۔ ماں نے بھی یہی کہا کہ میں نے اب تک کسی سے نکاح کیا۔ میں خاندان

قریش کی باعصمت عورت ہوں یہ لڑکا مجھ کو ناحق بدنام کرتا ہے۔ میں نہیں جانتی کہ یہ کون ہے۔ مگر لڑکے نے وہی کہا جو پہلے کہتا تھا۔ عمرؓ نے اُن چالیس آدمیوں کی گواہی اُس عورت کے بیان کی تصدیق میں سُن کر یہ حکم دیا کہ اس لڑکے کو قید خانہ میں لے جاؤ ہم ان گواہوں کے حال کی تحقیقات کریں گے اگر یہ گواہ عادل ثابت ہوئے تو اس لڑکے پر مفتری کی حد جاری کریں گے۔ چنانچہ اس لڑکے کو قید خانہ کی طرف لے چلے۔ راستہ میں حضرت علیؓ مل گئے۔ اس لڑکے نے ان کو دیکھ کر یہ فریاد کی کہ اے ابن عم رسولؐ میں ایک مظلوم لڑکا ہوں پھر سارا قصہ بیان کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ اس لڑکے کو عمرؓ کے پاس لے چلو۔ اس موقع پر اصل عبارت کافی کی یہ ہے :-

فقال علی علیہ السلام ردوہ الی عمرؓ فلما ردوہ قال لھم عمرؓ امرت بہ الی السجن فرددتموہ قالوا یا امیر المومنین امرنا علی بن ابی طالب ان نردہ الیک وسمعناک انت تقول لا تعصوا لعلی امرا فبینا ھم کذلک اذ اقبل فقال علیؑ بام الغلام فاتوا بھا

تو فرمایا علی علیہ السلام نے واپس لے چلو اس کو عمرؓ کی طرف۔ جب اس کو واپس لائے تو عمرؓ نے ان لوگوں سے کہا کہ میں نے اس کو قید خانہ کا حکم کیا تھا اور تم واپس لائے انھوں نے کہا کہ یا امیر المومنین ہم کو علی بن ابی طالب نے یہ حکم کیا ہے کہ ہم اس کو تیرے پاس واپس لا دیں۔ اور ہم نے تجھ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ مت نافرمانی کرنا علی کی کسی امر میں۔ وہ انھیں باتوں میں تھے کہ علی علیہ السلام آگئے اور انھوں نے

فقال علیؑ ما تقول فاعادت الکلام فقال علیؑ لعمرؓ اتاذن لی ان اقضی بینهم۔ فقال عمرؓ سبحان اللہ و کیف لا وقد سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و اٰلہ یقول اعلمکم علی بن ابی طالب۔

کہا کہ لڑکے کی ماں کو بلاؤ۔ تو اس کو لے آئے۔ پھر علی نے پوچھا کہ تو کیا کہتی ہے؟ تو اُس نے جو پہلے سے کہتی تھی وہی کہا پس علی علیہ السلام نے عمرؓ سے کہا کہ کیا تم اجازت دیتے ہو کہ میں ان لوگوں میں فیصلہ کر دوں۔ تو عمرؓ نے کہا سبحان اللہ اور یہ کیوں نہیں اور بے شک میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ وہ یوں کہتے تھے کہ زیادہ علم والا تم میں علی بن ابی طالب ہے۔

اس کے بعد یہ قصہ لکھا ہے کہ جناب امیر نے اس عورت سے پوچھا کہ تیرا کوئی ولی بھی ہے؟ اُس عورت نے کہا کہ میرے یہ چاروں بھائی میرے ولی ہیں۔ تب جناب امیر نے اُس عورت کے بھائیوں سے مخاطب ہو کر کہا:-

امری فیکم وفی اختکم جائز قالوا نعم یا بن عم رسول اللہ امرك فینا و فی اختنا جائز۔

میرا حکم جو تمہارے حق میں ہو یا تمہاری بہن کے حق میں ہو جائز ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں اے بھائی رسول اللہ کے تیرا حکم جو ہمارے اور ہماری بہن کے باب میں ہو جائز ہوگا۔

جب جناب امیر نے اس چالاکی کے ساتھ اُن سے اجازت لے لی تو سب کے سامنے اس لڑکے کا اس عورت کے ساتھ فوراً نکاح[1] کر دیا اور چار سو درہم مہر کے بھی اپنے گھر سے منگا کر اس لڑکے کو دیدیے اور یہ فرمایا کہ یہ

[1] ذرا حضرت علیؓ کے اس فیصلہ پر بھی غور فرمایئے کہ جب وہ لڑکا اُس عورت کو ماں کہہ رہا ہے تو پھر نکاح کیوں کر جائز تھا اگر عورت بھی اپنے فسق کی وجہ سے اس نکاح پر راضی ہو جاتی تو اس نکاح کی کیا حالت ہوتی اور اس کا وبال کس پر ہوتا؟ حالانکہ شیعوں کو یہ امر مسلم ہے کہ احکام شریعت ظاہر حال پر مبنی ہوتے ہیں نہ علم باطن پر (دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول مطبوعہ لکھنؤ) جس چالاکی سے نکاح کی اجازت لی ہے وہ بھی غور کے قابل ہے۔ کیا اس عورت یا اُس کے بھائیوں کو یہ خبر تھی کہ حضرت علیؓ جو اس معاملہ میں اپنے حاکم بننے پر ہم کو راضی کرتے ہیں اس سے اُن کا یہ مطلب ہے کہ اس عورت کے نکاح کی اجازت چاہتے ہیں اور اس لڑکے سے اس کا نکاح کر دیں گے۔ بھلا ایسی چالاکی جو بالکل دغا اور فریب کی صورت ہے کیوں کر جائز ہوگی؟ اب یہ فرمایئے کہ جو کچھ نتیجہ اس فیصلہ کا ہوا اُس سے یہ کیوں کر ثابت ہوا کہ یہ فیصلہ سچا تھا اور وہ عورت فی الواقع اُس کی ماں تھی اور لڑکے کا بیان صحیح تھا شاید اس عورت نے ماں ہونے کا اقرار اس وجہ سے کر لیا ہو کہ حضرت علیؓ نے اس لڑکے کے نکاح کی بلا میں اُس کو زبردستی پھانس دیا تھا اور وہ عورت اس نکاح سے راضی نہ ہو۔ اس لیے یہ حیلہ اس نے اس بلا سے نجات پانے کا تجویز کیا ہو۔ تعجب ہے کہ حضرت علیؓ نے یہ فرما دیا کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فیصلہ سکھایا ہے اور اللہ اس سے راضی ہے حالانکہ قاضی کو اس طرح کا فیصلہ کرنا کسی طرح شرعاً جائز نہیں اس لیے کہ ظاہر شریعت کے طور پر یہ ہرگز ثابت نہیں ہوا کہ وہ عورت جو اول ماں ہونے سے انکار کرتی تھی اور نکاح کی (بقیہ صفحہ ۳۳۲ پر ملاحظہ ہو)

زر پھر اپنی بی بی کی گود میں ڈال دے اور میرے پاس اُس وقت آئیو جب تو اس عورت سے ہم بستری کرلے اور غسل کا اثر تیرے بدن پر ظاہر ہو چنانچہ اُس لڑکے نے اسی وقت وہ درہم اُس عورت کی گود میں ڈال دیے اور اُس سے کہا کہ اُٹھ۔ تب مجبور ہو کر اُس عورت نے اقرار کیا کہ بے شک میں اس کی ماں ہوں اور یہ میرا بیٹا ہے میرا نکاح اس کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اُس وقت عمرؓ نے کہا کہ افسوس ہے عمرؓ پر اگر علیؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

(بقیہ صفحہ ۳۳۱) خبر سُن کر ماں ہونے کا اقرار کر لیا اس سے وہ فی الواقع اُس لڑکے کی ماں بن گئی اور چالیس آدمیوں نے جو گواہی دی تھی کہ اس عورت کا آج تک کسی سے نکاح نہیں ہوا اور یہ کنواری ہے وہ گواہی جھوٹی ہو گئی۔ عورت بے چاری نے نکاح کی مجبوری سے اپنے قول کی تکذیب کی اور ماں ہونے کا اقرار کیا لڑکے پر کوئی مجبوری نہ تھی اور وہ عاقل و بالغ ہونے کی وجہ سے ماں کا محتاج نہ تھا پھر جس کو ماں بتاتا تھا اُس سے نکاح اور ہم بستری پر راضی ہو جانا اس کے فسق کی دلیل ہے اور یہ قرینہ بظن غالب یہی ظاہر کرتا ہے کہ لڑکا جھوٹا تھا۔ پھر مزید براں یہ کہ عورت کے چار بھائی اور ان کے سوا چالیس آدمی اُس لڑکے کے جھوٹے ہونے کی شہادت دیتے تھے۔ اس روایت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ خلفائے ثلاثہ کے زمانہ میں حضرت علیؓ کو عسرت اور افلاس کی تکلیف نہ تھی بلکہ وہ ایسے دولتمند تھے کہ غیر کے جھگڑے میں چار سو درہم اپنے پاس سے خرچ کر دیے اگر اس قصہ کو سچا مانا جائے اور یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ جو فیصلہ حضرت علیؓ نے کیا تھا وہی ٹھیک تھا تو یہ بھی ثابت ہو گیا کہ عمرؓ کے مزاج میں کمال حقانیت تھی باوجود خلیفہ وقت ہونے کے جب اپنے حکم کی غلطی معلوم کر لی تو اپنے قصور کا اعتراف کر لیا بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ (بقیہ صفحہ ۳۳۳ پر ملاحظہ)

یہاں سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ خلفائے ثلاثہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں جناب امیر کو وہ اختیارات دے رکھے تھے جو وزارت کے منصب سے بھی بہت کچھ بڑھ کر تھے۔ بلکہ خلفائے ثلثہ کی خلافت برائے نام تھی درحقیقت خلافت علیؓ کی تھی۔

اسی قسم کی بہت سی روایتیں کتب شیعہ میں ایسی ملتی ہیں جن سے

(بقیہ صفحہ ۳۳۲) عمر پر افسوس ہے اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ حالانکہ انہوں نے ابھی حکم ناطق نہیں دیا تھا اور گواہوں کی عدالت جانچنا باقی تھی۔ با ایں ہمہ انہوں نے حضرت علیؓ کے فیصلہ کی اتنی عظمت کی کہ اپنے فیصلہ کو اپنے لیے باعثِ ہلاکت سمجھا اگر ان میں للّٰہیت نہ ہوتی تو اپنے غلط فیصلہ پر اتنا افسوس ان کو کیوں ہوتا وہ تو خلیفۂ وقت تھے حکومت ان کے اختیار میں تھی۔ حضرت علی اگر ذرا ان کی تیوری بدلی دیکھتے تو پابند تقیہ ہو کر یہی کہہ دیتے کہ عمر نے جو فیصلہ کیا وہی صحیح تھا۔ چنانچہ اس کا تجربہ بارہا ہو چکا تھا اور عمرؓ کے مقابلہ میں بڑے بڑے حوادثِ عظیمہ میں جناب امیر نے تقیہ کیا تھا۔ یہ وہی علی تو ہیں جن کی خلافت عمر نے چھین لی۔ گھر جلایا، جناب سیدہ علیہا السلام کو ایسا صدمہ پہنچایا جو باعث شہادت و معصوم ہوا حضرت علی کو زبردستی گھر سے نکال لائے۔ ان سب سے بڑھ کر ام کلثوم کا غصب قیامت کا نمونہ تھا (معاذ اللہ من ہذہ المفتریات) آج انہیں علیؓ نے عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں کیسے زور کے ساتھ حکومت میں دخل دیا جو عمرؓ کی بہت بڑی توہین کا باعث تھا اور عمرؓ نے باوجود خلیفۂ وقت ہونے کے اپنی توہین کی کچھ بھی پروا نہ کی اور اپنے قصور کا کس مبالغہ سے اقرار کیا۔ یہ عجائبات مذہب شیعہ کے ایسے ہیں کہ ان کا تسلیم کرنا حضرات شیعہ ہی کا کام ہے ۱۲

ثابت ہوتا ہے کہ جناب امیر اکثر خلفا کی حکومت میں دخل دیا کرتے تھے اور خلفا بڑی خوشی سے اس کو قبول کرتے تھے سلطنت کے امور عظیمہ میں بھی جناب امیر سے مشورہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب قیصر روم نے بھاری فوج کے ساتھ مسلمانوں کے مقابلہ میں خروج کیا اس وقت ابو عبیدہؓ سردار لشکر اسلام نے عمرؓ سے یہ درخواست کی کہ قیصر کے مقابلے کے لیے وہ بذاتِ خود میدانِ جنگ میں آویں عمرؓ نے اس معاملہ میں جناب امیر سے مشورہ کیا اور جو رائے انھوں نے دی اُسی پر عمل کیا۔

یہ قصہ نہج البلاغۃ[1] میں مذکور ہے:۔

ومن کلام له علیه السلام وقد شاوره عمر فی الخروج الی غزوة الروم بنفسه وقد توکل الله لاهل هذا الدین باعزاز الحوزة وستر العورة والذی نصرهم وهم قلیل لا ینتصرون ومنعهم وهم قلیل لا یمتنعون حی لا یموت۔

اور کلام ہے جناب امیر کا جب کہ مشورہ کیا تھا اُن سے عمرؓ نے غزوۂ روم پر بذاتِ خود جانے میں۔ اور بے شک ضامن ہوا ہے اللہ اس دین والوں کے لیے ان کی جماعت کو غالب کرنے اور عیب چھپانے کا۔ اور اللہ وہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں کی اُس حالت میں مدد کی تھی جب وہ تھوڑے تھے اور کوئی ان کی مدد نہیں کرتا تھا اور ان کی حفاظت کی جب وہ تھوڑے تھے کوئی ان کی حفاظت نہیں کرتا

---

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ورق چہارم جزو ۱۹۔ ۱۲

وہ اللہ زندہ ہے مرتا نہیں۔

انك متی تسیر الی اهل هذا العدو بنفسك فتلقهم فتنكب لا تكن للمسلمین كانفة دون اقصی بلادهم فلیس بعدك مرجع یرجعون الیه فابعث الیهم رجلا مجربا واحفز معه اهل البلاد والنصیحة فان اظهر الله فذاك ما تحب وان تكن الاخری كنت ردءً للناس ومثابة للمسلمین۔

بے شک جب تو جاوے گا ان دشمنوں کی طرف اور اُن سے مقابل ہو گا پھر صدمہ پہنچ جاوے گا تجھ کو تو نہ ہو گی مسلمانوں کے لیے کوئی پناہ ان کے ملک کے آخر کنارہ تک پس نہیں ہے بعد تیرے کوئی مرجع جس کی طرف مسلمان رجوع کریں گے اب بھیج دے دشمنوں کی طرف کسی شخص جنگ آزمودہ کو اور اُس کے ساتھ کر دے تجربہ کار اور مخلصین کو پھر اگر اللہ فتح دے تو یہ وہ بات ہے جس کو تو چاہتا ہے اور اگر ہوئی دوسری صورت پس تو ہو گا مدد دینے والا آدمیوں کو اور پناہ دینے والا مسلمانوں کو۔

اس قول میں جناب امیر علیہ السلام نے اول یہ ظاہر فرما دیا کہ اس دین کی حفاظت کا اللہ ضامن ہے۔ یہ قول جناب امیر کا اُس دین کی نسبت ہے جو عمرؓ کا اور تمام صحابہ کا دین تھا اور جس دین کے واسطے عمرؓ اور تمام صحابہ جہاد کرتے تھے۔ پس ثابت ہو گیا کہ عمرؓ اور تمام صحابہ دین حق پر تھے اور شیعوں کا یہ قول غلط ہو گیا کہ تمام صحابہ مرتد ہو گئے تھے (معاذ اللہ منہا)

یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ان کا جہاد نفسانی غرضوں اور ناجائز خواہشوں کے لیے نہ تھا بلکہ دین حق کے غالب کرنے کے لیے تھا۔ جبھی تو جناب امیر نے یہ فرمایا کہ اس دین کا اللہ ضامن ہے اور اگر ان کا جہاد دنیا کے لیے ہوتا تو جناب امیر اس جہاد کی نسبت دین کا ذکر کیوں کرتے اور اس کے واسطے اللہ کی حفاظت کی ذمہ داری کیوں ثابت کرتے پھر اسی دین کی نسبت جس کے لیے عمرؓ اور تمام صحابہ جہاد کرتے تھے جناب امیر نے یہ فرمایا کہ یہ وہ دین ہے جس کی اللہ نے اس وقت مدد کی تھی جب یہ دین نہایت ضعیف تھا کوئی اس کا مددگار نہ تھا وہ اللہ زندہ ہے مرتا نہیں۔ یعنی جس طرح اللہ نے اس وقت اس دین کی مدد کی تھی اب بھی اسی طرح مدد کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جناب امیر علیہ السلام نے عمرؓ سے یہ فرمایا کہ تمہارا دین وہی ہے جو رسولؐ کا دین تھا اور اللہ تمہاری اسی طرح مدد کرے گا جیسے رسولؐ کی مدد کی تھی اور تم اسی طرح دین حق کی حمایت کرتے ہو جیسے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے تھے۔

اس موقع پر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ جناب امیر نے یہ فرمایا کہ اللہ اس دین کو غالب کرنے کا ضامن ہے۔ یہ مضمون جناب امیر نے کہاں سے ثابت کیا یہ وعدہ آیت استخلاف میں مذکور ہے جو سورۂ نور میں ہے اور وہ یہ ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

وعدہ کیا ہے اللہ نے اُن سے جو تم میں سے ایمان لائے یہ کہ خلیفہ کرے گا اُن کو

فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○ (سورۂ نور)

زمین میں جیسے کہ خلیفہ کیا تھا ان کو جو ان سے پہلے تھے اور البتہ قوی کرے گا ان کے لیے اس دین کو جو اللہ نے ان کے لیے پسند کیا ہے۔ اور البتہ بدل دے گا ان کو ان کے خوف کے بعد امن سے میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور جو کفر کرے گا اس کے بعد پس وہ لوگ وہی ہیں جو فاسق ہیں۔

اس آیت میں خطاب اُن لوگوں سے ہے جو اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے اور اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے دولتِ اسلام سے مشرف ہو کر اعمال صالحہ کر چکے تھے اللہ اُن سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اُن کو زمین میں خلیفہ کرے گا جیسے اُن لوگوں کو خلیفہ کیا تھا جو پہلے گزر چکے یعنی جیسے قوم جبارین سے ملک نکال کر اللہ نے بنی اسرائیل کو دیا تھا اسی طرح کافروں سے ملک نکال کر اُن صحابہ کو دے گا جنھوں نے پیغمبرؐ پر ایمان لا کر نیک عمل کیے اور اللہ ان کا دین جو اللہ کو پسند ہے ان کے لیے قوی کر دے گا یعنی ان کے دین کو اور دینوں پر غلبہ دے گا اور پہلے اُن کو خوف تھا اس لیے کہ مسلمان تھوڑے تھے اور کافروں کو غلبہ تھا اس حالت کے بعد اللہ ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا پھر اللہ ان خلفا کی مدح یوں کرتا ہے کہ وہ میری

عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور اس خلافت کے ملنے اور دین خلفا کے غالب ہونے کے بعد جو لوگ انکار کریں گے وہ فاسق[1] یعنی سرکش ہیں۔

یہ مضمون حدیث صحیح میں بھی وارد ہے جس سے نہایت وضاحت کے ساتھ اس آیت کی تفسیر ہوتی ہے۔ ملا باقر مجلسی حیات القلوب جلد دوم صفحہ ۲۵۵ میں لکھتے ہیں (و در حدیث صحیح از امام باقر علیہ السلام منقول است) اس کے بعد انھوں نے ایک طویل حدیث نقل کی ہے اُس میں بیان اس وقت کا ہے جب ابتدائے بعثت میں سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو دعوت اسلام کی تھی۔ یہاں ہم حیات القلوب کی عبارت بقدر ضرورت نقل کرتے ہیں:۔

حق تعالےٰ امر فرمود آنحضرت را باظہار دعوت خود پس حضرت بمسجد آمد و بر حجر اسمٰعیل ایستادہ بصدائے بلند ندا کرد کہ اے گروہ قریش وائے طوائف عرب شمارا می خوانم بسوئے شہادت بوحدانیت خدا وایمان آوردن بہ پیغمبری من وامر می کنم شمارا کہ ترک کنید

حق تعالیٰ نے آنحضرتؐ کو حکم فرمایا کہ اپنا دعوے ظاہر کرو تو حضرت مسجد یعنی خانہ کعبہ میں آئے اور حجر اسمٰعیل پر کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے ندا کی کہ اے گروہ قریش اور اے اقوام عرب میں تم کو بلاتا ہوں خدا کی وحدانیت کی شہادت اور میری پیغمبری پر ایمان لانے کی طرف اور حکم کرتا ہوں تم

[1] اس سے مراد شیعہ اور خوارج ہیں اس لیے کہ مسلمانوں میں فقط یہی دونوں فریق خلفاء کے فضائل اور مناقب کے منکر ہیں ۱۲

بت پرستی را و اجابت نمائید مرا در آنچہ شمارا بآں می خوانم تا بادشاہان عرب گردید و گروہ عجم شمارا فرماں برداراں گردند و در بہشت بادشاہاں باشید

کو کہ تم کو کہ بت پرستی کو چھوڑ دو اور میرا قول قبول کرو اُس امر میں جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں تاکہ تم عرب کے بادشاہ ہو جاؤ اور اہل عجم تمھارے فرماں بردار ہو جائیں اور تم بہشت میں بادشاہ بنو۔

جو مضمون آیت استخلاف میں ہے وہ سب اس حدیث میں بھی ہے اور یہی وعدہ ہے جو پیغمبرؐ نے اللہ کی طرف سے قریش کے سامنے پیش کیا۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ آیت استخلاف میں جو اللہ نے یہ فرمایا ہے کہ ہم ان کو زمین میں خلیفہ کریں گے اس سے مراد عرب اور عجم کی بادشاہت ہے اور یہ جو آیت میں مذکور ہے کہ اللہ کو خلفا کا دین پسند ہوگا اور وہ اللہ کی عبادت کریں گے کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کریں گے یہ مضمون حدیث میں یوں مذکور ہوا کہ تم بہشت میں بادشاہ بنوگے۔

اب اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ یہ وعدہ کب پورا ہوا اگر یہ کہو کہ یہ وعدہ رسول کے زمانے میں پورا ہو چکا تو اس کا جواب یہ ہے کہ کامل غلبۂ اسلام کا تو بعد رسول کے ہوا ہے۔ قطع نظر اس کے حدیث نے آیت کی تفسیر یوں کر دی کہ وعدہ عرب اور عجم کی بادشاہت کا تھا اور عجم کی بادشاہت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ملی ہے۔ مفسرین شیعہ بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی لکھتے ہیں کہ یہ وعدہ بعد رسولؐ کے پورا ہوا۔ تفسیر صافی میں لیستخلفنہم فی الارض کی تفسیر یوں کی ہے:۔

لیجعلنہم خلفاء بعد نبیکم — البتہ کرے گا ان کو خلیفہ بعد تمہارے نبی کے۔

ائمہ معصومین سے بھی یہی منقول ہے کہ یہ وعدہ بعد رسولؐ کے پورا ہوا چنانچہ تفسیر[1] صافی میں ہے :۔

وعن الباقر ولقد قال اللہ فی کتابہ لولاۃ الامر من بعد محمد خاصۃ وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم الی قولہ فاولئک ھم الفسقون ○	اور امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے اور بے شک کہا ہے اللہ نے اپنی کتاب میں خاص اُن والیان حکومت کے لیے جو بعد محمدؐ کے ہوئے وعد اللہ الذین الخ فاسقون تک۔

اور اگر یہ کہو کہ یہ وعدہ ابھی تک پورا نہیں ہوا بلکہ امام مہدی کے زمانہ میں پورا ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب کمال غلبۂ اسلام خلفا کے زمانہ میں ظاہر ہوچکا پھر اس وعدہ کے پورے ہونے سے انکار کیوں کیا جائے قطع نظر اس کے وعدہ ان لوگوں سے تھا جو اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھے اور اس سے پہلے ایمان قبول کرکے عمل صالح کرچکے تھے پس اگر امام مہدی کے وقت میں غلبۂ اسلام ہوا تو یہ وعدہ پورا نہ ہوا اس لیے کہ جن لوگوں سے وعدہ ہے اُنھیں کے حق میں پورا ہونا چاہیے۔ رسولؐ نے تو ان قریش سے خطاب کیا تھا جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے

[1] مطبوعہ طہران ص۳۲۸ تفسیر صافی ۱۲

اور یہ فرمایا تھا کہ تم ایمان لاؤ گے تو عرب اور عجم کے بادشاہ بنو گے، کیا اس کے معنی وہ قریش یہ سمجھے ہوں گے کہ جس بادشاہت کا ہم سے وعدہ کیا جاتا ہے ہم کو نہ ملے گی بلکہ ہمارے مرجانے سے ہزارہا برس کے بعد جب دنیا آخر ہوکر قیامت آنے والی ہوگی اُس وقت کے لوگوں کو ملے گی۔ بھلا ایسی بادشاہت کا وعدہ ان کو ایمان لانے کی کیا ترغیب دیتا جس کا فائدہ ان کے حق میں کچھ بھی ظاہر نہ ہوتا اگر اس وعدہ کے یہی معنی تھے تو جن سے خطاب کیا گیا تھا اُن سے فقط جنت کا وعدہ کرنا چاہیے تھا بادشاہت کا ذکر ہی فضول تھا۔

یہ وعدہ اللہ نے مومنین صالحین سے کیا تھا۔ اب فرمائیے کہ رسولؐ کے وقت سے امام مہدی کے زمانہ تک کسی وقت میں مومنین صالحین دنیا میں موجود ہوئے یا نہیں۔ تو یہ کہنا پڑے گا کہ حضرت علیؓ اور ان کے مخلصین اور باقی تمام ائمہ امام عسکری علیہ السلام تک اور ان کے اصحاب اور تمام مخلصین شیعہ مومنین صالحین نہ تھے اور اگر یہ کہو کہ اس وقت میں بھی مومنین صالحین دنیا میں موجود ہوئے تو پھر ممکن نہیں کہ ان کے حق میں اللہ کا وعدہ پورا نہ ہو۔ ان اللہ لا یخلف المیعاد۔

پس یقیناً ثابت ہوگیا کہ اللہ نے یہ وعدہ خلفا کے حق میں پورا کیا اور اس وعدہ کے بموجب اُنھیں کو خلیفہ بنایا اور عرب و عجم کی بادشاہت عطا کی اور اُنھیں کا دین اللہ کو پسند تھا اور انھیں کی یہ مدح کی کہ وہ اللہ کی عبادت کریں گے کسی کو شریک نہ کریں گے اور وہ بہشت میں بھی بادشاہت کریں گے۔

بڑی دلیل اس کی یہ ہے کہ جناب امیر نے بھی اس آیت کو خلفا
کے حق میں سمجھا جبھی تو عمرؓ سے یہ کہا کہ اس دین کا اللہ ضامن ہے تم اللہ پر
توکل کرو اور فتح کی امید رکھو اگر جناب امیر نے یہ مضمون اس آیت سے
نہیں ثابت کیا تو حضرات شیعہ فرمائیں کہ اور کہاں سے ثابت کیا۔ شارح
میثم نے بھی یہی لکھا ہے کہ جناب امیر نے جو عمرؓ سے کہا کہ اس دین کے غلبہ کا
اللہ ضامن ہے۔ یہ مضمون آیت استخلاف سے مستنبط ہے۔ چنانچہ اسی قول کی شرح
میں فاضل میثم نے یہ لکھا ہے :۔

نبه على وجوه التوكل على الله
والاستناد اليه في هذا
الامر وخلاصتها انه ضمن
اقامة هذا الدين واعزاز
حوزة اهله وكنى بالعورة
عن هتك الستر في النساء
ويحتمل ان يكون استعارة
لما يظهر عليهم من الذل
والقهر لو اصيبوا فضمن
سبحانه ستر ذلك بافاضة
النصر عليهم

جناب امیر علیہ السلام نے ایسی وجہیں
بیان کیں کہ اللہ پر توکل کرو اور اس
معاملہ میں اسی پر بھروسہ کرو۔ اور خلاصہ
جناب امیر کی تقریر کا یہ تھا کہ اللہ ذمہ
وار ہوا ہے اس دین کے قائم رکھنے کا
اور اہل اسلام کی جمعیت کو غالب کرنے
کا اور یہ جو جناب امیر نے فرمایا کہ اللہ
مسلمانوں کی ستر عورت کا ضامن ہے
اس میں ستر عورت سے ان کی مراد
یہ ہے کہ اللہ مسلمان عورتوں کی بے عزتی
نہ ہونے دے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے
کہ اس سے مراد وہ ذلت اور عاجزی ہے
جو شکست کی حالت میں مسلمانوں پر
ظاہر ہوتی تو ضامن ہو گیا ہے اللہ پاک
اس ذلت سے بچانے کا اس طور پر کہ ان
کو مدد پہونچائے گا۔

وهذا الحكم من قوله تعالى وعد
الله الذين امنوا منكم وعملوا
الصلحت ليستخلفنهم
في الارض كما استخلف
الذين من قبلهم وليمكنن
لهم دينهم الذي ارتضى
لهم وليبدلنهم من بعد
خوفهم امنا ؕ

اور یہ حکم اللہ کے اس قول سے ثابت
ہوا ہے وعد اللہ الذین امنوا
منکم وعملوا الصلحت
لیستخلفنهم فی الارض کما
استخلف الذین من قبلهم
ولیمکنن لهم دینهم الذی
ارتضی لهم ولیبدلنهم من
بعد خوفهم امنا ؕ

پس جب علمائے شیعہ شارحین نہج البلاغت بھی یہی لکھتے ہیں
کہ یہ قول جناب امیر کا آیت استخلاف سے ماخوذ ہے تو اب کوئی شبہ باقی نہ
رہا کہ جناب امیر علیہ السلام حضرت عمرؓ کی خلافت کو وہی خلافت سمجھتے تھے
جس کا وعدہ اللہ نے آیت استخلاف میں کیا ہے۔

عمرؓ نے جس طرح یہ مشورہ قیصر روم کے جہاد کے وقت جناب
امیر سے پوچھا تھا اسی طرح اہل فارس کے جہاد کے وقت بھی پوچھا تھا کہ
بذاتِ خود ان کے جہاد کے لیے جاویں یا نہ جاویں۔ اس کے جواب میں بھی

اس سے بھی زیادہ
یہی مضمون جناب امیر نے فرمایا اور آیت استخلاف کی طرف
وضاحت کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔
اس بیان کے بعد یہ نتیجہ خواہ مخواہ ثابت ہو جائے گا کہ جو مضمون
اللہ نے آیت استخلاف میں بیان فرمایا ہے وہ سب عمرؓ پر صادق آوے گا
یعنی وہ مومن صالح تھے اللہ نے اپنے وعدے کے بموجب ان کو خلافت
دی تھی اور رسول کے وعدے کے بموجب وہ عرب اور عجم کے بادشاہ ہوئے
اور اللہ کو ان کا دین پسند تھا اسی کو اللہ نے غالب کیا اور رسولؐ کے وعدہ
کے بموجب وہ بہشت میں بھی بادشاہت کریں گے۔
اب جناب امیر کے اس کلام پر بھی غور کیجیے جو اس تمہید کے بعد
ہے:—
جناب امیر علیہ السلام نے عمرؓ کو یہ رائے دی کہ اگر تم اہل روم کے
مقابلہ میں گئے اور وہاں تم کو صدمہ پہنچا تو پھر مسلمانوں کو اپنے ملک میں بھی
پناہ نہ ملے گی اور تمہارے بعد کوئی ایسا شخص ان کو نہ ملے گا جس کے پاس
پناہ لیں اس لیے تم خود نہ جاؤ کسی اور کو بھیج دو پس اگر تمہاری فتح ہوئی تو
ھو المراد اور اگر شکست ہوئی تو تم مسلمانوں کو پناہ دے کر سنبھال لو گے۔
اس بیان سے ظاہر ہو گیا کہ جناب امیر عمرؓ کو ایسا لائق اور افضل
خلیفہ جانتے تھے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ عمرؓ مسلمانوں کی بڑی پشت و پناہ ہیں
اس لیے ان کی جان کی حفاظت[1] بہت ضروری ہے۔ اگر جہاد میں مسلمانوں کو

[1] شیعوں کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بقیہ صفحہ ۳۴۵ پر)

شکست بھی ہوگی تو وہ مسلمانوں کو سنبھال لیں گے اور اگر عمرؓ نہ ہوں تو پھر کوئی

(بقیہ صفحہ ۳۴۴) کے ساتھ ہو کر اپنے ہاتھ سے جنگ نہیں کی اس کا جواب یہ ہے کہ جناب امیر
کی اس تقریر سے بہت اچھی طرح واضح ہو گیا کہ عمرؓ کو اللہ نے حسن تدبیر اور انتظام کی لیاقت
ایسی دی تھی کہ جنگ سے افضل ان کا کام انتظام اور تدبیر کا تھا۔ تلوار لے کر عموماً تمام صحابی
لڑ سکتے تھے مگر حُسنِ تدبیر کی لیاقت ہر ایک میں نہ تھی۔ ذرا انصاف سے دیکھو جناب امیر نے
کیسے اصرار کے ساتھ عمرؓ کو جنگ سے بچایا اور صاف فرما دیا کہ مسلمانوں کی حفاظت کرنے والا
تمہارے بعد کوئی نہ ہوگا۔ اسی طرح ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ اور تدبیر کا
کام ان سے لیا اور اس کام کے لیے زیادہ تر انھیں تینوں کو مختص کیا تھا۔ اکثر فوج کی سرداری
ان کے سپرد ہوتی تھی یعنی اوروں کو لڑنے کے لیے مقرر کرتے تھے ان کو لڑانے کے لیے یہی
حالت تینوں خلیفوں کی تھی۔ چنانچہ خلفاء ثلاثہ کی حسن تدبیر اور قوت انتظام کا نتیجہ ان کی
خلافت کے زمانہ میں اظہر من الشمس ہو گیا۔ شرق سے غرب تک دین اسلام انھیں کی بدولت
پھیلا جس کے تصور سے شیعوں کی نگاہیں خیرہ ہوتی ہیں۔ اُن کے مقابلہ میں جناب امیر
علیہ السلام کی تدبیر اور انتظام کی حالت دیکھ لیجیے جس کا نمونہ ان کی خلافت کے زمانہ
میں بہت اچھی طرح ظاہر ہو گیا۔ خلفا نے فارس اور شام اور روم وغیرہ بلاد کفار کو
فتح کر کے دار الاسلام بنایا جس کے آثار آج تک باقی ہیں اور جناب امیر کے زمانہ میں
ایسی حالت ہوئی کہ بنی بنائی سلطنت میں خلل پڑ گیا۔ خلفا نے کافروں سے مقابلہ کیا اور
جناب امیر نے اپنی ماں ام المومنین سے جنگ کی حالانکہ ان کے معصوم بیٹے حسنؑ نے
اس جنگ سے ان کو منع کیا تھا۔ میثم[2] نے شرح نہج البلاغت میں لکھا ہے (بقیہ صفحہ ۳۴۶ پر)

[2] ابن میثم مطبوعہ طہران ج ۸۔ ۱۲

مسلمانوں کے لیے پناہ دینے والا نہیں یعنی اُس وقت جتنے مسلمان موجود تھے

(بقیہ صفحہ ۳۴۵) اقبل امیر المومنین الطواف وقد عزم علی اتباع طلحۃ والزبیر وقتالھما فاشار الیہ ابنہ الحسن ان لا یتبعھما ولا یرصد لھما القتال آئے امیر المومنین طواف کے لیے اور بے شک انھوں نے عزم کیا تھا طلحہ اور زبیر کے تعاقب اور قتال کا تو انھیں مشورہ دیا ان کے بیٹے حسن نے کہ اُن دونوں پر فوج کشی کریں اور نہ اُن سے لڑنے کا قصد کریں۔ جناب امیر نے اس مشورہ کو نہ مانا اور اُس معصوم جگر بند رسول کی رائے سے مخالفت کی جس میں رسول کا خون ملا ہوا تھا اور جس کی عصمت آیت تطہیر سے ثابت ہو چکی تھی۔ با ایں ہمہ ہم شیعوں سے پوچھتے ہیں کہ یہ انھیں کیوں کر معلوم ہوا کہ خلفائے ثلاثہ کبھی بدست خود نہیں لڑتے تھے اس لیے کہ احادیث میں ہر ہر صحابی کی جنگ بتفصیل مذکور نہیں کسی وجہ سے بعض بعض معرکے مذکور رہ گئے ہیں۔ مثلاً حیات القلوب میں لکھا ہے "موافق روایات وسیر معتبرہ شیعہ ہفتاد نفر از کفار در جنگ بدر کشتہ شدند از ان جملہ سی و پنج نفر بسیلاب تیغ امیر المومنین بآتش جہنم رسیدند و سی و پنج نفر بہ تیغ ملائکہ و سائر صحابہ ہلاک شدند" اب حضرات شیعہ کو یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ جناب امیر کے سوا اور صحابہ نے جو کافروں کو قتل کیا اُن صحابہ میں خلفائے ثلثہ شامل نہیں۔ با ایں ہمہ خاص ان کی جنگ کے تذکرے بھی کتب سیر و مغازی میں منقول ہیں۔ ازالۃ الخفا میں بحوالہ ابن ہشام اور حاکم کے ابن مسعود سے منقول ہے کہ مکہ میں ہم خانہ کعبہ کے پاس نماز نہیں پڑھ سکتے تھے جب عمر بن خطاب مسلمان ہو کر کافروں سے لڑے اُس دن سے خانہ کعبہ میں مسلمانوں کی نماز جاری ہوئی اور استیعاب سے یہ نقل کیا ہے کہ غزوۂ بدر میں عمر بن خطاب نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو (بقیہ صفحہ ۳۴۷ پر)

کسی کو جناب امیر اولوالامر ہونے کی لیاقت میں عمرؓ کے برابر نہیں جانتے تھے چنانچہ انھوں نے عمرؓ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر تم نہ ہو گے تو مسلمانوں کو اپنے ملک میں بھی پناہ نہ ملے گی۔

(بقیہ صفحہ ۳۴۶) قتل کیا۔ ایسی نظیر تو جناب امیر کے معرکوں میں بھی نہ ملے گی کہ انھوں نے کبھی ایسے قریب قرابت والے کو قتل کیا ہو اور ازالۃ الخفا میں غزوۂ احد کے معرکہ میں بحوالہ ابن اسحٰق یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مع ایک جماعت اصحاب کے پہاڑ کی گھاٹیوں میں تھے۔ اتنے میں لشکر قریش کے کچھ لوگ پہاڑ پر چڑھ گئے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ ہم پر چڑھ آویں۔ اس وقت عمر بن خطاب اور ایک جماعت مہاجرین نے قتال کیا تب وہ پہاڑ سے اُترے اور نیز ازالۃ الخفا میں مذکور ہے کہ غزوۂ خندق میں خندق کے ایک کنارہ کی محافظت عمرؓ بن خطاب سے متعلق تھی چنانچہ اس کی یادگار میں اس مقام پر آج تک ایک مسجد ان کے نام سے بنی ہوئی ہے اور غزوۂ خندق میں ایک روز فاروقؓ اور زبیرؓ نے حملہ کر کے جماعت کفار کو متفرق کر دیا۔ غزوۂ بنی مصطلق میں مقدمہ لشکر وہی تھے۔ اس معرکہ میں انھوں نے کافروں کے ایک جاسوس کو قتل کیا اور عین قتال میں وہ اس امر پر مامور ہوئے کہ کافروں سے پکار کر کہدیں کہ جو کوئی کلمہ اسلام کہدے اس کو امن ہے۔ تاریخ الخلفا میں بحوالہ ابن عساکر حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے عمرؓ کی ہجرت کا قصہ یہ منقول ہے کہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ عمرؓ کے سوا جس نے ہجرت کی ہے مگر جب عمر بن خطاب نے ہجرت کا قصد کیا تو تلوار گردن میں ڈالی اور کمان سنبھالی اور تیر ہاتھ میں لیا اور خانہ کعبہ میں آئے اس وقت سرداران قریش (بقیہ صفحہ ۳۴۸ پر دیکھیے)

اگر جناب امیر کسی اور میں بھی ایسی لیاقت سمجھتے تو یہ رائے دیتے کہ جب لشکر اسلام کے مقابلہ میں قیصر روم بذات خود آیا ہے اور ابو عبیدہؓ نے تم کو بلایا ہے تو اس وقت میدان جنگ میں تمہارا جانا ضرور ہے بالفرض اگر تم کو صدمہ پہنچا تو اور کوئی شخص تمہارا قائم مقام بن کر مسلمانوں کی پناہ بن جاوے گا۔

(بقیہ صفحہ ۳۴۷) وہاں موجود تھے سات مرتبہ طواف کیا اور دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر سرداران قریش میں سے ایک ایک کے مجمع میں آئے اور یہ کہا کہ تمھارے منہ بگڑ جاویں جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی ماں اس کو روئے اور اس کی اولاد یتیم ہو جائے اور اس کی بیوی بیوہ ہو جائے وہ اس جنگل کے پار ہو کہ میرے مقابل آوے مگر کسی کو جرأت نہ ہوئی جو عمرؓ کے پیچھے ہوتا۔ اور یہی حالت خلیفۂ اول کے جہاد کی تھی۔ تاریخ الخلفا میں بحوالہ مسند بزار حضرت علیؓ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ابو بکرؓ مجھ سے بھی زیادہ بہادر تھے جب ہم نے بدر کے دن رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک محفوظ مقام بلند بنایا۔ جس کو عریش کہتے تھے۔ تو ہم مشورہ کرتے تھے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کے واسطے کون رہے گا؟ تاکہ کوئی مشرک ان کی طرف نہ آسکے۔ واللہ ہم میں سے کوئی اس کام کے پاس نہ آیا مگر ابو بکرؓ شمشیر برہنہ ان کے ہاتھ میں تھی جو کوئی رسولؐ کی طرف آتا تھا یہ شمشیر برہنہ لے کر اس پر جاتے تھے۔ پھر علیؓ کہتے ہیں کہ مکہ میں میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قریش نے گھیر لیا تھا کوئی کھینچتا تھا، کوئی دبوچتا تھا اور کہتے تھے کہ تو نے بہت سے خداؤں کی جگہ ایک خدا بنا دیا۔ واللہ اس وقت کوئی ہم میں سے رسولؐ کے پاس نہیں گیا مگر ابو بکرؓ۔ کسی کو انھوں نے مارا کسی کو کھینچا کسی کو پچھاڑا۔
(بقیہ صفحہ ۳۴۹ پر)

اب جناب امیر علیہ السلام کا وہ کلام بھی سنیے جو جہاد فارس کے وقت عمرؓ نے بذاتِ خود میدان جنگ میں جانے کی نسبت اُن سے مشورہ کیا تھا اور اُس وقت بھی انھوں نے وہی رائے دی جو قیصر روم کے مقابلہ میں رائے دی تھی یعنی عمرؓ کو میدان جنگ میں جانے سے روکا۔ چنانچہ نہج البلاغت (مطبوعۂ طہران جزو ۲۰) میں ہے:۔

(بقیہ صفحہ ۳۴۸) اور یہ کہتے تھے کہ تم پر خرابی ہو کیا ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو یہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے۔ یہ قصہ بیان کر کے علیؓ نے اپنی چادر اوپر کو اٹھائی اور اتنے روئے کہ آپ کی داڑھی تر ہو گئی۔ پھر فرمایا کہ میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں مومن آل فرعون بہتر ہے یا ابو بکرؓ سب لوگ خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ تم مجھ کو جواب نہیں دیتے۔ واللہ ایک ساعت ابو بکرؓ کی بہتر ہے مومن آل فرعون کی ہزار ساعتوں سے۔ اُس نے ایمان چھپایا تھا اور ابو بکرؓ نے اپنے ایمان کا اعلان کیا۔ اب حضرات شیعہ ذرا اتنی بات پر بھی غور کریں کہ امام معصوم نے تو یہ کہدیا کہ قرآن میں یہ حکم نازل ہوا تھا کہ اے نبی کافروں سے جہاد کر منافقوں کو ساتھ لے کر اور جب یہ حالت ہے تو کسی کے جہاد کرنے میں اُس کی کیا فضیلت ہوگی بلکہ جن لوگوں کو پیغمبرؐ نے لڑایا ہوگا اُن پر نفاق کا گمان غالب ہوگا (معاذ اللہ منہا) حضرات شیعہ خلفاء کی شجاعت پر تو ایسے فضول اعتراض کرتے ہیں اور اپنی روایتوں کے بموجب یہ خیال نہیں کرتے کہ انھیں خلفا کے مقابلے میں جناب امیر کی کیا حالت ہوئی بھاگ کر گھر میں بیٹھے۔ یہاں تک کہ جناب سیدہ نے فرمایا کہ "ہمچو جنین در رحم نشستہ و ہمچو خائناں در خانہ گریختہ" اسی تقریر میں آخر کو یہ بھی کہدیا کہ "خود را ذلیل کردی" مگر جناب سیدہ کی اتنی ملامت پر بھی جناب امیر کو جوش نہ آیا۔ آخر جناب سیدہ (بقیہ صفحہ ۳۵۰ پر)

ومن کلام لہ وقد استشار لہ عمر بن الخطاب فی الشخوص لقتال الفرس بنفسہ ان ھذا الامر لم یکن نصرہ ولاخذلانہ بکثرۃ ولا بقلۃ وھو دین اللہ الذی

اور جناب امیر کے کلام سے ہے جب کہ مشورہ کیا تھا اُن سے عمرؓ نے قتال فارس کے لیے بذات خود جانے کا۔ بے شک یہ دین، نہیں ہے فتح اس کی اور شکست اس کی کثرت پر اور نہ قلت پر اور وہ اللہ کا

(بقیہ ص ۳۵۰) تنہا خلیفۂ ثانی سے ہاتھا پائی کی، لڑائی لڑیں۔ چنانچہ کافی میں ہے کہ اُنھوں نے عمرؓ کا گریبان پکڑ کر عمرؓ کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس ناگوار حالت میں بھی جناب امیر نے مطلق پروا نہ کی۔ اگر اپنے ننگ و ناموس کا لحاظ نہ تھا تو یہ خیال کیا ہوتا کہ یہ انھیں پیغمبرؐ کی بیٹی ہیں جن کی بدولت جناب امیر کو ایمان نصیب ہوا تھا افسوس کہ اُس نازک وقت میں جناب امیر نے جناب سیدہ کی حمایت سے جان چُرائی۔ حالانکہ جناب سیدہ کے طفیل میں ان کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اہل بیت میں داخل ہوگئے اب فرمائیے کہ اُس جان چُرانے اور چھپ کر گھر میں بیٹھنے کا نتیجہ کیا ہوا لوگ زبردستی ان کو گھر میں سے کھینچ لائے اور جس تکلف سے کھینچ کر لائے ذرا اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ حق الیقین میں ہے (وریسمانے درگلوئے مبارک حق جوئے آں مطیع امر الٰہی انداختند وکشیدند کہ از خانہ بیروں آوردند) آخر یہ نوبت پہنچی جو روضہ کافی میں مذکور ہے کہ جناب سیدہ قمیص رسول کو سر پر رکھ کر اور دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑ کر مسجد میں تشریف لائیں اور سفارش کرکے جناب امیر کی جان بچائی اور ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے گئیں۔ ان مشکل وقتوں میں اگر جناب امیر نے جناب سیدہ کی حمایت کی تو یہ کی کہ مجمع عام میں جناب سیدہ کو محض فرضی طور پر بے وجہ فحش گالیاں دیں۔ چنانچہ حق الیقین میں ہے کہ ایک مرتبہ (بقیہ ص ۳۵۱ پر)

اظھرہ وجندہ الذی اعدہ وامدہ حتی بلغ ما بلغ وطلع حیث طلع ونحن علی موعود من اللہ واللہ منجز وعدہ وناصر جندہ و

دین ہے جس کو اللہ نے غالب کیا ہے اور اللہ کا لشکر ہے جس کو اللہ نے آراستہ کیا ہے اور اسی نے بڑھایا ہے یہاں تک کہ جتنا پہنچنا تھا پہنچا اور جتنا چمکنا تھا چمکا اور ہم اللہ کے وعدہ پر ہیں اور اللہ اپنے

(بقیہ ص ۳۵۱) جناب امیر نے ابوبکرؓ سے جا کر بحث کی اور پوچھا کہ آیت تطہیر ہمارے حق میں ہے یا کسی اور کے حق میں۔ ابوبکرؓ نے کہا بلکہ تمھارے حق میں ہے اس کے بعد بعینہ عبارت حق الیقین کی یہ ہے "حضرت گفت پس اگر گواہان نزد تو گواہی بدہند کہ فاطمہؓ زنا کردہ است چہ خواہی کرد گفت بر او اقامت حد می کنم" ذرا انصاف کرو کہ جناب امیر کی زبان مبارک سے اُس معصومہ کی نسبت کیسا قبیح کلمہ صادر ہوا (معاذ اللہ منہا) محض بے وجہ یہ صورت قبیحہ فرض کی کیا جناب امیر باوجود کمال علم اور فصاحت و بلاغت کے ایسے عاجز تھے کہ بغیر فرض اس قبیح صورت کے اپنی حجت تمام نہیں کر سکتے تھے۔ بالفرض اگر جناب سیدہ کی نسبت کسی گناہ کبیرہ فرض کرنے پر مجبور تھے تو اس قبیح کے سوا کوئی اور کبیرہ فرض کر سکتے تھے اگر کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا تو چوری کی تہمت فرض کر لی ہوتی۔ فحش گالیاں تو نہ دی ہوتیں۔ دوسری حمایت جناب سیدہ کی یہ کی جو حق الیقین میں مذکور ہے کہ جناب سیدہ کو ایک خچر پر سوار کراکے اور دونوں بچوں کو ساتھ لے کر ایک تماشا بنا کر تمام مدینہ میں گھر گھر لیے پھرے۔ جب گھر جلایا گیا اُس وقت بھی جناب امیر سے کچھ نہ ہو سکا بالکل مردہ بدست زندہ کی کیفیت رہی البتہ اس وقت کارنمایاں یہ کیا کہ اگرچہ تمام اسباب جل گیا مگر کسی طرح وہ بارہ[12] لفافہ عہدنامہ کے بچا لیے (بقیہ ص ۳۵۲ پر)

مكان القيم بالامر مكان النظام من الخرز يجمعه ويضمه فان انقطع النظام تفرق الخرز وذهب ثم لم يجتمع بحذافيره ابدا والعرب اليوم وان كانوا قليلا فهم كثيرون بالاسلام وعزيزون بالاجتماع فكن قطبا واستدر الرحى بالعرب واصلهم دونك نار الحرب فانك ان شخصت من هذه الارض انتقضت

وعدہ کو پورا کرنے والا ہے اور اپنے لشکر کی مدد کرنے والا ہے اور اور مرتبہ مالک حکومت کا مرتبہ ڈورے کا سا ہے لڑی میں جوڑتا ہے اس کو اور ملاتا ہے اُس کو پھر اگر ٹوٹ گیا ڈورا تو بکھر جاتے ہیں دانے اور گم ہوجاتے ہیں پھر وہ پورے کبھی جمع نہیں ہوتے اور اہل عرب آج اگرچہ تھوڑے ہیں لیکن وہ اسلام کی وجہ سے بہت ہیں اور جمع ہوجانے کی وجہ سے غالب ہیں پس بن جاؤ قطب یعنی چکی کی کیلی اور عرب میں چکی چلا اور ڈال دے ان میں

(بقیہ صفحہ ۳۵۱) جو سربمہر دوازدہ اماموں کے لیے اللہ کے پاس سے نازل ہوئے تھے اگر وہ جل جاتے تو آئندہ امر امامت میں خلل پڑ جاتا۔ اس کے بعد جناب سیدہ پر حسب روایات شیعہ اور زیادہ مصیبت پیش آئی جو حق الیقین کی حدیث رجعت سے ظاہر ہے کہ عمرؓ نے ان کے تازیانہ مارا اور دروازہ اُن پر گرایا جس سے جناب سیدہ اور محسن معصوم کی شہادت ہوئی (معاذ اللہ) جناب امیر اس قصہ کو بھی بڑے صبر و سکوت کی نگاہوں سے دیکھتے رہے اور شربت کے سے گھونٹ پیتے رہے۔ آخر جناب سیدؓ کی اولاد کے ساتھ انہوں نے یہ سلوک کیا جس کو صاحب مجالس المومنین نے یہ لکھا ہے کہ دختر بعمر فرستاد اور اسی مضمون کو جناب امام جعفر صادق نے فحش گالی کے لفظوں میں ادا کیا مگر ان کی کیا شکایت ہے زبان اہلبیت کو گالیاں دینے کی سنت تو جناب امیر [illegible]

عليك العرب من اطرافها واقطارها حتى يكون ما تدع وراءك من العورات اهم اليك مما بين يديك ان الاعاجم ان ينظروا اليك غدا يقولوا هذا اصل العرب فاذا اقتطعتموه استرحتم فيكون ذلك اشد لكلبهم عليك وطمعهم فيك واما ما ذكرت من مسير القوم الى قتال المسلمين فان الله سبحانه هو اكره لمسيرهم منك وهو اقدر على تغيير ما يكره واما ما ذكرت من عددهم فانا لم نكن نقاتل فيما مضى بالكثرة وانما كنا نقاتل بالنصر والمعونة

اپنی آڑ میں لڑائی کی آگ پس بے شک اگر تو نکلے گا اس زمین سے تو ٹوٹ پڑیں گے تجھ پر عرب ملک کے اطراف و جوانب سے یہاں تک کہ تو جو عورتوں کو پیچھے چھوڑ جاؤ گا ان کی حفاظت زیادہ ضروری ہوگی تیرے لیے اُس جنگ سے جو تیرے سامنے ہوگی اور بے شک اہل عجم اگر کل کو تجھ پر نظر ڈالیں گے تو کہیں گے کہ یہ شخص عرب کی اصل ہے اگر تم اس کو جدا کر لوگے تو تم راحت پالوگے تو یہ امر ان کے حملے اور ان کی طمع کو تجھ پر بڑھا دے گا اور یہ جو تونے کہا کہ اُن کی قوم مسلمانوں سے لڑنے کو آئی ہے تو اللہ سبحانہ بہ نسبت تیرے زیادہ بُرا جاننے والا ہے ان کے آنے کو اور زیادہ قدرت والا ہے اُس کے بدل دینے کی جس کو بُرا جانتا ہو اور تونے جو ان کی تعداد کا ذکر کیا تو ہم گزشتہ وقت میں کثرت پر نہیں لڑتے تھے بلکہ اللہ کی مدد اور یاوری پر لڑتے تھے۔

اس قول میں جناب امیر نے عمرؓ کے دین کو اللہ کا دین بتایا ان کے لشکر کو اللہ کا لشکر بتایا اور اپنی ذات کو عمرؓ کی جماعت میں شامل کر کے فرمایا کہ ہم اللہ کے وعدہ پر ہیں اللہ اپنا وعدہ پورا کرنے والا ہے اور اپنے لشکر کی مدد کرنے والا ہے یہ وعدہ وہی ہے جو آیتِ استخلاف میں مذکور ہے فاضل میثم نے اس کی شرح میں لکھا ہے :-

وعدنا بموعود هو النصر والغلبة والاستخلاف فی الارض كما قال وعد الله الذين امنوا منكم وعملوا الصلحت ليستخلفنهم فی الارض

ہم سے وعدہ کیا گیا ہے ایک موعود کا وہ فتح اور غلبہ اور زمین کی خلافت ہے چنانچہ اللہ نے فرمایا ہے وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم الخ

جناب امیر کے ان دونوں قولوں سے بہت اچھی طرح واضح ہو گیا کہ انھوں نے آیت استخلاف کو عمرؓ کی خلافت پر صادق کیا۔

علامہ میثم بحرانی نے خطبہ شقشقیہ[1] کی شرح میں لکھا ہے :-

روی انه امران یوتی بامرأة الحال اقتضت لذلك وكانت حاملا فانزجت من هيبته فاجهضت جنينا فجمع جمعا من الصحابة

مروی ہے کہ عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ لائی جاوے ایک عورت بسبب ایک ضرورت کے جو مقتضی تھی اس کے بلانے کی اور وہ عورت حاملہ تھی تو گھبرا گئی عمرؓ کی ہیبت سے اور گرا دیا پیٹ کا بچہ تو عمرؓ نے جمع کیا

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران جز ۸ - ۱۲

وسالهم ما يجب عليه فقالوا انت مجتهد ولا نری انه يجب عليك شئ فراجع عليا فی ذلك واعلمه ما قال بعض الصحابة فانكر ذلك وقال اری عليك الغرة قال لا عشت لمعضلة لا تكون لها يا ابا الحسن

ایک جماعت صحابہ کو اور ان سے پوچھا کہ کیا واجب ہے اس پر۔ صحابہ نے کہا کہ تم مجتہد ہو ہمارے نزدیک تم پر کچھ واجب نہیں پھر عمرؓ نے رجوع کیا علی کی طرف اس مسئلہ میں اور بتایا ان کو جو کہا تھا بعض صحابہ نے تو علیؓ نے اس سے انکار کیا اور کہا کہ سمجھتا ہوں میں تم پر خطا۔ عمرؓ نے کہا کہ زندہ رہوں میں اس مشکل کے وقت میں جس کے حل کرنے کے لیے اے ابو الحسن تم موجود نہ ہو۔

بیان مذکورۂ بالا پر غور کرنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ خلفاء ثلثہ کے ساتھ جناب امیر کو بہت ربط و اتحاد تھا ان کی خلافت کو اپنی خلافت سمجھتے تھے اور ہر طرح ان کے مددگار رہتے تھے ان کی حکومت کو اپنی حکومت سمجھ کر بڑی بے تکلفی اور بے باکی کے ساتھ اُس میں دخل دیتے تھے ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں مرتدوں نے وہ فتنہ اٹھایا تھا کہ خلافت کے نکل جانے کا خوف تھا اس نازک وقت میں جناب امیر علیہ السلام نے ایسی حمایت کی کہ بدستِ خود جنگ کر کے اہل ارتداد کو قتل کیا اور خلافت ابی بکرؓ پر زوال نہ آنے دیا چنانچہ ملا فتح اللہ کاشانی نے ترجمہ نہج البلاغت[1] میں اس مکتوب کی

[1] یہ عبارت ہم نے اصل نسخہ ترجمہ نہج البلاغت مطبوعۂ ایران سے نقل کی ہے مگر اس میں صفحہ ہذا کے ہندسہ نہ تھے ۱۲ -

شرح میں لکھا ہے جو جناب امیر نے مالک اشتر کو والی مصر بنا کر ان کے ساتھ ایک مکتوب اہل مصر کو لکھا ہے :-

بدانکہ در زمان خلافت ابی بکر بسیارے از عرب برگشتند از دین و مرتد شدند و اصحاب در آں امر عاجز و حیران شدند چوں آں حضرت آں امر را چناں دید اصحاب را دلداری کردہ بزور بازوے حیدری اہل ارتداد را بسقر فرستاد و باز امر دین را انتظام داد۔

ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ میں بہت سے عرب دین سے پھر گئے تھے اور مرتد ہو گئے تھے اصحاب اس امر میں عاجز اور حیران تھے۔ جب جناب امیر علیہ السلام نے یہ حال دیکھا تو اصحاب کی دل داری کی اور زور بازوئے حیدری سے اہل ارتداد کو دوزخ میں بھیجا اور امر دین کا انتظام کیا۔

اب غور کرو کہ جناب امیر تو ابوبکرؓ کے ایسے حامی اور مددگار تھے کہ اپنی جان لڑا کر بزور شمشیر انھوں نے ابوبکرؓ کی خلافت کو سنبھالا مگر شیعوں نے کیا کیا بہتان باندھ لیے اور ان کے باہمی اتفاق کو نفاق بنا دیا اگر ابوبکرؓ کی خلافت دین کے خلاف ہوتی تو جس طرح اُس وقت جناب امیر نے بزور شمشیر دین کا انتظام کیا تھا اسی طرح خلافت بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتے تھے۔

شیخین کے مناقب ہمیشہ جناب امیر کی زبان پر جاری رہتے تھے امیر شام کے ایک خط کے جواب میں جو ایک خط جناب امیر نے لکھا ہے اس کو تمام شارحین نہج البلاغت نے نقل کیا ہے۔ ہم اس کو شرح میثم[1] سے نقل کرتے ہیں۔

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۳۱۔

وکان افضلھم فی الاسلام کما زعمت وانصحھم للہ ولرسولہ الخلیفۃ الصدیق وخلیفۃ الخلیفۃ الفاروق ولعمری ان مکانھما فی الاسلام تعظیم وان المصاب بھما لجرح فی الاسلام شدید یرحمھما اللہ وجزاھما باحسن ماعملا۔

اور تھے افضل صحابہ کے اسلام میں جیسا کہ تیرا خیال ہے اور زیادہ مخلص اللہ اور رسول کے خلیفہ صدیقؓ اور خلیفہ کے خلیفہ فاروقؓ اور قسم ہے مجھ کو اپنی جان کی کہ مرتبہ ان دونوں کا اسلام میں البتہ بڑا ہے اور بے شک پہنچا ان کی موت سے زخم اسلام میں سخت، رحم کرے اُن دونوں پر اللہ اور جزا دے اُن دونوں کو اُن کے نیک کاموں کی۔

نہج البلاغت[1] میں ایک قول جناب امیر کا یہ بھی منقول ہے جو خلیفہ ثانی کی مدح میں ہے :-

وقال فی کلام لہ ووَلیھم والٍ فاقام واستقام حتی ضرب الدین بجرانہ۔

اور فرمایا جناب امیر نے اپنے ایک کلام میں پھر حاکم ہوا۔ ان کا ایک والی تو قائم کیا دین اور ٹھیک چلا یہاں تک کہ دین کو کمال مضبوطی حاصل ہوئی۔

جران اونٹ کے سینہ کے اس کنارے کو کہتے ہیں جو گردن سے ملا ہوتا ہے۔ اونٹ جب زمین پر بیٹھ کر اپنا سینہ زمین پر رکھ دیتا ہے تو اس کے کمال اطمینان اور آرام کی حالت ہوتی ہے۔ اس قول میں جناب

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ورق آخر کتاب ۱۲

امیر نے دین کو اونٹ فرض کرکے فرمایا کہ دین نے سینہ رکھ دیا یعنی دین کو کمال اطمینان حاصل ہو گیا جس سے تقویت دین مراد ہے۔

ملا فتح اللہ کاشانی نے اول فقرہ کا ترجمہ یہ لکھا:-

"والی ایشان شد والی کہ آں عمرؓ خطاب است"

اور آخر فقرہ کا ترجمہ یوں لکھا:-

"تا آنکہ[1] بنہ د دین پیش سینۂ خود را بر زمین و ایں کنایت است از استقرار و تمکین اہل اسلام"

عثمانؓ خلیفہ ثالث کے جو مناقب حضرت امیر نے بیان فرمائے ہیں وہ بھی بہ نظر انصاف ملاحظہ کے قابل ہیں۔ مگر اول یہ سمجھ لینا چاہیے کہ نہج البلاغت رضی کی جمع کی ہوئی شیعوں کی کتاب ہے اس لیے اُس کے مطالب حضرات شیعہ کو ضرور قبول کرنے پڑیں گے مگر حضرات شیعہ اس کے مطالب سے اہل سنت کو الزام نہیں دے سکتے۔

نہج البلاغت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ عثمانؓ کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام سے بعض ظلموں کی شکایت کی اور یہ درخواست کی کہ آپ ہماری طرف سے یہ شکایت عثمانؓ تک پہنچائیں۔ اگر یہ مضمون تسلیم کیا جائے تو ممکن ہے کہ مروان نے کچھ ظلم

[1] یہاں تک کہ رکھا دین نے اگلا سینہ اپنا زمین پر اور یہ اشارہ ہے اطمینان اور مضبوطی اہل اسلام سے۔ شارح میثم نے بھی اس کے معنی یہی لکھے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ منقول یہی ہے کہ والی عمرؓ بن خطاب تھے ۱۲

کیے ہوں لیکن حضرت عثمانؓ اس سے بالکل بے خبر ہوں گے۔ اُس وقت جناب امیر نے عثمانؓ کے پاس جا کر جو گفتگو کی ہے وہ نہج البلاغت[1] میں اس طرح مذکور ہے:-

ومن کلام له علیه السلام لما اجتمع الناس الیه وشکوا علی عثمان وسالوه مخاطبته عنهم	اور جناب امیر علیہ السلام کے کلام سے ہے جب کہ جمع ہوئے ان کے پاس کچھ لوگ اور انھوں نے وہ شکایت کی جو اعتراض تھے ان کو عثمانؓ پر اور جناب امیر سے یہ درخواست کی کہ آپ عثمانؓ کے پاس جا کر ان کی طرف سے گفتگو کریں اور ان کے حق کے لیے جھگڑا کریں۔
فدخل علی عثمان فقال ان الناس ورائی وقد استسفرونی بینك وبینهم والله ما ادری ما اقول لك ما اعرف شیئا تجهله و لا ادلك علی الامر لا تعرفه ما سبقناك الی شئ فنخبرك عنه ولا خلونا	پس جناب امیر عثمانؓ کے پاس گئے اور فرمایا کہ لوگ میرے پیچھے ہیں اور انھوں نے اپنے اور تمھارے درمیان میں سفیر مجھ کو بنایا ہے۔ خدا کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں تم سے کیا کہوں۔ میں نہیں جانتا کوئی ایسی بات جس کو تم نہ جانتے ہو اور نہیں رہنمائی کر سکتا میں تم کو کسی ایسے امر پر جس کو تم نہ جانتے ہو۔ ہم کسی بات میں

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۲۱۔

بشئ فنبلغکہ وقد رایت کما رایناو سمعت کما سمعنا وصحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما صحبنا وما ابن ابی قحافۃ و لا ابن الخطاب اولی بعمل الحق منک۔

وانت اقرب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وشیجۃ رحم وقد نلت من صہرہ مالم ینالا فاللہ اللہ فی نفسک واللہ ما تبصر من عمی ولا تعلم من جہل وان الطریق لواضحۃ وان اعلام الدین لقائمۃ واعلم ان افضل عباد اللہ عند اللہ امام عادل وان شر الناس عند اللہ امام جابر یا عثمان انی انشدک اللہ ان

تم پر سابق نہیں ہیں جس کی تم کو خبر دیں اور نہیں معلوم کی خلوت میں ہم نے کوئی چیز جو تم کو پہنچا دیں اور بے شک دیکھا ہے تم نے جو ہم نے دیکھا ہے اور سُنا ہے تم نے جو ہم نے سنا ہے اور تم بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں اسی طرح رہ کر ہو جیسے ہم رہے ہیں اور نہیں تھے ابو بکر اور نہ عمر حق پر عمل کرنے میں اولیٰ تم سے۔ اور تم زیادہ قریب ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سلسلہ قرابت میں اور بے شک حاصل کیا تم نے ان کی دامادی کا شرف جو ان دونوں نے نہیں حاصل کیا پس اللہ سے ڈر اپنی جان کے لیے واللہ نہیں بینا کیا جاتا تو اندھے ہونے سے اور نہیں علم دیا جا سکتا تجھ کو جہالت سے (یعنی تم کو نصیحت اس لیے نہیں ہے کہ تم ناواقف ہو بلکہ تم سب کچھ جانتے ہو) اور بے شک رستے کھلے ہوئے ہیں اور نشان دین کے قائم ہیں اور جان لے تو کہ اللہ کے

تکون امام ہذہ الامۃ المقتول فانہ کان یقال یقتل فی ہذہ الامۃ امام یفتح علیہا القتل والقتال الی یوم القیامۃ ویلبس امورہا علیہا ویبث فیہا الفتن۔

بندوں میں افضل اللہ کے نزدیک امام عادل ہے۔ اور بے شک بہت بُرا آدمیوں میں اللہ کے نزدیک امام ظالم ہے۔ اے عثمان میں تجھ کو اللہ کی قسم دلاتا ہوں کہ تو اس امت کا امام مقتول بنے۔ پس بے شک یہ کہا جاتا تھا کہ قتل کیا جاوے گا اس امت میں ایک امام۔ کھل جاوے گا اُس حادثہ سے قتل و قتال قیامت کے دن تک اور مشتبہ ہو جائیں گے امور امت کے امت پر اور پھیل جاویں گے امت میں فتنے۔

فلا یبصرون الحق من الباطل فلا تکونن لمروان سیقۃ یسوقک حیث شاء۔

پھر نہیں دیکھیں گے حق کو باطل سے۔ پس مت بن تو مروان کا کھلونا کہ چلائے تجھ کو جدھر کو چاہے۔

جناب امیر کے اس کلام سے یہ ثابت ہوگیا کہ جناب امیر کا علم کسی طرح عثمانؓ کے علم سے زیادہ نہ تھا۔ اور جناب امیر کو خلوت میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسا علم حاصل نہیں ہوا تھا جو عثمانؓ کو معلوم نہ ہو۔

پس اگر حضرت علیؓ سب آدمیوں میں زیادہ علم والے اور دروازہ علم رسولؐ تھے تو یہ مرتبے عثمانؓ کو بھی حاصل تھے۔ جو کچھ جناب امیر نے دیکھا تھا وہ عثمانؓ نے بھی دیکھا تھا اور جو کچھ جناب امیر نے سُنا تھا وہ عثمان نے بھی سُنا تھا اور جو شرف صحبت رسول کا جناب امیر کو حاصل تھا وہ عثمان کو بھی حاصل تھا۔

چونکہ سب کا اعتقاد یہ تھا کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ تمام صحابہ میں افضل ہیں اس لیے جناب امیر نے عثمانؓ کو ان دونوں سے مقابلہ کر کے فرمایا کہ اے عثمان وہ دونوں بھی حق پر عمل کرنے میں تم سے بڑھ کر نہ تھے۔ یعنی جس طرح وہ دونوں حق پر عمل کرتے تھے اسی طرح تم بھی حق پر عمل کرتے ہو۔ جناب امیر نے دوسری فضیلت عثمانؓ میں بمقابلہ شیخین کے یہ ثابت کی کہ تم ان کی نسبت سلسلۂ نسب میں بھی رسولؐ سے قریب ہو یہ اس لیے فرمایا کہ عثمانؓ عبد مناف کی اولاد میں تھے۔

جناب امیر نے تیسری فضیلت عثمانؓ میں بمقابلہ شیخینؓ کے یہ ثابت کی کہ تم نے رسولؐ کی دامادی کی شرافت حاصل کی ہے۔ یہ فضیلت بھی ان دونوں کو حاصل نہ تھی۔

اس کے بعد جناب امیر نے بطور وعظ و نصیحت کے عدل و انصاف کی ترغیب دی اور امام عادل کی فضیلتیں اور امام ظالم کی بُرائیاں بیان کیں۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ جناب امیر عثمانؓ کو سمجھاتے تھے کہ تم امام عادل بنو اور امام ظالم نہ بنو۔

اب فرمائیے کہ اگر امامت بحکم نص رسولؐ جناب امیر سے مختص تھی تو ان کے سوا دوسرا شخص امام عادل کیوں کر بن سکتا تھا حالانکہ جناب امیر یہ چاہتے تھے کہ عثمانؓ امام عادل بن جاویں۔

جناب امیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سُنا تھا کہ اس امت میں ایک امام قتل ہوگا اور اس کے قتل سے اللہ ایسا نارہ امض ہوگا کہ اس کے وبال میں اس امت میں قتل و قتال کا دروازہ کھل جاوے گا اور فتنے پھیل جاویں گے اور حق و باطل کی تمیز نہ رہے گی۔ مگر جناب امیر کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ امام مقتول عثمان ہیں۔ اسی وجہ سے فرماتے تھے کہ تم وہ امام مقتول مت بنو لیکن در حقیقت تقدیر الٰہی میں عثمانؓ وہی امام مقتول تھے اور انھیں کے قتل کے بعد وہ تمام حوادث پیش آئے جن کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی تھی۔ اور اللہ نے یہ جو فرمایا ہے کہ اُس فتنہ سے بچو جس کا اثر ظالموں سے مختص نہیں ہوتا بلکہ سب پر عام ہوتا ہے وہ اسی قصہ پر صادق آیا۔ جناب امیر نے سب سے آخر میں اپنی گفتگو کا حاصل یہ نکالا کہ مروان کو حکومت میں ایسا دخل مت دو کہ تم بالکل اس کی رائے کے تابع ہو جاؤ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جناب امیر عثمانؓ کی ذات پر کوئی عیب نہیں لگاتے تھے اور جن کارروائیوں کی شکایت تھی وہ مروان کی کارروائیاں تھیں جن کی عثمانؓ کو خبر بھی نہ تھی۔ اگر پہلے سے خبر ہوتی کہ مروان[1] کے مزاج میں شر اور فساد ہے

[1] شیعوں کا حضرت عثمانؓ پر ایک طعن یہ ہے کہ مروان کے باپ حکم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکلوا دیا تھا۔ عثمانؓ نے بُلوایا اسی وجہ سے مروان مدینہ میں آیا۔ لیکن یہ طعن محض فضول ہے اس لیے کہ جب حکم نکلوایا گیا تھا اس کی اور حالت تھی اور (باقی ص۳۶۴ پر)

توعثمانؓ کسی کام میں اس کا دخل نہ ہونے دیتے۔

(بقیہ صفحہ ۳۶۳) جب بلوایا گیا اس کی حالت اور تھی اور جب حالت بدل جاتی ہے تو حکم بھی بدل جاتا ہے۔ پھر شیعوں کا یہ طعن ہے کہ مروان مفسد تھا اس کو اپنا نائب کیوں مقرر کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عثمانؓ عالم الغیب نہ تھے اُن کو مروان کے فسادوں کی کیا خبر تھی بے خبری میں ایسی غلطیاں جناب امیرؓ سے اس سے بھی بڑھ کر ہوئیں ہیں انھوں نے کسی اپنے چچا کے بیٹے کو بصرہ کا حاکم مقرر کیا تھا انہوں نے جناب امیر سے بے وفائی کی اور بیت المال کا مال غصب کر کے لے آئے ان کے نام جو جناب امیر نے خط لکھا ہے وہ نہج البلاغت میں موجود ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ (میں نے تجھ کو اپنی امامت میں شریک کیا تھا اور اپنا راز دار بنایا تھا اور میں یہ سمجھا تھا کہ میرے اہل میں تجھ سے زیادہ کوئی معتمد نہیں ہے مگر جب تو نے مجھ سے زمانہ مخالف دیکھا تو تو نے اپنے چچا کے بیٹے سے دغا کی اور بیت المال میں جو مال یتیموں اور بیوہ عورتوں کے لیے تھا وہ تو نے لوٹ لیا) شارحین نہج البلاغت کا اختلاف ہے کہ یہ خط عبداللہ بن عباس کے نام ہے یا اُن کے بھائی عبیداللہ کے نام۔ اسی طرح منذر بن جارود کو جناب امیر نے عامل مقرر کیا تھا اُس نے بھی خیانت کی اُس کے نام بھی ایسی ہی شکایت کا ایک خط نہج البلاغت میں مذکور ہے۔ زیاد ولد الزنا کو بھی جناب امیر ہی نے اول بصرہ میں ابن عباس کا نائب مقرر کیا اور پھر فارس کا والی مقرر کر دیا یہ بھی خیال نہ فرمایا کہ ع اصل بد از خطا خطا نہ کند۔ آخر اُس نے بھی دغا کی اس کے نام بھی جناب امیر کے خطوط نہج البلاغت میں موجود ہیں حالانکہ کافی کی روایتوں سے ظاہر ہے کہ جناب امیر کو سب ہونے والی باتوں کا حال معلوم تھا پھر بھی ایسے لوگوں کو عامل مقرر کرتے تھے (باقی صفحہ ۳۶۵ پر)

خلفاء کی مدح میں جناب امیر کا یہ خطبہ بھی نہج البلاغت[۵] میں موجود ہے:-

لله بلاد فلان ولقد قوم الاود وداوی العمد واقام السنة وخلف الفتنة۔	اور اللہ نگاہبان ہو اُس شخص کے شہروں کا اور بے شک اُس نے سیدھا کیا کجی کو اور دوا کی مرض کی (یعنی مرض جہالت کی) اور قائم کیا سنت کو اور پیچھے ڈالا فتنہ کو۔
ذهب نقی الثوب قلیل العیب اصاب خیرها وسبق شرها ادی الی الله طاعته واتقاه بحقه رحل وترکهم فی طرق متشعبة لا یهتدی	گیا پاک دامن، کم عیب۔ پہونچا خلافت کی خیر کو اور پہلے ہو گیا اس کے شر سے۔ ادا کی اللہ کے لیے اپنی طاعت اور اس کے لیے حق تقوی ادا کیا گیا۔ اور آدمیوں کو چھوڑا متفرق راہوں میں

(بقیہ صفحہ ۳۶۴) جو خیانت کرتے تھے اور نیز کافی کی روایتوں سے ثابت ہے کہ ائمہ ہر شخص کو دیکھ کر یا اس کی آواز سُن کر اُس کے اچھے بُرے ہونے کا حال معلوم کر لیتے تھے۔ پھر تعجب ہے کہ جناب امیر نے ایسے عامل کیوں مقرر کیے؟ اسی مروان کو جناب امیر نے جنگ جمل کے روز گرفتار کر لیا تھا اور حسنین کی سفارش پر چھوڑ دیا۔ حالانکہ اس سے اور اس کی اولاد سے جو کچھ ہونے والا تھا سب معلوم تھا۔ یہ قصہ بھی نہج البلاغت میں مذکور ہے ۱۲

[۵] یہ خطبہ ہم نے ترجمہ ملا فتح اللہ سے نقل کیا ہے ۱۲

فیہا الضال ولا یستیقن المھتدی۔ کہ راستہ نہیں پاتا ان میں بھٹکنے والا اور نہیں یقین کرتا ہدایت پانے والا۔

جناب امیر نے جس شخص کی یہ مدح کی ہے وہ ضرور بعد رسولؐ کے ہے اور خلیفہ ہے اس لیے کہ رسولؐ کی حیات میں کسی کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگوں کو ایسی متفرق راہوں میں چھوڑ گیا کہ جن میں راہ گم کرنے والے کو راستہ نہیں ملتا اور جو ہدایت پر ہے اس کو بھی یہ یقین نہیں کہ میں ہدایت پر ہوں اس لیے کہ جب رسولؐ ہدایت کرنے والے موجود ہیں پھر یہ قول کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ اس وقت میں گم راہ کو ہدایت کا راستہ نہیں ملتا اور ہدایت یافتہ کو اپنی ہدایت پر یقین نہیں ہوتا اور نہ رسولؐ کے سامنے مرنے والا کوئی ایسا شخص ہو سکتا ہے جس کی نسبت یہ کہا جائے کہ اس کی موت سے لوگ فتنہ میں پڑ گئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جتنے جلیل القدر صحابیوں کا انتقال ہوا ان کے نام معلوم ہیں۔ اب اگر اس ممدوح کا رسولؐ کے سامنے انتقال ہوا ہے تو بتاؤ کہ وہ اُن میں کون ہے جس پر یہ تمام صفتیں صادق آتی ہوں اُس وقت کے آدمیوں میں خلیفۂ برحق کے سوا کسی اور کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کی موت کی وجہ سے لوگ متفرق راستوں میں پڑ گئے اور ہدایت کا راستہ گم ہو گیا۔ پس ضرور ہے کہ خلفائے ثلثہ میں سے کوئی ایک مراد ہے۔ شارح میثم نے لکھا ہے کہ منقول یہ ہے کہ لفظ فلاں سے عمرؓ مراد ہیں اور یہی قول ابن ابی الحدید کا ہے۔ مگر میری رائے یہ ہے کہ ابو بکرؓ مراد ہیں۔
میثم نے یہ بھی لکھا ہے کہ لفظ (خیرہا، وشرہا) کی ضمیریں خلافت کی

طرف پھرتی ہیں۔ یعنی خلافت کی بھلائی اس کو ملی اور خلافت کے شر سے وہ پہلے چلا گیا۔

شارح[1] میثم نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ مراد ابو بکرؓ یا عمرؓ ہیں اب اس کلام کی جو تاویلیں نقل کی ہیں ان کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

واعلم ان الشیعۃ قد اوردوا ھھنا سوالا فقالوا ان ھذہ التمادح التی ذکرھا علیہ السلام فی احد ھذین الرجلین ینافی ما اجمعنا علیہ من تخطیتھما واخذھما منصب الخلافۃ فاما ان لا یکون ھذا الکلام من کلام علیہ السلام واما ان یکون اجماعنا خطاء ثم اجابوا من وجھین

تو جان لے کہ شیعوں نے اس جگہ ایک سوال وارد کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ مدح جناب امیر علیہ السلام نے ان دونوں خلیفوں میں سے کسی ایک کے حق میں بیان فرمائی اُس کے خلاف ہے جو شیعوں کا اجماع ہو گیا ہے ان دونوں کی بُرائی پر اور منصب خلافت غصب کر لینے پر پس یا تو جناب امیر علیہ السلام کا کلام نہ ہو گا اور یا یہ ہمارا اجماع غلطی پر ہو گا۔ پھر اس سوال کا جواب دیا ہے دو طرح سے۔

---

[1] ہمارے پاس شرح میثم کا نسخہ ناقص ہے اس جگہ سے اس کے اوراق کچھ کم ہو گئے ہیں اس لیے یہ عبارت ہم نے استیعاب سے نقل کی ہے مگر بعض علماء سے ہم نے سُنا ہے کہ یہ عبارت شرح میثم میں اُنھوں نے بچشم خود دیکھی ہے ۱۲

احدهما لا نسلم التنافی المذکور فانه جاز ان یکون ذلك المداح منه علیه السلام علی وجه استصلاح من یعتقد صحة خلافة الشیخین واستجلاب قلوبهم بمثل ذلك الكلام۔	ایک جواب یہ ہے کہ ہم نہیں مانتے کہ ہمارے اجماع میں اور اس قول میں مخالفت ہے۔ اس لیے کہ یہ مدح جناب امیر نے ان لوگوں کی اصلاح کے لیے بیان کر دی جو شیخین کی خلافت کو صحیح سمجھتے تھے اور اس کلام سے ان کی تالیف مقصود تھی۔
الثانی ان جاز ان یکون مداحه ذلك لاحدهما فی معرض توبیخ عثمان لوقوع الفتنة فی خلافته واضطراب الامر علیه۔	دوسرے یہ کہ جائز ہے یہ مدح کرنا جناب امیر کا اُن دونوں میں سے ایک کی توبیخ عثمانؓ کے موقع پر ہو اس لیے کہ عثمان کے زمانہ میں فتنہ پڑا اور ابتر ہو گیا امر اُن پر۔

ان دونوں جوابوں کا حاصل یہ ہوا کہ جناب امیر نے (معاذ اللہ منہ) جھوٹ بولا خواہ کسی کی تالیف قلب کے لیے خواہ توبیخ عثمانؓ کے لیے۔

حضرات شیعہ یہ کہتے ہیں کہ خطبہ شقشقیہ میں جو نہج البلاغت میں مندرج ہے اُس میں جناب امیر نے خلفائے ثلثہ کی بُرائی بیان کی ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو وہ خطبہ کسی طرح قابل اعتماد نہیں۔ فقط ایک ابن عباسؓ اُس خطبہ کے راوی بتائے گئے ہیں بھلا اتنے بڑے خطبہ کے

الفاظ بعینہ ان کو یاد کیوں کر رہے؟ ابن عباسؓ سے رضی تک سلسلۂ سند ابھی تک تصنیف نہیں کیا گیا البتہ یہ کہانیاں بیان کی جاتی ہیں کہ رضی سے پہلے بھی وہ خطبہ کسی کے پاس لکھا ہوا تھا۔

شیعہ جس طرح تمام صحابہ پر طعن کرتے ہیں اسی طرح ابن عباسؓ کے حق میں بھی انہوں نے کمی نہیں کی۔ یہ وہی ابن عباسؓ ہیں جو بصرہ کا بیت المال لوٹ لائے تھے۔ وہ مسئلہ امامت کے بھی منکر تھے۔ اصول کافی میں ہے[۱]:-

کہ ایک مرتبہ جناب امیر نے یہ فرمایا کہ ہر سال شب قدر میں ہم پر ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور تمام سال کے احکام بیان کر جاتے ہیں۔ ابن عباسؓ نے اس کی تکذیب کی اور یہ کہا کہ شب قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختص تھی ان کے بعد کسی کے لیے نہیں چنانچہ اس کی سزا میں اسی وقت فرشتہ نے ابن عباسؓ کی آنکھیں پھوڑ دیں اور اُس وقت سے وہ اندھے ہو گئے اور اسی روایت میں ہے کہ ابن عباس نے اپنی آخر عمر میں امام باقر سے اسی مسئلہ میں جھگڑا کیا آخر امام باقر علیہ السلام نے ابن عباس سے کہا کہ هلكت واهلكت یعنی تو خود بھی ہلاک ہوا اور تو نے اوروں کو بھی ہلاک کیا۔ اس کا ترجمہ خلیل قزوینی نے ترجمہ کافی میں یوں کیا ہے "جہنمی شدی و جہنمی کر دی"۔ پس جب شیعوں کے نزدیک ابن عباسؓ کی یہ حالت تھی (معاذ اللہ منہا) تو بھلا ایسے شخص کی روایت کا کیا اعتبار۔ حضرات شیعہ نے تو عباسؓ اور عقیلؓ کی بدگوئی میں بھی کمی نہیں کی نہ کہ ابن عباسؓ۔

بہت بڑا قرینہ اس خطبہ کے جھوٹے ہونے کا یہ بھی ہے کہ اُس میں،

---

[۱] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ باب الشان انا انزلنہ صفحہ ۱۵۱ ۱۲

یہ بھی مذکور ہے کہ جو لوگ بعد حادثۂ عثمانؓ کے جناب امیر علیہ السلام سے بیعت کرنے آئے تھے انھوں نے حسنین کو پامال کر ڈالا۔ بھلا کسی کی سمجھ میں آتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام اپنی خلافت کے وقت میں حسنین کی پامالی اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔
بایں ہمہ اُس خطبہ سے خلفاء کی بُرائی پر استدلال نہیں ہو سکتا اس لیے کہ حضرات شیعہ جن فقرات سے مذمت خلفاء ثابت کرتے ہیں اُن میں مدح کا احتمال بھی موجود ہے۔ چنانچہ ہم اُس خطبہ کو بھی اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے:-

خُطبۂ شقشقیّہ

لقد تقمصها ابن ابی قحافۃ وانہ لیعلم ان محلی منها محل القطب من الرحی ینحدر عنی السیل ولا یرقیٰ الی الطیر۔	پہن لیا لباس خلافت کو ابن ابی قحافہ نے (یعنی ابو بکر نے) اور بے شک وہ جانتے تھے اپنے آپ کو کہ میرا (یعنی ابو بکر کا) مرتبہ خلافت میں ایسا ہے جیسے چکی میں کیلی کا مرتبہ ہوتا ہے مجھ سے (علم و حکمت کا) دریا گرتا ہے اور میرے مرتبہ کی بلندی تک پرندہ بھی نہیں پہونچتا۔

یعنی ابو بکرؓ نے جو خلافت اختیار کی تو انھوں نے اول اپنی لیاقت اور علم اور مرتبے کو جانچ لیا تھا اور یہ جان لیا تھا کہ میں خلافت کے لیے ایسا مناسب ہوں جیسے چکی کے لیے کیلی اور میرا علم مثل دریائے رواں کے ہے۔

اور میرا مرتبہ ایسا بلند ہے کہ بلند پرواز جانور بھی اس کی بلندی کو نہیں پہنچتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابو بکرؓ نے جو خلافت کا منصب قبول کیا یہ کام اپنے حوصلہ سے بڑھ کر نہیں کیا بلکہ اپنے کمالات پر غور کر کے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں اس کام کے لائق ہوں۔ جس طرح اس قول میں ابو بکرؓ کے لیے قطب خلافت ہونے کی صفت مذکور ہے اسی طرح جناب امیر نے اس قول میں جب کہ عمرؓ نے قتال فارس کے لیے بذاتِ خود جانے میں مشورہ کیا تھا عمرؓ سے فرمایا تھا کہ تم قطبِ خلافت بنو اور عرب میں خلافت کی چکّی گھماؤ۔

فسدلت دونها ثوبًا و طویت عنها کشحًا۔	تو لٹکایا میں نے خلافت کے سامنے کپڑا اور موڑا میں نے اُس سے پہلو۔

جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب ابو بکرؓ نے اپنی لیاقت کو جانچ کر خلافت لی تو مجھ کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہ رہی اس لیے میں نے اپنے لیے خلافت کی کوشش نہ کی بلکہ خلافت کے سامنے میں نے پردہ لٹکا دیا یعنی میں اُس سے حجاب میں ہو گیا اور اس کے طلب کرنے سے میں نے پہلو موڑا اس بیان سے جناب امیر کی غرض یہ تھی کہ ابو بکرؓ اگر اس کام کے لائق نہ ہوتے تو میں ضرور دخل دیتا۔

وطفقت ارتای بین ان اصول بید جذاء او اصبر علی طخیۃ عمیاء	اور میں نے سوچنا شروع کیا کہ کٹے ہوئے ہاتھ سے جرأت کروں یا اپنی تاریک حالت پر ساکت رہوں۔

وفات رسولؐ کا صدمہ جناب امیر علیہ السلام پر ایسا غالب تھا

جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ادائے فرائض خلافت سے عاجز اور قاصر سمجھتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے اپنی حالت کو تاریک حالت اور اپنے ہاتھ کو دست بُریدہ فرمایا۔

جناب امیر فرماتے ہیں کہ اگرچہ میں نے طلب خلافت سے کنارہ کشی کی مگر اس کے ساتھ یہ بھی سوچنا شروع کیا کہ ایسی حالت میں کہ رسولؐ کے رنج نے میرا ہاتھ کاٹ دیا ہے اور تحمل بار خلافت سے عاجز کر دیا ہے میں طلب خلافت کی جرأت کروں یا اپنی حالت عجز پر ساکت رہوں۔

اس سوچنے اور فکر کرنے کی یہ ضرورت تھی کہ ابو بکرؓ نے اگرچہ اپنی لیاقت کا اندازہ کرکے منصب خلافت کو قبول کیا تھا مگر جب یہ بارِ عظیم ان کو اٹھانا پڑا تو ایسی دشواری پیش آئی کہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ خلافت مجھ سے واپس کرلو چنانچہ اس کا بیان اس خطبہ میں مذکور رہے گا۔ صحابہ میں سے جو لوگ اس کام کے لائق تھے ان میں سے یہ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ ابو بکرؓ کی اس التجا کو قبول کرے مگر جناب امیر علیہ السلام کے دل میں بمقتضائے مروت ابو بکرؓ کی ہمدردی کا خیال پیدا ہوا اسی وجہ سے انھوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ میں ایسی حالت میں کیا کروں؟ ہر طرح مشکل تھی اگر ابو بکرؓ کی التجا کو قبول کرکے خلافت لینے کا قصد کرتے تو رسولؐ کے رنج میں اپنے آپ کو ایسا ضعیف اور مضمحل پاتے تھے کہ گویا ہاتھ کٹا ہوا تھا اور اس بار عظیم کا اٹھانا دشوار تھا اگر اپنی حالت پر ساکت رہتے تھے تو ابو بکرؓ کی درخواست ان کی ہمدردی کا جوش دلاتی تھی۔ چونکہ آخر میں جناب امیر نے ان دونوں مشکلوں میں اس طرح تصفیہ کیا کہ اپنے آپ کو ابو بکرؓ کی درخواست قبول

کرنے سے عاجز سمجھا اور صبر و سکوت کو ترجیح دی اسی وجہ سے مصیبت فراق رسول کو حالت تاریک فرمایا اور آئندہ اس کی اور زیادہ تفصیل کی۔

یشیب فیہا الصغیر ویہرم فیہا الکبیر ویکدح فیہا مومن حتی یلقٰی ربہ

بوڑھا ہو جاوے اس میں بچہ اور بہت ضعیف ہو جاوے اس میں بوڑھا اور سختی اٹھاوے اس میں مومن اس وقت تک کہ اللہ سے ملے۔

وفات رسول کا رنج جو جناب امیر علیہ السلام پر طاری تھا اسی کو وہ پہلے فقرے میں حالتِ تاریک کہہ چکے ہیں اور اب اس کی تفصیل یوں بیان کی کہ وہ رنج ایسا سخت ہے کہ اگر بچہ پر وہ رنج طاری ہو تو اس کے صدمہ سے بوڑھا ہو جاوے اور اگر بوڑھے پر یہ صدمہ آئے تو وہ شیخ فانی بن جاوے اور مومن اس رنج میں زندگی بھر مبتلا رہے مومن کی تخصیص اس لیے کی کہ وفات رسولؐ کا رنج مومنین سے مختص تھا۔

فرأیت ان الصبر علی ہاتا احجی فصبرت وفی العین قذی وفی الحلق شجی۔

آخر میں نے یہ تصفیہ کیا کہ اس حالت عجز پر صبر کرنا بہتر ہے۔ پس سکوت کیا میں نے اور حال یہ تھا کہ آنکھ میں آشوب تھا اور حلق میں گرہ تھی۔

یعنی میں نے طلب خلافت کا قصد نہ کیا اور میری حالت یہ تھی کہ روتے روتے آنکھوں میں آشوب آگیا تھا اور ہچکیاں لیتے لیتے حلق میں گرہ پڑ گئی تھی۔

علمائے شیعہ یہ کہتے ہیں کہ اس خطبہ کے ابتدائی فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ جناب امیر یہ شکایت کرتے ہیں کہ ابوبکرؓ مجھ کو جانتے تھے کہ میں قطب خلافت اور دریائے علم اور بلند مرتبہ ہوں با ایں ہمہ انھوں نے خلافت لے لی۔

مگر یہ معنی ہرگز صحیح نہیں اس لیے کہ اس خطبہ کے آخر میں یہ مذکور ہے کہ جناب امیر کو خلافت کے قبول کرنے سے انکار تھا۔ سخت مجبوری کی حالت میں انھوں نے خلافت قبول کی تھی۔ اس سے پہلے جناب امیر کا یہ قول بھی مذکور ہو چکا کہ انھوں نے اول یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے چھوڑ دو اور میرے سوا کسی اور کو ڈھونڈھ لو۔ پس ظاہر ہے کہ جب جناب امیر اپنے واسطے خلافت پسند نہیں کرتے تھے تو یہ شکایت کیوں کرتے کہ ابوبکرؓ نے لباس خلافت کیوں پہن لیا اور مجھے کیوں نہ پہنایا۔

اب ہم اگر یہی معنی فرض کر لیں جو حضرات شیعہ کہتے ہیں تو شیعوں کی مشکل اور زیادہ ہے۔ ابوبکرؓ کے خلافت لینے کی جو شکایت کی اُس میں نص امامت بیان نہیں کی اور باوجود ضرورت کے اس موقع پر نص امامت کا ذکر نہ کرنا دلیل اس امر کی ہے کہ نص امامت کا وجود نہ تھا۔

اب جناب امیر نے جو یہ فرمایا کہ میں خلافت کے لیے ایسا تھا جیسے چکی کے لیے کیلی یعنی خلافت کی لیاقت مجھ میں اعلیٰ درجہ کی تھی اور مجھ سے دریائے علم جاری تھا اور میرا مرتبہ بہت بلند تھا ان سب کا حاصل یہ ہے کہ میں خلافت کے لیے سب سے افضل تھا مگر اس میں کوئی گناہ شرعی

ابوبکرؓ پر لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ جناب امیر ابوبکرؓ سے افضل تھے تب بھی دلیل شرعی سے یہ ثابت نہیں ہوا کہ باوجود افضل کے دوسرے شخص کو جو ان مراتب میں اُس سے کچھ کم ہو خلافت لینا جائز نہیں۔

اگر باوجود افضل کے غیر افضل کو خلافت جائز نہ ہوتی تو جناب امیر یہ کیوں فرماتے کہ مجھے چھوڑ دو اور خلافت کے لیے میرے سوا کسی دوسرے کو ڈھونڈھ لو۔

جناب امیر کا قول تو یہ تھا کہ فاسق کی خلافت بھی جائز ہے۔ چنانچہ جب خوارج نے یہ کہا کہ کسی کی حکومت جائز نہیں تو اُس کے جواب میں جناب امیر کا قول نہج البلاغت میں یہ مذکور ہے:۔

هؤلاء يقولون لا امرة وانه لابد للناس من امير بر او فاجر يعمل في امرته المؤمن ويستمتع فيها الكافر ويجمع به الفئ[1] ويقاتل به العدو وتأمن به السبل ويوخذ به للضعيف من القوي

خوارج کہتے ہیں کہ حکومت نہ ہو۔ حالانکہ ضرور ہے آدمیوں کے لیے کوئی امیر نیک ہو یا بدعمل کرے اس کی حکومت میں مومن اور فائدہ پاوے اُس میں کافر اور جمع کیا جاوے اس کے ذریعہ سے مال غنیمت اور لڑا جاوے اس کے ساتھ دشمن سے اور امن ہو جاوے اُس کے ذریعہ سے راستوں میں اور اس کے ذریعہ سے کمزور کے لیے زبردست سے مواخذہ کیا جاوے۔

---

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران۔ ج ۱۰۔ ۱۲

اس قول سے ثابت ہوگیا کہ جناب امیر خلیفہ کے لیے نیک اور متقی
ہونے کی شرط نہیں لگاتے تھے بلکہ فاسق کی خلافت بھی جائز سمجھتے تھے۔ یہاں
سے بہت اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ نص امامت کا ہرگز وجود نہ تھا۔

شیعہ کہتے ہیں کہ جناب امیر کے سوا کسی کی خلافت جائز نہیں اور
جناب امیر یہ کہتے ہیں کہ فاسق کی خلافت بھی جائز ہے۔

ان اقوال پر غور کرنے کے بعد سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر خلافت کسی اور
نے لے لی اور جناب امیر کو نہ دی تو اس پر کیا گناہ لازم آیا؟۔

پس جو معنی اس فقرہ کے علمائے شیعہ بیان کرتے ہیں اس کو اختیار
کرنے کی صورت میں نص امامت بھی باطل ہوتی ہے اور دلیل شکایت بھی ناتمام
رہتی ہے۔ حالانکہ بدلیل یقینی ثابت ہوچکا کہ ابوبکرؓ تمام صحابہ میں افضل تھے۔ یہ
بیان آیتِ غار کے تحت میں گزر چکا۔

پھر علمائے شیعہ کہتے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ کو
دست بُریدہ اس وجہ سے کہا کہ کوئی ان کا مددگار نہ تھا اور تین شخصوں کے سوا
سب مرتد ہوگئے تھے اور جناب امیر کے قول کا مطلب یہ ہے کہ میں یہ سوچتا تھا
کہ میں کٹے ہوئے ہاتھ سے یعنی اس بے کسی اور تنہائی کی حالت میں ابوبکرؓ پر
حملہ کرکے خلافت چھین لوں یا اس حالتِ تاریک پر صبر کروں۔ حالتِ
تاریک سے وہ احکام ظلم مراد ہیں جو خلافتِ ابوبکرؓ میں جاری تھے۔

مگر یہ قول کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ جناب امیر کو
پوری قوت حاصل تھی جس کی تفصیل جلد اول میں گزر چکی۔ مالک بن نویرہ معہ

تمام قوم بنی حنیف کے جناب امیر کے ساتھ تھا اور بگمان شیعہ اسی جرم میں معہ
اپنی تمام قوم کے ہلاک ہوا۔

سعد بن عبادہؓ سردار قبیلہ خزرج جناب امیر کی امامت کے معتقد
تھے وہ معہ تمام قبائل انصار کے ساتھ ہوسکتے تھے۔ بارہ ہزار صحابی رسولؐ کے
ایسے موجود تھے جو اہل بیت کے ساتھ کمال اخلاص رکھتے تھے۔ ان میں آٹھ
ہزار خاص مدینہ میں تھے۔ تمام بنی ہاشم جناب امیر کے ساتھ تھے۔ جناب امیر کی
ذاتی قوت ایسی تھی کہ تنہا بڑی بڑی فوجوں پر غالب آتے تھے۔ عمرؓ سے کئی بار
جناب امیر نے کشتی بھی لڑی اور یہ بھی کہا کہ اگر ہم کو صبر کا حکم نہ ہوتا تو ہم دکھا دیتے
کہ کس کے مددگار ضعیف ہیں اور کس کا گروہ تھوڑا ہے۔ ایک مرتبہ نماز کے بعد
مسجد میں جناب امیر نے خالدؓ کا گلا گھونٹ دیا اور قریب تھا کہ اس کا دم نکل جائے
آخر سب نے خوشامد کرکے چھڑایا حالانکہ ابوبکرؓ خلیفہ وقت بھی اس جلسہ میں
موجود تھے اور انھیں کی وجہ سے خالدؓ اس بلا میں مبتلا ہوئے تھے مگر ان کی
بھی مجال نہ ہوئی کہ علیؓ سے اس حرکت کا انتقام لیتے۔ ایک مرتبہ خالد ایک
لشکر کے ساتھ جاتے تھے اس وقت جناب امیر نے ایک لوہے کے لیے بانس
کو موڑ کر طوق کی طرح خالدؓ کے گلے میں ڈال دیا۔ آخر کسی طرح وہ طوق نہ نکل
سکا۔ اگرچہ خلیفہ وقت ابوبکر خالد کے حامی تھے اور خالد سے مقابلہ گویا انھیں
سے مقابلہ تھا مگر جناب امیر کے مقابلہ میں وہ ایسے عاجز تھے کہ کوئی تدبیر خالد
کی مخلصی کی نہ ہوسکی اور وہ طوق کسی طرح نہ نکل سکا۔ جب جناب امیر
کی خوشامد کی تو انھوں نے ہی نکالا۔ ایک مرتبہ جناب امیر نے عمرؓ کو دھمکانے

کے لیے اپنی کمان کو مہیب اژدہا بنا دیا اس کو دیکھتے ہی عمرؓ نہایت خوف زدہ اور بدحواس ہو گئے اور جناب امیر کی نہایت خوشامد کی تب جناب امیر نے اس اژدہے پر ہاتھ رکھا پھر وہ کمان ہو گیا۔ جناب امیر کو یہ بھی قدرت تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب چاہتے تھے قبر مبارک سے باہر بلا لیتے تھے اور جو چاہتے کہلوا دیتے تھے۔ اسم اعظم اور عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمان اور قوت معجزات اور لشکر جنات بھی ان کے پاس تھا بلکہ سلمانؓ کو ان پر یہ اعتراض تھا کہ اسم اعظم کے ذریعہ سے مخالفوں کو ہلاک کیوں نہیں کر دیتے۔

ابوبکرؓ کے پاس ایسا کیا عمل تسخیر تھا کہ رسولؐ کی وفات کے ساتھ دفعتاً تمام اہل عرب ابوبکرؓ کے جاں نثار ہو گئے اور باوجود دعوی اسلام کے اہل بیت رسولؐ کے دشمن بن گئے اور نص امامت جو سب کو معلوم تھی اس کی عمداً مخالفت کر کے اپنا گھر دوزخ میں بنایا (معاذ اللہ منہا) اور اہل بیت رسولؐ پر طرح طرح کے ظلم ہوتے دیکھے اور ذرا بھی پروا نہ کی۔ وہ بارہ ہزار صحابی جو مخلصین میں شامل تھے انھوں نے بھی اس وقت دغا کی۔ بالفرض اگر ابوبکرؓ کو خلافت کی طمع دامن گیر ہوئی تو اوروں کو کیا ہوا تھا؟ انصار اپنے واسطے خلافت چاہتے تھے جب وہ اپنی کوشش میں ناکام رہے تو انھوں نے ایسی مخالفت کی حالت میں بھی نص امامت کے مطابق جناب امیر کی طرف کیوں توجہ نہ کی۔

ابوبکرؓ نے اپنے لیے خلافت کی طلب بھی نہیں کی تھی دوسروں نے اُن کے لیے خلافت تجویز کی وہ اپنی خلافت کے زمانہ میں بھی یہ کہتے تھے کہ مجھ سے خلافت واپس کر لو۔ پھر یہ خیال کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے کہ انھوں نے خلافت کی طمع میں

یکایک کسی عمل تسخیر یا کسی جذب مقناطیسی سے سب کے دل اپنی طرف پھیر لیے عمرؓ اور عثمانؓ کو کیا خبر تھی کہ ابوبکرؓ کے بعد ہم کو خلافت ملے گی جو اس طمع میں ابوبکرؓ کے مددگار رہتے۔

اگر انصاف کرو تو فقط یہی بات کہ ابوبکرؓ نے جو کسی عمل تسخیر یا جذب باطنی یا توجہ قلبی سے دفعۃً تمام عرب کے دلوں کو مسخر کر کے اپنا طرفدار بنا لیا اور علیؓ سے سب کو عداوت ہو گئی دلیل اس امر کی ہے کہ مستحق خلافت کے ابوبکرؓ تھے نہ علیؓ اس لیے کہ ابوبکر کی یہ لیاقت اعلیٰ درجہ کی ظاہر ہو گئی کہ سب مسلمان انھیں سے راضی تھے اور خلیفہ وہی ہونا چاہیے جس سے سب مسلمان راضی ہوں اور جناب امیر کس طرح مستحق خلافت ہو سکتے تھے۔ جن کو سب نے چھوڑ دیا اور ان کے ہاتھ کٹ گئے۔

نہج البلاغتؔ[1] میں ایک خط جناب امیر کا عثمان بن حنیف انصاری عامل بصرہ کے نام مذکور ہے اس میں یہ بھی ہے:۔

لو تظاهرت العرب علی	اگر متفق ہو جاوے تمام عرب مجھ سے
قتالی لما ولیت عنها ولو	لڑنے پر تو میں ان سے منھ نہ پھیروں اور
امکنت الفرص من رقابها	اگر ظاہر ہو ایک رگ ان کی گردن میں
لسارعت الیها	تو فوراً حملہ کروں میں اس کی طرف۔

اس قول میں جناب امیر فرماتے ہیں کہ اگر تمام عرب میرے مقابلہ پر متفق ہو جاوے تو میں ان کے مقابلے سے منھ نہ پھیروں اور اگر ان کی گردن

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۴ ص ۳۔

کی ایک رگ بھی اُٹھے یعنی ذرا بھی مجھ پر غصہ کریں تو میں فوراً حملہ کروں۔

ایک اور خط جناب امیر کا نہج البلاغت[1] میں مذکور ہے جو اہل مصر کے نام مالک اشتر کے ہاتھ بھیجا تھا اُس میں مذکور ہے:۔

انی واللہ لو لقیتھم واحدا	واللہ اگر مقابل ہوں میں اُن سے اکیلا
وھم طلاع الارض کلھا	اور وہ اس قدر ہوں کہ تمام روئے زمین
ما بالیت ولا استوحشت	اُن سے بھر جاوے تو میں کچھ پروا نہ کروں اور نہ مجھے پریشانی ہو۔

خصال[2] بن بابویہ میں ایک طویل روایت ہے جس میں جناب امیر علیہ السلام سے ایک یہودی نے پوچھا ہے کہ ائمہ کے کتنے امتحان ہوا کرتے ہیں؟ اور اس کے جواب میں جناب امیر نے اپنے امتحانات بیان کیے ہیں اُس میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب ابوبکرؓ نے خلافت لے لی تو صحابہ میری مدد کے لیے آتے تھے اور لڑنے کی ترغیب دیتے تھے۔ چنانچہ عبارت اس کی یہ ہے:۔

وجماعۃ من خواص اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم	اور جماعت خواص اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو زیادہ پہچاننے والے تھے
اعرفھم بالنصح للہ و لرسولہ ولکتابہ ولدینہ	اللہ اور رسول کے ساتھ اخلاص کو اور اس کی کتاب کو اور اس کے دین اسلم کو،
الاسلام یاتونی عودا وعلانیۃ	آتے تھے میرے پاس بار بار اور ظاہر اور
وسرا فیدعونی الی اخذ	پوشیدہ اور یہ تحریک کرتے تھے کہ میں

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۳۶ - [2] خصال ابن بابویہ مطبوعہ طہران ج ۲ ص ۱۵

حقی ویبذلون انفسھم فی نصرتی۔	اپنا حق لے لوں اور وہ اپنی جانیں دینا چاہتے تھے میری مدد میں۔

پھر اسی روایت میں دوبارہ یہ مذکور ہے:۔

انی کنت اکثر عددا و	میرے گروہ کا عدد سب سے زیادہ تھا اور
اعز عشیرۃ و امنع رجالا	میرا خاندان سب پر غالب تھا اور میرے
واطوع امرا۔	آدمی سب سے زبردست تھے اور میرا حکم سب سے زیادہ مانا جاتا تھا۔

جناب امیر کی ان تمام قولوں پر غور کرنے کے بعد کیوں کر یہ قول صحیح ہوسکتا ہے کہ جناب امیر اس وقت میں اپنے آپ کو عاجز سمجھتے تھے اور اپنے ہاتھ کو کٹا ہوا ہاتھ کہتے تھے۔

جب کہ جناب امیر کی تنہائی اور بے کسی کا خیال غلط ہوگیا تو یہ قول بھی غلط ہوگیا کہ جناب امیر یہ سوچتے تھے کہ میں ایسی بے کسی کی حالت میں لڑوں یا صبر کروں۔

نہایت عجیب امر یہ ہے کہ جناب امیر کو تو معلوم تھا کہ مجھ کو اس حالت میں صبر کا حکم ہے۔ پھر یہ سوچنا کیسا تھا کہ صبر کروں یا نہ کروں کیا اللہ کا حکم مانوں یا اس کی مخالفت کروں۔

امام معصوم کو اس مسئلہ میں تردد کیوں ہوا جو سوچنا پڑا۔ اس لیے کہ بموجب اعتقاد حضرات شیعہ کے معصوم کو اجتہاد کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جناب امیر علیہ السلام کو ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لڑنے کا خیال کیوں
پیدا ہوتا وہ تو خلافت ابوبکرؓ سے مزاحمت کرنے کو فتنہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ نہج البلاغت[1]
میں ہے:۔

ومن کلام لہ علیہ السلام	اور جناب امیر علیہ السلام کا کلام ہے
لما قبض رسول اللہ صلی	جب کہ وفات پائی رسول اللہ صلی اللہ
اللہ علیہ وسلم وخاطبہ	علیہ وسلم نے اور عباس اور ابوسفیان نے
العباس وابو سفیان فی ان	جناب امیر سے یہ درخواست کی کہ ان
یبایعا لہ بالخلافۃ ایھا الناس	سے خلافت کی بیعت کریں۔ اے آدمیو!
شقوا امواج الفتن بسفن	نجات کی کشتیوں کے ساتھ فتنہ کی موجوں
النجاۃ وعرجوا عن طریق	سے بچو۔ اور نفرت کے راستہ سے جُدا
المنافرۃ وضعوا تیجان	ہو جاؤ اور فخر کا تاج اُتار رکھو۔
المفاخرۃ۔	

یعنی ابوبکرؓ کی خلافت میں خلل ڈالنا فتنہ ہے اور نفرت کا طریقہ ہے
اس سے پرہیز کرو اور تم کو جو یہ خیال پیدا ہو کہ خلیفہ عبد مناف کی اولاد میں سے
کیوں نہ ہوا بنی تیم میں سے کیوں ہوا یہ غرور اور فخر کا طریقہ ہے اس فخر کے تاج
کو سر سے اُتارو اور بنی تیم کو اپنے مقابلے میں کم مت سمجھو۔

افلح من نھض بجناح او	کامیاب ہوا وہ جو اٹھا قوت بازو کے ساتھ
استسلم فاراح۔	یا اطاعت کی اور راحت دی۔

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۸۔

یعنی کامیابی دو قسم کے آدمیوں کو ہے۔ ایک وہ جو قوت کے ساتھ
خلافت کا بوجھ اٹھانے کے لیے کھڑا ہوا۔ دوسرے گروہ جس نے اطاعت کی اور
کوئی جھگڑا اور فتنہ نہ کیا اور اپنی جان کو اور سب مسلمانوں کو اپنے فتنے سے راحت
دی۔ قوتِ بازو سے مراد جماعت مہاجرین وانصار کی بیعت ہے جو ابوبکر کو
حاصل ہوئی ہے۔ اس قول میں بھی جناب امیر نے یہ اشارہ کر دیا کہ خلافت میں
کامیابی اس کو ہے جس سے سب نے بیعت کی اور باقی سب مسلمانوں کو اطاعت
میں کامیابی ہے اور اب جو شر اور فساد اُٹھاوے گا وہ نامراد ہے۔ حاصل یہ ہوا
کہ خلافت کا مستحق وہ ہے جو اقویٰ ہے اور باقی سب مسلمانوں کو اس کی اطاعت
چاہیے۔

جناب امیر نے دوسرے قول میں بھی فرمایا ہے کہ خلافت کا مستحق
وہ ہے جو اقویٰ اور اعلم ہو یہ قول آئندہ مذکور ہوگا۔

ماء آجن ولقمۃ یغص	پانی کڑوا ہے اور لقمہ ایسا کہ حلق بند ہوتا
بھا آکلھا	ہے اس سے کھانے والے کا۔

یعنی خلافت میں راحت نہیں ہے بلکہ سخت مصیبت ہے اور اس
کے فرائض کا ادا کرنا بہت مشکل ہے اور بہت بڑی جوابدہی کا کام ہے۔

ومجتنی الثمرۃ لغیر وقت	اور پھل چننے والا ایسے وقت میں جو ان
ایناعھا کالزارع بغیر	کی پختگی کا وقت نہیں ہے ایسا ہے جیسے کھیتی
ارضہ۔	بونے والا ایسی زمین میں جو اس کی نہیں۔

اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام کو اپنی خلافت

حاصل ہونے کا وقت معلوم تھا! چنانچہ روایات کتب شیعہ سے بھی یہ ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بی بی حفصہ ام المومنین کو راضی کرنے کے لیے یہ بشارت سُنائی تھی کہ میرے بعد ابوبکرؓ خلیفہ ہوں گے ان کے بعد تیرا باپ عمرؓ۔ چنانچہ تفسیر صافی میں تفسیر سورۂ تحریم میں بحوالہ تفسیر[1] قمی یہ نقل کیا ہے:-

فقال ان ابا بکر یلی الخلافۃ بعدی ثم بعدہ ابوک فقالت من انبأک ھذا۔ قال نبأنی العلیم الخبیر۔	پس فرمایا رسولؐ نے کہ بیشک ابوبکرؓ والی خلافت ہوگا میرے بعد پھر اس کے بعد تیرا باپ۔ حفصہؓ نے پوچھا کہ یہ خبر تم کو کس نے دی ہے؟ رسولؐ نے فرمایا کہ مجھے علیم خبیر نے خبر دی ہے۔

[1] علی بن ابراہیم قمی کی روایت کا حاصل یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بی بی حفصہ ام المومنین کے حجرہ میں گئے وہ انہیں کی نوبت کا دن تھا۔ ماریہ قبطیہ بھی خدمت کے لیے ساتھ تھیں۔ حفصہ کسی کام کے لیے گئی تھیں اس وقت میں رسولؐ نے ماریہ سے خلوت کی حفصہؓ کو اس کی شکایت ہوئی تو رسولؐ نے فرمایا کہ اے حفصہ تم خفا مت ہو میں نے آئندہ ماریہ کو اپنے اوپر حرام کیا اور میں تم سے ایک راز مخفی کہتا ہوں اگر اس کا افشا کروگی تو اللہ بہت ناراض ہوگا حفصہ نے پوچھا کہ وہ کیا راز ہے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد ابوبکرؓ والی خلافت ہوگا اس کے بعد عمرؓ۔ حفصہؓ نے پوچھا کہ تم کو کس نے خبر دی ہے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو علیم خبیر نے خبر دی ہے۔ اس روایت کی عبارت بقدر ضرورت ہم نے نقل کی ہے۔ پس اگر ابوبکرؓ پہلی خلافت کو قبول نہ کرتے تو پیغمبرؐ کی تکذیب ہوتی حالانکہ مومنین پر خبر کی تصدیق واجب ہے ۱۲

پھر بحوالہ تفسیر مجمع البیان اور تفسیر عیاشی امام باقر علیہ السلام سے یہی مضمون نقل کیا ہے۔ پس جس خلافت کی بشارت پیغمبرؐ نے اپنی بی بی کو راضی کرنے کے لیے سُنائی وہ خلافت کیونکر ناجائز ہوگی؟ پیغمبرؐ کی یہ شان نہ تھی کہ اپنی بی بی کو ایسی خبر سے خوش کرتے جو مرضی الٰہی کے خلاف ہوتی۔

چونکہ یہ امر تقدیری معلوم ہوچکا تھا اور یہ خبر مشہور ہوگئی تھی اب اگر صحابہ کو یہ حکم ہوا تھا کہ بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علی کو خلیفہ بنانا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تقدیر الٰہی کو پلٹ دینا۔ گویا یوں حکم کیا۔

خدا چاہتا ہے کہ دے بعد میرے ۔۔۔ خلافت ابوبکر کو پھر عمر کو
مگر تم علی کو بلا فصل کرنا ۔۔۔ بدل دینا حکم قضا و قدر کو

جناب امیر کو بھی یہ مضمون معلوم تھا اسی لیے انہوں نے کہا کہ اس وقت میں ہماری خلافت طلب کرنا قبل از وقت ہے اور ایسا ہے جیسے پھلوں کی تیاری سے پہلے کوئی شخص پھل توڑنے کا ارادہ کرے وہ اسی طرح ناکام ہوتا ہے جیسے کوئی شخص ایسی زمین میں کھیتی کرے جس میں اس کا حق نہیں۔ اس کھیتی کے اس بونے والے کو فائدہ نہ ہوگا یعنی اس وقت مستحق خلافت ابوبکرؓ ہیں ان کی خلافت میں ہم کو دخل دینا ایسا ہے جیسے کہ دوسرے کی زمین میں کھیتی بونا اور جب کہ جناب امیر کو یہ معلوم تھا کہ ابھی میری خلافت کا وقت نہیں ہے پھر کیا وجہ جو وہ یہ سوچتے تھے کہ دست بریدہ ہوں لڑوں یا صبر کروں۔

فان اقول یقولوا احرص علی الملک وان اسکت	اب اگر میں دعوے کروں گا تو کہیں گے کہ حکومت کا حریص ہے اور جو ساکت

یقولوا جزع من الموت — رہوں گا تو کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا۔

مطلب یہ ہے کہ تمام مہاجرین و انصار ابوبکرؓ سے بیعت کر چکے اس کے بعد اگر میں دعویٰ کر دوں تو سب لوگ یہ کہیں گے کہ حکومت کا حریص ہے۔ یہ اس وجہ سے کہتے تھے کہ بعد انعقاد خلافت ابی بکرؓ کے جناب امیر کا دعویٰ کسی حجت شرعی کے ساتھ نہ ہوتا۔ یہ بھی دلیل نص امامت کے باطل ہونے کی ہے ورنہ اگر نص امامت موجود ہوتی تو سب لوگ یہی کہتے کہ بموجب نص رسول کے دعویٰ ہے حریص ملک کیوں بتاتے۔

اور اگر دعوے سے ساکت رہوں تو کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا۔

هیهات بعد اللتیا واللتی — افسوس ہے کہ بعد ان سب باتوں کے
واللہ لابن ابی طالب انس — قسم ہے خدا کی کہ ابن ابی طالب زیادہ
بالموت من الطفل بثدی — محبت رکھنے والا ہے موت کے ساتھ
امہ — اُس بچہ سے جو اپنی ماں کی پستان کے ساتھ محبت رکھتا ہو۔

یعنی طلب خلافت سے جو میرا سکوت ہے وہ ہرگز اس وجہ سے نہیں کہ مجھ کو موت کا خوف ہے۔ لوگوں کے خیالات پر افسوس ہے جو میری نسبت ایسا گمان کریں میں تو اپنی موت کا ایسا مشتاق ہوں کہ بچہ بھی ماں کے دودھ کا ایسا مشتاق نہیں ہوتا پھر میں موت سے کیوں ڈرتا بلکہ میرا سکوت اس وجہ سے ہے کہ ابوبکرؓ کی خلافت میں مزاحمت کرنا فتنہ ہے اور میری خلافت کا ابھی وقت نہیں آیا۔

اب انصاف فرمائیے کہ جناب امیر کو تو اپنی شجاعت کا ایسا دعویٰ تھا پھر وہ اپنے ہاتھ کو دست بریدہ کیوں کہتے یا کوئی اُن پر یا اُن کے اہل بیت پر ظلم کرتا تو اُن کو سکوت کی کہاں تاب ہوتی۔

بل اندمجت علی مکنون — بلکہ مجھے معلوم ہیں ایسی پوشیدہ باتیں
لو بحت بہ لاضطربتم — کہ اگر میں اُن کو ظاہر کر دوں تو تم اس طرح
اضطراب الارشیۃ فی — تڑپو جیسے گہرے کوؤں میں رسیاں تڑپتی
الطوی البعیدۃ — ہیں۔

یعنی تم مجھے دعویٰ خلافت کی ترغیب دیتے ہو مگر مجھے آئندہ کے حالات ایسے معلوم ہیں کہ اگر میں تم پر ظاہر کر دوں تو تم ایسے تڑپ جاؤ جیسے رسّی گہرے کوئیں میں تڑپتی ہے۔ وہ باتیں شاید یہ تھیں کہ ابوبکرؓ کے بعد جو خلافت لے گا وہ قتل ہوگا ان کے بعد جو خلیفہ ہوگا وہ قتل ہوگا ان کے بعد میں خلیفہ ہوں گا میں بھی قتل ہوں گا۔ پس ابوبکر تو خلافت لے چکے اب اُس کے بعد تم خلافت کی میرے لیے کوشش کرتے ہو حالانکہ اس کا نتیجہ قتل ہوگا اور جو چیز باعثِ قتل ہو اُس سے تو بچنا چاہیے نہ کہ اُس کو طلب کرنا۔

بھلا جناب امیر علیہ السلام کو ابوبکرؓ سے لڑنے کا خیال کیوں پیدا ہوتا وہ تو اپنی بیعت کرنے سے پہلے بھی ابوبکرؓ کی اطاعت کو اپنے ذمے واجب سمجھتے تھے۔

چنانچہ نہج البلاغت میں ہے کہ جناب امیر نے فرمایا:۔

الذلیل عندی عزیز حتی — عاجز آدمی میرے نزدیک زبردست ہے

اخذ الحق لہ والقوی عندی ضعیف حتی اخذ الحق منہ۔

تاکہ اس کا حق اور وں سے لے کر دلاؤں اور زبردست میرے نزدیک ضعیف ہے تاکہ اُس کا حق لوں۔

جب جناب امیر کی یہ حالت تھی تو پھر وہ کسی زبردست سے کیوں ڈرتے اور اپنے ہاتھ کو دست بریدہ کیوں کہتے اور اگر خلافت کو اپنا حق سمجھتے تو کیوں چھوڑتے۔

رضینا عن اللہ قضاءہ و سلمنا لہ امرہ۔

ہم اللہ کی تقدیر پر راضی ہیں اور جو اللہ کا حکم ہے اس کو تسلیم کرتے ہیں۔

یعنی ہم کو معلوم ہے کہ اللہ نے پہلی خلافت ابوبکرؓ کے لیے مقرر کی ہے ہم اللہ کی اس تقدیر پر راضی ہیں ہرگز ہم کو شکایت نہیں۔

اترانی اکذب علی رسول اللہ واللہ لانا اول من صدقہ فلا اکون اول من کذب علیہ۔

کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ میں رسول پر جھوٹ بولتا ہوں۔ واللہ میں نے سب سے پہلے ان کی تصدیق کی ہے اب میں سب سے پہلے اُن پر جھوٹ بولنے والا نہوں گا۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو یہ خبر دے گئے ہیں کہ پہلی خلافت حق ابی بکر ہے میں یہ خبر سچی بیان کرتا ہوں ہرگز جھوٹی نہیں۔

فنظرت فی امری فاذا طاعتی سبقت بیعتی واذا المیثاق فی عنقی لغیری۔

پس میں نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو یکایک یہ معلوم ہوا کہ میری اطاعت میرے بیعت کرنے سے پہلے تھی اور یکایک یہ معلوم ہوا

کہ عہد میری گردن میں غیر کا تھا۔

میسم بحرانی نے اپنی شرح میں نقل کیا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا خطبہ ہے اور اس میں جناب امیر نے اپنا حال اُس وقت سے بیان کیا ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی ہے مگر رضی نے نہج البلاغت میں پورا خطبہ نقل نہ کیا بلکہ ایک ٹکڑا اس میں سے نقل کیا۔

مطلب جناب امیر کا یہ ہے کہ وفات رسولؐ کے بعد جو میں نے اپنے معاملہ میں غور کیا تو یکایک مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ بیعت کرنے سے پہلے ہی ابوبکرؓ کی اطاعت مجھ پر واجب تھی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خبر دے گئے تھے کہ ابوبکرؓ خلیفہ برحق ہوں گے ان کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ اس سے پہلے جناب امیر نے فرمایا کہ میں رسول پر جھوٹ نہ بولوں گا۔

پھر قول جناب امیر کا یہ ہے کہ یکایک مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ غیر کا یعنی ابوبکر کا عہد میری گردن میں ہے یعنی مہاجرین و انصار نے ابوبکر سے بیعت کرلی تھی اس وجہ سے یہ عہد میرے ذمہ بھی واجب ہو گیا تھا اس لیے کہ بیعت کے وقت جو لوگ موجود ہوں ان کی بیعت ان پر بھی لازم ہو جاتی ہے جو اس وقت موجود نہ ہوں۔

اور چونکہ جناب امیر نے یہ فرمایا کہ میری بیعت سے پہلے ابوبکرؓ کی بیعت مجھ پر فرض ہو گئی اور ان کا عہد میری گردن پر آگیا تھا اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اگر یہ مانا جائے کہ جناب امیر نے بیعت میں تاخیر کی تھی تو وہ تاخیر اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ ابوبکرؓ کی اطاعت کو واجب نہ سمجھتے ہوں بلکہ بطور دوستانہ

شکایت کے تھی اور اس تاخیر میں کوئی حرج نہیں سمجھا تھا اس لیے کہ مقصود بیعت یعنی عہد اطاعت قبل بیعت حاصل تھا۔

جناب امیر کو ابوبکرؓ سے لڑنے کا خیال کیسے پیدا ہو سکتا تھا وہ تو ابوبکرؓ کی خلافت کو خلافت حقہ سمجھتے تھے بلکہ یوں کہتے تھے کہ جس طرح خلفائے ثلثہ کی خلافت حق تھی اسی طرح میری خلافت بھی حق ہے اس لیے کہ جس ذریعہ سے ان کو خلافت حاصل ہوئی تھی اسی ذریعہ سے مجھ کو حاصل ہوئی ہے اور جن مہاجرین اور انصار نے جس شرط پہ ان سے بیعت کی انھیں مہاجرین و انصار نے اسی شرط پر مجھ سے بیعت کی ہے پس جس طرح ان کی خلافت برحق تھی اسی طرح میری خلافت بھی برحق ہے اور جس طرح ان کی اطاعت سب پر واجب تھی اسی طرح میری اطاعت بھی سب پر واجب ہے۔ چنانچہ نہج البلاغت میں ہے[1]:-

ومن کتاب لہ علیہ السلام الی معویۃ انہ بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علی ما بایعوھم علیہ۔

اور جناب امیر نے خط لکھا تھا معاویہؓ کو کہ بے شک مجھ سے انھیں لوگوں نے بیعت کر لی جنھوں نے ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ سے بیعت کی تھی اسی شرط پر جس شرط پر ان سے بیعت کی تھی۔

فلم یکن للشاھد ان یختار ولا للغائب ان یرد۔

اب نہ کسی حاضر کو یہ جائز ہے کہ کسی اور کو پسند کرے اور نہ غائب کو یہ اختیار ہے کہ اس کو رد کرے۔

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۳۰۔

وانما الشوری للمھاجرین والانصار فان اجتمعوا علی رجل وسموہ اماما کان ذلک للہ رضا فان خرج من امرھم خارج بطعن او بدعۃ ردوہ الی ما خرج منہ فان ابی قاتلوہ علی اتباعہ غیر سبیل المومنین وولاہ اللہ ما تولی۔ ولعمری یامعویۃ لئن نظرت بعقلک دون ھواک لتجدنی ابرأ الناس من دم عثمان ولتعلم انی کنت فی عزلۃ منہ

اور نہیں ہے شوریٰ مگر مہاجرین اور انصار کے لیے پس اگر وہ جمع ہو کر کسی کو امام مقرر کر دیں تو وہی اللہ کی رضامندی ہے پھر اگر نکلے ان کے امر سے کوئی نکلنے والا خلیفہ پر طعن کر کے یا خود طریقۂ بدعت اختیار کر کے تو اس کو پھیر دو اسی بیعت کی طرف جس سے وہ نکلتا ہے۔ پھر اگر وہ انکار کرے تو اس سے لڑو اس سبب سے کہ اُس نے مومنین کے طریقہ کے خلاف طریقہ اختیار کیا اور پھیر دیا اُس کو حق سے اللہ نے۔ اور میں قسم کھاتا ہوں اپنی جان کی اے معاویہ اگر تو اپنی ہوا کو چھوڑ کر اپنی عقل سے غور کرے تو قتل عثمانؓ کے اتہام میں تو مجھ کو سب آدمیوں سے زیادہ بری پاوے گا اور البتہ تو جان لے گا کہ میں ایک گوشہ میں تھا اُس سے:

جناب امیر نے اول یہ فرمایا کہ جن لوگوں نے ابوبکر اور عمر اور عثمان سے بیعت کی تھی اُنھیں لوگوں نے مجھ سے بیعت کی ہے۔ پس جس طرح وہ تینوں امام برحق تھے اسی طرح میں امام برحق ہوں اور جس طرح ان کی

امامت سے کسی بیعت کرنے والے یا غائب کو انکار کرنا یا بغاوت کرنا یا کسی دوسرے کو امام مقرر کرنا جائز نہ تھا اسی طرح میری امامت سے انکار جائز نہیں۔

جب جناب امیر کا یہ قول تھا تو پھر کیوں کر یہ خیال صحیح ہو سکتا ہے کہ جناب امیر کو یہ تمرد دہو کہ ابو بکرؓ سے لڑوں یا نہ لڑوں۔ اگر جناب امیر ابو بکر سے لڑتے تو ابو بکر کے مقابلہ میں ان کی وہی حالت ہوتی جو جناب امیر کے مقابلہ میں امیر معاویہ کی ہوئی۔

پھر جناب امیر نے یہ ظاہر فرمادیا کہ امام مقرر کرنے کا اختیار مہاجرین اور انصار کو ہے جس کو وہ امام بناویں اُسی سے اللہ راضی ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ امامت کے لیے نص نہ تھی بلکہ امامت بیعت مہاجرین وانصار سے حاصل ہوتی تھی۔

خلفائے ثلٰثہ کو مہاجرین وانصار نے امام بنایا تھا پس اللہ ان کی امامت سے راضی تھا۔

مہاجرین وانصار جس کو امام بنا دیں پھر اُس سے جو کوئی مخالفت کرے اور سمجھانے سے نہ مانے اُس سے مومنین کو لڑنا چاہیے پس اگر جناب امیر ابو بکرؓ کی مخالفت کر کے ان سے لڑتے تو تمام مومنین کو جناب امیر سے لڑنا واجب ہوتا۔

مہاجرین وانصار جس کو امام بنا دیں اس پر طعن کرنا بھی جائز نہیں جو طعن کرے وہ بھی باغی ہے اور اُس سے لڑنا جائز ہے۔

جناب امیر نے جو یہ فرمایا قاتلوہ علی اتباعہ غیر سبیل المومنین وولاہ اللہ اس میں انھوں نے قرآن کی ایک آیت کی طرف اشارہ کیا جو سورۂ نساء میں مذکور ہے وہ یہ ہے :۔

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا ۝

اور جو شخص مخالفت کرے رسول کی ہدایت ظاہر ہو جانے کے بعد اور اتباع کرے غیر طریقہ مومنین کا پھیریں گے ہم اس کو جدھر کو پھرا اور ڈالیں گے ہم اس کو جہنم میں اور وہ بُرا ٹھکانا ہے۔

فاضل میثم بحرانی نے اس قول کی شرح میں لکھا ہے کہ جناب امیر کے خط میں (ولاہ اللہ) سے آگے (ما تولی) اور اس کے بعد پوری آیت لکھی تھی دوسری جگہ فاضل میثم نے پورا خط بھی نقل کیا ہے جس میں پوری آیت مذکور ہے۔ رضی نے اپنی عادت خیانت کے بموجب خط کا فقط ایک ٹکڑا نقل کیا اور اس آیت کے باقی لفظ بھی حذف کر دیے۔

جناب امیر علیہ السلام نے جو یہ فرمایا تھا کہ مہاجرین وانصار کے بنائے ہوئے امام سے جو مخالف ہو اُس سے لڑو اس دعوے کی دلیل میں یہ آیت ذکر کی اس سے ثابت ہوا کہ جناب امیر نے ان مہاجرین وانصار کو جنھوں نے ابو بکر اور عمر اور عثمان کو امام بنایا مومن مانا یہ وہی لوگ ہیں جن کو حضرات شیعہ مرتد کہتے ہیں۔ (معاذ اللہ منہا)

جناب امیر نے اس آیت کے ذکر سے یہ بھی ثابت کر دیا کہ ابو بکرؓ

اور عمرؓ اور عثمانؓ امام المومنین تھے اسی طرح میں بھی امام المومنین ہوں۔

اس آیت میں جہنم کی سزا اُس شخص کے لیے مذکور ہے جو حق ظاہر ہو جانے کے بعد رسول کی اور طریقۂ مومنین کی مخالفت کرے اور جناب امیر نے اس آیت کو اُس شخص پر صادق کیا جو ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ سے باغی ہو پس ثابت ہوا کہ جو شخص ابوبکر اور عمر اور عثمان اور علی کا مخالف ہو وہ رسول کا بھی مخالف ہے اور اس کی سزا جہنم ہے۔ شیعوں کے مقابلے میں جو اہل سُنت کا مذہب ہے وہ سب اس کلام معجز نظام سے ثابت ہوگیا اور چونکہ جناب امیر نے اس کے ثبوت میں قرآن کی آیت بھی ذکر کر دی ہے اس لیے ثابت ہوگیا کہ اہل سنت کا مذہب ثقلین کے مطابق ہے اور شیعوں کا مذہب ثقلین کے خلاف ہے۔

اے حضرات شیعہ

یاد رہے کہ قیامت کے دن یہی قول تم پر حجت ہوگا

جب روزِ جزا حساب ہوگا اس قول کا کیا جواب ہوگا
محشر میں نجات اُسے ملے گی جو تابعِ بوتراب ہوگا

علمائے شیعہ اس قول کی تاویل میں سخت عاجز ہیں اور مجبور ہو کر یہ کہتے ہیں کہ جو لوگ نص امامت کو نہیں مانتے تھے ان کے سامنے جناب امیر نے اپنی خلافت کے ثابت کرنے کے لیے ایسے طریقے سے استدلال کیا جو اُن کو مسلم تھا مگر جناب امیر کو مسلم نہ تھا۔ مگر یہ تاویل بچند وجوہ باطل ہے۔

اوّل یہ کہ جناب امیر نے اس قول کو قرآن سے ثابت کیا اور جو مضمون قرآن سے ثابت ہو وہ بے شک اُن کا مذہب ہے۔

دوسرے یہ کہ اس کلام میں کوئی ایسا قرینہ نہیں جس سے سمجھا جائے کہ یہ قول جناب امیر کو مسلم نہ تھا پس بغیر قرینہ کے ظاہر قول کیوں چھوڑا جائے اور ایسی تاویل کیوں کی جاوے جس کا اس کلام میں کوئی اشارہ نہیں بلکہ انصاف کیجیے تو بہت سے قرائن یہی ثابت کرتے ہیں کہ جو کچھ جناب امیر اس قول میں کہہ رہے ہیں ان کا اعتقاد بھی یہی تھا۔ اگر امیر معاویہؓ کو الزام دینے کے لیے ایسا لکھا تھا تو اتنا لکھ دینا کافی تھا کہ جن لوگوں نے خلفائے ثلثہ سے بیعت کی تھی انھیں لوگوں نے مجھ سے بیعت کی ہے۔ الزام دینے کی ضرورت فقط اتنے قول سے پوری ہوگئی تھی۔ اس کے بعد جو جناب امیر نے یہ لکھا کہ شوریٰ کا اختیار مہاجرین اور انصار کے سوا کسی اور کو نہیں اور جس کو وہ امام بنا دیں اُس سے اللہ راضی ہے اور جو اُس سے باغی ہو اُس سے لڑو اور پھر قرآن کی آیت سے اُس کو ثابت کیا۔ یہ تمام قرائن اس امر کے ہیں کہ جناب امیر وہی مضمون ثابت کر رہے ہیں جو اُن کے نزدیک حق ہے ورنہ بلا ضرورت امر ناحق کی اتنی تائید کیوں کرتے اور ایسی تفصیل کیوں بیان کرتے۔

ظاہر کلام بغیر قرینہ خلاف کے ہرگز نہیں چھوڑا جاتا اور یہاں کوئی قرینہ خلاف معنی ظاہر کے نہیں بلکہ معنی ظاہر کی تائید کے قرائن موجود ہیں پھر ظاہر کلام کو چھوڑنا ظلم ہے اور ظاہر ہر قول کا یہی ہوتا ہے کہ کہنے والے کے نزدیک حق یہی ہے جو کہہ رہا ہے۔

یہ امر فصاحت وبلاغت کے خلاف ہے کہ کہنے والا اپنے مذہب
کے خلاف کوئی بات کہے اور اُس میں کوئی ایسا اشارہ نہ کر دے کہ یہ قول اُس
کہنے والے کے نزدیک حق نہیں بلکہ اس کے خلاف اُسی قول کی بہت سی تائید
کر دی۔ جناب امیر کمال فصاحت وبلاغت میں بے نظیر تھے پھر بھلا اُن کے کلام
میں ایسے عیب کو کیوں کر دخل ہو سکتا ہے؟

(۴) تیسرے یہ کہ اگر جناب امیر کو الزامی دلیل پیش کرنی منظور تھی تو اس
کے ساتھ نص امامت بھی ضرور ذکر کر دیتے اور یوں لکھتے کہ رسول صلی اللہ علیہ
وسلم نے بھی مجھی کو امام بنانے کا حکم کیا ہے اور مہاجرین اور انصار نے بھی مجھ سے
بیعت کی ہے پس دونوں طرح سے امامت مجھی کو حاصل ہے اور جب دونوں
دلیلوں سے استدلال ہوتا تو فقط ایک الزامی دلیل کے مقابلے میں نہایت
قوی ہوتا پس قوی استدلال کو چھوڑ کر فقط ضعیف استدلال پر کیوں اکتفا کیا۔
اور ... دونوں دلیلوں کو جمع کیوں نہ کیا۔ افسوس کہ جناب امیر نے یہ بھی خیال
نہ کیا کہ اس کو دیکھ کر لوگوں کو یہ شبہ ہوگا کہ جناب امیر کے لیے نص نہ تھی۔

(۵) چوتھے یہ کہ جناب امیر کے دوسرے اقوال سے بھی اسی قول کی تائید
ہوتی ہے۔

۳۲۸ جب لوگوں نے بعد حادثہ عثمانؓ کے اُن کو خلیفہ بنانا چاہا تو جناب
امیر نے فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو کسی اور کو خلیفہ بنا لو۔ اس سے بھی ظاہر ہو گیا کہ خلیفہ
بنانا انھیں لوگوں کا کام تھا جس سے وہ بیعت کرتے وہی خلیفہ ہوتا۔ اس کلام
کے آخر میں جناب امیر نے یہ بھی فرمایا کہ جس کو تم خلیفہ بناؤ گے میں بھی مثل تمہارے

یا شاید تم سے بھی زیادہ اس کی اطاعت کروں گا۔
اب جناب امیر کا ایک اور خطبہ نہج البلاغت د شرح میثم مطبوعہ
طہران صفحہ ثانی ورق پنجم جزو ۲۲) میں مذکور ہے اس کو بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

ایھا الناس ان احق الناس بھذا الامر اقواھم علیہ واعلمھم بامر اللہ فیہ۔	اے لوگو! بے شک زیادہ حق دار آدمیوں کا خلافت کے لیے وہ ہے جو اُن سب میں خلافت پر قوت زیادہ رکھتا ہو اور امور خلافت میں احکام الٰہی سب سے زیادہ جانتا ہو۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ جناب امیر خلافت کے زیادہ حق دار نہ تھے
اس لیے کہ ان کا ہاتھ کٹا ہوا تھا اور جناب امیر نے یہ بھی صاف تصریح کر دی
ہے کہ ان کا علم عثمانؓ سے زیادہ نہیں ہے اور یہ امر فریقین کو مسلم ہے کہ شیخین
کا علم بھی عثمانؓ سے کم نہ تھا پس شیخین کا علم بھی جناب امیر کے علم سے کم نہ ہوگا
اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ ابوبکرؓ اقوی بھی تھے اور اعلم بھی تھے پس زیادہ
حق دار خلافت کے بھی وہی تھے۔ جناب امیر کے اس قول سے بھی نص امامت
باطل ہوئی۔

فان شغب شاغب استعتب وان ابی قوتل	پھر اگر فتنہ کرے کوئی مفسد تو اس پر عتاب کیا جاوے اور اگر نہ مانے تو اس سے قتال کیا جاوے۔

میثم نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ حکم اُس باغی کا ہے جو انعقاد

بیعت کے بعد امام سے بغاوت کرے۔

ولعمری لئن کانت الامامۃ لا تنعقد حتی یحضرھا عامۃ الناس ما الی ذلک سبیل

اور قسم ہے مجھ کو اپنی جان کی کہ اگر امامت کے لیے یہ حکم ہو کہ جب تک سب آدمی حاضر نہ ہوں اُس وقت تک منعقد نہ ہو تو نہ ہوگا خلافت کا کوئی طریقہ۔

جناب امیر اپنی جان کی قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ اگر خلافت کے لیے یہ شرط ہوتی کہ جب تک کل آدمی حاضر ہو کر بیعت نہ کریں اس وقت تک بیعت منعقد نہ ہو تو انعقاد خلافت کی کوئی صورت ہی نہیں اس لیے کہ سب کا جمع ہونا مشکل ہے۔

ولکن اھلھا یحکمون علی من غاب منھا

اور لیکن اہل اس کے حکم کرتے ہیں اُس پر جو بیعت خلافت کے وقت غائب تھا

یعنی جو لوگ بیعت کر چکے اُنھیں کا حکم اُس پر بھی جاری ہوگا جو اُس وقت موجود نہ تھا۔

ثم لیس للشاھد ان یرجع ولا للغائب ان یختار۔

پھر حاضر کو یہ اختیار نہیں کہ بیعت سے رجوع کرے اور غائب کو یہ اختیار نہیں کہ کسی اور کو پسند کرے۔

اس قول میں تو جناب امیر نے قسم کھا کر فرمایا کہ خلافت کے لیے بعض کی بیعت کافی ہے سب کا حاضر ہونا ضرور نہیں۔ کیا حضرات شیعہ کے نزدیک یہ قسم بھی جناب امیر کی جھوٹی تھی؟۔

دکھو ص۳۲۵

اس سے پہلے جناب امیر کا یہ قول بھی ہم نقل کر چکے ہیں کہ فاسق کی خلافت بھی جائز ہے وہ قول خوارج کے مقابلے میں تھا جو امامت کے بالکل منکر تھے۔

پس جو مضمون جناب امیر علیہ السلام نے امیر معاویہؓ کے نام خط میں لکھا تھا وہی مضمون اُنکے اور اقوال سے بھی ثابت ہے۔ اب کوئی شبہ باقی نہیں کہ جناب امیر کا یہی مذہب تھا اور شیعوں کا مذہب جناب امیر کے مذہب کے خلاف ہے۔

جناب امیر علیہ السلام کو ابوبکرؓ سے لڑنے کا خیال کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ صحابہ کی جماعت نے ابوبکرؓ کو خلیفہ بنایا ہے اور رسولؐ کا قول ہے کہ حق ہمیشہ جماعت کی طرف ہوگا۔

خصال[۱] ابن بابویہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

ان امتی ستفترق علی اثنین وسبعین فرقۃ یھلک احدی وسبعون ویتخلص فرقۃ قالوا یا رسول اللہ من تلک الفرقۃ قال الجماعۃ الجماعۃ الجماعۃ۔

بے شک میری امت متفرق ہوگی بہتّر فرقوں پر اکہتّر فرقے ہلاک ہوں گے اور ایک فرقہ نجات پائے گا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ وہ فرقہ کون سا ہوگا رسول نے فرمایا جماعت جماعت جماعت۔

---

[۱] خصال مطبوعہ طہران جلد دوم ص۱۴۱

بیان مذکورۂ بالا سے بخوبی واضح ہوگیا کہ جناب امیر علیہ السلام نے ابوبکرؓ سے لڑنے کا ہرگز خیال نہ کیا ہوگا۔

اب یہ بحث باقی رہی کہ وہ کیا مصیبت تھی جس کا جناب امیر نے اس مبالغہ کے ساتھ ذکر کیا۔

حضرات شیعہ یہ کہتے ہیں کہ وہ مصیبت یہ تھی کہ ابوبکرؓ کی خلافت میں احکام ظلم و جور کے جاری تھے۔

مگر یہ خیال ہرگز صحیح نہیں اس لیے کہ جناب امیر نے خلافت ابوبکرؓ کی مدح کی ہے۔ چنانچہ جناب امیر کا یہ کلام تمام شارحین نہج البلاغت نے نقل کیا ہے ہم اس کو ترجمہ ملا فتح اللہ اور شرح میثم[1] سے نقل کرتے ہیں:۔

فاختار المسلمون بعده	پھر پسند کیا مسلمانوں نے بعد نبیؐ کے
بآرائهم رجلا منهم	اپنی رائے سے اپنی جماعت میں سے
فقارب وسدد بحسب	ایک شخص کو تو اس نے ٹھیک اور درست
استطاعته على ضعف وجد	کام کیا اپنی طاقت کے موافق اور پر ضعیفی
(شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۴۰)	کے اور کوشش کے۔

یعنی ابوبکرؓ نے حتی الامکان بہت اچھا کام کیا اور باوجود ضعیفی کے وہ کوشش کرتے تھے۔ اس کلام سے ظاہر ہوگیا کہ خلافت ابی بکرؓ کے زمانے میں ظلم نہ تھا ورنہ جناب امیر ان کی خلافت کی مدح نہ کرتے۔

نہج البلاغت میں جناب امیر کا وہ قول مذکور ہے جو انھوں نے

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۱۲۔

بیعت عثمانؓ کے وقت کہا تھا۔ اس میں یہ بھی ہے:۔

والله لاسلمن ما سلمت	واللہ صلح رکھوں گا میں جب تک کہ سلامت
امور المسلمين ولم يكن	رہیں گے معاملے مسلمانوں کے اور نہ ہوگا
فيها جور الا علي خاصة	ظلم مگر خاص مجھ پر۔

اس قول سے ظاہر ہوگیا کہ جناب امیر نے فرمایا کہ میں اپنے اوپر ظلم بھی گوارا کر لوں گا لیکن مسلمانوں پر ظلم گوارا نہ کروں گا اور میری صلح اسی وقت تک رہے گی جب تک کہ مسلمانوں پر ظلم نہ ہوگا اور جب مسلمانوں پر ظلم ہوگا تو میں ہرگز صلح نہ رکھوں گا ضرور لڑوں گا۔

پس اگر خلافت ابی بکرؓ میں ظلم ہوتا تو جناب امیر ضرور لڑتے لیکن جناب امیر ابوبکرؓ سے نہیں لڑے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ خلافت ابی بکرؓ میں ظلم نہ تھا۔

اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جناب امیر مجبور نہ تھے ورنہ اگر صلح نہ کرتے تو دست بریدہ سے کیا کر سکتے؟۔

میثم بحرانی نے اس قول کی شرح میں لکھا ہے:۔

ای لاترکن المناقشة فی هذا	یعنی البتہ چھوڑوں گا میں جھگڑا امر خلافت
الامر مهما سلمت امور	میں جب تک سلامت رہیں گے معاملات
المسلمین من الفتنة وفیه	مسلمانوں کے فتنہ سے۔ اور اس میں یہ
اشارة الی ان غرضه من	اشارہ ہے کہ بے شک غرض جناب امیر
المناقشة فی هذا الامر هو	کی امر خلافت میں جھگڑا کرنے سے بہتری

صلاح حال المسلمین و استقامۃ امورھم و سلامتھم عن الفتن وقد کان لھم بمن سلف من الخلفاء استقامۃ امر۔

مسلمانوں کے حال کی اور درستی اُن کے اُن کے امور کی اور سلامتی مسلمانوں کی فتنہ سے تھی۔ اور بے شک تھی مسلمانوں کے لیے گزشتہ خلیفوں کی خلافت میں درستی حالت کی۔

یعنی شیخین کے زمانے میں مسلمانوں کے معاملات درست تھے جور وظلم نہ تھا۔

اس کے بعد شارح میثم نے یہ شبہ نقل کیا ہے کہ جناب امیر خلفائے ثلاثہ سے اس لیے نہ لڑے کہ لڑائی میں فتنہ تھا۔ پھر معاویہ سے کیوں لڑے حالانکہ اُن سے لڑنے میں بھی فتنہ تھا۔ پھر اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے:-

ان الفرق بین الخلفاء الثلثۃ و بین معویۃ فی اقامۃ حدود اللہ والعمل بمقتضی اوامرہ ونواھیہ ظاھر۔

بے شک فرق درمیان خلفاء ثلاثہ اور درمیان معاویہ کے اللہ کے احکام قائم کرنے اور اللہ کے امر و نہی کے مطابق عمل کرنے میں ظاہر ہے۔

یعنی خلفاء ثلثہ کے زمانہ میں احکام الٰہی جاری ہوتے تھے اور اللہ کے امر و نہی کے مطابق عمل ہوتا تھا اس لیے خلفاء ثلثہ سے جناب امیر نہ لڑے اور معاویہ پر یہ اعتماد نہ تھا اس لیے اُن سے جناب امیر لڑے۔

جناب امیر کے اس قول کی شرح میں جو بیعت عثمان کے وقت فرمایا تھا۔ تمام شارحین نہج البلاغت نے یہی لکھا ہے جو میثم نے لکھا یعنی خلفاء ثلثہ کی

حکومت عدل وانصاف کی حکومت تھی اور احکام الٰہی ان کے زمانے میں جاری تھے یہی وجہ ہے کہ جناب امیر ان سے نہ لڑے۔

پس یہ خیال بھی باطل ہوگیا کہ جناب امیر کی وہ مصیبت جس کا اس مبالغہ سے انھوں نے بیان کیا ہے یہ تھی کہ خلیفہ اول کے زمانہ میں احکام مخالف شرع جاری تھے۔

نہایت عجیب یہ ہے کہ اگر روایات شیعہ پر غور کیا جاتا ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر ظلم وجور کا ہونا یا امور منہیہ کا واقع ہونا جناب امیر کو ایسا ناگوار نہ تھا جو بڑی مصیبت سمجھا جائے اس لیے کہ ظلم وجور اور امور منہیہ جناب امیر کے عہد خلافت بلکہ اُن کی خاص مجلس میں علانیہ واقع ہوتے تھے مگر جناب امیر ان کے دفع کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

سب سے اول اُن واقعات پر غور کیجیے جو اُسی وقت واقع ہوئے جب جناب امیر سے لوگوں نے خلافت کی بیعت کی۔ نہج البلاغت میں جناب امیر کا ایک خطبہ منقول ہے۔ جس کو ہم ترجمہ ملا فتح اللہ مطبوعہ طہران سے نقل کرتے ہیں۔

ومن کلام لہ علیہ السلام فی وصف بیعتہ بالخلافۃ وقد تقدم مثلہ بالفاظ مختلفۃ بسطتم یدی فکففتھا۔

اور جناب امیر علیہ السلام کا کلام ہے اس بیان میں کہ اُن کی خلافت کی بیعت کس طرح ہوئی۔ اور پہلے بھی مذکور ہو چکا ہے اسی طرح کا مضمون مختلف الفاظ پر کھولا تم نے میرا ہاتھ اور میں نے اس کو روکا۔

جناب امیر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ تم سب بیعت کرنے کے لیے میرا ہاتھ کھولتے تھے۔ لیکن چونکہ خلافت مجھ کو پسند نہ تھی۔ اس لیے میں اپنا ہاتھ روکتا تھا اور تمھاری بیعت پر راضی نہ تھا۔ یہاں سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ جناب امیر کو خلافت پسند نہ تھی پھر بھلا ابوبکرؓ کے خلافت لینے کی شکایت وہ کیوں کرتے اور جو چیز کہ اُن کو پسند نہ تھی اور اُس کے قبول کرنے سے انکار کرتے تھے اُس کا غصب کیسا؟۔

فتداککتم علیّ تداک	پھر ہجوم کیا تم نے مجھ پر ہجوم کرنا پیاسے اونٹوں
الابل الھیم علی حیاضھا	کا اپنی حوضوں پر پانی ملنے کے دن یہاں
یوم ورودھا حتی انقطعت	تک کہ ٹوٹا جوتی کا تسمہ اور گری چادر۔
النعل وسقط الرداء ووطی	اور پامال ہوگئے وہ لوگ جو ضعیف تھے۔
الضعیف۔ وبلغ من سرور	اور پہونچی خوشی آدمیوں کی اس بات پر
الناس ببیعتھم ایای ان	کہ انھوں نے مجھ سے بیعت کی یہاں تک
ابتھج بھا الصغیر۔ وھدج	کہ خوش ہوئے اس پر بچّے اور لرزتے
الیھا الکبیر۔ وتحامل	ہوئے آئے بوڑھے بیعت کے لیے۔ اور
نحوھا العلیل۔	مشقت اٹھا کر گئے بیعت کے لیے بیمار۔
وحسرت الیھا الکعاب۔	اور چہرہ کھولا بیعت کے لیے اُبھری چھاتیوں والی عورتوں نے۔

آخری جملہ کا ترجمہ ملا فتح اللہ کاشانی نے یہ لکھا ہے (وکشف کردند رخسارہ را بسوئے آں دختران نار پستاں)[1]

(۱ دیکھو ص۴۰۵ کا حاشیہ)

اس کلام سے ظاہر ہوگیا کہ جناب امیر سے بیعت کرنے کے واسطے جو لوگوں نے ہجوم کیا تو انھوں نے ضعیفوں کو پامال کرکے پیس ڈالا۔ یہ بہت بڑا ظلم تھا اس سے بڑھ کر ظلم وہ ہے جو خطبہ شقشقیہ کے آخر میں مذکور ہے کہ حسنینؑ کو بھی پامال کر ڈالا۔ اس سے بڑھ کر قیامت یہ ہے کہ جناب امیر کی مجلس میں بلند چھاتیوں والی عورتوں نے بیعت کے لیے منہ کھولا یہ علانیہ فسق ہے۔ بھلا خلافت کی بیعت سے عورتوں کو کیا تعلق تھا؟ جناب امیر نے اپنی مجلس میں عورتوں کو کیوں آنے دیا۔ منہ کھولنے سے منع کیوں نہ کیا۔ اُن کی بیعت کیوں قبول کی۔ یہ کیوں کر معلوم ہوا کہ اُن عورتوں کی چھاتیاں بلند تھیں اور وہ نار پستاں تھیں۔ اس امر کے معلوم کرنے کے لیے اگر زیادہ نہیں تو کم سے کم بغور دیکھنے کی تو ضرورت بے شک ہے ؎

حیا و شرم کا پردہ اٹھا یا شرمگینوں نے
سرِ مجلس نقابیں کھول دیں پردہ نشینوں نے

کیا عہد اطاعت نو رسیدہ نازنینوں نے
ملائے ہاتھ اُبھری چھاتیوں والے حسینوں نے

جو شرماتے تھے گھر میں مجلسوں میں بے حجاب آئے
جو گھونگھٹ رات میں کرتے تھے دن میں بے نقاب آئے

افسوس کہ خلافت ملنے کی خوشی میں جناب امیر کو ان امور کی کچھ بھی پروا نہ ہوئی۔

یہ کیسا غضب ہے کہ اس ظلم و فسق کو جناب امیر فخریہ اپنے کلام میں بیان

(ص۴۰۴ کا حاشیہ) یعنی بیعت کے لیے اُن لڑکیوں نے منہ کھولا جن کے پستان انار کی مانند تھے ۱۲

کر رہے ہیں کہ ہم وہ ہیں کہ ہماری خلافت کے وقت ایسے امور واقع ہوئے۔

بھلا اس میں کیا فخر تھا کہ بچوں نے اور اُبھری چھاتیوں والی عورتوں نے بیعت کی، لرزتے ہوئے بوڑھے بیعت کرنے کو آئے اور بیماروں نے بھی بیعت کے لیے مصیبت اٹھائی۔ یہ تو بہت شرم کی باتیں تھیں نہ کہ اظہار فخر کے لیے خطبہ میں ان کا ذکر کیا جائے۔ اگر جناب امیر کو فقط یہی ثابت کرنا منظور تھا کہ بہت سے آدمیوں نے مجھ سے بیعت کے لیے ہجوم کیا تھا تو یہ مضمون پہلے فقرہ سے ثابت ہوگیا پھر ان ناگوار باتوں کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟۔

جس خلافت کی ابتدا ان امور سے ہو اس میں کامیابی کی امید کیا ہو سکتی ہے۔

چنانچہ روایات کتب شیعہ سے یہ بھی ثابت ہے کہ جناب امیر کے زمانہ میں ظلم وجور بہت رائج تھا طرفہ یہ ہے کہ جناب امیر کو اس کی خبر تھی اور پھر بھی اس وجہ سے اس کا تدارک نہیں کرتے تھے کہ مرتکب اُن ظلموں کے وہی لوگ تھے جو جناب امیر کی فوج میں شامل تھے اور اُن کے شیعہ تھے۔ وہ لوگ ناراض ہو کر جُدا ہو جاتے تو جناب امیر کی خلافت چھن جاتی۔ چنانچہ روضہ[1] کافی میں ایک طویل خطبہ جناب امیر کا منقول ہے اُس میں یہ ہے کہ جناب امیر کے گرد ایک مجمع ان کے اہل بیت اور خاص شیعوں کا تھا اُس وقت جناب امیر نے متوجہ ہو کر بہت سے ظلموں کا جو اُس وقت موجود تھے ذکر کیا من جملہ ان کے یہ بھی کہا کہ اگر میں وہ جاگیریں جاری کر دوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکم سے بعض قوموں کے لیے

[1] کتاب الروضہ مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۲۹ ۱۲

مقرر کر دی تھیں مگر یہ حکم رسولؐ جاری نہ ہوا اور جو حکم جور کے دیے گئے ہیں اگر میں اُن کو منسوخ کر دوں اور جو عورتیں ناحق بعض مردوں کے قبضہ میں ہیں اگر میں ان کو نکال کر اُن کے شوہروں کے پاس پہنچا دوں، اگر میں دفتر عطایا کا محو کر دوں اور اسی طرح دیا کروں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کو برابر دیا کرتے تھے اور بیت المال اغنیا کی دولت نہ بناؤں اور اگر میں قرآن کے مطابق عمل کرنے کا حکم کروں تو تم مجھ سے جُدا ہو جاؤ۔

یہ مضمون جلد اول میں بھی مذکور ہو چکا ہے۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جناب امیر نے وہ عورتیں بھی واپس نہ دلائیں جو ظالموں نے ان کے شوہروں سے ناحق چھین لی تھیں۔ بیت المال کو بھی اغنیا کی دولت بنایا اور موافق طریقہ سنت کے برابری کے ساتھ تقسیم نہ کیا۔ نہایت عجیب یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرنے کا بھی حکم نہ کیا۔

بیان مذکورۂ بالا میں ہم بخوبی ثابت کر چکے کہ شیعوں نے جو خطبہ شقشقیہ کے ان فقرات کے معنی بنائے ہیں وہ غلط ہیں تو اب ہم خطبہ شقشقیہ کے آئندہ فقرات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں:۔

آری تراثی نہبا — دیکھتا ہوں میں اپنی میراث کو لُوٹ۔

جناب امیر فرماتے ہیں کہ مصیبت فراق رسولؐ نے میری یہ حالت کر دی ہے کہ میں اپنے مال کی بھی پروا نہیں کر سکتا میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا مال لُٹ رہا ہے اور مجھ سے کچھ اس کا انتظام نہیں ہو سکتا پس اس حالت کا انتظام کیا کر سکوں گا۔ میراث سے وہ جائداد مراد ہے جو ابو طالب نے مکہ میں چھوڑی تھی جیسے شعب ابی طالب

وغیرہ اس تمام جائداد کو عقیل اور طالب نے بیچ ڈالا۔ جناب امیر کو اس میں سے کچھ نہ ملا۔

علمائے شیعہ اس فقرہ کی تفسیر میں مذبذب ہیں کبھی کہتے ہیں کہ خلافت مراد ہے یعنی خلافت جو میری میراث ہے وہ لٹ رہی ہے۔ حالانکہ خلافت پر درحقیقت میراث کا لفظ صادق نہیں آتا اس لیے کہ خلافت کوئی مال نہیں جس میں میراث جاری ہو نہ جناب شرعاً رسولؐ کے وارث تھے۔

قطع نظر اس کے بیان سابق میں ہم ثابت کر چکے کہ پہلی خلافت ابوبکرؓ کا حق تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی بشارت دے گئے تھے پس جناب امیر کو ہرگز اس کی شکایت نہیں ہو سکتی اور خلافت بیعت مہاجرین وانصار سے حاصل ہوتی ہے جنھوں نے ابوبکرؓ سے بیعت کی تھی۔

علاوہ ان سب امور کے جناب امیر خلافت کو اپنے واسطے پسند نہیں کرتے تھے۔

کبھی کہتے ہیں کہ میراث سے فدک مراد ہے حالانکہ فدک بھی جناب امیر کی میراث نہ تھا۔ بھلا فدک کی جناب امیر کو کیا شکایت ہوتی انھوں نے تو خود بھی فدک میں وہی عمل کیا جو خلفانے کیا تھا۔ اگر جناب امیر کے نزدیک فدک میں میراث جاری ہونا چاہیے تھی اور خلفاء کا فیصلہ غلط تھا تو جناب امیر اپنے زمانے میں ضرور اُس میں میراث جاری کرتے پس جس وقت کہ جناب امیر اپنی خلافت کے زمانے میں یہ خطبہ پڑھ رہے تھے اس وقت بھی فدک لُٹ رہا تھا۔

جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث

سُنا دی کہ انبیا کے مال میں میراث نہیں ہوتی اور جو مال وہ چھوڑیں وہ صدقہ ہے پھر ابوبکرؓ پر کیا طعن ہے کیا ان کو حدیث پر عمل کرنا واجب نہ تھا؟ اگر ابوبکرؓ کا فیصلہ حق نہ ہوتا تو تمام صحابہ مخالفت کرتے بلکہ ابوبکرؓ کو خلافت سے معزول کر دیتے فدک کے سوا اور بعض قطعات جو رسولؐ کے قبضہ میں تھے ان کا وقف ہونا جناب سیدہ نے تسلیم کیا۔ چنانچہ دلال، عفاف وغیرہ سات قطعات پر جناب سیدہ قابض تھیں ان میں عباسؓ نے میراث کا جھگڑا کیا تو ان کو جناب سیدہ نے یہی جواب دیا کہ یہ وقف ہیں ان میں میراث جاری نہ ہوگی۔ فروعِ کافی[1] کی جلد ثالث میں مذکور ہے:۔

عن أحمد بن محمد عن أبي الحسن الثاني علیه السلام قال سألته عن الحیطان السبعة التي كانت میراث رسول الله لفاطمة علیها السلام۔	احمد بن محمد نے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کی وہ کہتا ہے کہ میں نے امام سے اُن سات باغوں کا حال پوچھا جو فاطمہ علیہا السلام کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میراث تھے۔
فقال لا انما كانت وقفا وكان رسول الله یاخذ الیه منها ما ینفق علی اضیافه۔	امام نے فرمایا کہ میراث نہ تھے بلکہ وقف تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُس میں سے اس قدر لے لیتے تھے جو مہمانوں کے خرچ کو کافی ہو۔

[1] فروع کافی جلد ثالث مطبوعہ لکھنؤ ص۲۷۔

...ا قبض جاء العباس يخاصم
...مة فيها فشهد علي عليه
السلام وغيره انها وقف على
فاطمة عليها السلام وهي
الدلال والعفاف والحسنى
والصافية ومالام ابراهيم
والمبيت والبرقة۔

پھر جب رسولؐ کا انتقال ہوا تو عباسؓ نے
اُن کی بابت فاطمہؑ سے جھگڑا کیا۔ پس
حضرت علیؑ وغیرہ نے گواہی دی کہ وہ وقف
ہیں فاطمہ علیہا السلام پر۔ اور وہ تھے
دلالؔ اور عفافؔ اور حسنیٰ اور صافیہ اور
مالامِ ابراہیم اور مبیتؔ اور برقہ۔

پس جس طرح علیؑ کے بیان پر ان سات باغوں میں میراث جاری نہ
ہوئی اسی طرح ابوبکرؓ وغیرہ کی حدیث رسول نقل کرنے پر فدک میں میراث
جاری نہ ہوئی۔

بڑا شبہ شیعوں کی طرف سے یہ پیش کیا جاتا ہے کہ بخاری
کی روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابوبکرؓ کا جواب سن کر جناب سیدہ ناراض
اور غضبناک ہوئیں اور پھر جب تک زندہ رہیں ابوبکر سے کلام نہیں کیا اور
جب ان کا انتقال ہوا تو جناب امیر نے رات میں اُن کو دفن کر دیا اور ابوبکرؓ
کو اس کی اطلاع بھی نہیں کی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کی کتب صحاح میں جناب سیدہ
کی زبان سے اُن کا ناراض یا غضبناک ہونا ہرگز منقول نہیں۔ ناراضی فعل قلب
ہے جب تک زبان سے ظاہر نہ کی جاوے دوسرے شخص کو اس کی خبر نہیں ہو سکتی
البتہ قرائن سے دوسرا شخص قیاس کر سکتا ہے مگر ایسے قیاس میں کبھی غلطی بھی ہو جاتی ہے۔

بخاری میں یہ [illegible]
سیدہ سے۔ ام المومنین عائشہ یہ نہیں کہتیں کہ میں نے فاطمہ زہراؑ کی زبانی
ابوبکرؓ کی شکایت سنی۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ عائشہؓ عالم الغیب نہ تھیں البتہ قرائن سے انھوں
نے یہی سمجھا جو کچھ بیان کیا مگر اس پر کیا دلیل ہے کہ یہ سمجھنا ان کا مطابق واقع
کے تھا۔

پس اگر حضرات شیعہ کو یہ دعویٰ ہو کہ فدک کی بحث میں جناب سیدہ
ابوبکرؓ سے ناراض ہوئیں تو اہل سنت کی صحیح روایتوں سے ابوبکرؓ کی شکایت جناب
سیدہ کی زبان سے ثابت کریں اور بغیر اس کے یہ دعویٰ بے دلیل ہے۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا پر بھی کوئی طعن نہیں ہو سکتا اس لیے
کہ انھوں نے بیان خلاف واقع کا قصد نہیں کیا بلکہ وہ جو کچھ سمجھے ہوئے تھیں اس
کو ایک مرتبہ عروہ بن زبیرؓ کے سامنے بیان کیا تھا یہ اتفاقی بات ہے کہ اس
معاملہ میں جو کچھ وہ سمجھی تھیں وہ خلاف واقع تھا۔ اس امر میں وہ بمقتضائے
بشریت معذور تھیں۔

اگر یہ خبر صحیح ہوتی تو اس وقت میں اس کا بڑا چرچا ہوتا اور حضرت
عائشہؓ کے سوا اور بہت سے لوگ بھی اس کو ضرور نقل کرتے لیکن عائشہؓ کے
سوا کسی اور سے یہ مضمون منقول نہیں اور اُن سے فقط ایک شخص عروہ اس کی
روایت کرتا ہے۔

اگر حضرت عائشہ حیات فاطمہ یا عہد ابی بکرؓ میں یہ خیال ظاہر کرتیں تو

ضرور اس کی تصحیح ہو جاتی مگر حضرت عائشہؓ نے شاید آخر میں یہ مضمون عروہ سے بیان کیا ہوگا۔ اس لیے کہ خلافت صدیق کے زمانے میں عروہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ پس جناب سیدہؓ کا ابوبکرؓ سے ناراض ہونا ایک ایسا بے اصل خیال ہے کہ اتنا بھی ثابت نہیں ہوتا کہ خلافت ابوبکرؓ کے زمانہ میں کسی کی زبان پر اس کا ذکر بھی آیا ہو یا عائشہؓ کے سوا کسی کے دل میں اس کا خیال بھی گزرا ہو۔ دعوی فدک کے بعد شاید حضرت عائشہ اور جناب سیدہ سے ملاقات بھی نہ ہوئی ہوگی اس لیے کہ حضرت عائشہ پابند عدت تھیں اور جناب سیدہؓ مرض الموت میں مبتلا ہو گئیں۔ پس جن قرائن سے حضرت عائشہ نے یہ نتیجہ نکالا ہوگا وہ ایسے قرائن نہ تھے جن کو بچشم خود انھوں نے دیکھا ہو یا بلاواسطہ جناب سیدہ کی زبان سے سُنا ہو۔

جب جناب سیدہ کا ابوبکرؓ سے ناراض ہونا صحیح نہیں تو پھر یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ ناراضی کی وجہ سے انھوں نے ابوبکر سے کلام چھوڑ دیا تھا۔

ممکن ہے کہ اس کے بعد اُن میں باہم کلام ہوا ہو مگر حضرت عائشہ کو اُس کی خبر نہ ہو۔

بالفرض اگر کلام نہیں ہوا تو وجہ اس کی یہ ہوگی کہ کوئی ضرورت کلام کی نہ پڑی ہوگی یہ ظاہر ہے کہ غیر محرم سے عورتیں بلا ضرورت بات چیت نہیں کرتیں۔ قطع نظر اس کے جناب سیدہ حالت مرض میں بھی مبتلا ہو گئیں اور بہت جلد ان کا انتقال ہو گیا اس وجہ سے کوئی موقع گفتگو کا نہ ہوا۔ البتہ ایسی حالت میں ابوبکرؓ نے اپنی بی بی اسماء بنت عمیس کو جناب سیدہ کی خدمت کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ وہ آخر وقت تک ان کی خدمت میں رہیں اور جب جناب سیدہؓ کو یہ

خیال ہوا کہ کپڑے سے عورتوں کے جنازہ کا تستر اچھی طرح نہیں ہوتا تو گہوارہ کی رائے بھی ابوبکرؓ کی بی بی نے دی اور بیان کیا کہ حبشہ میں انھوں نے یہ صورت دیکھی ہے کہ جنازہ پر لکڑیاں باندھ کر گہوارہ بناتے ہیں چنانچہ اسی صورت کا گہوارہ جناب سیدہؓ نے پسند کیا۔ ابوبکرؓ کی بی بی موافق وصیت جناب سیدہ کے ان کے غسل اور تجہیز و تکفین میں بھی شریک رہیں۔ ابوبکرؓ پانچوں وقت مسجد میں علیؓ سے ملتے تھے انھیں ملاقاتوں میں جناب سیدہؓ کا حال پوچھتے رہتے ہوں گے۔

اگر جناب سیدہ ابوبکرؓ سے ناراض ہوتیں تو ان کی بی بی کو اپنی خدمت میں کیوں قبول کرتیں۔ پس درحقیقت کلام نہ ہونا اس وجہ سے تھا کہ جناب سیدہؓ کو ابوبکرؓ سے کوئی بات کہنے کا موقع نہیں ملا۔ عائشہؓ کو جو پہلے سے یہ وہم بندھا ہوا تھا کہ جناب سیدہ کو ابوبکر سے رنج ہو گیا ہے پس اُنھوں نے کلام نہ کرنے کو اسی پر قیاس کر لیا۔

ابوبکرؓ کو حضرت علیؓ نے انتقال فاطمہؓ کی اس وجہ سے اطلاع نہ بھیجی کہ اُن کی بی بی نے اول ہی خبر کر دی ہوگی۔ شیخ عبدالحق نے ترجمہ مشکوٰۃ کی جلد آخر میں یہ روایت نقل کی ہے کہ گہوارہ کی خبر سُن کر ابوبکرؓ یہ پوچھنے آئے تھے کہ یہ نئی چیز کیوں بنائی گئی؟ جب ابوبکرؓ کی بی بی نے اُن کو یہ سمجھا دیا کہ جناب سیدہؓ نے اس کو دیکھ کر پسند کیا تھا اور اسی کی وصیت کی تھی تو خاموش ہو گئے۔ بخاری کی اس روایت سے یا صحاح کی کسی اور روایت سے یہ نہیں ثابت ہوا کہ ابوبکرؓ جنازہ کی نماز میں شریک[1] نہ تھے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ابوبکرؓ نماز جنازہ

[1] البتہ بعض علماء کو بخاری کی اس روایت سے یہ وہم پیدا ہوا ہے (باقی ص ۴۱۶ پر دیکھو)

کے امام تھے۔

حاصل یہ ہے کہ فقط ایک حضرت عائشہ کو یہ شبہ ہو گیا تھا کہ ابوبکر کا جواب سن کر جناب سیدہ کو غصہ آیا اسی پر یہ تمام خیالات مبنی ہیں اور جب کہ وہ ان کا شبہ صحیح نہ تھا تو جتنے خیالات اس پر مبنی ہیں وہ سب غلط ہیں۔ حضرت عائشہؓ کے سوا اور کسی کو یہ شبہ بھی نہیں ہوا بلکہ یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ حضرت عائشہ کے اس شبہ پر کسی زمانہ میں کسی صحابی کو اطلاع ہوئی ہو۔

حضرات شیعہ بہت زور دے کر یہ کہتے ہیں کہ جناب سیدہ کی ناراضی کا مضمون بخاری میں مذکور ہے اس لیے اس کا انکار نہیں ہو سکتا۔

اس مغالطہ کا جواب یہ ہے کہ بخاری میں مذکور ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عروہ بن زبیر سے یہ قصہ کسی طرح نقل کیا اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ لیکن بخاری میں مذکور ہونے کا یہ نتیجہ نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ حضرت عائشہ نے نقل کیا وہ مطابق واقع کے تھا بمقتضائے بشریت اس معاملہ میں جو غلط فہمی حضرت عائشہؓ سے ہوئی یہ اُن کے مناقب اور فقاہت کے خلاف نہیں اس لیے کہ قرائن خارجی سے کسی نتیجہ کے نکالنے میں کبھی معصومین سے بھی غلطی ہو جاتی ہے۔

حضرت موسیٰ جب کوہ طور سے واپس آئے تو بنی اسرائیل کو گوسالہ

(بقیہ صفحہ ۴۱۳) جو محض بے دلیل ہے اور یہ مضمون اس وقت تک قابل اعتبار نہیں جب تک کسی قابل اعتماد روایت سے یہ نہ ثابت ہو کہ ابوبکرؓ نماز جنازہ میں شریک نہ تھے ۱۲

پرستی میں مبتلا دیکھ کر حضرت ہارونؑ پر یہ الزام لگا دیا کہ انھوں نے میرے حکم کی اچھی طرح تعمیل نہیں کی اور یہ خیال اُن کے دل میں یہاں تک جم گیا کہ غضبناک ہو کر حضرت ہارون کی داڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے۔ حالانکہ ہارون بالکل بے قصور تھے یہ خلاف واقع خیال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قرائن موجودہ کے دیکھنے سے ہوا تھا۔

یا مثلاً حضرت موسیٰ کو توریت کی تختیوں میں بہت سے علوم دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ میرے پاس سب علوم جمع ہو گئے۔ حالانکہ خضر کے پاس بعض علوم ایسے تھے جو حضرت موسیٰ کے پاس نہ تھے چنانچہ تفسیر صافی؎ میں ہے:۔

فی المجمع عن الصادق قال کان عنده علم لو یکتب لموسی فی الالواح وکان موسی یظن ان جمیع الاشیاء التی یحتاج الیها فی تابوته وان جمیع العلم کتب له فی الالواح۔	مجمع البیان میں صادق سے منقول ہے کہ خضر کے پاس ایسا علم تھا جو موسیٰ کی تختیوں میں مکتوب نہ تھا اور موسیٰؑ کا یہ گمان تھا کہ جتنی چیزوں کی حاجت ہے وہ سب میرے صندوق میں ہیں اور تمام علم میری الواح میں ہے۔

یا مثلاً جب حضرت خضر نے کشتی کے تختے توڑ ڈالے تو حضرت موسیٰ نے یہ کہا کہ تم نے بہت بُرا کام کیا شاید تم کشتی والوں کو ڈبونا چاہتے ہو اور حضرت خضر نے جب ایک لڑکے کو مار ڈالا تو حضرت موسیٰ نے کہا کہ تم نے بُرا کیا جو بے گناہ کو قتل کیا۔

یہ دونوں خیال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ظاہری حالت کے لحاظ سے

؎ تفسیر صافی مطبوعہ طہران تفسیر سورہ کہف ص ۲۱۱۔

پیدا ہوئے تھے۔ حضرت خضر کے دل کی اُن کو کچھ خبر نہ تھی۔ بایں ہمہ یہ خیالات
حضرت موسیٰ کے دل پر ایسے غالب ہوگئے کہ اگرچہ حضرت خضر کے علم و فضل سے واقف
تھے اور علم سیکھنے کے لیے ان کے ساتھ ہوئے تھے اور انھوں نے یہ تاکید کردی تھی
کہ تم میرے کاموں کی مصلحت کو نہ سمجھو گے اس لیے تم صبر نہ کرسکو گے اور حضرت
موسیٰ نے صبر کا وعدہ کرلیا تھا مگر پھر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صبر نہ
ہوسکا۔

یا مثلاً حسب روایات شیعہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی بادشاہی
کی شان و شوکت دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ہم حضرت یعقوب علیہ السلام سے
مرتبہ میں افضل ہیں اسی وجہ سے جب وہ اپنے باپ حضرت یعقوب کے استقبال
کو آئے تو گھوڑے سے اُتر کر پیادہ نہ ہوئے۔ حال آنکہ یہ خیال حضرت یوسف کا
غلط تھا اور اس کی سزا میں نور نبوت اُن سے نکل گیا اور پھر اُن کی اولاد میں بھی
کوئی پیغمبر پیدا نہ ہوا یہ روایت جلد اول میں نقل ہوچکی ہے۔

یا مثلاً ماریہ قبطیہ کے پاس جریح قبطی کی آمد و رفت پر بدگمانی ہوئی
تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؓ کو جریح کے قتل کے لیے بھیجا چنانچہ
تفسیر صافی میں تفسیر سورۂ نور میں تحت آیت افک کے امام باقر علیہ السلام سے
جو روایت نقل کی ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے علیؓ کو بھیجا اور یہ حکم کیا کہ جریح کو قتل کردو۔ علیؓ تلوار لے کر گئے۔ جریح
بھاگا اور ایک درخت پر چڑھ کر نیچے گرا جس میں اُس کا ستر کھل گیا اور
یہ ظاہر ہوگیا کہ اس کے بدن میں نہ مرد کی علامت ہے نہ عورت کی۔

تب علیؓ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور یہ پوچھا کہ میں آپ کے حکم کی
تعمیل کروں یا تامل کے ساتھ تحقیق کروں تو رسول نے فرمایا کہ تامل کے ساتھ
کام کرو۔ تب اُنھوں نے جریح کی حالت ظاہر کی۔ اُس وقت رسول اللہ نے
فرمایا الحمد للہ الذی صرف عنا السوء اہل البیت یعنی حمد اُس اللہ
کے لیے جس نے ہمارے اہل بیت سے بُرائی دور کردی۔

؎ اس روایت سے دو فائدے اور بھی ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و
آلہ وسلم نے جو آخر میں فرمایا کہ اُس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمارے اہل بیت سے بُرائی دور کردی
اس میں لفظ اہل بیت سے ماریہ قبطیہ مراد ہیں۔ پس جب لفظ اہل سے بی بی مراد ہوئی تو آیۂ
تطہیر میں بھی لفظ اہل بیت سے بی بیاں مراد ہوں گی۔

واقعہ قرطاس

دوسرا فائدہ یہ حاصل ہوا کہ رسولؐ نے جو خاص علیؓ کو قتل جریح قبطی کا حکم کیا تھا
اُس کو انھوں نے ایسا واجب نہ سمجھا کہ ہر صورت میں ادا کیا جائے بلکہ جریح کی حالت دیکھ کر
بغیر تعمیل حکم واپس آئے اور پھر استفسار کیا آخر معلوم ہوا کہ اس حکم کی تعمیل میں غور و فکر کی
ضرورت ہے۔ یہی حالت اُس حکم کی ہے جو رسولؐ نے مرض الموت میں فرمایا تھا کہ کاغذ اور
دوات لاؤ میں ایسا مضمون لکھوا دوں کہ اس کے بعد تم گمراہی میں نہ پڑو۔ یہ حکم اگرچہ عام
تھا۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو زیادہ تر اس کی تعمیل کے مستحق علیؓ تھے کہ داماد رسولؐ تھے اگر لکھنے کا
سامان رسولؐ کے گھر میں ہوگا تو اُنھیں کو معلوم ہوگا کہ کہاں رکھا ہے اگر باہر سے لانے کی ضرورت
تھی تو سب سے قریب علیؓ کا گھر تھا۔ اس لیے کہ ان کے گھر کا دروازہ مسجد میں کھلا تھا مگر جناب
امیر نے اس حکم کی کچھ بھی پروا نہ کی۔ البتہ عمرؓ سمجھ گئے کہ رسولؐ یہ لکھواتے ہیں کہ قرآن کو مت
چھوڑنا۔ اسی لیے انھوں نے بعض صحابہ سے مخاطب ہوکر کہا کہ تم کو (باقی صفحہ ۴۱۸ پر دیکھو)

اس روایت سے ظاہر ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جریح کو مجرم قابل قتل سمجھ لیا تھا اور اپنی بی بی ماریہ قبطیہ کو بھی مجرم سمجھا تھا یہ خیال صحیح نہ تھا۔

(بقیہ ص ۴۱۷) قرآن کافی ہے۔ پس جس طرح جریح کی حالت دیکھ کر علی یہ سمجھ گئے تھے کہ اب اس کا قتل مقصود نہیں اس کی حالت پر رسولؐ کو اطلاع کر دینا کافی ہے۔ اسی طرح عمرؓ بھی (لن تضلوا بعدہ) کے قرینہ سے یہ سمجھ گئے کہ جو کچھ رسول لکھواتے ہیں وہ ہم کو معلوم ہے رسول کو اطلاع کر دینا کافی ہے اگر ہماری سمجھ میں غلطی ہوگی تو رسولؐ دوبارہ حکم کریں گے ورنہ شدت مرض میں رسول کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ قطع نظر اس کے کاغذ اور دوات وغیرہ لانے سے یہ جواب اولیٰ تھا کہ رسولؐ یہ معلوم کر کے بہت خوش ہوں گے کہ جو کچھ میں لکھوانا چاہتا تھا وہ اُن کو خوب معلوم ہے اور یہ لوگ ایسی ہدایت کامل پا چکے کہ اب ان کو اور کچھ بتانے کی حاجت نہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اب کوئی نیا حکم نہ ہوگا اس لیے کہ آیت اکملت لکم دینکم نازل ہو چکی تھی۔ بالفرض اگر نیا حکم ہوگا تو رسول اس جواب پر ساکت نہ رہیں گے اس لیے کہ تبلیغ احکام دین اُن پر واجب ہے یہ ہرگز ممکن نہیں کہ اللہ کا حکم نازل ہو اور کسی وجہ سے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تبلیغ ملتوی کر دیں۔ یہ رائے عمرؓ کی نہایت صحیح تھی اس لیے کہ پھر رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوانے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ جب بعض لوگوں نے اس رائے سے اختلاف کر کے جھگڑا کیا تو رسولؐ نے اپنے پاس سے اٹھا دیا۔ اگرچہ ابن عباسؓ کی رائے اس کے مخالف تھی اور وہ اس تحریر کے ملتوی ہو جانے کو بڑی مصیبت سمجھتے تھے مگر اُن کی یہ رائے صحیح نہ تھی اس لیے کہ عمرؓ کی رائے کو رسولؐ نے قبول کر لیا پھر لکھوانے کا قصد نہ کیا۔ پس اگر عمرؓ پر یہ طعن کیا جاوے کہ انھوں نے رسولؐ کے حکم کی تعمیل نہ کی (باقی ص ۴۱۹ پر)

یا مثلاً جناب سیدہ کو یہ یقین ہوگیا کہ علیؓ باوجود قوت کے میری مدد نہیں کرتے اور انھوں نے حالت غیظ و غضب میں وہ مضمون ارشاد فرمایا کہ جس کا ترجمہ حق الیقین میں یوں منقول ہے ہمچو جنین در رحم الخ حالانکہ جناب سیدہؓ کا یہ خیال بگمان حضرات شیعہ صحیح نہ تھا۔

(بقیہ ص ۴۱۸) تو یہ الزام زیادہ تر علی پر عائد ہوگا اس لیے کہ وہ اس کی تعمیل کے زیادہ تر مستحق تھے اور پھر بھی انھوں نے اس حکم کی تعمیل نہ کی۔ اور دوسرا الزام اُن پر یہ ہے کہ قتل جریح کے حکم کی تعمیل نہ کی۔ اگر یہ کہو کہ رسول دوبارہ قتل جریح کا حکم کرتے تو علیؓ اس کی تعمیل پر آمادہ تھے تو جواب یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر دوبارہ لکھنے کا حکم کرتے تو عمرؓ بھی اس کے لکھنے پر آمادہ تھے۔ اگر یہ کہو کہ علیؓ کو یہ معلوم تھا کہ جریح کا قتل مقصود نہیں بلکہ اس کی حالت کا اظہار مقصود ہے تو جواب یہ ہے کہ عمرؓ کو بھی یہ معلوم تھا کہ لکھوانا مقصود نہیں ہے بلکہ ہماری زبان سے یہ مضمون ادا کرانا مقصود ہے کہ ہم قرآن کو کبھی نہ چھوڑیں گے اس لیے کہ اس کو کافی سمجھتے ہیں۔ اگر یہ کہو کہ یہ جواب غلط تھا اس لیے کہ درحقیقت قرآن کافی نہیں تو جواب یہ ہے کہ جب یہ معلوم تھا کہ نیا حکم نازل نہیں ہوا ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ بالفرض نیا حکم ہوگا تو رسول دوبارہ ضرور حکم کریں گے پس یہ جواب بہت صحیح تھا۔

قطب الدین راوندی نے کتاب الخرائج میں نظم قرآن کے معجزات میں سے نواں معجزہ یہ لکھا ہے:۔

والتاسعۃ وجود ما یحتاج العباد الی علمہ من اصول دینھم وفروعہ	اور نواں معجزہ نظم قرآن کا یہ ہے کہ اُس میں وہ سب چیزیں موجود ہیں جن کے علم کی بندوں کو حاجت ہے اصول دین اور فروع دین میں۔

(بقیہ ص ۴۲۰ پر)

یا مثلاً جناب امیر جب خلیفہ ہوئے تو جن بلوائیوں نے عثمانؓ کو قتل کیا تھا وہ یکا یک اُن پر ایسے مسلط ہوگئے کہ جناب امیر ان کے ہاتھ میں بالکل مجبور تھے اسی وجہ سے نہ قتل عثمانؓ کا قصاص لے سکے نہ اُس مفسد گروہ کو کچھ سزا دے سکے اُس جماعت کی کثرت دیکھ کر جناب امیر نے اُن کی قوت بڑی سمجھ لی تھی اور اپنے آپ کو اُن کے مقابلہ میں عاجز سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے جو کچھ وہ

(بقیہ ص ۴۱۹) ذرا حضرت سلمان کا وہ قول بھی یاد کیجیے جو جلد اول میں مذکور ہو چکا جس میں انھوں نے اُن لوگوں پر اعتراض کیا ہے جنھوں نے قرآن چھوڑ کر حدیث پر عمل شروع کیا تھا

اب عمرؓ کے اس قصہ کے ساتھ اُس قصہ کا مقابلہ کرو جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے یہ حکم کیا تھا کہ ولایت علی کا حکم امت کو سُنا دو۔ تفسیر صافی میں سورۂ مائدہ میں بذیل آیت (یا یہا الرسول بلغ ما انزل الیك) بحوالہ احتجاج طبرسی امام باقر علیہ السلام سے ایک طویل روایت منقول ہے اس میں یہ بھی ہے کہ حجۃ الوداع میں جب رسول اللہ نے موقف میں وقوف کیا تو جبریل اللہ کی طرف سے یہ حکم لائے کہ ولایت علی کی تبلیغ کر دو۔ یہ سُن کر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم سے خوف پیدا ہوا اور جبریل سے کہا کہ اللہ سے یہ کہو کہ ان لوگوں سے میری محافظت کی ذمہ داری کرے اور اس کے بعد رسول منتظر رہے کہ جبریل محافظت کا وعدہ لے کر آویں اور اس حکم کی تبلیغ ملتوی کر دی جب مسجد خیف میں پہونچے تو پھر جبریل یہ حکم لائے کہ ولایت علی کی تبلیغ کر دو مگر محافظت کا وعدہ نہ لائے جب کراع الغمیم میں پہونچے جو مکہ اور مدینہ کے درمیان میں ہے تو پھر جبریل یہی حکم لائے مگر محافظت کا وعدہ نہ لائے تب رسول نے جبریل سے کہا کہ مجھ کو خوف ہے کہ میری قوم مجھ کو جھٹلا دے گی اور علی کے باب میں میرا قول نہ مانے گی۔ یہ کہہ کر رسولؐ نے (باقی ص ۴۲۱ پر)

چاہتے تھے جناب امیر کو بہ مجبوری وہی کرنا پڑتا تھا حالانکہ یہ خیال جناب امیر کا خلاف واقع تھا۔ اگر جناب امیر حُسنِ تدبیر سے اُن کو دفع کرنا چاہتے تو وہ مفسد گروہ بہت جلد پریشان ہو جاتا۔ چنانچہ نہج البلاغت میں ہے:-

---

(بقیہ ص ۴۲۰) وہاں سے بھی کوچ کیا جب غدیر خم میں پہونچے تو جبریل پانچ گھڑی چڑھے محافظت کا وعدہ بڑی جھڑکی اور عتاب کے ساتھ لائے اور آیت یا یہا الرسول بلغ ما انزل الیك نازل کی تب رسول نے ولایت علی کی تبلیغ کی۔ اب انصاف کے ساتھ ان دونوں قصوں کا مقابلہ کر کے فرمائیے کہ حکم کی تعمیل نہ کرنے کا الزام کس میں زیادہ ہے۔ یہ وہی رسول ہیں کہ جنھوں نے نہایت ضعف اسلام کے وقت میں مشرکین مکہ کے سامنے ان کے معبود بتوں کی بُرائی بیان کی اور شرک کا رد کیا اور اللہ کے حکم کے مقابلہ میں کافروں کی ایذاؤں کی کچھ پروا نہ کی اب قوت اسلام کے زمانہ میں مسلمانوں سے اُن کو یہ خوف ہوا کہ وہ اللہ پر توکل نہ کر سکے نہ اس سے پہلے جو اللہ نے ان کی نصرت اور مدد کے بہت سے وعدے کیے تھے وہ ان کو یاد رہے۔

اصول کافی کی کتاب الحجۃ باب مانص اللہ میں ایک طویل روایت مذکور ہے اُس میں صرف اسی قدر قصہ ہے جو غدیر خم میں واقع ہوا تھا اُس میں یہ بھی ہے کہ جب تبلیغ ولایت کا حکم آیا تو رسولؐ کا دل تنگ ہو گیا اور خوف ہوا کہ کہیں لوگ دین سے پھر نہ جاویں اور اس حکم کو رب کی طرف پھیر دیا۔

افسوس ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ اللہ کو بھی سب کچھ خبر ہے وہ حکیم اور علیم ہے پھر ان کو اللہ کا حکم پہونچانے میں تردد کیا تھا؟ اللہ کے حکم کو بار بار رد کرنا اور اُس میں یہ شرط مقرر کرنا کہ محافظت کا وعدہ نازل ہوگا تو ہم اس حکم کو (باقی ص ۴۲۲ پر)

ومن کلام له علیه السلام بعد ما بویع بالخلافة۔

اور جناب امیر علیہ السلام کا کلام ہے اُس وقت کا جب کہ اُن سے خلافت کی بیعت کی گئی۔

(شرح میثم ج ۲۲)

(بقیہ صفحہ ۴۲۱) ادا کریں گے ورنہ ادا نہ کریں گے اطاعت نہیں بلکہ سرکشی ہے اگر محافظت کا وعدہ نازل نہ ہوتا تو رسول اس حکم کی تبلیغ کبھی نہ کرتے۔ جب نبی معصوم کا یہ حال تھا تو اب عشر پر کیا طعن؟ ۔

علمائے شیعہ اس باب میں سخت حیران ہیں کہ رسول معصوم نے اللہ کے حکم کو بار بار رد کیوں کیا؟ خلیل قزوینی نے صافی ترجمۂ کافی میں جو تاویل ذکر کی ہے وہ یہ ہے:۔

میل رسول علیہ السلام ایں بود کہ شاید کہ تصریح و تفسیر ولایت در قرآن شود و اکتفا بہ سنت نہ شود۔

رسول علیہ السلام کی خواہش یہ تھی کہ شاید تصریح اور تفسیر حکم ولایت کی قرآن میں نازل ہو جاوے فقط سنت پر اکتفا نہ رہے۔

بھلا یہ تاویل کیوں کر صحیح ہوگی؟ اللہ کے کاموں میں رسول کو کیا دخل تھا اللہ کو اختیار ہے کہ جس حکم کو چاہے قرآن میں بیان کرے جس کو چاہے نہ بیان کرے۔ کیا اس تاویل سے رسول کو بار بار اللہ کے حکم کا رد کرنا جائز ہو گیا یہاں سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ رسول کے نزدیک مسئلہ امامت قرآن میں نہ تھا۔

نہایت عجیب امر یہ ہے کہ یہ حکم بہت مدت پہلے نازل ہو چکا تھا مگر رسولؐ اس کی تبلیغ کو ٹال رہے تھے۔ چنانچہ ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب کی جلد دوم میں ذکر حجۃ الوداع میں لکھا ہے:۔

وقال له قوم من الصحابة لو عاقبت قوما ممن اجلب على عثمان فقال یا اخوتاه انی لست اجهل ما تعلمون۔

اور اُن سے صحابہ کی ایک جماعت نے کہا تھا کہ جن لوگوں نے عثمانؓ پر بلوہ کیا تھا اگر اُن میں سے ایک ایک گروہ کو سزا دو تو بہتر ہے تو جناب امیر نے فرمایا کہ اے میرے بھائیو میں ناواقف نہیں ہوں اُس سے جو تم جانتے ہو۔

(بقیہ صفحہ ۴۲۲) و پیشتر نیز در ایں باب وحی برآں حضرت نازل شدہ بود ولیکن مشتمل بر توقیت و تاکید نبود بایں سبب حضرت تاخیر نمود کہ مبادا درمیان امت اختلافے حادث شود۔

اور پہلے بھی اس باب میں وحی حضرت پر نازل ہوئی تھی لیکن اس میں تبلیغ ولایت کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا اور نہ تاکید تھی۔ اس سبب سے حضرتؐ نے ٹال دیا کہ امت میں کہیں اختلاف نہ ہو جائے۔

اب غور کیجیے کہ اگرچہ تبلیغ رسالت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر واجب تھی مگر اس حکم کو مدتوں تک اس حیلہ سے ٹالا کہ خدا نے اس حکم میں تبلیغ کا کوئی وقت مقرر کیا نہ تاکید کی جب بہت تقاضا ہوگا دیکھا جائے گا جب حجۃ الوداع میں بمقام موقف تاکید ہوئی تو وعدہ محافظت کی شرط لگائی بار بار جبرئیل کو آمد و رفت کی مصیبت میں ڈالا۔ آخر غصہ اور عتاب کی نوبت پہنچی اور رسول کی ضد سے مجبور ہو کر چار و ناچار خدا کو وعدۂ محافظت کرنا پڑا۔

یہ لطیفہ بھی سننے کے قابل ہے کہ اگرچہ بہت سی دشواریوں کے بعد رسولؐ نے اللہ کے غصہ سے مجبور ہو کر حکم ولایتِ علی سنا دیا مگر مرض الموت میں پھر اُن کی نیت بدل گئی تھی اور عباسؓ کو اپنا وصی اور وارث بنانا چاہتے تھے یہی نشانی خلافت کی تھی لیکن جب عباس نے نامنظور کیا تب علی کو وارث اور وصی بنایا اور اپنے کپڑے اور ہتھیار۔ (باقی صفحہ ۴۲۴)

ف یعنی جس طرح تم جانتے ہو کہ یہ لوگ سزا دینے کے لائق ہیں میں بھی یہی جانتا ہوں اور اسی خیال میں ہوں۔ شرح میسم میں لکھا ہے کہ اس قول سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب امیر کے دل میں تھا کہ کسی طرح ان کو سزا دوں۔

(بقیہ ص۴۲۳) اور گھوڑے وغیرہ حوالہ کیے۔ اگر عباسؓ وصی ہونا قبول کر لیتے تو یہ ہتیار وغیرہ اُنھیں کو ملتے جو نشان امامت وخلافت تھے یہ قصہ اصول کافی کی کتاب الحجۃ میں باب ما عند الائمۃ من سلاح رسول میں بہ تفصیل مذکور ہے۔ پس امامت علی کا حکم ایسا تھا کہ رسول آخر وقت تک اس کی مخالفت کی کوشش کرتے رہے شاید رسولؐ کے اسی خیال نے صحابہ کے دلوں میں اثر کیا تھا اور اسی خیال کو مستحکم کرنے کے لیے رسولؐ نے یہ امر تقدیری سُنا دیا کہ میرے بعد ابوبکر پھر عمر خلیفہ ہوں گے۔

پس طعن قرطاس میں جو الزام عمرؓ پر عائد کیا جاتا ہے اگر اُس کو تسلیم کیا جائے تو امر ولایت کی تبلیغ میں رسولؐ پر اس سے بڑھ کر الزام عائد ہوگا (معاذ اللہ منہا) اب قصہ قرطاس میں ایک بحث اور باقی رہی اور وہ یہ ہے کہ جب صحابہ میں بحث ہو رہی تھی اور ایک فریق کہتا تھا کہ کاغذ دوات لاؤ۔ دوسرا کہتا تھا کہ اس شدت مرض کے وقت تکلیف مت دو۔ اس وقت بعض لوگوں نے یہ کہا:۔

ما شانہ اھجر استفھموا — رسول کا کیا حال ہے کیا جدا ہو گئے۔ غور کرو۔

ان کہنے والوں کا نام معلوم نہیں کہ وہ کون کون تھے پس اگر اس عبارت سے کوئی طعن پیدا ہو تو وہ کسی شخص خاص کی طرف منسوب نہیں ہو سکتا۔ ہجر کے معنی جدائی کے بہت مشہور ہیں اور اس لفظ کو سُن کر اول یہی معنی ہر شخص کی سمجھ میں آتے ہیں۔ کہنے والوں کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ایسا فرماتے ہیں کیا اب آپؐ کی وفات کا وقت (بقیہ ص۴۲۵ پر)

ولکن کیف لی بقوۃ والقوم المجلبون علی حد شوکتھم یملکوننا ولا نملکھم — اور لیکن مجھ میں قوت کہاں ہے اور بلوہ کرنے والی جماعت اپنی پوری قوت پر ہے وہ ہم پر قابو رکھتے ہیں اور ہم اُن پر قابو نہیں رکھتے۔

(بقیہ ص۴۲۴) قریب آگیا اور ہم سے جُدا ہو گئے۔ اس معنی پر کوئی طعن نہیں۔ لفظ ہجر کے ایک دوسرے معنی بھی ہیں یعنی شدت مرض میں بیمار کی زبان سے جو مشتبہ باتیں نکلتی ہیں اُن کو بھی ہجر کہتے ہیں وہ کئی قسم ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ مریض قصد صحیح سے کلام کرنا چاہے مگر زبان پر خشکی غالب ہونے کی وجہ سے آواز ایسی نکلے جو سننے والوں کی سمجھ میں اچھی طرح نہ آوے۔ دوسرے یہ کہ مریض کو ہوش نہ ہو اور بلا قصد اس کی زبان سے باتیں نکلیں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عبارت مذکورہ میں ہم لفظ ہجر کے معنی جدائی کے نہ لیں اور کلام مریض کے لیں۔ بالفرض اگر کلام مریض کے معنی مراد ہوں تو قسم اول مراد ہوگی یعنی آپؐ کا کیا حال ہے کیا آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں اچھی طرح سمجھو۔ اس صورت میں بھی کسی طعن کی گنجائش نہیں۔

بالفرض اگر یہ معنی مراد لیے جائیں کہ بے ہوشی میں بلا قصد باتیں کرتے ہیں تو یہ کلام اُس فریق کا ٹھیرے گا جو لکھنے کا اصرار کرتے تھے یعنی وہ دوسرے فریق سے کہتے تھے کہ کیوں نہیں لکھواتے کیا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ باتیں بے ہوشی کی ہیں؟ یعنی یہ باتیں بے ہوشی کی نہیں ہیں ضرور لکھواؤ۔ اکثر روایتوں میں ہمزۂ استفہام موجود ہے جن میں نہیں وہاں محذوف مانا جاوے گا۔ **بالفرض** اگر کلام بے ہوشی مراد لیا جاوے اور یہ کلام اُسی فریق کا مانا جاوے جو لکھوانے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے اور استفہام بھی نہ مانا جاوے تو شاید انھوں نے یہ خیال کیا ہوگا کہ بے ہوشی میں بلا قصد باتیں کرنا عوارض مرض سے ہے (باقی ص۴۲۶ پر)

قد ثارت معهم عبدانكم والتفت اليهم اعرابكم وهم خلالكم يسومونكم ما شاؤا اهل ترون موضعا لقدرة على شئ تريدونه

بے شک جمع ہوگئے ہیں ان میں غلام تمہارے اور مل گئے ہیں اُن کے ساتھ صحرائی لوگ اور وہ تمہارے درمیان میں ہیں۔ مجبور کرتے ہیں تم کو جس امر پر چاہتے ہیں کیا دیکھتے ہو تم کوئی موقع قدرت کا اس کام پر جس کا تم ارادہ کرتے ہو۔

شرح میسم میں لکھا ہے کہ قتل عثمانؓ کے قصاص نہ لینے کا عذر جناب امیر کی طرف سے یہی تھا اور حاصل اس عذر کا یہ ہوا کہ پوری قدرت قصاص لینے کی حاصل نہ تھی۔

(بقیہ صفحہ ۴۲۵) اور جس طرح مرض کے دوسرے عوارض رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر طاری ہوتے ہیں اسی طرح کلام بے ہوشی کی کیفیت بھی طاری ہوتی ہے لیکن ایسی باتیں جو منافی شان نبوت ہوں بے ہوشی میں بھی زبان رسول سے نہیں نکلیں گی۔ پس اس کلام کی نسبت کلام بے ہوشی کا لفظ اس وجہ سے اُن کی زبان سے نکل گیا کہ وہ اس کلام کو منافی شان نبوت نہیں سمجھتے تھے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ کاغذ دوات وغیرہ لاؤ میں ایسا مضمون لکھوا دوں جو تم کو گمراہی سے بچاوے منافی شان نبوت نہ تھا اور ایسے کلام کا بلا قصد رسولؐ کی زبان سے نکل جانا وہ جائز سمجھتے تھے۔ پس اگر یہ ثابت ہوجائے کہ حالت بے ہوشی مرض میں اچھے کلام بھی بلا قصد رسولؐ کی زبان پر نہیں آتے تھے تب بھی ان کی خطا ثابت ہوگی وہ معصوم نہ تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدت مرض دیکھ کر اس وقت بد حواس بھی تھے اللہ سے امید مغفرت ہے ۱۲

جناب امیر کی اس غلط فہمی کی کہ اُنھوں نے اپنے آپ کو قاتلان عثمانؓ کے مقابلہ میں عاجز اور مغلوب سمجھ لیا تھا بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہونچی کہ یہ بلوائی صحابہ کو دھمکانے لگے۔ طلحہؓ اور زبیرؓ انھیں کی دھمکیوں کی وجہ سے مدینہ سے نکلے انھیں بلوائیوں نے جناب امیر کو فوج کشی پر مجبور کیا اور اگرچہ بصرہ میں پہنچ کر جناب امیر کی طلحہ اور زبیر کے ساتھ بالکل صفائی ہوگئی تھی مگر انھیں بلوائیوں نے بغیر اجازت اور اطلاع جناب امیر کے یکایک لڑائی چھیڑ دی اور کشت و خون شروع کر دیا جس کی وجہ سے چار و ناچار فریقین کو جنگ میں مبتلا ہونا پڑا۔

امیر معاویہؓ سے جو لڑائیاں ہوئیں ان میں بھی بناء مخاصمت یہی تھی کہ ان بلوائیوں سے قصاص کیوں نہ لیا۔

اگر جناب امیر ابتداءً میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے اور ان کو سزا دینے کا قصد مصمم کر لیتے تو یہ ناگوار حوادث جو واقع ہوئے کبھی نہ پیش آتے اور مسلمانوں میں باہم کشت و خون نہ ہوتا۔ طلحہؓ اور زبیرؓ اور معاویہؓ جس طرح خلفاء ثلاثہ کے مطیع رہے جناب امیر کے بھی مطیع رہتے اور جناب امیر کی خلافت کی وہ حالت نہ ہوتی جو ہوئی۔

افسوس کہ جناب امیر اُن مفسد بلوائیوں کو ساتھ لے کر بصرہ میں طلحہؓ اور زبیرؓ اور صفین میں معاویہؓ سے لڑے اور یہ نہ کیا کہ طلحہ اور زبیر اور معاویہ کو ساتھ لے کر اُن بلوائیوں سے لڑتے اس کی وجہ یہی غلط فہمی تھی کہ جناب امیر نے اپنے آپ کو اُن کے ہاتھوں میں بالکل مجبور سمجھ لیا تھا۔

یا مثلاً جناب امیر نے ان لوگوں کو جنھوں نے بہت سا ہجوم کر کے اُن کی

بیعت کی اپنا ناصر اور مددگار سمجھ لیا چنانچہ خطبہ شقشقیہ کے آخر میں وہ فرماتے ہیں کہ اگر اتنے آدمی بیعت کے لیے حاضر نہ ہوتے اور مددگاروں کے موجود ہوجانے کی وجہ سے حجت پوری نہ ہوجاتی تو میں خلافت کو کبھی قبول نہ کرتا یہ دھوکا جناب امیر کو اس وجہ سے ہوا کہ لوگ بڑی بدحواسی کے ساتھ بیعت کے لیے آئے حالانکہ یہ خیال جناب امیر کا بالکل غلط تھا اور بعد کو ظاہر ہوگیا کہ وہ ہرگز مددگار نہ تھے۔ چنانچہ امتحان کے وقت ان کی حالت ظاہر ہوگئی اُنھیں کی وجہ سے جناب امیر اُس ظلم و جور کے باقی رکھنے پر مجبور رہے جس کا اوپر ذکر ہوچکا۔ نہج البلاغت[1] میں ہے کہ جناب امیر اُن سے مخاطب ہوکر یوں فرماتے تھے:-

قاتلکم اللہ لقد ملاءتم قلبی قیحا و شحنتم صدری غیظا۔	غارت کرے تم کو اللہ بے شک بھر دیا تم نے میرا دل پیپ سے اور بھر دیا تم نے سینہ میرا غصہ سے۔

دوسرا کلام جناب امیر کا اُن کی نسبت نہج البلاغت[2] میں یہ مذکور ہے:-

اللھم انی قد مللتھم وملونی و سئمتھم و سئمونی فابدلنی بھم خیرا منھم و ابدلھم بی شرا منی۔	اے اللہ میں نے اُن کو ملول کر دیا اور اُنھوں نے مجھ کو ملول کر دیا اور میں نے ان کو عاجز کر دیا اور اُنھوں نے مجھ کو عاجز کر دیا پس بدل دے تو میرے لیے ان کے عوض بہتر قوم اُن سے اور بدل دے ان کے لیے میرے عوض میں زیادہ شر والا مجھ سے۔

[1] و [2] شرح میثم ج ۹۔

اس قول میں جناب امیر نے کسی قدر شر کی اپنی طرف بھی نسبت کی۔ یہ کمال فصاحت کا مقتضا تھا کہ کوئی ایسا لفظ ان کو میسر نہ آیا جس میں یہ وہم پیدا نہ ہوتا۔

یا مثلاً جنگ صفین میں جب لشکر معاویہ کی طرف سے قرآن علموں میں باندھ کر دکھائے گئے جس میں یہ اشارہ تھا کہ اے مسلمانو آپس میں مت لڑو اور کسی کو ثالث مقرر کرو جو قرآن کے بموجب فیصلہ کر دے۔ اس وقت ابتدا میں جناب امیر کی رائے یہ تھی کہ ہرگز ثالثی نہ کی جائے اور غضب میں آکر آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ کلمۂ حق زبان سے کہہ کر اُس سے باطل مراد لیتے ہیں اور تمام لشکر سے آپ نے فرما دیا کہ ہرگز ثالثی پر راضی نہ ہونا چاہیے۔ اس رائے کے ظاہر کرنے کے بعد جناب امیر کی (جو باعتقاد شیعہ خطائے اجتہادی سے بھی معصوم تھے) رائے بدلی اور ثالث مقرر کرنے پر راضی ہوگئے۔ پس بعض خیالات سے دھوکا کھا کر جو جناب امیر نے اپنی رائے بدل دی اور ثالثی مقرر کر دی یہ جناب امیر کی بڑی بھاری غلطی تھی جس کے نتیجے میں جناب امیر کے لشکر میں سے ایک گروہ خارجی ہوگیا اور یوں کہنے لگا کہ پہلے تم نے ہم کو ثالثی مقرر کرنے سے منع کیا تھا اب ثالثی پر راضی ہونے کا حکم کرتے ہو۔ اب ہم نہیں جانتے کہ تمھاری پہلی رائے صحیح تھی یا دوسری رائے بہتر ہے مگر اس رائے بدلنے اور ثالثی مقرر کرنے سے یہ ظاہر ہوگیا کہ تم کو خود اپنی امامت میں شک ہے۔ نہج البلاغت[1] میں لکھا ہے کہ اُس وقت جناب امیر نے

[1] شرح میثم ج ۱۰۔ نہج البلاغت کا یہ فقرہ جو جناب امیر کا کلام ہے اور اُس کے علاوہ یہ تمام قصہ شرح میثم سے ماخوذ ہے ۱۲

کف افسوس مل کر یہ فرمایا:-

ھذا جزاء من ترك العقدة — یہی ہے سزا اس کی جس نے چھوڑی رائے مستحکم۔

شرح میثم میں یہ بھی لکھا ہے کہ جناب امیر کی رائے بدلنے کی وجہ یہ ہوئی کہ اصحاب جناب امیر میں سے ایک گروہ ثالثی مقرر کرنے پر ایسا اصرار کرتا تھا کہ اُس نے جناب امیر سے یہ کہا کہ اگر تم ثالثی مقرر نہ کروگے تو ہم تم کو اسی طرح قتل کر دیں گے جیسے ہم نے عثمانؓ کو قتل کر دیا پس جناب امیر نے اپنی رائے چھوڑ کر انھیں کی رائے اختیار کی۔

اب غور کرو کہ جب خلیفہ مفسدوں کی دھمکیوں سے ایسا ڈر جائے تو اُس سے خلافت کا انتظام کیا ہو سکے۔ کثرت فضائل و مناقب دوسری چیز ہے اور انتظام ملک اور تدبیر جنگ دوسری چیز ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جناب امیر کے قلب منور پر کیفیاتِ باطنی کی تجلیات ایسی غالب تھیں کہ وہ ہمہ تن اُنھیں مشاہدات میں محو تھے اور اُن کی رائے کی جتنی قوت تھی وہ اُسی میں مصروف تھی خلافت زبردستی اُن کے سر پر ڈالی گئی جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے احباب نے جو اُن کے حالات سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ ابتدا میں خلافت کی مصیبت سے اُن کو بچایا تھا وہ جانتے تھے کہ جناب امیر کی حالت کے مناسب یہی ہے کہ کیفیات باطنی اور مشاہدۂ انوار قدس کی ان کو پوری فرصت اور آزادی دی جائے اور انتظامی معاملات میں نہ پھنسایا جاوے چنانچہ یہ رائے صحابہ کی ایسی صائب تھی جس کا نتیجہ اُس شخص پر بہت اچھی طرح ظاہر

ہوگا جسنے خلفائے ثلثہ کے عہد حکومت اور کثرت فتوحات کا مقابلہ جناب امیر کے عہد خلافت کے واقعات سے کیا ہوگا۔

جناب امیر نے جو اپنی رائے بدلی اور مفسدوں کے دھمکانے سے ڈر گئے اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ وہ قاتلان عثمانؓ کے ہاتھ میں کیسے مجبور تھے۔

یا مثلاً اصول کافی کے باب کراہۃ التوقیت میں مذکور ہے کہ جب اللہ نے خروج مہدی کے لیے سنہ ۱۴۰ھ مقرر کیا تھا تو امام باقر علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ ہم نے تم کو اس کی خبر کر دی اور تم نے اس راز کو مشہور کر دیا اس لیے اللہ نے اس وقت کو ٹال دیا اور آئندہ اُس کا کوئی وقت مقرر نہ کیا۔

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام باقر علیہ السلام وغیرہ ائمہ نے نا اہلوں سے اس راز کو ظاہر کیا تھا پس اگر اُن کو پہلے سے نا اہل جانتے تھے تو اُن سے راز کہنا گناہ کبیرہ تھا۔ اور اگر دھوکا کھایا اور اہل و نا اہل کی تمیز نہ ہوئی تو یہ غلط فہمی تھی۔

یا مثلاً امام باقر کو جو اتفاقاتِ زمانہ سے ایک ایسا طعام طیّب نعمتِ غیر مترقبہ مل گیا تھا جس کے کھانے والے کے لیے خواہ وہ عمل کرے یا نہ کرے جنت واجب ہو جاتی تھی اس کو جناب امام نے ایک اپنے غلام کے پاس امانت رکھا اور حکم کیا کہ اس کو امانت رکھ میں تناول کروں گا۔ مگر وہ غلام نافرمان اور خائن اُس مال طیب کو بلا اجازتِ امام خود کھا گیا۔ پس امام نے جو اس کو امین سمجھا تھا یہ ان کی غلط فہمی تھی۔

من لایحضرہ الفقیہ میں باب المکان للمحدث میں لکھا ہے:-

دخل ابو جعفر الباقر الخلاء فوجد لقمة خبز في القذر فاخذها وغسلها ودفعها الى مملوك معه وقال يكون معك لآكلها اذا خرجت فلما خرج قال للمملوك اين اللقمة قال اكلتها يا ابن رسول الله۔

داخل ہوئے امام باقر علیہ السلام پاخانے میں تو پایا روٹی کا ایک ٹکڑا جو گو میں پڑا تھا تو اُٹھا لیا اُس کو اور دھویا اور ایک غلام کے حوالے کر دیا جو اُن کے ساتھ تھا اور فرمایا کہ یہ ٹکڑا تیرے پاس رہے۔ جب میں نکلوں گا تو اس کو کھاؤں گا۔ پھر جب امام پاخانہ سے باہر تشریف لائے تو غلام سے پوچھا کہ لقمہ کہاں ہے؟ غلام نے کہا کہ اے ابن رسول اللہ میں اس کو کھا گیا۔

فقال انما ما استقرت في جوف احد الا وجبت له الجنة فاذهب فانت حر فاني اكره ان استخدم من اهل الجنة

امام نے فرمایا کہ وہ نہ پہونچے گا کسی کے معدے میں مگر واجب ہو جائے گی اُس کے لیے جنت۔ پس چلا جا تو آزاد ہے میں ناپسند کرتا ہوں کہ کسی ایسے شخص سے خدمت لوں جو جنت والا ہو۔

اس روایت سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ائمہ اہل جنت سے خدمت نہیں لیتے تھے اور چونکہ سب ائمہ کی حالت ایک سی ہوتی تھی تو اب فرمائیے کہ رسولؐ نے اور ائمہ نے جن لوگوں سے خدمت لی ہے جیسے بلالؓ او قنبرؓ وغیرہ ان کی کیا حالت ہوگی۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ بعض صورتوں میں شارع معصوم کی نافرمانی میں بھی جنت ملتی ہے تو قصۂ قرطاس میں عمرؓ پر کیا الزام ہے؟

تعجب ہے کہ شیعیانِ امام سنتِ امام کو چھوڑ کر تلاش معاش میں سرگرداں ہیں ایسی غذائے لطیف اور لقمۂ طیب کی تلاش کیوں نہیں کرتے کہ ہم خرما وہم ثواب ہے۔ لذت زبان اور سیری شکم کے علاوہ جنت مفت ملتی ہے۔

یا مثلاً کبھی ملائکہ کو بھی غلط فہمی ہوتی ہے چنانچہ شہادت حسینؑ سے پہلے ملائکہ نے اللہ سے اجازت حاصل کر لی تھی کہ حسین کی مدد کریں۔ ملائکہ یہ سمجھتے تھے کہ جب اللہ نے ہم کو مدد کی اجازت دی ہے تو ضرور ہم کو مدد کرنے کا موقع ملے گا چنانچہ ملائکہ نے سامان جنگ درست کرنے کے لیے کسی قدر توقف کیا (شاید زنگ آلودہ ہتیار تیز کرتے ہوں گے، رسد کے اہتمام کے لیے بار برداری کے جانور اور غلہ بہم پہونچاتے ہوں گے، آسمان سے زمین کربلا تک عبور فوج کے لیے سڑکیں بناتے ہوں گے، خبر رسانی کے لیے ٹیلی گراف قائم کیا ہوگا، زخمیوں کے لیے ہسپتال بنائے ہوں گے) جب وہ ملائکہ زمین کربلا میں پہونچے تو امام حسین شہید ہو چکے تھے۔ اس وقت اللہ سے اُن ملائکہ نے شکایت کی کہ اگر ہمارے پہونچنے سے پہلے امام حسین کا خاتمہ کر دینا منظور تھا تو ہم کو اجازت کیوں دی تھی تو ان کو یہ حکم ملا کہ اب تم ان کی قبر پر بیٹھے ہوئے رویا کرو جب وہ قبر سے نکلیں تو ان کی مدد کرنا۔ پس ملائکہ نے جو یہ سمجھا تھا کہ اللہ نے ہم کو مدد کی اجازت دی ہے تو ضرور ہم کو مدد کرنے کا موقع ملے گا اور ہم جب تک سامان جنگ درست کر کے کربلا تک پہونچیں گے اُس وقت تک جناب امام ضرور زندہ ہوں گے

یہ ان کی غلط فہمی تھی یہ قصہ اصول کافی کے باب ان الائمۃ لم یفعلوا شیئاً الا بعهد من اللہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس طرح منقول ہے :-

ان الحسین علیہ السلام قرء صحیفۃ التی اعطیها و فسر له ما یاتی بنعی وبقی فیها اشیاء لم تقض فخرج للقتال وکانت تلك الامور التی بقیت ان الملائکۃ سالت اللہ فی نصرته فاذن لها فمکثت تستعد للقتال و تتاهب لذلك حتی قتل فنزلت وقد انقطعت مدته وقتل علیہ السلام فقالت الملائکۃ یا رب اذنت لنا فی الانحدار واذنت لنا فی نصرته فانحدرنا وقد قبضته فاوحی اللہ الیهم ان الزموا قبره حتی تروه قد خرج فانصروه وابکوا علیه[۱]

امام حسین علیہ السلام کو جو صحیفہ عطا ہوا تھا وہ انھوں نے پڑھا ان کے لیے اس میں تفسیر تھی آنے والی باتوں کی مع خبر مرگ کے اور باقی رہ گئی تھیں اُس صحیفہ میں بہت سی چیزیں جو ابھی پوری نہیں ہوئی تھیں ۔ پھر نکلے امام حسین قتال کے لیے ۔ اور تھے وہ امور جو باقی رہ گئے تھے یہ کہ ملائکہ نے اللہ سے اجازت چاہی تھی امام حسین کی مدد کرنے کی تو اللہ نے ان کو اجازت دے دی پس ٹھہرے ملائکہ کہ تیار ہوتے تھے لڑائی کے لیے اور سامان درست کرتے تھے جنگ کے لیے اتنے میں قتل ہوگئے حسین ۔ پھر ملائکہ اُترے اور ختم ہوچکی تھی عمر حسین کی اور قتل ہوچکے تھے حسین علیہ السلام ۔ تو ملائکہ نے کہا کہ اے اللہ تونے ہم کو اجازت دی تھی اُترنے کی اور تونے ہم کو اجازت دی تھی حسین کی مدد کرنے کی پس ہم اُترے اور تونے اُن کی روح قبض کرلی تو اللہ نے فرشتوں کی طرف وحی بھیجی کہ حسین کی قبر پر ہر وقت موجود رہو اس وقت تک کہ تم حسین کو دیکھو کہ قبر سے نکلے تو اُن کی مدد کرنا اور اب روتے رہو حسین پر ۔

[۱] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ صـ ۱۷۴

اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح ملائکہ کو غلط فہمی ہوئی اسی طرح حسین علیہ السلام کو بھی غلط فہمی ہوئی ۔ جلد اول میں مفصل مذکور ہوچکا ہے کہ نصر فرشتہ جو اُن کی مدد کے لیے نازل ہوا تھا اُس کی مدد انھوں نے قبول نہیں کی اُس کی وجہ شاید یہی تھی کہ اپنے صحیفہ سے اُن کو یہ خبر بھی ملی تھی کہ ملائکہ کا لشکر مدد کے لیے نازل ہوگا ۔ پس وہ اسی خیال پر اس مدد کے منتظر رہے لیکن تا تریاق از عراق آوردہ شود کا حساب ہوگیا ۔ اب اگر کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ اللہ نے معرکہ کربلا میں حسین کی جان کیوں نہ بچائی اور ظالموں کو دفع کیوں نہ کیا تو اس کا معقول جواب یہ ہے کہ اللہ نے فرشتوں کو مدد کرنے کا حکم کیا تھا اب فرشتے نہ آئیں تو اللہ پر کیا الزام ۔ پھر اگر فرشتوں کو یہ الزام دیا جائے کہ تم نے دیر کیوں کی تو ان کا جواب یہ ہے کہ بغیر درستی سامان کے فرشتے آتے تو کیا کرسکتے تھے ۔ درحقیقت حسین کے معاملے میں اس وجہ سے تساہل ہوگیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اور جناب سیدہ نے

بار بار ان کی بشارت رد کی تھی اور جناب سیدہ نے بہت سی رد وکد کے بعد رضامندی ظاہر کی اور پھر ایسی ناراض ہوگئیں کہ اُن کا حمل اور تولد ناگوار تھا۔ پس جب حسین مظلوم کے معاملے میں رسول اور جناب سیدہ کی نگاہیں پھری ہوئی تھیں پھر ان کے معاملے میں فرشتے تساہل نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔

یا مثلاً علمائے شیعہ نے یہ تصریح کی ہے کہ کبھی بعض انبیا نے گمان غالب کے اعتبار پر کوئی حکم کر دیا ہے لیکن وہ غلط ہوگیا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ نے کوہ طور سے واپس آنے کا وعدہ تیس دن کا کیا تھا مگر وہ غلط ہوگیا۔ خلیل قزوینی نے صافی[1] ترجمہ کافی کے باب کراہتہ التوقیت میں لکھا ہے:۔

موسیٰ کلیم اللہ عالم الغیب نبود وعدہ از روئے ظن کردہ وظن او غلط شد۔

موسیٰ کلیم اللہ عالم الغیب نہ تھے گمان غالب کے اعتبار پر وعدہ کیا تھا وہ گمان اُن کا غلط ہوگیا۔

یا مثلاً علمائے شیعہ نے یہ تصریح کی ہے کہ ملائکہ اور انبیا اور ائمہ سے کبھی یہ غلطی ہوجاتی ہے کہ جس کام کا وقت ابھی دور ہے اُس کو سمجھ لیتے ہیں کہ جلدی ہونے والا ہے یا جس کام کا وقت جلد ہے اُس کو سمجھ لیتے ہیں کہ دیر میں ہونے والا ہے۔ صافی[2] ترجمہ کافی باب البداء میں لکھا ہے:۔

گاہ باشد ملائکہ ورسل واوصیا ظن وقوع چیزے مؤخر کنند واو تقدیم کند وگاہ باشد

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ملائکہ اور رسول اور ائمہ کسی چیز کی نسبت یہ گمان کر لیتے ہیں

[1] صافی مطبوعہ لکھنؤ کتاب الحجۃ جز ۴ حصہ ۲ صفحہ ۴

[2] صافی مطبوعہ لکھنؤ کتاب التوحید جزو دوم صفحہ ۲۳

کہ ظن وقوع چیزے مقدم کنند واو تاخیر کند۔

کہ دیر میں واقع ہوگی اور اللہ اس کو جلدی کر دیتا ہے اور کبھی ہوتا ہے کہ کسی چیز کے جلد واقع ہونے کا گمان کر لیتے ہیں اور اللہ اس میں دیر کرتا ہے۔

یا مثلاً علمائے شیعہ نے یہ تصریح کی ہے کہ بداء کے معنی یہ ہیں کہ امام کو جو پہلے سے غلط فہمی ہوگئی وہ رفع ہوجاوے۔ چنانچہ صافی[1] ترجمہ کافی کے باب البداء میں لکھا ہے:۔

بداء مستلزم محو گمان امام ست اگر گمان کردہ باشد خلاف مقتضائے آں را۔

بداء کا حاصل یہ ہے کہ امام نے جو خلاف واقع کے کوئی گمان کر لیا ہے وہ رفع ہوجاوے

یا مثلاً علمائے شیعہ نے یہ تصریح کی ہے کہ ہر سال امام کے اعتقادات بدلا کرتے ہیں اور جو اعتقادات پہلے سے حاصل ہیں اُن میں بعض کی غلطی ظاہر ہوجاتی ہے اور بعض نئے اعتقادات سکھائے جاتے ہیں جو پہلے سے حاصل نہ تھے اور یہ تغیر وتبدل بذریعہ ایک کتاب کے ہوتا ہے جو ہر سال لیلۃ القدر میں نازل ہوتی ہے۔ چنانچہ خلیل قزوینی نے صافی[2] ترجمہ کافی میں باب البداء میں لکھا ہے:۔

برائے ہر سال کتابے علیحدہ ست مراد کتابے است کہ در آں تفسیر احکام حوادث کہ محتاج الیہ امام است تا سال دیگر

ہر سال کے لیے علیحدہ کتاب ہے جس میں اُن امور کی وضاحت ہوتی ہے جس کی دوسرے سال تک امام کو حاجت ہوگی۔ ملائکہ اور

[1] صافی ترجمہ کافی کتاب التوحید جزو دوم صفحہ ۲۲۷۔

[2] صافی ترجمہ کافی مطبوعہ لکھنؤ کتاب التوحید جزو دوم صفحہ ۲۲۹

نازل شوند بآں کتاب ملائکہ و روح در شب قدر بر امام زماں اللہ تعالیٰ باطل می کند بآں کتاب انچہ را کہ می خواہد از اعتقادات امام خلائق و اثبات می کند در وانچہ کہ می خواہد از اعتقادات۔

ارواح اُس کتاب کو لے کر شب قدر میں نازل ہوتی ہیں اُس کتاب کے ذریعہ سے اللہ امام کے جو اعتقادات چاہتا ہے باطل کر دیتا ہے اور جو نئے اعتقادات چاہتا ہے ثابت کر دیتا ہے۔

ہر شب قدر میں نازل ہوتی ہے کتاب　جس میں احکام نئے ہوتے ہیں اقوال نئے
حق جو تھا سال گذشتہ میں وہ اب ناحق ہے　اعتقادات بدل جاتے ہیں ہر سال نئے

یہ بیان اُن خطاؤں کا تھا جن میں غلطی کا قصد نہیں کیا جاتا بلکہ بمقتضائے بشریت غلطی ہو جاتی ہے مگر علمائے شیعہ نے تو اس سے بڑھ کر یہ بھی تصریح کی ہے کہ انبیاء جب تک اللہ کی کسی قدر مخالفت نہ کریں اس وقت تک وہ ذلت عبودیت کا اقرار نہیں کرتے اس لیے اللہ کبھی پیغمبروں کو اپنی حالت پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ کوئی گناہ کر لیں۔ ملا باقر مجلسی نے حیات القلوب[1] میں بیان قصۂ داؤد علیہ السلام میں لکھا ہے:-

از پیغمبراں گناہ صادر نمی شود لیکن چوں نہایت مرتبہ کمال انسانی اقرار بعجز و ناتوانی و تذلل ست و ایں معنی بدوں صدور فی الجملہ مخالفتے حاصل نمی شود۔ لہذا حق تعالیٰ گاہے انبیاء و دوستان خود را بخود می گزارد کہ مکروہے یا ترک اولیٰ از ایشاں صادر گردد۔

پیغمبروں سے گناہ نہیں ہوتا لیکن انسان کے کمال کا سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ اپنے عجز اور ذلت کا اقرار کرے اور یہ اقرار اُس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کچھ مخالفت نہ کر لے اس لیے اللہ کبھی انبیاء کو اپنے دوستوں کو اُن کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے کہ کوئی گناہ جو مکروہ یا ترک اولیٰ ہو اُن سے صادر ہو جائے

[1] جلد اول قصۂ داؤد علیہ السلام بیان ترک اولیٰ صفحہ ۳۰۷ -

گناہ کیوں نہ کریں شوق سے نبی و ولی
کہ ہے مخالفتِ حق کمالِ انسانی

پس جب انبیاء اور ائمہ اور ملائکہ کی غلط فہمیوں کا یہ حال ہے تو اگر بمقتضائے بشریت ام المومنین عائشہؓ سے بھی اس معاملہ میں غلط فہمی ہو گئی تو کوئی محل طعن نہیں ہو سکتا۔

اب فرض کرو کہ جناب سیدہ فی الواقع خفا ہوئیں تو اُس میں ابوبکرؓ کا کیا قصور۔ ابوبکرؓ کا فعل تو یہ تھا کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کی اور اس پر عمل کیا۔ اگر اس میں جناب سیدہ کی ناراضی ہو جائے تو ابوبکرؓ کیا کریں۔ کیا حضرات شیعہ کا یہ مطلب ہے کہ ابوبکرؓ جناب سیدہؓ کی خاطر سے حدیث پر عمل چھوڑ دیتے۔

کبھی معصومینؑ میں بھی باہم رنج ہو جاتا ہے جس میں کسی کا قصور نہیں ہوتا جیسے موسیٰ اور ہارون میں ہو گیا۔

جناب سیدہ کا غصہ ابوبکرؓ پر جو بخاری کی اس روایت سے ثابت کیا جاتا ہے اُس کو جناب سیدہ کے اس غصہ سے مقابلہ کرو جو الفاظ "ہمچو جنین در رحم" الخ سے جناب امیر پر ظاہر ہوا۔ یہ الفاظ درشت جس غصہ کی خبر دیتے ہیں وہ آخر وقت تک رفع نہیں ہوا اور اس کے بعد دونوں کا ساتھ رہنا تعلق زوجیت اور بیماری کی مجبوری سے تھا۔

شیعوں کی بعض روایتوں میں یہ ہے کہ جناب سیدہ کے آخر وقت میں

ابوبکرؓ اور عمرؓ نے جناب امیر کے توسط سے اپنا قصور معاف کرانا چاہا جناب سیدہ نے اپنے حضور میں بلا لیا مگر ان دونوں نے ہر چند معذرت کی قصور معاف نہ کیا۔

افسوس کہ حضرات شیعہ کو ایسی روایات کے لکھنے سے شرم نہیں آتی اس فرقہ کو جناب سیدہؓ سے کمال محبت کا بڑے غلو کے ساتھ دعویٰ ہے اور باایں ہمہ کیسی بے رحمی اور سنگ دلی کا عیب اُن پر لگایا۔ معذرت کے بعد قصور معاف نہ کرنا کیسی بے مروتی ہے۔ بالفرض اگر جناب سیدہ نے قصور معاف نہ کیا تو نہ کریں۔ آخرت کی حکومت تو ان کے اختیار میں نہ ہوگی بلکہ غفور الرحیم کے اختیار میں ہوگی وہ خوب جانتا ہے کہ ان دونوں نے کیسی معذرت کی اور اس کے مقابلے میں جناب سیدہ نے سنگ دلی اور بے رحمی اختیار فرمائی جو مومن کی شان سے بعید ہے۔ بہرحال جب انھوں نے معذرت کرلی تو اُن پر کوئی الزام باقی نہ رہا۔ اہل انصاف جانتے ہیں کہ یہ روایت ہرگز قابل قبول نہیں ورنہ جناب سیدہ پر بڑا طعن عائد ہوتا ہے۔ حضرات شیعہ کو اس روایت کے تصنیف کرنے سے ابوبکرؓ اور عمرؓ پر یہ الزام بڑھانا مقصود تھا کہ جناب سیدہ نے باوجود اُن کی معذرت کے اُن کا قصور معاف نہ کیا۔ اس سے ان کو کیا غرض کہ اس میں جناب سیدہؓ کی نسبت کیسی بے رحمی کی صفت ثابت ہوگئی۔ رفتہ رفتہ علمائے شیعہ بھی اس قباحت کو سمجھ گئے اور اب وہ اس کے مقابلے میں ایک دوسری روایت پیش کرتے ہیں جس کو ہم میثم بحرانی کی شرح[1] نہج البلاغت سے نقل کرتے ہیں:۔

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۳۵۔

انہ لما سمع کلامہا حمد الله واثنی وصلی علی رسولہ ثم قال یا خیرۃ النساء وابنۃ خیر الآباء والله ما عدوت رای رسول الله ولا عملت الا بامرہ قد قلت فابلغت واغلظت فاہجرت فغفر الله لنا ولك

ابوبکرؓ نے جب جناب سیدہ کا کلام سُنا تو ابوبکرؓ نے اللہ کی حمد بیان کی اور ثنا کی اور رسولؐ پر درود پڑھا پھر کہا کہ اے افضل عورتوں کی اور بیٹی اُس باپ کی جو سب میں افضل ہے میں نے رسول اللہ کی رائے سے تجاوز نہیں کیا اور نہیں عمل کیا میں نے مگر رسولؐ کے حکم پر بے شک تم نے گفتگو کی اور بات بڑھادی اور سختی اور ناراضی کی اب اللہ معاف کرے ہمارے لیے اور تمہارے لیے

اما بعد فقد دفعت آلات رسول الله ودابتہ الی علی واما ما سوی ذلك فانی سمعت رسول الله یقول انا معاشر الانبیاء لا نورث ذہبا ولا فضۃ ولا ارضا ولا عقارا ولا دارا ولكنا نورث الایمان والحكمۃ والعلم والسنۃ وعملت بما امرنی ونصحت فقالت ان رسول الله قد وہبہا لی

اس کے بعد یہ ہے کہ میں نے رسولؐ کے ہتیار اور سواری کے جانور علیؓ کو دیدیے اور لیکن جو کچھ اس کے سوا ہے اُس میں میں نے رسول اللہ کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ ہم جماعت انبیاء نہ سونے کی میراث دیتے ہیں نہ چاندی کی نہ زمین کی نہ کھیتی کی نہ مکان کی اور لیکن ہم میراث دیتے ہیں ایمان اور حکمت اور علم اور سُنت کی اور عمل کیا میں نے اُس پر جو مجھ کو حکم کیا تھا اور میں نے نیک نیتی کی ہے تو جناب سیدہ نے

قال فمن یشھد بذلک فجاء
علی بن ابی طالب وام ایمن
فشھدا لھا بذلک فجاء عمر بن
الخطاب وعبد الرحمن بن عوف
فشھدا ان رسول اللہ کان
یقسمھا۔ فقال ابوبکر صدقت
یا ابنۃ رسول اللہ وصدق علی
وصدقت ام ایمن وصدق عمر
وصدق عبد الرحمن وذلک
ان لک ما لابیک کان رسول اللہ
یاخذ من فدک قوتکم ویقسم
الباقی ویحمل منہ فی سبیل اللہ
ولک علی اللہ ان اصنع بھا
کما کان یصنع فرضیت بذلک
واخذت العھد علیہ بہ و
کان یاخذ غلتھا فیدفع الیھم
منھا ما یکفیھم ثم فعلت
الخلفاء بعدہ کذلک
الی ان ولی معویۃ فاقطع

فرمایا کہ بے شک رسول اللہ نے فدک
مجھ کو ہبہ کر دیا ہے۔ ابوبکر نے کہا اس پر
گواہ کون ہے۔ تو آئے علی بن ابی طالب
اور ام ایمن ان دونوں نے فاطمہ کے لیے
گواہی ہبہ کی دی۔ پھر آئے عمر بن خطاب
اور عبد الرحمن بن عوف انھوں نے یہ گواہی
دی کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فدک
کو تقسیم کر دیتے تھے۔ تو ابوبکر نے کہا کہ اے
رسول کی بیٹی تو نے سچ کہا اور علی اور ام ایمن
نے بھی سچ کہا اور عمر نے بھی سچ کہا اور عبد الرحمن
نے بھی سچ کہا اور اس کا تصفیہ یہ ہے کہ جو
تیرے باپ کے لیے تھا وہی تیرے لیے ہے
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فدک
سے تمہارا قوت رکھ لیتے تھے اور باقی کو
تقسیم کر دیتے تھے اور اٹھاتے تھے اس
میں سے اللہ کی راہ میں۔ اور میں تیرے
لیے اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ فدک میں وہی
کروں گا جو رسول کرتے تھے تو اس پر
فاطمہ راضی ہو گئیں اور فدک میں اسی پر

مروان ثلثھا بعد الحسن ثم
خصلت فی خلافتہ وتداولھا
اولادہ الی ان انتھت الی عمر
بن عبد العزیز فردھا فی
خلافتہ علی اولاد فاطمۃ۔

عمل کرنے کا ابوبکر سے عہد لے لیا اور ابوبکر
فدک کی پیداوار کو لیتے تھے اور جتنا اہل
بیت کا خرچ ہوتا تھا اُن کے پاس بھیج دیتے
تھے۔ پھر ابوبکر کے بعد اور خلفا نے بھی یہی
کیا۔ یہاں تک کہ حاکم ہوئے معاویہ تو امام
حسن کی وفات کے بعد مروان نے فدک کے
ایک ثُلث کو اپنی جاگیر بنا لیا۔ پھر اپنی خلافت
کے زمانہ میں اپنے لیے خاص کر لیا۔ اور مروان
کی اولاد کے پاس رہا یہاں تک کہ عمر بن
عبد العزیز کے پاس پہونچا تو اُنھوں نے
اپنی خلافت کے زمانہ میں فدک کو اولاد
فاطمہ پر رد کر دیا۔

اس روایت کے ملاحظہ کے بعد نہ غصب فدک کی شکایت باقی رہی
نہ ناراضی اور خفگی کا وجود رہا اور طعن کی جڑ کٹ گئی۔

اصل قصہ بحث فدک کا یہ ہے کہ بعض قطعات جو مسلمانوں کے حملے
کے وقت کافروں نے مغلوب ہو کر بغیر لڑائی کے مسلمانوں کو دیدیے تھے وہ رسول
اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی حاجتوں کے واسطے اپنے قبضہ میں رکھ لیے تھے۔
جس میں ایک فدک تھا جو مدینہ سے تین منزل ایک گاؤں تھا اس کی نصف
زمین یہودیوں نے بطور صلح کے دے دی تھی اس کے علاوہ سات قطعے مدینہ سے

ملحق تھے وہ بھی یہود بنی نضیر سے ملے تھے ان کے علاوہ بھی بعض قطعات تھے۔
خیبر جس کو جہاد میں فتح کیا تھا وہاں سے پانچواں حصہ حق رسول ملتا تھا۔ جہاد
میں سے جو غنیمت کا مال آتا تھا اس میں سے بھی حق رسول ملتا تھا۔ یہی رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی آمدنی تھی یہی ان کی سلطنت کا خزانہ تھا اپنا خرچ بھی اس
میں سے کرتے تھے اور تمام بنی ہاشم کو بھی کچھ کچھ دیتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ صدقہ
لینا ان کو جائز نہ تھا حاجتمندوں کو بھی اسی میں سے دیتے تھے۔ قافلے کے قافلے
مہمانوں کے اور بادشاہوں کے سفیر جو آیا کرتے تھے ان کی مہمانی بھی اسی میں سے
ہوتی تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد کو تشریف لے جاتے تھے تو سواری
اور ہتیار اور زاد رہ وغیرہ بھی اسی میں سے تھا اس کے علاوہ جہاں تک ہو سکتا
تھا اور مجاہدین کی بھی مدد کرتے تھے کسی کو گھوڑا یا اونٹ دے دیتے تھے کسی کو ہتیار
یا زاد راہ دینا پڑتا تھا ہر جہاد میں بہت سے لوگوں کے ساتھ یہی سلوک کیا کرتے
تھے۔ اصحاب صفہ کی بہت کچھ خبر گیری کرتے تھے۔ حاصل یہ ہے کہ سلطنت کے جتنے
مصارف ہوتے ہیں سب اسی میں سے ہوتے تھے۔ صدقہ کا مال جو آتا تھا وہ فوراً
مستحقین پر تقسیم ہو جاتا تھا کوئی ذخیرہ اُس میں سے نہیں رہتا تھا۔ قطع نظر اس کے
تمام ضروریات سلطنت مصرف زکوٰۃ نہ تھے۔ رسولؐ کی بیبیوں کا نفقہ اور بنی ہاشم
کا وظیفہ بھی اُس میں سے ادا نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ آمدنی ان تمام مصارف کے مقابلے میں ایسی تھوڑی تھی کہ ہمیشہ رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عسرت رہتی تھی یہ سب زمینیں بہ تعلق حیثیت سلطنت
اور جہاد کے حاصل ہوئی تھیں اسی لیے یہ سلطنت کے مصارف کے لیے تھیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ذاتی ملکیت نہیں بنایا تھا بلکہ اللہ کا مال اللہ
کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ یا بنظر ظاہر یوں سمجھ لو کہ سلطنت کا مال تھا اور چونکہ
خرچ بہت اور آمدنی بہت تھوڑی تھی اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اپنے مصارف میں بہت کفایت کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ ازواج مطہرات کو
بھی شکایت رہتی تھی۔ بنی ہاشم میں سے ہر ایک کو اسی قدر دیتے تھے جتنا ممکن اور
مناسب ہوتا تھا حضرت فاطمہ علیہا السلام حد سے زیادہ عزیز تھیں مگر اُن کی
بھی پوری کفالت نہیں کر سکتے تھے۔

ابوداؤد میں جو من جملہ صحاح اہل سنت ہے یہ روایت موجود ہے
کہ فدک کو جناب سیدہ نے مانگا تھا رسولؐ نے انکار کر دیا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ گو
جناب سیدہ کیسی ہی عزیز ہوں مگر اللہ کے وہ کام جس میں روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت
تھی اُن سے زیادہ عزیز تھے۔

ایک مرتبہ جناب سیدہ نے اپنے ہاتھوں کے آبلے دکھائے جو روٹی پکانے
اور چکی پیسنے سے پڑ گئے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں تسبیح
ان کو بتا دی۔

شیعوں کی روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض
الموت میں جناب سیدہ حسنین کو لائی تھیں کہ ان دونوں کو کچھ میراث دیجیے اس
وقت بھی آپؐ نے میٹھی باتوں میں ٹال دیا۔ خصال ابن بابویہ مطبوعہ طہران ص ۳۹
میں ہے:-

اتت فاطمۃ بنت رسول اللہ — جناب سیدہ رسولؐ کے پاس مرض الموت

فی شکواہ الذی توفی فیہ فقالت یا رسول اللہ ھذان ابناک فورثھما شیئا قال اما الحسن فان لہ ھیبتی واما الحسین فان لہ جرأتی۔

میں تشریف لائیں اور کہا کہ یہ دونوں بچے ہیں اُن کو کچھ میراث دیجیے تو رسولؐ نے فرمایا کہ حسن کو میری ہیبت اور حسین کو میری جرأت ملے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بھی تمنا تھی کہ اگرچہ نبوت ختم ہوچکی مگر یہ للّٰہی سلطنت میرے بعد اسی طرح قائم رہے اور اس جائداد کی آمدنی اسی طرح ضروریات سلطنت میں صرف ہوتی رہے۔ اس لیے کہ اُس سلطنت کے تمام مصارف اللہ کے کام تھے اور اللہ کے وعدہ کے بموجب رسولؐ کو یہ بھی معلوم تھا کہ آئندہ برکت کا چشمہ اسی سلطنت سے جوش کرنے والا ہے۔ پس آپؐ نے یہ فرمادیا تھا کہ انبیاء کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ہم چھوڑیں وہ اللہ کا مال ہے یہ حدیث اکثر صحابہ کو معلوم تھی۔ عباس اور علی کو بھی معلوم تھی مگر بمقتضائے بشریت سہو ہوگیا تھا ابوبکرؓ کے یاد دلانے سے یاد آگئی۔ اس حدیث کے مضمون کا پتہ شیعوں کی روایتوں میں بھی ملتا ہے چنانچہ اصول کافی کی کتاب العلم میں ہے:۔

عن ابی عبد اللہ قال ان العلماء ورثۃ الانبیاء و ذالک ان الانبیاء لم یورثوا درھما ولا دینارا وانما

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ انبیاء کے وارث علماء ہیں اور یہ اس لیے کہ انبیاء نے میراث نہیں دی درہم اور دینار میں اور نہیں میراث دی انہوں نے

اورثوا احادیث من احادیثھم ۔ مگر حدیثیں۔

(اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص۱۷)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں نے خلافت کی بیعت ابوبکرؓ سے کی اور یہ منصب عظیم ان کے سپرد ہوا تو جناب سیدہؓ اور عباس نے اُس تمام جائداد میں میراث کا دعویٰ پیش کیا۔ ازواج مطہراتؓ نے بھی یہی قصد کیا تھا مگر اس حدیث کو سن کر رک گئیں۔ اس وقت ابوبکرؓ پر عجیب مشکل تھی۔ جناب سیدہ کے خلافِ مراد جواب دینا بھی دشوار تھا اور اگر اس تمام جائداد پر وارثوں کو قبضہ دیدیں تو ضروریات سلطنت کا انجام کہاں سے ہو۔ عرب کی اتنی بڑی سلطنت اور بجز اس جائداد کے اور کوئی خزانہ یا سرمایہ نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ جدا ہوگئے تھے مگر ان کے تمام مصارف اسی طرح باقی تھے تمام ازواج مطہرات کو نفقہ دینا ضروری تھا۔ بنی ہاشم کے ساتھ بھی کچھ سلوک کرنا ضرور تھا اس لیے کہ وہ صدقہ سے روکے گئے تھے۔ سلطنت کے مہمانوں کی ضیافت، غیر ملکی سفیروں کی مدارات، اپنی طرف سے بھی جابجا سفیروں اور قاصدوں کے بھیجنے کی ضروریات، مجاہدین کا سامان، ملازموں کی تنخواہ، محتاجوں کی اعانت۔ اور اس کے علاوہ سلطنت کی ضرورتیں بے انتہا تھیں جن کا حصر نہیں ہوسکتا۔ ذرا انصاف سے غور کرو کہ اگر کسی تہی دست کو تخت سلطنت حوالہ کردیا جائے اور خزانہ کا ایک حبّہ بھی اُس کو نہ دیا جائے اور وہ ناجائز طور پر کسی کا مال لینا بھی گوارا نہ کرے تو آپ فرمائیے کہ وہ سلطنت کا انتظام کیوں کر پورا کرے۔ ابوبکرؓ نے اس

مشکل کے ہر پہلو پر غور کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو منشا تھا اُسی کو
پورا کرنا مقدم سمجھا اور اللہ پر توکل کر کے رسولؐ کی حدیث سنا دی اور یہ کہہ دیا
کہ اس جائداد کی آمدنی جس طرح رسولؐ صرف کرتے تھے اسی طرح میں بھی صرف
کروں گا سر مو تجاوز نہ کروں گا۔ یہ جواب سن کر جناب سیدہ نے بھی اس حدیث
کی تکذیب نہیں کی۔ البتہ ابوبکرؓ نے جناب سیدہ کی خدمت میں نہایت ادب
سے عرض کیا کہ میرا جو کچھ مال ہے وہ حاضر ہے اس کی تفصیل جلد اول میں مذکور
ہو چکی۔ ابوبکرؓ نے نہایت نیک نیتی سے رسولؐ کا منشاء پورا کرنے کا قصد کیا
اور سمجھ لیا تھا کہ اس پر اگر جناب سیدہ ناراض بھی ہو گئیں تو اللہ ناراض نہ
ہو گا۔ اب اگر یہ بھی فرض کر لو کہ جس طرح بخاری کی روایت سے ثابت ہے
اسی طرح جناب سیدہ ناراض ہو گئیں تب بھی قیامت کے دن وہ ضرور راضی
ہو جائیں گی۔ عرب کی سلطنت جو تمام جہان میں اللہ کا دین پھیلانے اور کلمۃ اللہ
کو غالب کرنے کے لیے قائم ہوئی تھی اُس کے کام ابوبکرؓ نے اسی مختصر خزانہ سے
چلانا شروع کیے۔ ازواج مطہرات کا خرچ بنی ہاشم کا وظیفہ اور تمام ضروریات
اور خلافت اور مہمات سلطنت کا سامان اسی میں سے تھا۔ اگر یہ جائداد جناب
سیدہ کے حوالے کر دی جاتی تو اس وقت ضروریات سلطنت پورا کرنے کی
کوئی سبیل نہ تھی البتہ اس وقت کے بعد رفتہ رفتہ یہ سلطنت اللہ کے فضل
سے ایسی غالب ہو گئی کہ تمام جہاں اس نے مسخر کر لیا اور یہیں سے ثابت ہو گیا
کہ ابوبکرؓ کی رائے نہایت صائب تھی اور بے شک سب سے مقدم اسی
سلطنت کی ضروریات تھیں جس کا نتیجہ ایسا عمدہ ظاہر ہونے والا تھا۔ ابوبکرؓ کو

یہ معاملہ ایسے نازک وقت میں پیش آیا تھا جب عرب کی سلطنت کے پاس اس
جائداد کے سوا اور کوئی خزانہ اور سرمایہ نہ تھا مگر علیؓ نے اس وقت بھی یہی معاملہ
کیا جب یہ سلطنت عظیم الشان سلطنت ہو چکی تھی اور جناب امیر کے مقرر
کیے ہوئے عامل زیاد اور ابن جارود وغیرہ دونوں ہاتھوں سے بیت المال کو
لُوٹ رہے تھے۔ ابوبکرؓ نے تمام صحابہ کے سامنے یہ تصفیہ کیا اور کسی نے ناپسند
نہیں کیا۔ اس کے بعد پھر ایسی صورت واقع ہوئی کہ جناب امیر اور عباس نے
عمرؓ کے زمانہ میں بصورتِ دیگر دعویٰ پیش کیا تفصیل اس دعوے کی منقول
نہیں مگر قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدعوے میراث حق تولیت چاہتے
تھے یعنی یہ کہتے تھے کہ جب یہ جائداد وقف رسولؐ ہے تو اس کے متولی اور
متصرف بقدر اپنے اپنے حصہ ارث کے وارثان رسول ہونے چاہییں اس
کے جواب میں عمرؓ نے اول تو قبضہ دینے میں عذر کیا جب اُنھوں نے دوبارہ
آکر اصرار کیا تو عمرؓ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سات باغ جو مدینہ میں
صدقہ رسول کہلاتے تھے حوالہ کر دیے۔ چنانچہ عباس اور علی نے ان باغوں پر
قبضہ کر لیا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ باہم جھگڑا پڑا اور ایک مرتبہ دونوں لڑتے ہوئے عمرؓ کی
مجلس میں آئے اور عباسؓ نے عمرؓ سے مخاطب ہو کر یوں کہا کہ اے امیر المومنین
میرا اور اس کاذب آثم غادر خائن کا فیصلہ کرا دیجیے یہ کلمات عباس کی زبان
سے نہایت جوش غضب میں علیؓ کی نسبت نکلے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان
جس پر بے حد خفا ہوتا ہے اس کی نسبت سخت عیب لگانے والے کلمے اُس کی
زبان سے نکل جاتے ہیں مگر معنی حقیقی اس کے ہرگز مراد نہیں ہوتے بلکہ جوشِ

غضب کا اظہار ہوتا ہے جیسے جناب سیدہ کے کلمات ہیچو جنین الخ اسی طرح بمقتضائے بشریت عباس کی زبان سے جو یہ کلمے حضرت علیؓ کی نسبت نکلے اس میں بھی ہرگز عباس کا یہ مقصود نہ تھا کہ علی میں درحقیقت یہ عیب موجود ہیں بلکہ جوش غضب میں یہ الفاظ زبان سے نکل گئے۔ عمرؓ نے اس کے جواب میں اول تو حدیث لانورث یاد دلائی جس کا حاصل یہ ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا ہے کہ ہمارے مال میں میراث جاری نہ ہوگی اور جو کچھ ہم چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔ اس حدیث کی ان دونوں نے اور تمام اہل مجلس نے تصدیق کی۔ پھر اس جائداد کو جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم خرچ کیا کرتے تھے اس کا ذکر کیا سب نے اس کی بھی تصدیق کی پھر عمرؓ نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم دونوں نے رسول کے انتقال کے بعد ابوبکرؓ سے اس طرح میراث مانگی کہ اے عباس تم اپنے چچا کے مال میں سے میراث چاہتے تھے اور علی اپنی بی بی کی طرف سے باپ کے مال میں میراث چاہتے تھے جب ابوبکرؓ نے میراث نہ دی تو تم نے اُسے کاذب آثم غادر خائن سمجھا حالانکہ اللہ جانتا ہے کہ ابوبکرؓ کا فیصلہ سچا تھا اس کے بعد تم نے مجھے بھی ایسا ہی سمجھا حالانکہ میرا جواب بھی وہی تھا جو درحقیقت حق تھا۔ پھر میں نے تم کو یہ باغ دے دیے اور تم سے یہ عہد لے لیا ہے کہ تم اس کو اسی طرح خرچ کرو گے جیسے رسول خرچ کرتے تھے اگر تم اس عہد پر قائم نہیں تو واپس کر دو اس کے سوا میں اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

حضرت عمرؓ نے جو تقریر کی یہ عجیب حکیمانہ تقریر ان کے باہمی اصلاح کے لیے تھی اگرچہ کلماتِ درشت فقط عباس نے کہے تھے مگر خطاب میں علیؓ کو بھی شامل

کر لیا تاکہ عباس کو یہ ناگوار نہ ہو کہ ملامت فقط ہم کو کی علی کو نہ کی۔ علاوہ اس کے علی کو یہ سمجھا دینا بھی مقصود تھا کہ جیسی عباس کے مزاج میں سختی ہے تمھارے مزاج میں بھی ہے تم دونوں کا ایک سا حال ہے۔ جو کلمات عباس نے علی کو کہے تھے وہ عمر نے ابوبکر پر اور اپنے اوپر بھی الزاماً عائد کر لیے تاکہ علی کو کسی قدر تسکین ہو جائے عباس نے جو کلمات علی کو کہہ دیے حالانکہ علی اُن عیوب سے بالکل پاک تھے اس سے عمر نے یہ نتیجہ نکالا کہ جو شخص تمھاری مرضی کے خلاف کارروائی کرے خواہ وہ کارروائی حق ہو مگر تم اس کو کاذب آثم غادر خائن کہہ دیتے ہو۔ چنانچہ علیؓ نے کوئی ظلم اور خیانت نہیں کی مگر ان کی کارروائی جو عباس کی مرضی کے خلاف تھی اُن کو کاذب آثم وغیرہ کہہ دیا۔

پس اس سے لازم آیا کہ جب ابوبکرؓ نے معاملہ میراث میں تمھارے خلاف فیصلہ کیا اور حدیث لانورث سُنائی تو تم نے گویا اُنھیں بھی ایسا ہی کہا اور جب میں نے یہی کیا تو گویا تم نے مجھے بھی یہی کہا جیسے علی کو کہا حالانکہ ہم دونوں کا فیصلہ حق تھا۔ اصل مقصود اس تقریر سے عباس کی ملامت اور علی کی تسکین تھی اور یہ سمجھا دینا منظور تھا کہ جس طرح عباس نے تمھاری نسبت یہ لفظ کہہ دیے ایسا اختلاف تو اُن سے تم دونوں بھی کر چکے ہیں پس ہماری نسبت وہ اس سے پہلے کہہ چکے ہیں۔ اب تم کو کوئی شکایت نہیں چاہیے اس لیے کہ تم دونوں کی یہ عادت ہے کہ جو شخص تمھاری مرضی کے خلاف کوئی کارروائی کرے اس کو تم ایسا کہہ دیا کرتے ہو۔ یہ مقصود نہیں تھا کہ عباس یا علی نے فی الواقع ایسے کلمات ابوبکرؓ یا عمرؓ کو کہے تھے بلکہ یہ الزام دینا مقصود تھا کہ عباس نے جو کلمات علی کو کہے اُس سے

یہ لازم آتا ہے کہ گویا ہم دونوں کو بھی یہی کہا۔

حضرات شیعہ نے اُس طعن کو زیادہ سخت کرنے کے لیے بڑے زور شور سے یہ بھی تصنیف کر لیا کہ رسولؐ نے فدک فاطمہ کو ہبہ کر دیا تھا اس پر بھی ترقی کر کے یہ کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے قرآن کی آیت میں یہ حکم نازل ہوا تھا۔ چنانچہ اصولِ کافی[1] میں امام موسیٰ کاظم سے روایت ہے:۔

قال ان اللہ لما فتح علی نبیہ فدک فانزل اللہ علی نبیہ و آت ذا القربی حقہ فلم یدر رسول اللہ من ھم فراجع فی ذلک جبریل وراجع جبریل ربہ فاوحی اللہ الیہ ان ادفع فدک الی فاطمۃ۔

امام نے فرمایا کہ جب اللہ نے اپنے نبی پر فدک فتح کرا دیا تو اپنے نبی پر یہ آیت نازل کی (اور دے قرابت والے کو اس کا حق) تو نہ سمجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ وہ کون ہیں۔ تو رجوع کیا اس میں جبریل سے اور رجوع کیا جبریل نے اپنے رب سے تو اللہ نے وحی بھیجی کہ فدک کو فاطمہ کی طرف دفع کر دو۔

چنانچہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہؓ کو بُلا کر فدک بڑے اہتمام سے ہبہ کیا اور انھوں نے اس ہبہ کو قبول کیا۔

کیا یہ امر کچھ عجیب نہیں ہے کہ پیغمبرؐ اپنے اقربا کو بھی نہیں جانتے تھے اللہ ایسے کلام سے خطاب کرے اور پیغمبرؐ اس کا مطلب بھی نہ سمجھیں حضرات شیعہ نے اہل بیت کے حق میں جتنے احکام تصنیف کیے ہیں وہ سب ایسے ہیں

[1] اصول کافی کتاب الحجۃ مطبوعہ لکھنؤ ص۲۵۴

کہ پیغمبرؐ کو ان کا ایک دو مرتبہ رد کرنا پڑا ہے۔ بشارت حسین کی یہی حالت ہوئی ولایت علی کی تبلیغ میں بھی کئی مرتبہ ردوبدل ہوئی آیۂ انما ولیکم اللہ کا مطلب بھی کوئی نہ سمجھا۔ یہی حالت عطائے فدک کی ہوئی۔ عرب کا ہر بچہ اس آیت کا مطلب سمجھ سکتا تھا مگر افسوس کہ پیغمبر نہ سمجھے۔ آیت کا مطلب صاف تھا کہ ہر قرابت والے کا حق صلہ رحم ادا کر یعنی ہر قریب کے ساتھ احسان کر پھر اس میں پیغمبرؐ کو تامل کیوں ہوا۔

اللہ کی طرف سے اگر ایسے اہتمام کے ساتھ عطیہ ہوتا تو اللہ کی سخاوت میں کیا کمی تھی سلطنت سلیمان کی بھی کوئی حقیقت نہ تھی مگر تعجب تو یہ ہے کہ جبریل جس عطیہ کی سند لے کر آئے وہ تھوڑی سی بے حقیقت زمین تھی اس پر طرہ یہ ہے کہ وہ بھی جناب سیدہ کو نصیب نہ ہوئی اور اس کے مانعین کی فہرست میں جناب امیر کا نام بھی درج ہوا۔ حضرات شیعہ نے یہ بھی تو خیال نہ کیا کہ یہ آیت مکی ہے اور فدک مدینہ میں ملا تھا پھر یہ جوڑ کیوں کر صحیح ہوگا۔

شیعہ کہتے ہیں کہ یہ روایت سنیوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے حالانکہ سنیوں کی کسی ایسی کتاب میں ہرگز اس کا پتہ نہ ملے گا جس میں روایتیں معہ سند کے منقول ہوتی ہیں بالفرض کسی غیر معتمد کتاب میں ہو تو اس کے راوی شیعہ غالی اور کذاب ہوں گے۔ تعجب ہے کہ ہبہ کے وقت رسولؐ نے دو مردوں کو اس ہبہ پر گواہ بھی نہ کر لیا کہ دعویٰ ہبہ کے وقت گواہی دیتے۔

شیعوں کا ایک طعن یہ بھی ہے کہ عمرؓ نے جناب سیدہ کے گھر جلانے کا قصد کیا تھا۔ مدار اس طعن کا ایک روایت پر ہے جو صاحب ازالۃ الخفا نے مصنف ابن ابی شیبہ سے نقل کی ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ کچھ لوگ جناب

سیدہؓ کے گھر میں جمع ہو کر یہ مشورہ کیا کرتے تھے کہ ابو بکرؓ سے خلافت چھین کر علیؓ کو خلیفہ بنا دیں۔ عمرؓ کو جو یہ خبر ہوئی تو وہ جناب سیدہؓ کے پاس آئے اور یہ کہا کہ تمام مخلوق میں سب سے زیادہ محبوب ہم کو تمہارے باپ تھے اور اُن کے بعد سب سے زیادہ محبت ہم کو تم سے ہے لیکن یہ امر اس بات کا مانع نہیں کہ اگر یہ لوگ تمہارے پاس جمع ہوئے تو میں یہ حکم کر دوں گا کہ اُن پر گھر جلا دیا جائے چنانچہ اس کے بعد جب وہ آئے تو جناب سیدہ نے اُن سے کہہ دیا کہ عمر قسم کھا گئے ہیں کہ تم پر گھر جلا دیں گے بے شک جو انھوں نے قسم کھائی ہے اس کو وہ پورا کریں گے تو یہاں سے چلے جاؤ اور اب مت آنا۔

اس روایت کا کتب صحاح میں کہیں پتہ نہیں نہ کسی محدث نے اس کی تصحیح کی راوی اس کے مجہول ہیں کسی دوسری روایت سے اس مضمون کی تصدیق نہیں ہوتی جس کتاب میں یہ روایت ہے اُس میں ہر ایک قسم کی روایتیں یہاں تک کہ جھوٹی روایتیں بھی موجود ہیں۔ قطع نظر اس کے نادر الوجود ہونے کی وجہ سے اس کتاب میں بھی تحریف کا احتمال ہے اس لیے یہ قصہ ہم کو مسلم نہیں اور جس طعن کا مدار ایسی غیر معتمد روایت پر ہو وہ قابل جواب نہیں۔

بفرض تسلیم عمرؓ نے یہ کہا کہ ان پر گھر جلا دوں گا یہ نہیں کہا کہ جناب سیدہؓ کا گھر ان پر جلا دوں گا اور یہ ظاہر ہے کہ تہدید فقط ان کو کی تھی نہ جناب سیدہ اور جناب امیر کو۔ پھر جناب سیدہ کے گھر جلانے سے کیا تعلق تھا حالانکہ درحقیقت اُن پر بھی گھر جلانا مقصود نہ تھا بلکہ اس محاورہ کا استعمال فقط ڈرانے اور دھمکانے کے لیے تھا۔

بیان سابق سے یہ مضمون بہت اچھی طرح ثابت ہو چکا ہے کہ جناب امیر کو خلافت ابی بکرؓ سے تعرض کرنا ہرگز منظور نہ تھا اور عباس و ابو سفیان نے جب یہ رائے دی تھی تو جناب امیر نے اس خیال کو فتنہ بتایا تھا بلکہ جناب امیر اس شخص سے لڑنا جائز سمجھتے تھے جو ان کی خلافت سے انحراف کرے۔ پس ظاہر ہے کہ جو لوگ خلافت ابی بکرؓ کی مخالفت کی رائے دیتے ہوں گے وہ درحقیقت جناب امیر کی رائے کے مخالف ہوں گے۔ پس عمرؓ نے ان لوگوں کو دھمکایا جو جناب امیر کی رائے کے مخالف تھے۔ کیا عجب ہے کہ جناب امیر نے خود ہی عمرؓ سے یہ تحریک کی ہو کہ اُن لوگوں کو دھمکا دو تاکہ ہمارے گھر میں فساد کے مشورہ کے لیے جمع نہ ہوا کریں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تکملہ نصیحۃ الشیعہ جلد دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامِدًا وَّمُصَلِّیًا وَّمُسَلِّمًا

اس جلد میں دو مبحث نہایت اہم اور نہایت ضروری ہیں۔ مذہب شیعہ کی اصلی حقیقت کا راز انہیں دونوں سے کھل جاتا ہے۔ اوّل مبحث امامت، دوم مبحث تحریفِ قرآن (معاذ اللہ منہ) اور یہ دونوں محتاج تکمیل ہیں۔ لہٰذا بالاختصار دونوں کے متعلق کچھ لکھا جاتا ہے۔

مبحثِ امامت

کتب شیعہ میں مبحث امامت کا اچھی طرح مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت پورے طور پر منکشف ہو جاتی ہے کہ بانیان مذہب شیعہ کی اصلی غرض کیا تھی اور مسئلہ امامت کی تصنیف کس نیت سے کی گئی ؟۔

اکثر لوگ اس دھوکہ میں ہیں کہ مسئلہ امامت کی تصنیف حضرت علیؓ اور اُن کی اولاد کی محبت میں غلو کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ یہ مسئلہ محض رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت میں آپؐ کے ظل رحمت سے

مسلمانوں کو محروم کرنے کے لیے تصنیف ہوا ہے۔

امام کے متعلق شیعوں کے جو اعتقادات ہیں وہ کھلم کھلا ختم نبوت کے خلاف ہیں۔ لہٰذا مصنف کا یہ کہنا کہ مسئلہ امامت کا ثبوت قرآن مجید سے نہیں ہوتا ایک ہلکا لفظ ہے۔ ثبوت کیا معنی اس مسئلہ کا بطلان قرآن مجید سے اظہر من الشمس ہے کیونکہ قرآن مجید بآواز بلند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین قرار دیتا ہے قیامت تک کے لیے آپؐ ہی کی اطاعت و فرماں برداری کو کافۃ الناس پر لازم و واجب بتاتا ہے اور صرف آپؐ ہی کے اتباع کو واحد ذریعہ نجات کا قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا نہ کوئی معصوم ہو سکتا ہے نہ مفترض الطاعۃ نہ کسی کا قول و فعل حجتِ شرعی کہا جا سکتا ہے لہٰذا مسئلہ امامت کا ابطال قرار واقعی ہو گیا۔

امام کے متعلق شیعوں کے اعتقادات میرے رسالہ الخامس من المائتین کے نمبر اول میں بالتفصیل درج ہیں نمونہ کے طور پر کچھ یہاں بھی بیان کیے جاتے ہیں:

شیعوں کا ایک **عقیدہ** یہ ہے کہ بارہ امام (یعنی علی[1] حسن[2] حسین[3] زین العابدین[4] باقر[5] جعفر[6] موسےٰ[7] رضا[8] نقی[9] تقی[10] حسن عسکری[11] مہدی[12]) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم اور مفترض الطاعۃ ہیں ان کے ہر حکم کی اطاعت اسی طرح تمام مخلوق پر فرض ہے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر حکم کی اطاعت فرض تھی اور ان بارہ اماموں کی فضیلت و بزرگی بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر ہے۔ چنانچہ اصول کافی مطبوعہ

نول کشور پریس لکھنؤ ص۱۱ میں امام باقر علیہ السلام سے روایت ہے۔

ماجاءبہ علی اخذ بہ وما نھی عنہ انتھی عنہ جری لہ من الفضل مثل ماجری لمحمد و لمحمد الفضل ...... علی جمیع ماخلق اللہ عزوجل المتعقب علیہ فی شی من احکامہ کالمتعقب علی اللہ وعلی رسولہ والراد علیہ فی صغیرۃ اوکبیرۃ علی حد الشرک باللہ کان امیر المومنین باب اللہ الذی لایوتی الامنہ وسبیلہ الذی من سلک بغیرہ یھلک وکذلک یجری لائمۃ الھدی واحداً بعد واحدٍ۔

جو کچھ علی لائے ہیں میں اس پر عمل کروں گا اور جس چیز سے انھوں نے منع کیا ہے اس سے باز رہوں گا کیونکہ ان کی بزرگی مثل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بزرگی کے ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ عزوجل کی تمام مخلوق پر بزرگی ہے۔ علی کے کسی حکم پر نکتہ چینی کرنے والا ایسا ہے جیسے اللہ و رسول پر نکتہ چینی کرنے والا اور علی کی چھوٹی یا بڑی بات کو رد کرنے والا شرک باللہ کی حد میں ہے۔ امیر المومنین اللہ کے دروازے تھے اللہ تک اسی دروازہ سے رسائی ہوسکتی ہے اور اللہ کی راہ تھے جو کسی اور راہ پر چلے ہلاک ہوگا اور یہی شان تمام ائمہ ہدی کی یکے بعد دیگرے ہے۔

اب بتائیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا ضرورت رہ گئی اور آپ کی تعلیمات کے معلوم کرنے اور ان پر عمل کرنے کی کیا حاجت باقی رہی مذہب شیعہ کا عمل بھی اسی پر ہے شیعوں کی کتابوں کو دیکھ جاؤ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہر جگہ یہی پاؤ گے کہ امام

باقر علیہ السلام نے فرمایا اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ ارشاد کیا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث شاذ ونادر طور پہ ملے گی۔

انصاف سے کوئی بتادے کہ اس اعتقاد کے بعد ختم نبوت کی کیا حقیقت رہ گئی کیا لفظ بے معنی سے زیادہ اس کی کچھ وقعت ہوسکتی ہے؟

شیعوں کا دوسرا **عقیدہ** یہ بھی ہے کہ ان بارہ اماموں میں سے ہر ایک کو تحلیل وتحریم کا اختیار حاصل ہے جس چیز کو چاہیں حرام کردیں اور جس چیز کو چاہیں حلال کردیں۔

چنانچہ اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص۲۷۸ میں ہے:۔

عن محمد بن سنان قال کنت عند ابی جعفر الثانی علیہ السلام فاجریت اختلاف الشیعۃ فقال یا محمد ان اللہ تبارک وتعالی لم یزل متفرداً بوحدانیتہ ثم خلق محمداً وعلیا وفاطمۃ فمکثوا الف دھر ثم خلق جمیع الاشیاء فاشھدھم خلقھا واجری طاعتھم علیھا وفوض امورھم الیھم فھم یحلون مایشاؤن

محمد بن سنان کہتا ہے کہ میں امام محمد تقی علیہ السلام کے پاس تھا میں نے شیعوں کے اختلاف کا تذکرہ کیا تو امام نے فرمایا کہ اے محمد اللہ تبارک وتعالی برابر اپنی واحدانیت کے ساتھ یکتا رہا پھر اس نے محمد اور علی اور فاطمہ کو پیدا کیا یہ لوگ ہزاروں برس ٹھیرے رہے پھر اللہ نے تمام اشیا کو پیدا کیا اور ان کی پیدائش ان لوگوں کو دکھلائی اور ان لوگوں کی اطاعت سب پر فرض کی اور سب کے کام ان کے سپرد کردیے پس یہ لوگ جس چیز کو چاہیں

ویحرمون مایشاؤن ولن یشاؤا الا ان یشاء اللہ تبارک وتعالی۔ — حلال کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور ان کا چاہنا بغیر اللہ تبارک وتعالی کے چاہنے کے نہیں ہوتا۔

حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ محمد بن سنان نے امام محمد تقی علیہ السلام سے دریافت کیا کہ شیعوں میں اس قدر زیادہ مذہبی اختلافات کیوں ہیں؟ امام محمد تقی علیہ السلام نے اس عظیم الشان اختلاف کا سبب یہ بیان فرمایا کہ ائمہ کو تحلیل و تحریم کا اختیار حاصل ہے۔ یعنی اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ ایک امام نے کسی چیز کو حلال کر دیا دوسرے امام نے اس کو حرام کر دیا لہذا کوئی شیعہ اس چیز کو بحکم امام اول حلال سمجھتا ہے اور کوئی شیعہ اس چیز کو بحکم امام دوم حرام جانتا ہے۔

اب بتلایئے کہ ختم نبوت کا پردہ بالکل چاک ہو گیا یا ابھی اس کا کوئی تار باقی ہے۔ اماموں کے لیے تحلیل و تحریم کے اختیار کی روایات نہ ہوتیں تو بھی امام کو معصوم اور مفترض الطاعۃ ماننے کے بعد تحلیل و تحریم کا اختیار ماننا ضروری تھا اس لیے کہ اگر اماموں کی صرف یہ حیثیت ہو کہ وہ احکام نبوی کے ناقل اور راوی ہیں یا مجتہدین کی طرح احکام میں اجتہاد و استنباط کرتے ہیں تو راوی یا مجتہد کے لیے معصوم ہونے کی شرط شیعہ بھی نہیں لگاتے لامحالہ امام کی شان ایک راوی یا ایک مجتہد سے بالاتر ہونی چاہیے اور وہ یہی ہے کہ ائمہ کو تحلیل و تحریم کا اختیار ہے اور وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے پابند نہیں ہیں۔

مسئلہ امامت کے متعلق ان دو عقیدوں کے بیان کر دینے کے بعد یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو گئی کہ قرآن مجید اس مسئلہ کا قرار واقعی ابطال کر رہا ہے جس شخص کا ایمان قرآن مجید پر ہے وہ مسئلہ امامت کو بدتر از کفر سمجھتا ہے یقیناً اس مسئلہ کے تصنیف کرنے والوں کا اس کے سوا اور کچھ مقصد نہ تھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع سے مسلمانوں کو بے نیاز کر کے شریعت اسلامیہ کو تباہ و برباد کر دیں۔

مبحثِ تحریف

مصنف نے اس مبحث میں یہ بیان کیا ہے کہ اس مسئلہ میں شیعہ مختلف فیہ ہیں متقدمین شیعہ تحریف قرآن کے قائل تھے مگر متأخرین نے اس عقیدہ کی خرابی محسوس کر کے تحریف قرآن سے انکار کر دیا جن میں پہلا شخص شریف مرتضی ہے۔

حالانکہ یہ مسئلہ شیعوں میں مختلف فیہ نہیں ہے۔ تحریف کی چار قسمیں ہیں۔ (۱) آیتوں اور سورتوں کا نکل جانا۔ (۲) انسانی کلام کا قرآن میں اضافہ۔ (۳) الفاظ و حروف قرآنی کا بدل جانا۔ (۴) ترتیب کا الٹ پلٹ ہو جانا۔ ترتیب کے بگڑنے کی تین صورتیں ہیں۔ اول آیتوں کا آگے پیچھے ہو جانا۔ دوم آیتوں کے اندر جو کلمات ہیں ان کا آگے پیچھے ہو جانا۔ سوم کلمات کے اندر جو حروف ہیں ان کا آگے پیچھے ہو جانا۔

شیعوں میں صرف چار اشخاص ہیں جو تحریف کی ان تمام اقسام کا انکار

شیعہ ان تمام اقسام کا منکر نہیں ہے چوتھی قسم کی تحریف کا تو
ب مجتہدین شیعہ اقرار کر رہے ہیں اور دبی زبان سے
م کا بھی اقرار کر لیتے ہیں البتہ دوسری قسم کی تحریف کا آج کل کے
بتاتے ہیں۔
س بحث میں کئی مناظرے میرے علمائے شیعہ سے ہوئے اور
یں بھی میں نے لکھیں جن میں آخری کتاب تنبیہ الحائرین اور الاول
ین اس بحث کے لیے کافی و وافی ہیں ان کتابوں میں حسب ذیل امور
ور پر ثابت کر دیے گئے ہیں۔

(۱) کسی شیعہ کا ایمان قرآن مجید پر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

(۲) کتب معتبرہ شیعہ میں تحریف قرآن کی روایتیں زائد از دو ہزار
ہیں۔

(۳) یہ زائد از دو ہزار روایتیں بقول محدثین شیعہ متواتر اور
مستفیض ہیں۔

(۴) یہ زائد از دو ہزار روایتیں حسب تصریح علمائے شیعہ تحریف
قرآن پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں۔

(۵) باوجودیکہ مذہب شیعہ میں اختلاف روایت کی یہ حالت ہے
کہ کتاب الطہارت سے لے کر کتاب المیراث تک ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں
جس میں مختلف روایات ائمہ سے منقول نہ ہوں مگر تحریف قرآن کے مسئلہ
میں نفی تحریف کی ایک روایت بھی کتب شیعہ میں نہیں۔

قمی، ابو علی طبرسی
تحریف ہیں۔

(۷) چاروں مذکورہ بالا اشخاص کا انکار از
انھوں نے اپنی تائید میں کوئی روایت ائمہ معصومین کی پیش نہیں کی اور نہ
دو ہزار روایات تحریف کا کوئی جواب نہیں دیا سوا اس کے کہ وہ روایات
ضعیف ہیں مگر وجہ ضعف کی کچھ نہیں بیان کی اور اپنے قول کی تائید میں صحابہ
کرام کی دینداری اور حفاظت قرآن میں ان کی مساعی جمیلہ کا ذکر کیا ہو

(۸) قرآن پر ایمان رکھنا اور اس کو تحریف سے پاک سمجھنا مذہب شیعہ
میں ضروریات دین سے نہیں ہے چنانچہ جو لوگ اپنے کو منکر تحریف کہتے ہیں وہ
بھی قائلین تحریف کو کافر نہیں کہتے۔

(۹) اہل سنت کی کسی کتاب سے کوئی شیعہ ایک روایت بھی تحریف
کی نہیں پیش کر سکتا۔ نسخ تلاوت یا اختلاف قراءت کی روایات کو خواہ مخواہ
تحریف کی روایت قرار دے کر پیش کرتے ہیں مگر جب ان سے کہا جاتا ہے کہ
جس طرح ہم نے تمھاری روایات اس اقرار کے ساتھ پیش کی ہیں کہ یہ روایات
متواتر ہیں اور تحریف پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں اسی طرح تم بھی کوئی روایت
ہمارے علما کی اس اقرار کے ساتھ پیش کرو تو مبہوت ہو جاتے ہیں اور زبان و
قلم پر مہر سکوت لگ جاتی ہے۔

(۱۰) اہل سنت میں شروع سے آج تک ایک متنفس بھی تحریف کا

قائل نہیں ہوا اور وہ بالاتفاق قائل تحریف کو کافر کہتے ہیں علمائے شیعہ کو
بھی اس کا اقرار ہے۔

ان دس باتوں کو نہایت محققانہ طریقے سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس
مبحث میں ان تمام باتوں کو غائر نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات صاف
ہوجاتی ہے کہ مذہب شیعہ کی اصلی غرض وغایت دین اسلام کو بگاڑنا اور
مٹانا ہے اسی لیے انھوں نے مسئلہ امامت ایجاد کیا کہ رسول خدا صلے اللہ
علیہ وسلم کی اطاعت میں نجات کا منحصر ہونا اور آپ کی اطاعت کا نجات
کے لیے کافی ہونا مشکوک ہوجائے اور اسی لیے اُنھوں نے عقیدۂ تحریف قرآن
تصنیف کیا کہ دین اسلام کی بنیاد قرآن پر ہے جب قرآن مشکوک ہوجائے گا
تو دین اسلام کے نیست ونابود ہوجانے میں کیا شک ہے۔

وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُونَ ۝

ناچیز احقر عباد اللہ محمد عبد الشکور عافاہ مولاہ
۷ رصفر ۱۳۵۴ھ

نصیحۃ الشیعہ

جلد سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ ذی العفو الواسع والعقاب الشدید من ہداہ
فہو السعید الرشید ومن اضلہ فہو الطرید البعید قسم الخلق
قسمین وجعل لہم منزلتین فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر
ان ربک فعال لما یرید ولیس بظلام للعبید وصلی اللہ علی رسولہ
الحمید المجید الہادی للناس الی الطریق السدید وعلی آلہ واصحابہ
الذین بذلوا انفسہم فی الطاعۃ والتائید۔

امابعد بندۂ مسکین محمد احتشام الدین مراد آبادی کان اللہ لہ

ولوالدیہ فی العواقب والمبادی مسلمانوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ میں جلد ثالث نصیحۃ الشیعہ کو میں نے اللہ پر توکل کر کے شروع کیا ہے۔ خداوند کریم اس کو اپنے فضل سے اتمام کو پہونچا کر باعث ہدایت بنا دے۔

خطبۂ شقشقیہ کا ابتدائی حصہ جس میں خلیفۂ اول کی خلافت کا ذکر تھا جلدِ ثانی میں گذر چکا باقی ذیل میں مذکور ہوتا ہے:۔

حتی اذا مضی الاول لسبیلہ
فادلی بہا الی فلان بعدہ ثم
تمثل بقول الاعشیٰ
شتان ما یومی علے کورہا
ویوم حیان اخی جابر

یہاں تک کہ جب گزر گئے خلیفۂ اول اپنی راہ پر تو حوالے کی خلافت خلیفۂ ثانی کو اپنے بعد۔ پھر بطور مثال کے جناب امیر نے اعشی شاعر کا شعر پڑھا:۔ بڑا فرق ہے میرے اس دن میں جب میں پشت ناقہ پر تھا، اور میرے آج کے دن میں کہ میں حیان برادر جابر کے پاس ہوں۔

ف یہ شعر اعشی شاعر کی تصنیف ہے۔ اس شاعر پر اول پریشانی تھی جا بجا تلاش معاش میں مارا مارا پھرتا تھا اس کے بعد ایک امیر عرب کا مصاحب ہو گیا جس کا نام حیان تھا اور اس کے بھائی کا نام جابر تھا وہاں خوب عیش و عشرت سے گزرنے لگی۔ اس مضمون کو اس نے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ ایک میرا وہ وقت تھا کہ میں ناقہ پر سوار ہو کر جا بجا پریشان پھرتا تھا ایک آج کا دن ہے کہ حیان برادر جابر کے پاس عیش میں ہوں۔ ان

دونوں زمانوں میں بڑا فرق ہے پہلا زمانہ بڑی مصیبت کا تھا اور اب زمانہ بڑے عیش کا ہے۔

چونکہ خلیفۂ ثانی کے زمانہ میں جہاد بہت ہوئے اور فتوحات کثیرہ حاصل ہوئیں اور مال غنیمت سے جناب امیر کو اتنا حصہ ملا کہ ان کی عسرت دور ہو گئی اسی لیے جناب امیر اپنی عسرت کے زمانہ کو اس فراغت کے زمانہ سے مقابلہ کر کے ظاہر کرتے ہیں کہ پہلے میری عسرت کا زمانہ تھا اور خلیفۂ ثانی کے زمانہ میں مجھ کو دولتمندی حاصل ہو گئی اور اعشیٰ کا یہ شعر انہوں نے اپنی انھیں دونوں حالتوں کی مثال میں پڑھا۔

یہ شعر اس مراد پر بہت وضاحت کے ساتھ دلالت کرتا ہے اور اسی سے ظاہر ہو گیا کہ جناب امیر کو خلیفۂ ثانی کا زمانہ بہت پسند تھا۔

اس موقع پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ابوبکرؓ نے جو خلافت عمرؓ کو حوالے کی تھی وہ مہاجرین و انصار سرداران اسلام کے مشورہ سے کی تھی نہ فقط اپنی رائے سے۔ اگر ابوبکرؓ نے خلافت بغرض دنیا و شوق حکومت و جاہ حاصل کی ہوتی تو آخر وقت میں وہ اپنے بیٹے کو ولی عہد کر جاتے پس اپنے بیٹے یا کسی قرابت والے کو ولی عہد نہ کرنا اور غیر شخص کے لیے خلافت کی رائے دینا دلیل اس بات کی ہے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت فقط اللہ کے واسطے تھی۔

فیا عجبا بینا ہو یستقیلہا
فی حیوتہ اذ عقدہا لاخر

پس تعجب ہے ابوبکرؓ پر کہ وہ اپنی زندگی میں تو خلافت کو واپس کرتے تھے اور اپنی

بعد وفاتہ — وفات کے بعد کے لیے خلافت دوسرے کو دے گئے۔

یعنی خلافت کے بارِ عظیم کو دشوار سمجھ کر وہ اپنی زندگی میں تو یہ کہا کرتے تھے کہ مجھ سے خلافت واپس کر لو پس جس کام کی دشواری سے وہ بخوبی واقف ہو گئے تھے تعجب ہے کہ اس مشکل میں اُنہوں نے عمرؓ کو کیوں مبتلا کر دیا۔

لشدّ ما تشطرا ضرعیھا — البتہ خوب چوسا اُن دونوں نے خلافت کی دونوں پستانوں کو۔

یعنی ان دونوں نے خلافت کے فرائض کو بہت اچھی طرح ادا کر کے بڑا اجر حاصل کیا۔

فصیرھا فی حوزۃ خشناء — پھر کر دیا خلافت کو حد مستحکم میں۔

یعنی خلیفہؓ ثانی نے سلطنت اسلام کو بہت قوی اور مضبوط کر دیا۔

یخشن لمسّھا — سخت ہے چھونا اُس کا۔

خلافت کو چھونے سے مراد اُس سے مقابلہ کرنا ہے یعنی مخالفین اسلام کو اُن کی خلافت سے مقابلہ کرنا بہت دشوار تھا بلکہ وہ بلاد اسلام کی حد کو چھو نہیں سکتے تھے۔

ویغلظ کلمھا — اور سخت تھا زخم اس کا

یعنی اُن کی خلافت کی طرف سے دشمنوں پر بڑا سخت حملہ ہوتا تھا۔

ویکثر العثار فیھا والاعتذار — اور بہت ہوتا تھا جہاد[1] اُس خلافت میں

منھا — اور عذر خلافت کی طرف سے۔

یعنی اگرچہ عمرؓ کی خلافت میں جہاد بہت ہوئے۔ با ایں ہمہ عمرؓ ہمیشہ عذر کیا کرتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ فرائض خلافت مجھ سے اچھی طرح ادا نہیں ہوتے۔

حضرات شیعہ کہتے ہیں کہ یہاں لفظ عثار کے معنی لغزش اور ٹھوکر کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ عمرؓ سے خطائیں بہت ہوتی تھیں اور ان پر متنبہ ہو کر وہ عذر کیا کرتے تھے۔

ہم کہتے ہیں کہ اس سے پہلے خلافتِ عمرؓ کی قوت اور مضبوطی کا بیان ہے اس کے مناسب جہاد کے معنی ہیں اور چونکہ خلافت عمر کثرت جہاد سے مختص تھی اور یہ صفت اُس خلافت کی بہت مشہور رہے اس لیے ظاہر معنی یہی ہیں۔

اگر ہم یہ بھی تسلیم کر لیں کہ یہاں عثار بمعنی خطا ہے تو اگرچہ ربط کلام کے خلاف ہونے کی وجہ سے منافی فصاحت ہے مگر اس معنی میں کوئی ہمارا حرج نہیں اس لیے کہ اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ جناب امیر نے یہ فرمایا کہ

---

[1] عثار کے معنی لغزش اور ٹھوکر کھانے کے ہیں مگر یہ لفظ بمعنی جنگ بھی مستعمل ہے اور بعض احادیث میں بھی اس معنی میں وارد ہے۔ اہل لغت نے لکھا ہے کہ چونکہ جنگ میں ٹھوکر بہت ہوتی ہے اس لیے جنگ کا نام بھی عثار ہو گیا ۱۲

عمرؓ کی خلافت جو بہت قوی اور غالب تھی اُس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ عمرؓ معصوم تھے بلکہ عمرؓ سے اکثر خطا بھی ہو جاتی تھی لیکن اُن میں بڑی عمدہ صفت یہ بھی کہ جب وہ اپنی خطا پر متنبہ ہو جاتے تو نادم ہو کر بہت سے عذر کرتے تھے اپنی خطا پر ان کو اصرار نہ تھا۔

یہ ظاہر ہے کہ خطا پر متنبہ ہو جانے کے بعد اُس پر نادم ہونا اور عذر کرنا بڑی عمدہ صفت ہے۔ اگر جناب امیر کو عمرؓ کی بُرائی بیان کرنا مقصود ہوتی تو عمرؓ کی اس صفت محمود کو ہرگز ذکر نہ کرتے۔ تعجب ہے کہ حضرات شیعہ نے اس صفت محمود کو بھی بہت بڑا طعن ٹھیرایا ہے

ہنر بچشم حسوداں بزرگ تر عیب ست

فصاحبها کراکب الصعبة ان اشنق لها خرم وان اسلس لها تقحم

پس صاحب خلافت کا وہ حال ہوتا ہے جیسے سرکش ناقہ کے سوار کا اگر سوار اُس کی مہار سختی سے کھینچے تو ناقہ کی ناک زخمی ہو جائے اور اگر مہار کو ڈھیلا چھوڑ دے تو سوار کو گرا دے۔

اب جناب امیر خلافت کی مشکلات کا صاف صاف بیان فرماتے ہیں کہ خلیفہ اگر بہت سختی کرے تب بھی خرابی ہے اور بہت نرمی کرے تب بھی قباحت ہے۔ ہر امر میں اعتدال کا طریقہ چاہیے پس انتظام خلافت نہایت نازک امر ہے۔ مقصود یہ تھا کہ باوجود ان مشکلات کے عمرؓ نے خلافت کا کام بڑی کامیابی سے انجام دیا اور اپنی خلافت کو بڑی قوت دی

فمنی الناس لعمر الله بخبط وشماس وتلون واعتراض

پس مبتلا ہوئے آدمی [illegible] کج روی اور سرکشی میں اور تلون میں اور کج روی میں۔

مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو مرتد ہو کر عمرؓ کے مخالف ہوئے جیسے قوم غسان جن کا سردار جبلہ بن الایہم تھا۔

فصبرت علی طول المدة و شدة المحنة

پس سکوت کیا میں نے طول مدت اور شدت محنت پر۔

یعنی جب عمرؓ کی خلافت کو میں نے ایسا عمدہ پایا تو میں نے اپنے لیے خلافت طلب کرنے کی ضرورت نہ سمجھی اور اپنی حالت پر سکوت کیا مطلب یہ ہے کہ اگر میں ان کی خلافت کو پسند نہ کرتا تو کبھی صبر نہ کرتا۔ جناب امیر علیہ السلام نے جس حالت پر سکوت کیا تھا اُس حالت کی توضیح یہ کی کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کو مدت طویل گذر چکی تھی مگر میرے رنج کی سختی وہی باقی تھی۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ میں اپنے رنج کی وجہ سے اس وقت تک بھی فرائض خلافت کو ادا کرنے کے قابل نہ تھا۔

حضرات شیعہ یہ کہتے ہیں کہ طویل مدت سے انتظار خلافت اور شدت محنت سے خلافت نہ ملنے کا رنج مراد ہے۔ مگر اس کا جواب وہی ہے جو ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جناب امیر علیہ السلام تو خلافت سے ایسا بچنا چاہتے تھے کہ بعد واقعہ عثمانؓ کے جب اُن کو خلافت ملی ہے اُس وقت بھی

انھوں نے انکار کیا تھا اور بڑی مشکل سے نہایت مجبور ہو کر خلافت قبول کی تھی اگر اُن کو خلافت کا شوق ہوتا تو اتنا عذر کیوں کرتے اور یہ کیوں کہتے کہ میرے سوا کسی اور کو خلیفہ مقرر کر لو۔ بالفرض اگر جناب امیر عمرؓ کی خلافت پسند نہ کرتے اور انھیں اپنی خلافت کا شوق ہوتا تو بہت آسانی سے لے سکتے تھے۔ کتاب خصال[1] کی ایک طویل روایت میں جس میں جناب امیر نے اپنے امتحانوں کا ذکر کیا ہے یہ بھی ہے کہ جس وقت عمرؓ کو خلافت ملی تھی اُس وقت جناب امیر کو خوب قوت حاصل تھی اس کو انھوں نے اس طرح بیان کیا:-

انی کنت اکثر عددا واعز عشیرۃ وامنع رجالا واطوع امرا۔
تھا میں زیادہ شمار میں (یعنی میرے مددگار شمار میں زیادہ تھے) اور زبردست خاندان والا (یعنی میرے خاندان کے لوگ سب میں زبردست تھے) اور زیادہ قوی باعتبار مددگار آدمیوں کے۔ اور سب سے زیادہ میرا حکم مانا جاتا تھا۔

حتی اذا مضی لسبیلہ جعلھا فی جماعۃ زعم انی
یہاں تک کہ وہ گئے اپنی راہ پر (یعنی ان کا انتقال ہوا) تو کر گئے خلافت کو ایک جماعت میں کہ ان کے گمان میں میں بھی

[1] خصال ابن بابویہ مطبوعہ طہران ص۱۹

احدھم۔
اُن میں کا ایک تھا۔

ف میثم بحرانی نے شرح کبیر میں لکھا ہے کہ جب عمرؓ زخمی ہوئے تو اجلّہ صحابہ نے اُن کے پاس جا کر یہ کہا کہ تم جس کو پسند کرتے ہو اُس کو خلافت کے لیے اپنا ولی عہد مقرر کر دو۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نہ اپنی زندگی میں اس اس بوجھ کے اٹھانے کو پسند کرتا تھا نہ بعد موت کے پسند کرتا ہوں تب صحابہ نے کہا کہ ہم کو مشورہ دو کہ تمھارے بعد کس کو خلیفہ مقرر کریں۔ تب عمرؓ نے کہا کہ اس کام کے لائق سات آدمی ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ وہ سب اہل جنت ہیں۔ سعیدؓ بن زید۔ مگر میں اس کو خارج کرتا ہوں اس لیے کہ وہ میرے اہل بیت میں سے ہے۔ اور سعدؓ بن ابی وقاص اور عبدالرحمنؓ بن عوف اور طلحہؓ اور زبیرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ رضی اللہ عنہم۔

یہ جو جناب امیر نے فرمایا کہ اُنھوں نے گمان کیا تھا کہ میں بھی ایک اُن میں کا ہوں اُس میں زعم کے لفظ سے یہ ظاہر کر دیا کہ عمرؓ نے جو خیال کر لیا تھا کہ علی خلافت قبول کریں گے یہ خیال اُن کا صحیح نہ تھا۔

فیاللہ وللشوریٰ
پس فریاد ہے اللہ کے پاس شوریٰ سے

جناب امیر کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اہل شوریٰ ان کو نہ منتخب کریں اور اس امر کو وہ اپنے لیے سخت مصیبت سمجھتے تھے اسی لیے انھوں نے اس پر فریاد ظاہر کی کہ جماعت شوریٰ میں میرا نام کیوں شریک کیا گیا۔

متی اعترض الریب فی مع
کب شک ہوا تھا میری حالت میں ان کے

الاول منھم حتی صرت	خلیفہ اول کے ساتھ یہاں تک کہ ہوگیا
اقرن الی ھذہ النظائر	میں ایسا کہ شامل کیا جاؤں اُن لوگوں کے ساتھ جو میری مثل ہیں۔

یعنی میرا عذر تو خلیفۂ اول کے زمانہ میں یقین کے ساتھ معلوم ہوچکا تھا اور سب کو قطعی طور پر ظاہر ہوگیا تھا کہ میں خلافت کے قبول کرنے سے عذر کرتا ہوں اُس وقت میرے عذر میں کوئی شک باقی نہیں رہا تھا تو اب میں ان لوگوں کے ساتھ کیوں شامل کیا گیا جن میں سے ہر ایک لیاقت خلافت میں میری نظیر ہے اور کیا وجہ ہے کہ اب میری طرف یہ گمان کرلیا کہ میں خلافت قبول کرلوں گا جو مجھ کو شوریٰ میں شامل کیا۔

لکن اسففت اذا سفوا و	لیکن پست ہوا میں جب وہ پست
طرت اذا طاروا	ہوئے اور بلند ہوا میں جب وہ بلند ہوئے۔

یعنی اگرچہ شوریٰ میں شامل ہونا میرے لیے مصیبت سخت تھا مگر میں نے ہر بلندی و پستی میں قوم کی موافقت کی جب انھوں نے مجھ کو بھی شامل کیا تو مجبور ہو کر میں بھی شامل ہوگیا۔

اب حضرات شیعہ انصاف فرمائیں کہ اگر جناب امیر کے لیے نص امامت موجود تھی تو پھر خلیفہ کے لیے شوریٰ کیوں ہوتا تھا۔

عمرؓ کا جس وقت انتقال ہوتا تھا اُس وقت خلافت کی کوئی طمع اُن کو باقی نہ تھی نہ وہ اپنی اولاد یا اقربا میں سے کسی کو خلافت دینا چاہتے تھے

نہ کسی اپنے خاص دوست کو انھوں نے ولی عہد بنایا تھا پس اگر علیؓ کے واسطے نص امامت ان کو معلوم ہوتی تو اس وقت ضرور اس پر عمل کرتے۔

اگر عمرؓ کو علیؓ سے کوئی خصومت ہوتی تو شوریٰ میں ان کو شامل کیوں کرتے حالانکہ شیعوں نے یہ روایت بھی تصنیف کرلی ہے کہ عمرؓ نے مرتے وقت غصب خلافت سے توبہ کی تھی چنانچہ خصال[1] ابن بابویہ میں ہے:—

قال عمر حین حضرۃ الموت	کہا عمرؓ نے جب سامنے آئی موت اُن کے
اتوب الی اللہ من ثلث	کہ میں اللہ کی طرف تین چیزوں سے
اغتصابی ھذا الامر انا و ابوبکر	توبہ کرتا ہوں۔ غصب[2] کرنا میرا خلافت
من دون الناس و استخلافی	کو میرا اور ابوبکر کا نہ اور آدمیوں کا
علیھم و تفضیلی المسلمین	اور ولی عہد بنانا مجھ کو ان پر اور ترجیح
بعضھم علی بعض	دینا میرا مسلمانوں میں بعض کو بعض پر

بہرحال اگر جناب امیر کے لیے نص امامت موجود ہوتی تو چھ آدمیوں میں شوریٰ کیوں جاتا اور ایسے وقت میں جناب امیر کو خلافت کیوں نہ دی جاتی۔

جب ابوبکرؓ و عمرؓ دونوں مر چکے تو پھر کیا وجہ کہ (معاذ اللہ منہا) تمام

---

[1] خصال ابن بابویہ مطبوعہ طہران ص۸۱

[2] جب عمرؓ نے مرتے وقت توبہ کرلی تھی پھر شیعہ ان کو بُرا کیوں کہتے ہیں۔

ادپر جمے رہے اور نص امامت کو یاد کر کے جناب امیر کو امام نہ بنایا
صحابہ[1] نے بعد شہادت عثمانؓ کے جناب امیر کو خلیفہ بنایا تو نص امامت
بھی یاد نہ کی۔ پس موافق زعم شیعہ اگر شیخین کے لیے طمع خلافت
ک نص رسولؐ ہوئی تو شیخین کے سامنے خصوصاً اُن کے بعد دوسرے
طمع تھی کہ باوجود مسلمان ہونے کے نص رسول پر عمل نہیں کرتے تھے
ے وجہ ایسی مخالفت خدا و رسول اختیار کی تھی جس کی نوبت ارتداد
ں (معاذ اللہ منہا)

جناب امیر سے اگر کوئی خاص خصومت تھی تو ایک دو شخص کو ہوگی
لو ایسی خصومت کی کیا وجہ تھی جس کی وجہ سے حکم خدا اور رسول کی
اور باوجود اعتقاد توحید و رسالت اور حقیت قرآن کے مومنین میں
وئے۔

اگر عموماً صحابہ کو جناب امیر سے خصومت ہوتی تو وصیت عمرؓ کو
ق رکھتے اور جناب امیر کو شوریٰ میں ہرگز شامل نہ کرتے اور پھر
ے عثمان کے جناب امیر کو ہرگز خلیفہ نہ بناتے۔

ہرچند تاویل کو ہر بات میں دخل ہو سکتا ہے اور تمام فرق باطلہ اپنے
شکل کی کچھ نہ کچھ تاویل کر لیا کرتے ہیں لیکن جس شخص کی طبیعت میں
صاف ہوگا وہ ان عجائبات کو کسی طرح تسلیم نہیں کر سکتا۔

---

[1] ب امیر نے اس مکتوب میں جو امیر معاویہ کے نام لکھا ہے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ جنھوں
رسے بیعت کی تھی اُنھوں نے مجھ سے بھی بیعت کی ہے۔

صحابہ اپنے سرداروں کی ایسی اطاعت کرتے تھے کہ ابوبکرؓ کے بعد
ابوبکرؓ کی وصیت کے مطابق انھوں نے عمرؓ کو خلیفہ بنا لیا۔ عمرؓ کے بعد عمرؓ کی
وصیت کے مطابق اُنھوں نے اُنھیں آدمیوں میں شوریٰ کیا جن کو عمرؓ بتا گئے
تھے۔ پس ایسے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امر خلافت میں رسولؐ کی
وصیت کیسے چھوڑ دیتے۔

جب جناب امیر اپنی رضامندی سے شوریٰ میں شامل ہو گئے تو
شرائط شوریٰ انھوں نے مان لیں پس فیصلۂ شوریٰ واجب التسلیم ہو گیا اور
اس صورت میں عثمانؓ پر غصب خلافت کا طعن ہرگز باقی نہ رہا۔

فصغی رجل منھم لضغنہ	تو اُن میں سے ایک نے انحراف کیا عداوت
ومال الآخر لصھرہ مع ھن	عثمان کے سبب سے اور دوسرے
وھن[1]۔	نے میل کیا بسبب دامادی عثمان کے مع
	اور بہت سے امور کے۔

جناب امیر فرماتے ہیں کہ اہل شوریٰ میں سے ایک شخص نے عثمانؓ
سے مخالفت کی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ عثمانؓ سے اُس کو عداوت تھی۔ اور
دوسرے نے عثمانؓ کی طرف میل کیا اس لیے کہ عثمانؓ کو فضیلت دامادی
رسولؐ کی حاصل تھی اس کے علاوہ اور بھی چند اسباب ایسے تھے جو انتخاب عثمانؓ
کے باعث ہوئے۔ چونکہ جناب امیر نے یہ نہیں ظاہر کیا کہ پہلا شخص کون تھا اور

---

[1] اہل لغت نے لکھا ہے کہ ہن کے معنی شے کے ہیں خواہ وہ اچھی ہو یا بری لیکن جب اس کا نون
مشدد ہوتا ہے تو وہ بری چیز سے مختص ہو جاتا ہے ۱۲

دوسرا کون تھا اس لیے اپنی طرف سے کسی کو معین کرنا قابل اعتبار نہیں ہو
سکتا۔ بہرحال نتیجہ شوریٰ میں کثرت رائے سے خلافت عثمانؓ کے لیے مقرر
ہوگئی۔

اہل سنت کی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ جب خلوت میں عبدالرحمٰن
بن عوف نے عثمانؓ سے رائے پوچھی تو انھوں نے علیؓ کی طرف اشارہ کیا
اور جب اسی طرح علیؓ سے رائے پوچھی تو انھوں نے عثمانؓ کو تجویز
کیا۔

الی ان قام ثالث القوم نافجا حضنیہ بین نثیلہ ومعتلفہ

یہاں تک کہ قائم ہوئے قوم کے تیسرے خلیفہ جو بلند کرنے والے تھے اپنے پہلوؤں کو آنتوں اور معدہ کے درمیان میں۔

یعنی فربہ اندام تھے اور اُن کے پیٹ اور پہلوؤں پر فربہی زیادہ
تھی۔ چونکہ جسیم آدمی کو سرداری زیبا ہوتی ہے اس لیے اس قول میں جناب
امیرؑ نے یہ ظاہر فرمایا کہ اُن کی وجاہت اور شان خلافت کے شایاں
تھی۔

وقام معہ بنو امیۃ یخضمون مال اللہ خضم الابل نبتۃ الربیع

اور اُس کے ساتھ بنو امیہ کھڑے ہوئے جو اللہ کا مال اس طرح کھاتے تھے جیسے اونٹ فصل بہار کا سبزہ کھاتے ہیں۔

اب جناب امیرؑ نے عثمانؓ کی یہ صفت بھی بیان کی کہ انھوں نے
صلہ رحم کا حق بہت اچھی طرح ادا کیا اور اپنے خاندان بنوامیہ کے ساتھ

بہت سلوک کیا اور وہ سلوک یہ تھا کہ جابجا عمدہ خدمتوں پر ان کو مقرر کیا
جس کی وجہ سے بڑی بڑی تنخواہیں ان کو ملنے لگیں۔ یہ صفت جناب امیرؑ میں
بھی تھی اور انہوں نے بھی اپنے زمانہ میں اولاد عباس کے ساتھ یہی سلوک
کیا تھا۔ اللہ کے مال سے مراد یہ ہے کہ اللہ کا دیا ہوا مال یعنی مال خدا
داد۔

اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ اللہ کے مال سے بیت المال کا مال مراد ہو
جو حق مساکین تھا تب بھی جناب امیرؑ نے عثمانؓ پر کوئی الزام نہیں لگایا یعنی یہ
نہیں کہا کہ عثمان کھلاتے تھے یا ممکن ہے کہ وہ خیانت کرتے ہوں اور عثمان
کو اس کی خبر نہ ہو جیسے کہ جناب امیرؑ کے زمانہ میں ابن عباس اور زیاد اور ابن
جارود نے کیا۔

الی ان انتکث علیہ فتلہ واجھز علیہ عملہ وکبت بہ بطنتہ

یہاں تک کہ ٹوٹا اُن پر انتظام ان کا اور کام تمام کیا اُن پر اُن کے عمل نے اور گرا دیا ان کو ان کے دلی دوستوں نے

یعنی انجام ان کی خلافت کا یہ ہوا کہ ان کا انتظام بگڑ گیا اور اُن کا
جو یہ عمل تھا کہ بہ نیت صلہ رحم بنوامیہ کو انھوں نے اختیارات اور منصب
دیے تھے ان کا عمل ان کے لیے ایسے فتنے کا باعث ہوا جس میں اُن کا کام
تمام ہوگیا اور مروان جس کو وہ دلی دوست سمجھتے تھے اُسی نے اُن سے
دغا کی۔

اس موقع پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جس وقت باغیوں نے عثمانؓ پر

بلوہ کیا اُس وقت میں جناب امیر نے عثمانؓ کی مدد کرنے میں کوئی کمی نہیں کی اور اس بلوہ کے دفع کرنے میں جہاں تک ہوسکا زبان سے کام لیا لیکن آخر کو تقدیر الٰہی سے مجبور ہو گئے۔ امیر معاویہ کے نام جناب امیر کا وہ مشہور خط جو نہج البلاغت میں مذکور ہے جس کو ہم جلد ثانی میں ذکر کر کے شیعوں پر حجت گردان چکے ہیں اور جس کا پہلا فقرہ یہ ہے (انہ بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان) اور اس کے آخر کا فقرہ یہ ہے:۔

اے معاویہ اگر دیکھے گا تو اپنی عقل سے نہ اپنی ہوا سے تو البتہ پاوے گا تو مجھ کو سب سے زیادہ پاک خون عثمان سے	یامعویۃ لان نظرت بعقلک دون ہواک لتجدنی ابرأ الناس من دم عثمان

اس فقرہ کی شرح میں فاضل میثم[1] نے یہ لکھا ہے:۔

اور نہیں منقول ہے علی سے امر عثمان میں مگر یہ کہ علی اپنے گھر میں بیٹھ گئے اور عثمان سے جدا ہو گئے۔ بعد اس کے کہ بلوہ دفع کیا عثمان سے بہت مدت تک اپنے ہاتھ سے اور زبان سے پھر بھی دفع نہ ہوسکا۔	لم ینقل عن علی فی امر عثمان الا انہ لزم بیتہ واعتزل عنہ بعد ان دافع عنہ طویلا بیدہ ولسانہ فلم یمکن الدفع

یعنی اول علی نے عثمان سے بلوہ دفع کرنے میں بہت مدت تک اپنی زبان اور ہاتھ سے کوشش کی لیکن پھر بھی بلوہ دفع نہ ہوسکا تو مجبور ہو کر

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۲۱

علیحدہ ہو گئے اور اپنے گھر میں بیٹھ رہے۔

ہاتھ سے بلوہ دفع کرنے کے معنی یہ ہیں کہ عثمانؓ کی حمایت میں باغیوں سے تلوار کے ساتھ جنگ کی۔ اب حضرات شیعہ غور فرمائیں کہ جناب امیر عثمانؓ کے کیسے حامی اور مددگار تھے پھر بھلا وہ اُن کی بُرائی کیسے بیان کرتے۔

پھر یکایک آدمی دوڑتے تھے میری طرف جیسے کفتار[1] ہجوم کرتے ہیں۔ برس پڑے مجھ پر ہر طرف سے۔	فما راعنی الا والناس یھرعون الی کعرف الضبع قد انثالوا علی من کل جانب۔
یہاں تک کہ پامال ہو گئے حسنین اور ٹوٹ گئے میرے دونوں شانے۔ جمع ہو گئے میرے گرد جیسے بکریوں کا غول۔	حتی لقد وطی الحسنان وشق عطفای مجتمعین حولی کربیضۃ الغنم

یعنی ایسی بدحواسی کے ساتھ مجھ سے بیعت کرنے آئے کہ اُن بدحواسوں کے ہجوم میں حسنین بھی پامال ہو گئے اور مجھ پر ایسے گرے کہ میرے دونوں شانے ٹوٹ گئے۔

یہ ظاہر ہے کہ صحابہ مہاجرین وانصار جو مسلمانوں میں سردار سمجھے جاتے تھے اور بند و بست امر خلافت جن کا حق تھا اور جس کو اتفاق کر کے وہ امام مقرر کر دیتے اُسی کی خلافت سے اللہ راضی ہوتا تھا وہ ایسے بے تمیز اور بدحواس نہ تھے کہ دیوانوں کی طرح ہجوم کریں اور حسنین کو پامال کر ڈالیں اور حضرت علی پر جا کر ایسے گریں کہ اُن کے شانے ٹوٹ جاویں یا جیسا کہ جناب

[1] ضبع کتے کے برابر ایک جانور ہوتا ہے جس کو فارسی میں کفتار کہتے ہیں۔

امیر کے دوسرے خطبہ سے ثابت ہوا ہے جس کو ہم جلد ثانی میں ذکر کر چکے کہ نوجوان عورتیں بھی بے پردہ ان کے ہجوم میں گھس پڑیں۔ قطع نظر اس کے اس وقت مدینہ میں بلوائیوں کا فتنہ و فساد بڑی گرما گرمی پر تھا وہ لوگ خلیفہ کو قتل کر چکے تھے تمام اہل مدینہ جان کے خوف سے اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے تھے باہر نہیں نکلتے تھے ایسے نازک وقت میں جن لوگوں نے ایسا بیہودہ ہجوم کیا وہ انھیں مفسدوں اور بلوائیوں کا گروہ ہوگا جنھوں نے عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا اور اس کے بعد وہ جناب امیر پر ایسے مسلط ہو گئے تھے کہ اگرچہ جناب امیر یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ان بلوائیوں کو سزا دیں مگر ان پر قابو نہ تھا اور جو کچھ وہ چاہتے تھے وہی جناب امیر کو کرنا پڑتا تھا۔ ہم جلد ثانی میں بھی یہ مضمون نہج البلاغت سے نقل کر چکے ہیں اور اب پھر نقل کرتے ہیں:-

ومن کلام لہ علیہ السلام	اور جناب امیر کا کلام ہے اُس وقت کا
بعد ما بویع بالخلافۃ وقال لہ	جب اُن سے خلافت کی بیعت ہو چکی اور
قوم من الصحابۃ لو عاقبت قوما	جناب امیر سے صحابہ کی ایک جماعت نے
ممن اجلب علی عثمان فقال	کہا کہ کیوں نہیں سزا دیتے ایک ایک
یا اخوتاہ انی لست اجھل ما	گروہ کو ان میں سے جنھوں نے سامان
تعلمون	پر بلوہ کیا تھا تو جناب امیر نے فرمایا کہ میں
	ناواقف نہیں ہوں اُس حکم سے جس کو
(شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۲۲)	تم جانتے ہو۔

ف یعنی جس طرح تم جانتے ہو کہ قاتلان عثمان رضؓ سزا دینے کے لائق ہیں میں بھی جانتا ہوں۔

ولکن کیف لی بقوۃ والقوم	اور لیکن مجھ میں یہ قوت کہاں ہے اور
المجلبون علی حد شوکتھم	بلوائی گروہ اپنی قوت پر ہے وہ ہم پر قدرت
یملکوننا ولا نملکھم وھاھم	رکھتے ہیں ہم ان پر قدرت نہیں رکھتے۔
ھولاء قد ثارت معھم	اور ہاں ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جمع
عبدانکم والتفت الیھم	ہوگئے ہیں ان کے ساتھ تمہارے غلام اور
اعرابکم وھم خلالکم	شامل ہوگئے ہیں ان میں تمہارے ملک کے
یسومونکم ماشاءوا ھل	گاؤں والے اور وہ تمہارے درمیان
ترون موضعا لقدرۃ علی شئ	میں موجود ہیں جس امر پر چاہتے ہیں تم کو
تریدونہ ان ھذا الامر امر	مجبور کر لیتے ہیں۔ کیا دیکھتے ہو تم کوئی موقع
جاھلیۃ	اُس کام کی قدرت کا جس کا تم ارادہ رکھتے ہو
	بے شک یہ کام کام جاہلیت کا تھا۔

ف یعنی ان بلوائیوں نے جنھوں نے عثمان رضؓ سے بغاوت کی اور ناحق ان کو قتل کیا یہ جاہلیت کا کام تھا۔ یہاں سے ظاہر ہوگیا کہ جناب امیر ان کو سزا دینا چاہتے تھے مگر قدرت نہیں رکھتے تھے بلکہ ایسے مجبور تھے کہ جو کچھ وہ چاہتے تھے وہ جناب امیر کو کرنا پڑتا تھا۔

وان لھولاء القوم مادۃ	اور بے شک اس قوم کے مددگار
	ہیں۔

ف یہی وجہ جناب امیر کے زیادہ خوف کی تھی اس لیے کہ اول تو وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ یہ گروہ ایسا زبردست ہے کہ ہم اُن پر قدرت نہیں رکھتے بلکہ ان کے ہاتھوں میں مجبور ہیں جو وہ چاہیں وہی ہم کو کرنا پڑتا ہے دوسرے وہ یہ جانتے تھے کہ ان کے اور بھی مددگار رہیں جو ضرورت کے وقت ان کے شریک ہو جائیں گے۔

اس قول کے ابتدائی فقرہ کی شرح میں شارح میثم نے یہ لکھا ہے:-

واعلم ان هذا الکلام اعتذار منه فی تاخیر القصاص عن قتلة عثمان۔

اور تو سمجھ لے کہ یہ کلام جناب امیر کی طرف سے عذر ہے قاتلان عثمان سے قصاص لینے کی تاخیر کا۔

وقوله انی لست اجهل ما تعلمون دلیل علی انه کان ذلک فی نفسه وحاصل هذا العذر عدم التمکن کما ینبغی

اور جناب امیر نے یہ جو فرمایا کہ (میں ناواقف نہیں ہوں اس سے جس کو تم جانتے ہو) اس بات کی دلیل ہے کہ جناب امیر کے دل میں یہی تھا کہ قصاص لیا جائے اور حاصل اس عذر کا یہ تھا کہ اس کام کے لیے جیسی چاہیے ویسی قدرت حاصل نہ تھی۔

ولذلک قال وکیف لی بقوة والقوم علی حد شوکتهم

اور اسی لیے جناب امیر نے یہ فرمایا کہ (مجھ میں ایسی قوت کہاں ہے حالانکہ قوم اپنی پوری شوکت پر ہے)

وصدقه ظاهر فان اکثر اهل المدینة کانوا من المجلبین علیه وکان من اهل مصر و من اهل الکوفة خلق عظیم حضروا من بلادهم وقطعوا المسافة البعیدة لذلک انضم الیهما اعراب اجلاف من البادیة وعبدان المدینة فکانوا فی غایة من شدة الشوکة حال اجتماعهم وثاروا ثورة واحدة۔

اور سچا ہونا جناب امیر کے اس قول کا ظاہر ہے اس لیے کہ اکثر اہل مدینہ عثمان پر بلوہ کرنے والوں میں شامل تھے اور تھی اہل مصر اور کوفہ سے بہت سی مخلوق جو اپنے ملکوں سے آگئی تھی اور اس کام کے لیے بڑا سفر طے کیا تھا اور مل گئے تھے اُن میں گاؤں کے کمینے لوگ جنگل کے اور غلام مدینہ کے۔ اس لیے وہ جمع ہو کر انتہا درجہ کی شوکت رکھتے تھے اور بلوہ کیا تھا اُنھوں نے اتفاق کے ساتھ۔

وروی انه جمع الناس ووعظهم ثم قال لتقم قتلة عثمان فقام الناس باسرهم الا القلیل۔

اور مروی ہے کہ جناب امیر نے لوگوں کو جمع کیا اور وعظ فرمایا پھر فرمایا کہ کھڑے ہو جاویں قاتلان عثمان۔ تو تھوڑے سے آدمیوں کے سوا سب کھڑے ہو گئے۔

ف یہاں سے ظاہر ہو گیا کہ جناب امیر علیہ السلام کے درباریوں اور ساتھیوں میں زیادہ تر وہ مفسد اور بلوائی لوگ تھے جنھوں نے عثمانؓ پر بلوہ کیا اور جناب امیر ان سے قصاص لینا چاہتے تھے مگر قابو نہیں پاتے تھے اور ان کے ہاتھوں میں مجبور تھے اگرچہ وہ مجرم جرم بلوہ اور قتل خلیفہ کے تھے مگر

اس جرم کی سزا کا ان کو مطلق خوف نہ تھا بے دھڑک اُنھوں نے اپنے آپ کو ظاہر کر دیا۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ اُس وقت کے خلیفہ یعنی جناب امیر کو وہ اپنے قابو میں مجبور سمجھتے تھے۔

وكان ذلك الفعل منه استشهادا على صدق قوله والقوم على حد شوكتهم ومع تحقق هذا الحال لا يبقى له موضع قدرة على شئ من امرهم ثم قال على سبيل قطع لجاج الطالبين مخاطبًا لهم ان هذا الامر امر الجاهلية يريد امر المجلبين عليه اذا لم يكن قتلهم اياه بمقتضى الشريعة

اور یہ فعل جناب امیر کا شہادت پیش کرنا تھا اپنے اس قول کی راستی پر جو انھوں نے فرمایا تھا کہ "قوم اپنی کامل شوکت پر ہے" اور جب یہ حالت تھی تو جناب امیر کو کوئی موقع ان کے معاملے پر قادر رہونے کا باقی نہ رہا۔ پھر جو لوگ اُن بلوائیوں کو سزا دینے پر اصرار کرتے تھے ان کا جھگڑا ختم کر دینے کے لیے جناب امیر نے اُن سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا کہ یہ کام جاہلیت کا کام تھا۔ مراد جناب امیر کی یہ ہے کہ بلوائیوں کا عثمان پر بلوہ کرنا جاہلیت کا کام تھا۔ اس لیے کہ انھوں نے جو عثمانؓ کو قتل کیا ان کا یہ فعل بمقتضائے شریعت نہ تھا۔

چونکہ اس زمانہ میں علم جہان سے بہت کم ہو گیا تھا اس لیے یہاں تک نوبت پہونچی کہ بعض مصنفین مذہب شیعہ نے جناب امیر کے قول و فعل

کی مخالفت اختیار کر کے اس بحث میں معاویہؓ کی پیروی شروع کی اور جس طرح معاویہؓ جناب امیر پر یہ تہمت لگاتے تھے کہ وہ قتل عثمانؓ کے مشورے میں شریک تھے اسی طرح اس زمانے کے علمائے شیعہ بھی کہنے لگے کہ قاتلانِ عثمانؓ نے جناب امیر کے اشارہ سے عثمانؓ کو قتل کیا تھا حالانکہ جو اقوال جناب امیر کے نہج البلاغت میں مذکور ہیں اُن میں جا بجا یہ مضمون موجود ہے کہ جناب امیر قتل عثمان کی سازش سے قسم کھا کھا کر اپنی برارت ظاہر کرتے ہیں بلکہ وہ اس فعل کو ناجائز سمجھتے تھے اور امر جاہلیت کہتے تھے وہ اپنی خلافت کے زمانہ میں چاہتے تھے کہ خون عثمان کا قصاص لیں مگر اس وجہ سے مجبور تھے کہ اس کام پر ان کو قدرت نہ ملی۔ علامہ میثم نے یہ بھی لکھ دیا کہ جناب امیر نے زبان سے اور ہاتھ سے اُس فتنہ کے وقت عثمان کی مدد کی مگر اس بلوہ کے دفع کرنے میں قابو نہ پایا تب مجبور ہو کر گھر میں بیٹھ رہے۔

اب حضرات شیعہ یہ جو کہتے ہیں کہ عمار بن یاسر قتل عثمان میں شریک تھے اگر یہ قول سچا ہو تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عمار بن یاسر جناب امیر کے مخالف تھے اور امر ناجائز کے مرتکب ہوئے۔ بعض روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ جناب امیر نے حسنین وغیرہ کو بھی عثمان کی مدد کے لیے بھیجا تھا اور جب ان کی بے خبری میں عثمان قتل ہو گئے تو اُن پر بہت عتاب کیا۔

حتى اذا نهضت بالامر نكثت طائفة۔

اور جب میں حکومت پر قائم ہوا تو ایک گروہ نے عہد توڑا۔

اس موقع پر جناب امیر نے ایک فریق کو عہد توڑنے والا اور ایک
فریق کو فاسق اور ایک فریق کو دین سے نکل جانے والا بتایا ظاہر یہ ہے کہ ان
تینوں قوموں سے خوارج مراد ہیں اس لیے کہ ان میں بھی کئی فریق تھے مگر شارحین
نہج البلاغت بلکہ تمام علمائے شیعہ یہ کہتے ہیں کہ پہلے قول سے طلحہ اور زبیر
اور دوسرے قول سے اہل شام اور تیسرے قول سے خوارج مراد
ہیں۔

طلحہ اور زبیر کا قصہ جو علمائے اہل سنت نے بحوالہ تاریخ قرطبی
وغیرہ نقل کیا ہے اور صاحب سیف[1] المسلول نے لکھا ہے کہ یہی صحیح اور
مشہور ہے اور اسی کو جمہور اہل علم نے نقل کیا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ
طلحہ اور زبیر قتل عثمان پر بہت افسوس کرتے تھے اور ہر وقت ان کی زبان
پر یہ تذکرہ تھا کہ بلوائیوں نے بڑا ظلم کیا کہ عثمان کو ناحق شہید کیا۔ یہ امر بلوائی
گروہ کو ناگوار تھا اور جو کوئی عثمان کو مظلوم اور بلوائیوں کو ظالم کہتا تھا اس کو یہ
بلوائی مفسد دھمکاتے تھے اور مدینہ میں اپنی حکومت سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں
نے اُن صحابہ پر حملہ کرنے کا قصد کیا جب ان صحابہ نے یہ خبر سُنی تو مدینہ سے
بھاگ کر مکہ کو چلے گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اُس سال حج کو گئی تھیں
اور اُس وقت تک مکہ میں تھیں۔ طلحہ اور زبیر نے یہ سارا قصہ اُن سے بیان
کیا اور اُنھیں کے ساتھ ہو لیے اور اُن سے یہ کہا کہ تم ام المومنین ہو تمھاری
پناہ میں ہم کو امن ملے گا اور تم ایسی کوشش کرو کہ یہ فساد کسی طرح دفع ہو

۱؎ یہ کتاب حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی ہے ۱۲

علی جو اس وقت امیر المومنین ہیں وہ مصلحت یوں سمجھے ہوئے ہیں کہ ابھی قصاص
کے معاملے میں سکوت چاہیے۔ حضرت عائشہؓ نے ان جھگڑوں میں پڑنے کو
انکار کیا تب اُنھوں نے قرآن کی وہ آیت پڑھی جس میں اللہ نے آدمیوں میں
اصلاح کی کوشش کو خیر کہا ہے تب حضرت عائشہ بہ نیت[1] اصلاح اُن کے

۱؎ حضرت عائشہ نے جو اس وقت طلحہ اور زبیر کے ساتھ ہو جانا قبول کر لیا اس کی بڑی
وجہ یہی تھی کہ مدینہ کے واقعات پر مطلع ہو کر وہ یہ سمجھ گئی تھیں کہ آج کل مدینہ میں امن
نہیں ہے اور علی جو اس وقت خلیفہ ہیں وہ مفسدوں کا تدارک نہیں کر سکتے اور روز
بروز مفسدوں کی جماعت بڑھتی جاتی ہے۔ شاید یہ فساد مکہ تک پہونچے بلکہ تمام عرب میں
پھیلے اس لیے عرب سے باہر ہو جانا مصلحت ہے۔ اس گروہ کو حضرت عائشہؓ نے اپنی جان
وآبرو کا محافظ سمجھا اس لیے کہ طلحہ اور زبیر وغیرہ جلیل القدر صحابی حضرت عائشہ کے
مناقب اور ناموس رسولؐ کی عزت سے بخوبی واقف تھے۔ قطع نظر اس کے بہت
سے لوگ حضرت عائشہ کے قریب رشتہ دار تھے چنانچہ حضرت عائشہ کی ایک بہن
ام کلثوم زبیر کی بی بی تھیں دوسری بہن اسماء طلحہ کی بی بی تھیں اور عبداللہ بن زبیر وغیرہ
ان دونوں کے کئی فرزند جو حضرت عائشہ کے حقیقی بھانجے تھے اس گروہ میں موجود تھے
اور یہ لوگ نہ دعویدار خلافت تھے اور نہ جناب امیر کی خلافت کے مخالف بلکہ جناب
امیر کی خلافت کے مؤید تھے اس لیے کہ یہ چاہتے تھے کہ قاتلان عثمان سے قصاص لیا
جاوے تاکہ علی کی مجبوری رفع ہو۔ بس اس فریق کا مقصود محض اصلاح تھا نہ فتنہ
وفساد نہ جناب امیر سے بغاوت۔ لہذا اس نازک وقت میں حضرت عائشہ نے انھیں
کے ساتھ رہنا مصلحت سمجھا۔ (باقی صفحہ ۴۹۳ پر)

ساتھ ہولیں اور مشورہ یہ ٹھیرا کہ جب تک یہ مفسد علی کو گھیرے ہوئے اور مجبور کیے ہوئے ہیں اُس وقت تک مدینہ میں نہ جانا چاہیے بلکہ عرب سے باہر

(بقیہ صفحہ ۴۷۳) شیعوں کی طرف سے اس موقع پر ایک طعن یہ پیش کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بی بیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ تم میں وہ کون ہے جس پر حوأب[عہ] کے کتے بھونکیں گے اے حمیرا[عہ] تو وہ مت ہونا۔ چنانچہ جب سفر بصرہ میں حضرت عائشہ کا اونٹ ایک مقام پر ٹھیرا تو اس پر کتے بھونکنے لگے اُس وقت حضرت عائشہ نے اس مقام کا نام پوچھا تو کسی نے حوأب بتایا اُس وقت حضرت عائشہ نے یہ حدیث نقل کی اور یہ کہا کہ مجھ کو واپس کردو تب مردان نے بہت سے آدمیوں سے گواہی دلوادی کہ اس مقام کا نام حوأب نہیں ہے۔ اس روایت کی بنا پر شیعوں کا طعن یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالتخصیص اس سفر سے منع کر دیا تھا مگر عائشہؓ نے اس کی مخالفت کی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس روایت کا کتب صحاح اہل سنت میں وجود نہیں غیر صحاح کی روایت ہے۔ پھر محدثین کا اس کے ثبوت میں بڑا اختلاف ہے اگرچہ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے مگر محدثین کا یہ قول ہے کہ تصحیح کے باب میں حاکم کا اعتبار نہیں۔ ابن عربی نے کتاب العواصم والقواصم میں اس کو بے اصل کہا ہے۔ اکثر نے اس کو اس وجہ سے منکر کہا ہے کہ قیس بن حازم اس کا راوی مجروح ہے ایسی حالت میں یہ روایت قابل تسلیم نہیں۔ بااین ہمہ (باقی صفحہ ۴۷۵ پر)

عہ حوأب بحای حطی مفتوحہ پھر واؤ ساکن پھر ہمزہ مفتوحہ پھر بار موحدہ بروزن جعفر بصرہ کے نواح میں ایک گاؤں ہے اور وہاں ایک ندی ہے اس کو بھی حوأب کہتے ہیں ۱۲

عہ لفظ حمیرا کے معنے گوری عورت کے ہیں حضرت عائشہ کا یہ لقب تھا ۱۲

کوئی امن کا ٹھکانا ڈھونڈنا چاہیے اور کسی حیلہ سے علی کو ان مفسدوں کے گروہ سے جدا کر کے اپنے ساتھ لے لینا چاہیے پھر ان کی سیاست اور قصاص

(بقیہ صفحہ ۴۷۴) اس روایت کے آخر میں جو یہ مضمون ہے کہ اے حمیرا تو وہ مت ہونا اس فقرہ کے جھوٹے ہونے میں اختلاف بھی نہیں بلکہ اتفاق ہے اور جن کتابوں میں یہ روایت مذکور ہے بغیر اس فقرہ کے ہے البتہ یہ فقرہ ایک اور روایت کا ہے جس کو جھوٹے راویوں نے یہاں ملا دیا اب اس روایت کی بنا پر کوئی طعن باقی نہ رہا۔ ایک طعن شیعوں کی طرف سے اور پیش کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ لشکر جب بصرہ میں پہونچا تو بیت المال کو لوٹ لیا اور عثمان بن حنیف کو جو وہاں عامل تھے قید کر لیا۔ اس قصہ کا بھی کتب صحاح میں وجود نہیں نہ ان کے سوا کسی اور صحیح روایت میں اس کا ذکر ہے۔ صاحب السیف المسلول نے لکھا ہے کہ یہ قصہ صحیح روایتوں سے ثابت نہیں ہوا محدثین کا قول ہے کہ جنگ جمل کے واقعات میں جھوٹ اور افترا بہت ہے۔ اور ابن سبا نے بہت سی جھوٹی روایتیں اپنی طرف سے بنا کر مشہور کر دی ہیں بااین ہمہ بعضی ضعیف اور مجروح روایتوں میں جس طرح یہ قصہ منقول ہے وہ بھی محل طعن نہیں ہو سکتا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس گروہ کے پاس زاد راہ تمام ہو چکا تھا اس لیے انھوں نے بیت المال کی مدد لینا چاہی اور یہ کہا کہ بیت المال حق مسلمین ہے اور ہم سب اس وقت حاجتمند مسلمان ہیں مگر عثمان بن حنیف عامل بصرہ نے مخالفت کی اور لڑنے پر آمادہ ہو گئے اور لشکر والوں کو شہر میں داخل ہونے سے روکا جانوروں کے لیے چارہ اور دانہ اور آدمیوں کے لیے رسد کا سامان بند کر دیا۔ قریب تھا کہ بھوک کے مارے تمام لشکر ہلاک ہو جاوے ایسی مجبوری کی حالت میں عوام لشکر نے بیت المال پر قبضہ کر لیا۔ (باقی صفحہ ۴۷۶ پر)

کی تدبیر ہو جائے گی اسی مشورہ پر عزم مصمم کرکے یہ گروہ بصرہ کو چلا گیا۔ جناب امیر پر بلوائی گروہ غالب تھا انھوں نے بہت بگاڑ کر اس قصہ کو جناب امیر کے سامنے پیش کیا اور یہ سمجھا دیا کہ یہ لوگ تم سے خلافت چھیننا چاہتے ہیں اور

(بقیہ صفحہ ۴۷۵) حضرت عائشہ کی سفارش سے عثمان بن حنیف کو صحیح و سلامت چھوڑ دیا اور معذرت کی۔ پس عوام نے بھی جو کچھ کیا مجبوری کی حالت میں کیا اور چونکہ یہ فریق خلافت کا مخالف نہ تھا بلکہ اپنے آپ کو خلیفہ کا مؤید سمجھتا تھا اس لیے بیت المال سے اُن کو مدد حاصل کرنا ناجائز نہ تھا۔ بہرحال اس قصہ سے حضرت عائشہ کو کوئی تعلق نہیں۔

اس موقع پر یہ بخوبی سمجھ لینا چاہیے کہ حضرت عائشہ کا اس فریق میں شامل ہونا محض اپنی حفاظت کے واسطے تھا مگر جب وہ اس فریق کے ساتھ ہو گئیں تو جو دعوے اس فریق کے تھے یعنی امن قائم ہو جانا اور قاتلان عثمان سے قصاص لینا یہ امور بھی خواہ مخواہ ان کی طرف منسوب ہو گئے اور اس میں شک نہیں کہ وہ بھی ان امور کو پسند کرتی ہوں گی لیکن خروج اُن کا ان مقاصد کے لیے نہ تھا اور اونٹ پر سوار ہو کر صف جنگ میں انکا شامل ہونا دوسروں کے اصرار سے ہوگا نہ اپنی خواہش سے قطع نظر اس کے اس میں یہ مصلحت بھی ہوگی کہ اگر فوراً یہاں سے جدا ہو جانے کی ضرورت ہو تو سامان سواری میں دیر نہ ہو۔

حضرت علی بھی حضرت عائشہ کے ذمہ کوئی الزام نہیں لگاتے تھے اسی لیے اُنھوں نے بعد فتح کے بھی ان کی وہی تعظیم کی اور جب بہت سے سامان (باقی صفحہ ۴۹۴ پر)

عہ اگر یہ فریق جناب امیر کا مخالف ہوتا تو بصرہ کو نہ جاتا بلکہ شام میں معاویہ کے پاس جاتا ۱۲

جو اصلی نیت اس فریق کی تھی اُس کی جناب امیر کو ہرگز خبر نہ ہوئی آخر یہ بلوائی گروہ جناب امیر کو بھڑکا کر بصرہ کی طرف لے چلا حسنین[1] اور عبداللہ بن جعفر اور ابن عباس نے اس فوج کشی سے بہت منع کیا مگر انھیں مفسدوں کا قول غالب رہا۔ جب جناب امیر کی فوج بصرہ کے قریب پہونچی تو انھوں نے ایک شخص قعقاع نام کو جو من جملہ صحابہ تھے بطور سفیر کے طلحہ اور زبیر کے پاس بھیجا قعقاع نے اول حضرت عائشہ رض سے ملاقات کی انھوں نے صاف کہہ دیا کہ میں اصلاح چاہتی ہوں یعنی میرا مقصود فقط اسی قدر ہے کہ فتنہ و فساد دور ہو کر امن قائم ہو جائے۔ پھر قعقاع نے طلحہ اور زبیر سے گفتگو کی اور یہ پوچھا کہ تم نے اصلاح کی کیا تدبیر تجویز کی ہے۔ اُن دونوں نے کہا کہ جب تک قاتلان عثمان سے قصاص نہ لیا جائے گا اس وقت تک امن قائم نہ ہوگا۔ قعقاع نے کہا کہ یہ مقصود اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک سب مسلمان اتفاق نہ کریں پس تم کو چاہیے کہ علی کے ساتھ متفق ہو کر اس کی تدبیر کرو۔ اُن دونوں نے اس رائے کو بہت پسند کیا اور صلح کا مژدہ لے کر قعقاع جناب امیر کے پاس آئے وہ بھی اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور عام طور پر سب لوگوں کو

(بقیہ صفحہ ۴۷۶) کے ساتھ ان کو مدینہ کی طرف رخصت کیا تو کئی میل تک خود پہونچانے گئے۔ ایک منزل تک اُن کے سب بیٹے ساتھ گئے اور محمد بن ابی بکر مدینہ تک اُن کے ساتھ گئے ۱۲

[1] علماء شیعہ نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ امام حسن اس فوج کشی کے مانع ہوئے تھے چنانچہ شرح میثم کی عبارت ہم جلد ثانی میں نقل کر چکے ہیں ۱۲

یہ خوش خبری سُنادی کہ صلح ہوگئی اس کے بعد تین دن تک سفیروں کی معرفت دونوں فریقوں میں نامہ و پیام جاری رہا تیسرے دن شام کو ایلچیوں کی معرفت یہ قرار پایا کہ صبح کو علی کی ملاقات طلحہ اور زبیر کے ساتھ اس طرح ہو کہ قاتلان عثمان کو اُس مجلس میں دخل نہ ہو۔ قاتلان عثمان کو یہ امر سخت ناگوار ہوا وہ جانتے تھے کہ اگر تنہائی میں علیؓ کی طلحہؓ اور زبیرؓ سے ملاقات ہوگئی تو شاید علی ہمارے قابو سے نکل جائیں اس لیے وہ کوئی ایسی تدبیر سوچتے تھے کہ کسی طرح یہ صلح ٹوٹ جائے اور ملاقات نہ ہونے پائے۔ عبداللہ بن سبا مشہور منافق (موجد مذہب شیعہ) بھی ان کے گروہ میں شامل ہو کر سب کا سردار بن گیا تھا آخر سب نے اُس سے مشورہ پوچھا اُس نے یہ رائے دی کہ تم اسی شب میں لڑائی شروع کردو اور اس کے بعد جناب امیر کو یہ اطلاع دو کہ دوسرے فریق نے بدعہدی کرکے جنگ کی ابتدا کی۔ چنانچہ ان مفسدوں نے خود بخود پچھلی رات میں طلحہؓ اور زبیرؓ کے لشکر پر حملہ کر دیا آخر اُن لوگوں کو بھی جواب دینا پڑا۔ اس طرح فریقین کے عوام میں کشت و خون شروع ہوگیا اور بہت سی خوں ریزی کے بعد ادھر جناب امیر کو اور اُدھر طلحہ اور زبیر کو اس حادثہ کی خبر ہوئی۔ علی کو یہ سمجھایا گیا کہ طلحہ اور زبیر نے بدعہدی کی اور اپنی طرف سے جنگ شروع کردی دوسری طرف یہ شہرت تھی کہ علی نے بدعہدی کی اس طرح فریقین جنگ کی مصیبت میں پھنس گئے اور پھر کسی طرح یہ آگ بجھ نہ سکی۔ اس ہنگامہ میں جو عبداللہ بن سبا کی فتنہ انگیزی کا ایک کرشمہ تھا دونوں طرف سے تیرہ ہزار مسلمان قتل ہوئے طلحہؓ اور زبیرؓ بھی شہید ہوئے اس تعداد میں ایک ہزار

حضرت علی کی طرف کے تھے باقی دوسری طرف کے۔

مفسدوں کی فتنہ انگیزی ہوئی — باعث خون ریزی جنگ جمل
ورنہ شیر حق سے طلحہ اور زبیر — چاہتے ہرگز نہ تھے جنگ و جدل
تھا یہی ہونا رضینا بالقضا — تھی یہی تقدیر رب لم یزل
خون عثمان رنگ لایا بے طرح — پڑ گیا امن خلائق میں خلل
وہ اٹھے فتنے عرب میں چارسو — سو برس تک جن کا باقی تھا عمل

مجرم و بے جرم سب آفت میں تھے
الاماں اے خالق عز و جل

جناب امیر نے جو خطبہ شقشقیہ کے اس فقرہ میں اس فریق کو عہد توڑنے والا بتایا یہ باعتبار اسی خیال کے ہے جو مفسدوں نے ان کو سمجھا دیا تھا اور شاید اس خطبہ کے وقت تک یہ مفسد ان پر مسلط ہوں گے اس لیے کہ جنگ صفین میں جب تحکیم کی بحث پیش ہوئی ہے اُس وقت بھی یہ مفسد گروہ جناب امیر کے ساتھ موجود تھا چنانچہ نہج البلاغت میں جناب امیر کا ایک خطبہ ہے جو انھوں نے اُس وقت فرمایا تھا جب کہ جنگ صفین میں اول ثالثی کے قبول کرنے سے انکار کیا تھا اور آخر کو قبول کی۔ اُس خطبہ کی ابتدا یہ ہے:۔

وقد قام رجل من اصحابه فقال نهيتنا عن الحكومة ثم امرتنا به الخ

اس کی شرح میں علامہ میثم نے اول یہ قصہ لکھا ہے کہ جناب امیر نے اول تحکیم قبول کرنے سے انکار کیا اور اس قول پر ان کو بہت غصہ آیا اس کے

بعد یہ لکھا ہے

فافترق اصحابہ فریقین منهم من رای رایہ فی الاصرار علی الحرب ومنهم من رای ترك الحرب والرجوع الی الحکومۃ وکانوا اکثرین فاجتمعوا الیہ فقالوا ان لم تفعل قتلناك کما قتلنا عثمان فرجع الی قولهم وامر برد الاشتر عن الحرب۔

پھر اصحاب علی رضؓ کے جُدا جُدا دو فرقے ہو گئے، ایک فرقہ وہ تھا جن کی رائے جناب امیر کے موافق تھی کہ جنگ میں ثالثی نہ مانو اور لڑائی جاری رکھو اور دوسرا فرقہ وہ تھا جو یہ کہتے تھے کہ لڑائی چھوڑ دو اور ثالثی قبول کر لو اور یہی لوگ بہت تھے پس حضرت کے پاس جمع ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اگر تم تحکیم نہ مانو گے تو ہم تم کو اسی طرح قتل کر دیں گے جیسے ہم نے عثمان کو قتل کیا تھا۔ پس جناب امیر نے اُنہیں کے قول کی طرف رجوع کیا یعنی اپنی رائے کے خلاف ثالثی قبول کر لی اور مالک اشتر کو لڑائی سے واپس ہونے کا حکم کیا۔

یہ قول اُنہیں بلوائیوں کا تھا جو قاتلان عثمانؓ تھے اُنھوں نے جناب امیر کا کچھ بھی ادب نہ کیا اور صاف کہہ دیا کہ جس طرح ہم نے عثمانؓ کو

۱؎ شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۱۸۵۔

قتل کیا تھا تم کو بھی قتل کر دیں گے اسی وجہ سے جناب امیر کو مجبور ہو کر اپنی رائے بدلنی پڑی اور اگرچہ جناب امیر کی ہرگز مرضی نہ تھی کہ کسی کو ثالث بناویں مگر ان بلوائیوں کے دھمکانے سے اپنی رائے کے خلاف ثالثی ماننا پڑی۔

ثم کتبوا کتاب الصلح وطافوا بہ فی اصحابہ واتفقوا علی الحکومۃ۔

پھر لکھی تحریر صلح کی اور لشکر علیؑ میں اس کی عام اطلاع کر دی اور متفق ہو گئے ثالثی پر۔

یہ ثالثی جناب امیر نے قاتلان عثمان کے دھمکانے سے منظور کی تھی اپنی رائے سے منظور نہیں کی تھی چنانچہ اس کے نتیجہ میں دوسری مشکل پیش آئی۔

فخرج بعض اصحابہ من هذا الامر وقالوا کنت نهیتنا عن الحکومۃ ثم امرتنا بها۔

تو مخالف ہوئے بعض اصحاب علیؑ کے اس حکم کے اور انھوں نے کہا کہ تم نے ہم کو ثالثی سے پہلے منع کیا تھا پھر اب تم اس کا حکم کرتے ہو۔

فما ندری ای الامرین ارشد وهذا ابدال علی انك شاك فی امامۃ نفسك فصفق باحدی یدیہ علی الاخری فعل النادم من قولهم وقال هذا اجزاء من ترك العقدۃ

اب ہم نہیں جانتے کہ ان دونوں کاموں میں کون سا کام اچھا ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم کو خود اپنی امامت میں شک ہے۔ تو جناب امیرؑ نے ایک ہاتھ اپنا دوسرے ہاتھ پر ملا جیسے کہ نادم کا فعل ہوتا ہے ان کی بات سے غصہ میں آکر

اور فرمایا کہ یہی ہے سزا اس کی جو اپنی مضبوط
رائے کو چھوڑے۔

چونکہ تحکیم کے قصہ سے چند ماہ کے بعد جناب امیر کی شہادت ہوگئی اس سے ثابت ہوگیا کہ جناب امیر پر ابتدائے خلافت سے آخر تک یہ بلوائی مفسد مسلط رہے اور جناب امیر ان کے ہاتھ میں مجبور رہے اور ان کی خلافت کا سب زمانہ اسی مجبوری کی حالت میں گذرا۔

یہ بھی ثابت ہوگیا کہ صلح و جنگ بھی انھیں کے اختیار میں تھی اور جناب امیر کسی امر میں ان کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے ورنہ وہ یوں دھمکاتے تھے کہ جیسے ہم نے عثمان کو قتل کیا تم کو بھی قتل کر دیں گے۔

اب جناب امیر کی حالت کو خلفائے ثلثہ کی حالت کے ساتھ مقابلہ کرو شیخین کے زمانہ میں کسی کی مجال نہ ہوئی کہ ان کو دھمکا سکے جو کچھ کرتے تھے وہ اپنی رائے سے کرتے تھے کبھی کسی مجبوری کو انھوں نے نہ مانا۔ اس کے ساتھ یہ بھی غور کرو کہ ان کے استقلال کا نتیجہ کیسا عمدہ پیدا ہوا۔ عثمانؓ بھی ہمیشہ اپنی رائے میں مستقل رہے اور کسی مجبوری کو انھوں نے نہ مانا البتہ آخر میں مروان کا دھوکا کھایا جس کے نتیجہ میں ان بلوائیوں کا گروہ قائم ہوگیا پھر بھی عثمانؓ نے موت گوارا کی مگر بلوائیوں کی دھمکی نہ مانی اور جناب امیر کی طرح کسی کی دھمکی کے خوف سے اپنی رائے نہیں بدلی۔

یہیں سے یہ بھی سمجھ لو کہ صحابہ مہاجرین و انصار جو جناب امیر کے مزاج سے بخوبی واقف تھے انھوں نے خلافت اول اور ثانی اور ثالث کے لیے

جناب امیر کا انتخاب کیوں نہ کیا۔

اب یہ بھی غور کرو کہ جب یہ حالت تھی تو طلحہؓ اور زبیرؓ اور معاویہؓ وغیرہم کی کیا شکایت ہے وہ جناب امیر سے ہرگز نہیں لڑتے تھے بلکہ اُن بلوائیوں سے لڑتے تھے مگر اس کا کیا علاج کہ جناب امیر ان بلوائیوں کے ہاتھ میں پھنسے ہوئے تھے۔ اگر جناب امیر اپنی حکومت میں مستقل ہوتے تو کبھی مسلمانوں میں باہم لڑائیاں نہ ہوتیں اور یہی طلحہؓ اور زبیرؓ اور معاویہؓ جناب امیر کے ساتھ ہو کر جہاد کرتے اور جس طرح سے خلفائے ثلثہ کے مطیع تھے جناب امیر کے بھی مطیع رہتے۔

اس موقع پر اس بحث سے ہمارا مطلب فقط اتنا ثابت کرنا تھا کہ خطبہ شقشقیہ کے وقت بھی جناب امیر اسی مجبوری میں ہوں گے پس بلوائیوں کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتے تھے ورنہ وہ بلوائی سامنے کھڑے ہو کر یوں کہتے کہ جس طرح ہم نے عثمان کو قتل کیا تھا تم کو بھی قتل کریں گے پس اسی مجبوری کی حالت میں جناب امیر نے طلحہؓ اور زبیرؓ کو عہد توڑنے والا کہا۔

وَفَسَقَتْ اُخریٰ
اور نافرمانی کی دوسرے نے

علمائے شیعہ لکھتے ہیں کہ مراد اس سے معاویہ وغیرہ اہل شام ہیں جو صفین میں جناب امیر سے لڑے اصل قصہ معاویہ کا یہ ہے کہ وہ خلیفہ ثانی کے وقت سے دمشق کے حاکم تھے خلیفہ ثالث نے تمام ملک شام پر ان کو حاکم کر دیا۔ ان دونوں خلافتوں کے عہد میں نہ انھوں نے دعویٰ خلافت کیا اور نہ بغاوت اور سرکشی کی جب مدینہ میں عثمانؓ شہید ہوئے

اور وارثان[1] عثمانؓ نے معاویہؓ کے پاس جاکر پناہ لی اُس وقت معاویہؓ کو اپنے بھائی کے خون ناحق پر بڑا جوش آیا۔ جناب امیر سے اُن کو یہ شکایت تھی کہ قاتلان عثمانؓ سے قصاص کیوں نہ لیا اور ان کو اپنے دربار میں اتنا رسوخ کیوں دیا اور اسی امر کو انھوں نے قرینہ اس بات کا ٹھیرایا کہ شاید جناب امیر قتل عثمانؓ کی سازش میں شریک تھے پس جناب امیر کی خلافت کو انھوں نے نہ مانا اس میں فریقین کی جو باہم خط وکتابت ہوئی ہے اس کو ہم نقل کرتے ہیں جس سے بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ ہر ہر فریق کو کیا کیا دعویٰ تھا۔ نہج البلاغت[2] میں جناب امیر علیہ السلام کا خط معاویہؓ کے نام اس طرح مذکور ہے :-

ومن کتاب له الی معاویة انہ بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر وعمر وعثمان علی ما بایعوھم علیہ فلم یکن للشاھد ان یختار ولا للغائب ان یرد وانما الشوری للمھاجرین والانصار فان اجتمعوا علی

اور جناب امیر کا خط ہے معاویہ کے نام بے شک مجھ سے انھیں لوگوں نے بیعت کرلی جنھوں نے ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ سے بیعت کی تھی اسی شرط پر جس شرط پر ان سے بیعت کی تھی اب نہ کسی حاضر بیعت کو یہ جائز ہے کہ کسی اور کو پسند کرے اور نہ غائب وقت بیعت کو یہ

[1] وارثان عثمانؓ مدینہ سے فوراً نکل جانے پر اس وجہ سے مجبور ہوئے کہ قاتلان عثمان کا جناب امیر کے دربار میں بڑا زور ہو گیا اور مدینہ میں گویا انھیں کی حکومت ہو گئی ۱۲

[2] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۳۰۔

رجل وسموہ اماماً کان ذلك للہ رضی فان خرج من امرھم خارج بطعن او بدعة ردوہ الی ما خرج منہ

اختیار ہے کہ اس کو رد کردے اور نہیں ہے شوریٰ مگر مہاجرین اور انصار کے لیے۔ تو اگر وہ جمع ہو کر کسی کو امام مقرر کر دیں تو وہی اللہ کی رضامندی ہے پھر اگر نکلے ان کے امر سے کوئی نکلنے والا خلیفہ پر طعن کر کے یا خود طریقہ بدعت اختیار کر کے تو اس کو پھیر دو اُسی بیعت کی طرف جس سے وہ نکلتا ہے۔

فان ابی قاتلوہ علی اتباعہ غیر سبیل المومنین وولاہ اللہ ما تولی۔

پھر اگر وہ انکار کرے تو اس سے لڑو اس سبب سے کہ اُس نے طریقہ مومنین کے خلاف طریقہ اختیار کیا اور پھیر دیا اس کو اللہ نے حق سے۔

ولعمری یا معویة لان نظرت بعقلك دون ھواك لتجدنی ابرأ الناس من دم عثمانؓ و لتعلمن انی کنت فی عزلة منہ

اور میں قسم کھاتا ہوں اپنی جان کی اے معاویہ اگر تو اپنی ہوا کو چھوڑ کر اپنی عقل سے غور کرے تو قتل عثمان کے اتہام میں تو مجھ کو سب آدمیوں سے زیادہ بری پائے گا اور البتہ تو جان لے گا کہ میں ایک گوشہ میں تھا اُس سے۔

اس خط میں جناب امیر نے معاویہؓ پر یہ حجت پیش کی کہ میری خلافت اسی طرح ثابت ہو گئی جس طرح ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کی خلافت ثابت ہوئی تھی اور جن لوگوں نے اُن سے بیعت کی تھی اُنھیں لوگوں نے اُنھیں شرطوں پر مجھ سے بھی بیعت کر لی پس جس طرح ان کی اطاعت واجب تھی اسی طرح میری اطاعت بھی واجب ہے۔ اس لیے کہ شورے کا اختیار مہاجرین و انصار کو ہے کسی اور کو نہیں۔ مہاجرین و انصار متفق ہو کر جس کو امام بناویں اُسی کی امامت سے اللہ راضی ہوگا۔ پس مہاجرین و انصار نے ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کی طرح مجھے امام بنایا ہے اور جو شخص مہاجرین و انصار کے حکم سے نکلے اور سمجھانے سے نہ مانے اس سے لڑنے کا حکم ہے اس لیے کہ وہ مومنین کے طریقہ کی مخالفت کرتا ہے بس تم جو میری خلافت سے انکار کرتے ہو اب میں تم کو سمجھاتا ہوں کہ مان جاؤ ورنہ تم سے لڑنا جائز ہوگا اور تم جو مجھ پر سازش قتل عثمان کی تہمت لگاتے ہو یہ ہرگز صحیح نہیں۔ میں اپنی جان کی قسم کھاتا ہوں کہ خون عثمانؓ سے سب سے زیادہ بری ہوں اور میں ہرگز اُس بلوے میں شریک نہ تھا بلکہ ایک گوشہ تنہائی میں بیٹھا ہوا تھا۔

اس خط کا جواب جو معاویہؓ نے بھیجا ہے وہ بھی شرح میثم[1] میں اس طرح مذکور ہے:۔

واجابہ معویۃ — تو اس طرح جواب دیا جناب امیر کو معاویہ نے

---

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران جز و ۱۱

امابعد فلعمری لو بایعك القوم الذین بایعوك وانت بری من دم عثمان کنت کابی بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ

بعد حمد و نعت کے مطلب یہ ہے کہ اگر بیعت کر لیتے تم سے وہ لوگ جنھوں نے تم سے بیعت کی ہے۔ اور تم پاک ہوتے عثمانؓ سے تب تم مثل ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کے ہوتے۔

مطلب یہ ہے کہ مہاجرین و انصار نے جو تم سے بیعت کی ہے دل سے بیعت نہیں کی بلکہ بلوائیوں کے خوف سے مجبور ہو کر بیعت کی ہے اگر یہ لوگ اپنے ارادہ سے بغیر کسی مجبوری کے تم سے بیعت کر لیں اور تمھاری برات خون عثمانؓ سے ثابت ہو جاوے اُس وقت تمھاری خلافت مثل ابو بکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ کے ہوگی۔

ولکنك اغریت لعثمانؓ و خذلت عنہ الانصار فاطاعك الجاهل وقوی بك الضعیف

اور لیکن تم نے لوگوں کو بھڑکایا عثمان کے لیے اور جدا کیا عثمان کے مددگاروں کو۔ تو اطاعت کی تمھاری جاہلوں نے اور مضبوط ہو گئے تمھارے سبب سے کم زور۔

جناب امیر نے جو قسم کھا کر اپنے آپ کو خون عثمانؓ سے بری بتایا تھا اس کی معاویہؓ نے تکذیب نہیں کی اور اتنی بات مان لی کہ تم اس بلوے میں شریک نہ تھے بے شک اُس سے جدا تھے مگر اس صورت کے سوا اور صورتیں یہ ہو سکتی ہیں کہ خود جدا رہنا مگر دوسروں کو عثمانؓ کے خون پر بھڑکانا اور عثمانؓ

کے طرفداروں کو کم کرنا۔

اس میں شک نہیں کہ معاویہؓ کا یہ خیال کہ جناب امیر کسی طرح سازش قتل عثمان میں شریک تھے بہت عجیب اور بعید تھا مگر انسان کی یہ طبعی بات ہے کہ جو خیال اُس کے دل میں کسی دلیل سے ثابت ہو جائے اُس پر اس وقت تک جما رہتا ہے جب تک اُس خیال کی غلطی کسی دلیل سے ثابت نہ ہو جائے۔ قاتلان عثمانؓ کا جناب امیر کے دربار میں بہت سا رسوخ ہونا بے شک ایسا امر تھا کہ جو اس قسم کی بدگمانیاں کرنے کی گنجائش دیتا تھا۔ اور یہی منشاء معاویہؓ کی بدگمانی کا ہوا۔ لیکن اصلی وجہ ان بلوائیوں کے رسوخ کی جو جناب امیر کی مجبوری اور کمزوری تھی وہ معاویہؓ کو معلوم نہ تھی ایسی بدگمانیاں جو غلط فہمیوں پر مبنی ہوتی تھیں کبھی باہم معصومین میں بھی واقع ہو جاتی تھیں جیسے حضرت موسیٰ اور ہارون میں جھگڑا ہوا اور جناب سیدہ کو جناب امیر سے بدگمانی ہوئی جو مضمون "ہمچو جنین در رحم" الخ سے ظاہر ہے۔

چونکہ جناب امیر کے دربار میں بلوائیوں نے بڑا زور پکڑا تھا اسی وجہ سے امیر معاویہؓ نے یہ لکھا کہ جاہلوں نے تمہاری اطاعت کی اور کمزوروں نے تمہاری وجہ سے قوت پکڑی۔

وقد ابی اھل الشام الا قتالك حتی تدفع الیھم قتلۃ عثمانؓ	اور اہل شام تم سے لڑنے کے سوا اور کسی بات پر راضی نہیں ہوتے جب تک تم قاتلان عثمانؓ کو ان کے حوالے نہ کردو۔

اس قول میں امیر معاویہؓ نے صاف ظاہر کر دیا کہ ہماری تمہاری لڑائی فقط خون عثمان کی وجہ سے ہے۔ اس کے سوا اور کوئی وجہ جنگ نہیں ہے اگر تم خون عثمانؓ سے بالکل بری ہو تو قاتلان عثمانؓ کو ہمارے حوالے کردو اور اگر تم ان کو پناہ دو گے تو ہم تم کو بھی اس سازش میں شریک سمجھیں گے اور بغیر لڑے کسی طرح نہ مانیں گے

فان فعلت کانت شوریٰ بین المسلمین	اب اگر تم ایسا کرو گے تو ہوگا شوریٰ مسلمانوں میں۔

یعنی ہم کو تمہاری خلافت پر دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ قتل عثمانؓ کی سازش میں تم شریک تھے۔ دوسرے یہ کہ مہاجرین و انصار وغیرہ سرداران اسلام نے اپنے ارادہ کے ساتھ تم سے بیعت نہیں کی بلکہ بلوائیوں کے خوف سے کی ہے۔

پہلا اعتراض یوں دفع ہو سکتا ہے کہ تم قاتلان عثمانؓ کی حمایت چھوڑ دو اور اُن کو ہمارے پاس بھیج دو۔ دوسرے اعتراض کے دفع ہونے کی تدبیر یہ ہے کہ جب قاتلان عثمان ہمارے پاس آجاویں اور سب آدمیوں کے دلوں سے اُن کا خوف جاتا رہے اُس وقت خلافت کا معاملہ مسلمانوں کے شوریٰ پر چھوڑ دو وہ اپنی خوشی سے جس کو خلیفہ بنا دیں وہی خلیفہ ہو پس اگر ان مسلمانوں نے اپنی خوشی سے تم کو خلیفہ بنایا ہے تو پھر دوبارہ تمہیں کو خلیفہ بنا دیں گے۔ یہاں سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ معاویہؓ جنگ صفین سے پہلے خلافت کا دعویٰ نہیں کرتے تھے بلکہ خون عثمانؓ کا انتقام لینا

چاہتے تھے اور اگر کوئی صورت ایسی ممکن ہوتی کہ قاتلان عثمانؓ ان کے حوالے
کر دیے جاتے تو اس وقت معاویہؓ یہی چاہتے تھے کہ سرداران اسلام باہمی
شوریٰ سے کسی کو خلیفہ مقرر کر دیں لیکن جب وہ صورتیں جو معاویہؓ نے پیش کی
تھیں پوری نہ ہوئیں اور جنگ کی نوبت پونہچی تو خواہ مخواہ معاویہؓ کو خلافت کا
دعویٰ کرنا پڑا۔

فاما شرفك في الاسلام و قرابتك من النبي وموضعك من قريش فلست ادفعه	لیکن بزرگی تمہاری اسلام میں اور قرابت تمہاری نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اور مرتبہ تمہارا جو قریش میں ہے میں اس کا انکار نہیں کرتا۔

اس فقرہ سے صاف ظاہر ہو گیا کہ معاویہؓ مناقب جناب امیر کے
منکر نہ تھے۔

ان دونوں خطوں سے فریقین کے دعوے اور اختلاف بہت
اچھی طرح ظاہر ہو گئے۔ لڑائی کی وجہ یہی بلوائی قاتلان عثمانؓ تھے جو جناب
امیر پر مسلط تھے۔ اگر یہ بلوائی جناب امیر سے جدا ہوتے اور جناب امیر ان
سے قصاص لینے پر آمادہ ہوتے تو جناب امیر کی خلافت پر کسی کو اعتراض نہ
ہوتا اور یہ ناگوار صورتیں ہرگز پیش نہ آتیں اور معاویہؓ جناب امیر کے ساتھ ہو کر
بلوائیوں سے انتقام لیتے۔

جناب امیر کی طرف سے قصاص نہ لینے کا ایک عذر یہ بھی بیان
کیا جاتا ہے کہ وارثان عثمانؓ نے جناب امیر کے سامنے دعوے پیش نہیں کیا

اگر وہ خون عثمانؓ کا دعویٰ پیش کرتے اور قاتل کو معین کر کے گواہوں کی شہادت
سے قتل کرنے کا جرم اُن پر ثابت کرتے اس وقت جناب امیر موافق شریعت
کے ضرور فیصلہ کرتے۔

مگر اس جواب سے معٰویہؓ اور وارثان عثمانؓ کی تسکین کیونکر ہوسکتی
تھی۔ قاتلان عثمانؓ کو جناب امیر کے دربار میں وہ حکومت تھی کہ ان کے مقابلہ
میں وارثان عثمانؓ کی کیا مجال تھی کہ اُن پر خون کا دعوے کرتے اگر قاتلان عثمانؓ
ان کو بھی قتل کر دیتے تو جس طرح عثمانؓ کا قصاص نہ لیا گیا ان کا بھی نہ لیا جاتا
اس لیے کہ خلیفہ اس امر کے منتظر رہتے کہ جب اُن مقتولوں کا کوئی وارث
گواہوں کو ساتھ لے کر دعوے کرنے آوے گا اُس وقت دیکھا جائے گا۔

اب فرض کرو کہ ان مقتولوں کا بھی کوئی وارث مدعی خون پیدا ہو
جاتا تو یہ بلوائی اس کو بھی تہ تیغ کر کے عثمانؓ اور وارثان عثمانؓ کے پاس پہونچا
دیتے اور اسی طرح سلسلہ قتل کا جاری رہتا اور خلیفہ وقت کو کچھ پروا نہ ہوتی
اس لیے کہ وہ تو قصاص کا حکم اس وقت دے جب اس کی عدالت میں دعویٰ
پیش ہو کر شہادت سے ثابت ہو اور بغیر اس کے ہزاروں خون ہوا کریں خلیفہ
کو کیا غرض۔ اگر قصاص بغیر ان شرائط کے ممکن نہ تھا تو بطور تعزیر کے اُن
بلوائیوں کو سزا کیوں نہ دی گئی اور سرزنش اور تنبیہ کیوں نہ کی گئی بخلاف
اس کے قتل عثمانؓ کے بعد اُن کا زور اور زیادہ بڑھ گیا۔ جو بلوائی طلحہؓ اور
زبیرؓ جیسے دلاوروں اور اکثر صحابہ کو دھمکیاں دے کر مدینہ سے نکال دیں
اور جناب امیر خود ان کی قوت ایسی بیان کریں جیسا کہ ان کے کلام سے اول

ظاہر ہو چکا اور جن کو یہ جرأت ہو کہ قصۂ تحکیم کے وقت جناب امیر سے انھوں نے
کہا کہ جس طرح ہم نے عثمانؓ کو قتل کیا اسی طرح تم کو بھی قتل کر دیں گے ان کے
مقابلہ میں حسب ضابطہ خون کے دعوے کی کیا صورت تھی ؟ -

ستم اُٹھائے غریبوں نے اور خموش رہے
لبوں پہ رک گئی فریاد دادخواہوں کی،
تمام شہر پہ بلوائیوں کا قبضہ تھا
نہ مستغیث کی پرسش نہ واں گواہوں کی
گھٹے گا زور جب ان کا تو ہو گی فکر قصاص،
یہی تھی مصلحتِ وقت بادشاہوں کی
مگر نہ زور گھٹا اور نہ انتقام ہوا
وبال پڑ گیا گردن پہ بے گناہوں کی
تمام مجمع اسلام میں نفاق پڑا
بہت سی ہو گئیں خوں ریزیاں سپاہوں کی

پس جناب امیر کی طرف سے واقعی عذر قصاص نہ لینے کا یہی تھا کہ جناب امیر مجبور تھے۔ اور بلوائیوں کا ایسا زور تھا کہ جناب امیر کو ان کے سزا دینے کی قدرت نہ تھی۔

اس موقع پر ہم جناب امیر کی وہ تحریر بھی نقل کرتے ہیں جس میں جناب امیر نے صاف صاف ظاہر کر دیا ہے کہ معاویہؓ وغیرہ اہل شام سے صفین میں لڑائی کیوں ہوئی اور اس جنگ کا سبب کیا تھا یہ وہ تحریر ہے جو بطور اشتہار

اور اعلان کے جناب امیر نے ہر ہر شہر کو بھیجی تھی تاکہ سب مسلمانوں کو وجہ اس لڑائی کی معلوم ہو جائے۔ نہج البلاغت[۱] میں ہے :-

ومن کتاب له علیه السلام کتبه الی اهل الامصار یقتص فیه ماجری بینه و بین اهل صفین وکان بدء امرنا انا التقینا والقوم من اهل الشام۔	اور جناب امیر علیہ السلام کا خط ہے سب شہروں کے مسلمانوں کی طرف بیان کیا ہے اُس میں وہ قصہ جو اُن میں اور اہل صفین میں واقع ہوا۔ اور ابتدا ہمارے معاملہ کی یہ ہوئی کہ ہمارا اور اہل شام کے گروہ کا مقابلہ ہوا۔
والظاهر ان ربنا واحد ونبینا واحد ودعوتنا فی الاسلام واحدة۔	اور یہ امر ظاہر ہے کہ رب ہم دونوں کا ایک تھا نبی ہم دونوں کا ایک تھا اور دعویٰ ہمارا اسلام میں ایک تھا۔
لا نستزیدهم فی الایمان بالله والتصدیق برسوله صلی الله علیه وآله ولا یستزیدوننا	نہ ہم اُن میں زیادتی چاہتے تھے اللہ پر ایمان اور رسولؐ کی تصدیق میں اور نہ وہ ہم میں زیادتی چاہتے تھے۔
فالامر واحد الا ما اختلفنا فیه من دم عثمانؓ ونحن منه براء۔	پس معاملہ ایک تھا مگر جھگڑا پڑ گیا ہم میں خون عثمان پر اور ہم اُس سے پاک ہیں۔

اس قول سے صاف ظاہر ہو گیا کہ جناب امیر اور معاویہؓ میں کوئی

۱؎ شرح میثم مطبوعہ طہران جزو ۳۶۔

مذہبی اختلاف نہ تھا دین وایمان دونوں کا ایک تھا نہ معاویہؓ جناب امیر کے دین میں کوئی نقصان جانتے تھے نہ جناب امیر معاویہؓ کے دین میں کوئی نقصان سمجھتے تھے ۔ فقط خون عثمانؓ پر اختلاف تھا اور اسی کی لڑائی تھی مذہبی لڑائی نہ تھی ۔

یہ بھی ثابت ہوگیا کہ معاویہؓ اسی طرح مومن تھے جیسے جناب امیر پس ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم بدرجۂ اولیٰ مومن ہوں گے ۔

مسئلہ اعتقاد امامت کی ہرگز کوئی اصل نہ تھی ورنہ جناب امیر اپنا اور معاویہؓ کا دین ایک نہ بتاتے اگر انصاف کرو تو اسی قول سے اصول مذہب شیعہ کا بطلان بہت اچھی طرح ثابت ہوگیا ۔

یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ امیر معاویہؓ کو دعوی خلافت مقصود بالذات نہ تھا اور یہ لڑائی خلافت کے لیے نہ تھی اس لیے کہ جناب امیر نے لڑائی کا سبب خون عثمانؓ کے سوا کوئی اور نہ بتایا ۔

اب خطبۂ شقشقیہ کے اس فقرہ میں جو جناب امیر نے گروہ معاویہؓ کی طرف نافرمانی کا الزام لگایا اس کی تفصیل ہمارے اس بیان سے بہت اچھی طرح ظاہر ہوگئی ۔ اس میں شک نہیں کہ معاویہؓ کی کارروائی جناب امیر کی رائے کے خلاف تھی اسی وجہ سے جناب امیر نے اُن کی طرف نافرمانی کی نسبت کی ۔ مگر جس کام کا معاویہؓ نے قصد کیا تھا وہ بھی نیک نیتی پر مبنی تھا ۔ اگر اس میں اُن کے اجتہاد کی خطا ہو تو وہ معذور تھے ۔ اگر معاویہؓ کو جناب امیر کی مجبوری کی حالت معلوم ہوجاتی تو وہ اس طرح جنگ نہ کرتے بلکہ سب سے

پہلے جناب امیر کی مجبوری دفع کرنے کی کوشش کرتے ۔

وخرجت اخرون کانھم لم یسمعوا قول اللہ تعم تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۰ بلی واللہ لقد سمعوھا ووعوھا	اور دین سے نکل گئے دوسرے لوگ ۔ گویا کہ خوارج نے نہیں سُنا اللہ تعالیٰ کا یہ قول یہ آخرت کا گھر مقرر کرتے ہیں ہم اس کو ان کے لیے جو زمین میں نہ بڑائی چاہتے ہیں نہ فساد اور آخرت کی بھلائی پرہیزگاروں کے لیے ہے ۔ ہاں بخدا کہ خوارج نے اُسے سُنا تھا اور یاد رکھا تھا ۔
ولکنھم احلولت الدنیا فی اعینھم وراقھم زبرجھم	اور لیکن بھلی معلوم ہوئی دنیا ان کی آنکھوں میں اور لُبھایا اُن کو دنیا کی بہار نے
اما والذی فلق الحبۃ وبرء النسمۃ	ہاں قسم ہے اُس کی جس نے چیرا دانہ کو اور پیدا کیا انسان کو ۔
لولا حضور الحاضر	اگر نہ ہوتا حضور آنے والوں کا
وقیام الحجۃ بوجود الناصر و مآ اخذ اللہ تعالیٰ علی العلماء ان لا یقاروا علی کظۃ ظالم	اور قائم ہوجانا حجت کا بسبب مل جانے مددگاروں کے اور اگر اللہ کا یہ حکم نہ ہوتا کہ اُس نے واجب کردیا ہے علما[1] پر کہ راضی

[1] یہاں جناب امیر نے یہ فرمایا کہ علما کو جب مددگار ملیں تو مظلوموں کی دادرسی ان پر واجب ہے یعنی انصاف کرنے کے لیے خلافت قبول کرنا واجب ہے (باقی ص ۵۱۲ پر)

ولا سغب مظلوم - راضی نہ ہوویں ظالم کی سیری اور مظلوم کی بھوک پر۔

لالقیت حبلھا علٰی غاربھا البتہ ڈالتا میں ناقۂ خلافت کی رسّی اس کی پشت پر۔

اب جناب امیر اللہ کی قسم کھا کر یہ فرماتے ہیں کہ میں خلافت کو ہرگز پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اس مجبوری کی وجہ سے میں نے خلافت قبول کی کہ بہت سے بیعت کرنے والے جو حاضر ہوئے تو مجھ کو مددگار مل گئے اور اللہ نے علما پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ ظالم کی سیری اور مظلوم کی بھوک پر راضی نہ ہوجاویں بلکہ ضرور مظلوم کی دادرسی کریں پس مددگاروں کے مل جانے اور علماء پر مظلوموں کی دادرسی واجب ہونے کی وجہ سے خلافت کا قبول کرنا مجھ پر واجب ہوگیا اگر مجھ کو مددگار نہ ملتے یا علماء پر مظلوموں کی دادرسی واجب نہ ہوتی تو میں خلافت کو ہرگز قبول نہ کرتا بلکہ ناقۂ خلافت کی رسی اُس کی پشت پر ڈال دیتا اور میں اُس کی مُہار اپنے ہاتھ میں نہ لیتا۔

(بقیہ صلالہ) اور امیر معاویہ کو یہ خط لکھا تھا اُس میں یہ تھا کہ مہاجرین وانصار جس کو امام بناویں اسی کی خلافت سے اللہ راضی ہوگا۔ ان دونوں قولوں کا مطلب ایک ہے اس لیے کہ مہاجرین وانصار جس کو امام بنادیں گے وہ عالم ہوگا اور مہاجرین و انصار اس کے مددگار ہوں گے۔ اور جب یہ دونوں قول ایک ہیں تو ثابت ہوگیا کہ جو مضمون امیر معاویہ کو لکھا تھا وہ بطور الزام کے نہ تھا بلکہ درحقیقت جناب امیر کا یہی اعتقاد تھا ۱۲

جناب امیر نے قبول خلافت کے واجب ہونے کی وجہ نصِ امامت نہ بتائی بلکہ یہ وجہ بتائی کہ مددگاروں کے مل جانے کی صورت میں علما پر مظلوموں کی دادرسی واجب ہے۔ یہ ایک ایسی وجہ ہے کہ جناب امیر سے مختص نہیں بلکہ جس عالم کو مددگار مل جائیں اُس پر مظلوموں کی دادرسی واجب ہے۔ اسی دلیل سے خلفائے ثلثہ نے خلافت قبول کی تھی۔ پس جناب امیر کے اس قول سے خلافت خلفائے ثلثہ کی حقیقت بھی ثابت ہوگئی بلکہ یہ ثابت ہوگیا کہ ان میں سے ہر ایک پر خلافت کا قبول کرنا واجب تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی ثابت ہوگیا کہ معاویہؓ نے جو خونِ عثمانؓ کا انتقام لینا چاہا تھا وہ بھی ان پر واجب تھا اس لیے کہ مددگار اُن کے پاس موجود تھے پس وارثانِ عثمانؓ کی دادرسی اُن پر واجب تھی۔

اگر جناب امیر کے واسطے نص امامت موجود ہوتی تو قبول خلافت کی وجہ میں اوّل اسی کو ذکر کرتے اور یوں کہتے کہ میں نے خلافت اس لیے قبول کی کہ اللہ نے رسولؐ کے بعد مجھی کو خلیفہ مقرر کیا تھا اور رسولؐ یہی حکم دے گئے تھے کہ میرے بعد علیؑ کو خلیفہ بناؤ۔

بلکہ جو دلیل جناب امیر نے بیان کی وہ نص امامت کے مخالف ہے اس لیے کہ نص امامت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت جناب امیر کے سوا دوسرے کو خلافت کا قبول کرنا جائز نہ تھا اور اس دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر عالم پر بشرط مل جانے مددگاروں کے خلافت قبول کرنا واجب ہے۔

پس جس طرح اس خطبہ کے پہلے فقرہ سے مذہب شیعہ کا بطلان ثابت ہوگیا تھا جہاں جناب امیر نے حسب معنی مزعومی شیعہ اپنے مرتبہ اور علم سے استحقاق خلافت ثابت کیا تھا نہ نص سے اسی طرح اس آخر کے فقرہ سے بھی مذہب شیعہ باطل ہوگیا اس لیے کہ جناب امیر نے ایسی دلیل سے استدلال کیا جس سے نص امامت کی باطل ہوگئی۔

وذقت آخرها بكاس اولها

اور چکھا تا میں آخر خلافت کو کاسہ اول خلافت کا۔

یعنی جس طرح میں نے پہلی خلافت قبول نہیں کی تھی اسی طرح آخر خلافت قبول نہ کرتا۔

ولالفيتم دنياكم هذه اهون من عفطة عنز بين مجذوم

اور البتہ پاتے تم اپنی اس دنیا کو بے حقیقت زیادہ بکرے کے ناک کے پانی سے جو کسی جذامی کے ہاتھ میں ہو۔

یعنی اگر اس دلیل سے جس کو میں نے اول ذکر کیا خلافت کا قبول کرنا مجھ پر واجب نہ ہوگیا ہوتا تو تم اپنی اس سلطنتِ دنیا کو میرے نزدیک نہایت ذلیل اور بے حقیقت پاتے۔

اس قول میں جناب امیر نے خلافت کو سلطنتِ دنیا بتایا اور نہایت بے حقیقت ظاہر کیا اور گندی چیز سے اس کو تشبیہ دی۔ پس ظاہر ہوگیا کہ جناب امیر کو خلافت سے سخت نفرت تھی اور مجبوری کی حالت میں اس کو قبول کیا تھا۔ اگر جناب امیر کی خلافت کے لیے شارع کی طرف سے

نص ہوتی تو وہ اس کو سلطنتِ دنیا ہرگز نہ بتاتے اور نہ ایسی ذلیل چیز فرماتے۔ یہاں سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ یہ خلافت دینی امامت نہ تھی۔

یہ آخری فقرہ اس خطبہ کا ہے اس کے بعد رضی نے نہج البلاغت میں یہ لکھا ہے:-

قالوا وقام اليه رجل من اهل السواد عند بلوغه الى هذا الموضع من خطبته فناوله كتابا فاقبل ينظر فيه۔

کہتے ہیں کہ جناب امیر کے سامنے ایک گاؤں والا کھڑا ہوا جب وہ اپنے خطبہ میں اس فقرہ تک پہونچے تو ان کو ایک کاغذ دے دیا اس کو جناب امیر دیکھنے لگے۔

فلما فرغ من قراءته قال له ابن عباس لو اطردت مقالتك من حيث افضيت

جب وہ فارغ ہوئے تو ابن عباسؓ نے کہا کہ کاش اب بڑھاتے تم اپنے کلام کو جہاں سے چھوڑا ہے۔

فقال هيهات يا ابن عباس تلك شقشقة هدرت ثم قرت

تو جناب امیر نے فرمایا ہو چکا اے ابن عباس یہ ستی کے جھاگ تھے کہ اُنھوں نے جوش کھایا تھا اب وہ دب گئے۔

یعنی اے ابن عباسؓ مجھ کو اپنے گزشتہ دوست یاد آگئے تھے اُس جوش میں میں نے ان کا اس قدر ذکر کر دیا اب وہ جوش فرو ہوگیا۔

فقال ابن عباس فوالله ما

تو ابن عباسؓ نے کہا کہ خدا کی قسم مجھ کو

اسفت علی کلام قطع کاسفی علی ذلک الکلام ان لا یکون امیرالمومنین بلغ من حیث اراد -

کبھی کسی کلام پراتنا افسوس نہیں ہوا جتنا اس کلام پر ہوا کہ جناب امیر نے اپنے کلام کو وہاں تک کیوں نہ پہونچایا جہاں تک مقصود تھا۔

اب یہ خطبہ شقشقیہ تمام ہوا اور اس سے ظاہر ہوگیا کہ علمائے شیعہ جو جو اس خطبہ سے خلفائے ثلثہ کی بُرائی پراستدلال کرتے ہیں یہ استدلال صحیح نہیں بلکہ اسی طرح اس خطبہ سے خلفائے ثلثہ کی مدح پر استدلال ہو سکتا ہے اور جابجا اس خطبہ کے فقرات سے نص امامت کا بطلان ثابت ہوگیا جس سے مذہب شیعہ کی بنیاد اُکھڑ گئی۔

جناب امیر نے یہ خطبہ ناتمام چھوڑ دیا اگر پُورا کرتے تو جو معنی اس کے فقرات کے شیعوں نے تراشے ہیں ان کی گنجائش بھی باقی نہ رہتی۔

شاید اُن کے سکوت کی یہ وجہ ہوئی کہ جناب امیر نے جو وجہ خلافت کے قبول کر لینے کی فرمائی وہ اُن کے حق میں صحیح نہ تھی اور اس وجہ کے بیان کر دینے کے بعد اس کی غلطی اُن پر ظاہر ہوگئی ہوگی اس ندامت میں انہوں نے سلسلہ کلام کو قطع کر دیا۔

وجہ اس دلیل کے صحیح نہ ہونے کی یہ ہے کہ جناب امیر نے خلافت قبول کر لینے کا سبب یہ فرمایا کہ "مددگاروں کے ملنے کی صورت میں علماء پر مظلوموں کی دادرسی واجب ہوتی ہے اور مجھ کو مددگار مل گئے اس لیے

خلافت کا قبول کر لینا مجھ پر واجب ہوگیا اس مجبوری سے میں نے خلافت قبول کی ورنہ ہرگز قبول نہ کرتا اور اس کو نہایت ذلیل سمجھتا"۔

مگر جناب امیر سے مظلوموں کی دادرسی کچھ بھی نہ ہوسکی۔ نہ قاتلانِ عثمانؓ سے وہ قصاص لے سکے، نہ وہ عورتیں انھوں نے واپس دلائیں جو ظالموں نے اُن کے شوہروں سے ناحق چھین لی تھیں، بیت المال کو بھی اغنیاء کی دولت بنایا اور موافق طریقہ سُنت کے برابری کے ساتھ تقسیم نہ کیا۔ نہایت عجیب یہ ہے کہ قرآن پر عمل کرنے کا بھی حکم نہ کر سکے۔ یہ مطالب جناب امیر کے اس خطبہ سے ظاہر ہیں جو کافی کی کتاب الروضہ[1] میں مذکور ہے۔ اس کی تفصیل اس کتاب کی جلد اول میں گزر چکی اور کسی قدر ذکر اس کا جلد ثانی میں اسی خطبہ کی ابتدا میں ہے۔

اُس خطبہ میں جناب امیر نے حاضرین سے مخاطب ہو کر اس کا عذر یہ بیان کیا ہے کہ اگر میں ان باتوں کا تدارک کروں تو تم مجھ سے جدا ہو جاؤ گے جس کا حاصل یہ ہوا کہ میں تنہا رہ جاؤں گا اور خلافت مجھ سے چھن جائے گی۔ پس خطبہ شقشقیہ میں تو جناب امیر یہ فرماتے ہیں کہ میں نے خلافت اس لیے قبول کی کہ مظلوموں کی دادرسی مجھ پر واجب ہے اور اُس خطبہ میں یہ فرما چکے تھے کہ میں مظلوموں کی دادرسی اس لیے نہیں کرتا کہ خلافت مجھ سے چھن جائے گی۔

خطبہ شقشقیہ قصہ خوارج کے بعد بیان فرمایا ہے اس لیے کہ خوارج کا

---

[1] کتاب الروضہ کافی مطبوعہ لکھنؤ صـ۲۹

ذکر اُس میں موجود ہے وہ وقت جناب امیر کے آخر خلافت کا تھا اور اُس وقت اُن کو بخوبی ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ مظلوموں کی دادرسی نہیں کر سکتے بلکہ اس سے پہلے اپنی زبان سے کہہ چکے تھے کہ ہم مظلوموں کی دادرسی سے مجبور ہیں. پس ایسی دلیل جناب امیر نے کیونکر بیان کی جس کو وہ خوب جانتے تھے کہ ہرگز ان پر صادق نہیں آسکتی اور نہ آئندہ اس کی امید تھی اس لیے کہ اپنی موت کا وقت اُن کو معلوم تھا کہ بہت قریب ہے۔

جناب امیر نے مظلوموں کی دادرسی کے لیے یہ بے حقیقت اور گندی چیز اپنے لیے جائز سمجھ لی تھی اور جب مظلوموں کی دادرسی ممکن نہ ہوئی تو اب یہ گندی چیز کس دلیل سے جناب امیر کے لیے جائز تھی؟

اب حضرات شیعہ یہ بھی ارشاد فرماویں کہ جناب امیر نے مددگاروں کے مل جانے کا اقرار کیا اور یہی وجہ خلافت قبول کرنے کی بیان فرمائی۔ پس جس خلیفہ کے پاس مددگار موجود ہوں اُس کو ایسے ظلم باقی رکھنا اور اُن کا تدارک نہ کرنا کیوں کر جائز ہوگا؟

البتہ حضرات شیعہ کی طرف سے اس شبہ کا ایک جواب نہایت لطیف ہو سکتا ہے جس میں سارا قصہ فیصل ہو جاوے گا اور وہ یہ ہے کہ جناب امیر کو یہ اختیار حاصل تھا کہ جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں۔ پس ممکن ہے کہ جناب امیر نے اپنے اس اختیار جائز کے بموجب جن ظلموں کو باقی رکھا ان کو حلال کر دیا ہو۔

اصول کافی[1] میں امام محمد تقی علیہ السلام سے منقول ہے:۔

---

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنو ص۲۷۸ باب مولد النبی ۱۲

عن محمد بن سنان قال کنت عند ابی جعفر الثانی فاجریت اختلاف الشیعۃ

محمد بن سنان کہتا ہے کہ میں امام تقی علیہ السلام کی مجلس میں تھا تو میں نے شیعوں کے اختلاف کا ذکر کیا۔

علامہ خلیل قزوینی نے صافی میں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔

"مذکور ساختم اختلاف شیعہ امامیہ را در عمل بسبب اختلاف فتواہائے ائمہ"

یعنی اماموں نے جو مختلف فتوے دیے ہیں ایک ہی مسئلہ میں کبھی کچھ کہہ دیا ہے کبھی کچھ اور ائمہ کے ان مختلف فتووں کی وجہ سے جو شیعوں میں اختلاف پڑ گیا ہے اُس کا میں نے ذکر کیا۔

فقال یا محمد ان اللہ تبارک وتعالی لم یزل متفردا بوحدانیتہ

تو امام نے فرمایا کہ اے محمد بے شک اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے یکتا تھا اپنی وحدانیت میں۔

ثم خلق محمدا و علیا و فاطمۃ

پھر اُس نے پیدا کیا محمدؐ اور علی اور فاطمہ علیہم السلام کو۔

خلیل قزوینی نے اس کا ترجمہ یہ لکھا ہے:۔

"بعد ازاں آفرید محمدؐ و علیؓ و فاطمہؓ را مراد ایشاں و ائمہ اولاد ایشان ست۔"

یعنی اگرچہ اس حدیث میں ذکر فقط علیؓ اور فاطمہؓ کا ہے مگر ان کی اولاد کے ائمہ بھی مراد ہیں۔

فمكثوا الف دهر ثم خلق
جميع الاشياء فاشهدهم
خلقها واجرى طاعتهم عليها
وفوض امورها اليهم فهم
يحلون ما يشاءون ويحرمون
ما يشاءون ولن يشاءوا الا ان
يشاء الله

وہ اسی طرح رہے ہزار برس۔ پھر پیدا کیا
سب چیزوں کو اور دکھایا اُن تینوں کو
سب چیزوں کا پیدا کرنا اور جاری کی اطاعت
ان کی سب چیزوں پر۔ اور سپرد کرئے
کام اُن چیزوں کے اُن تینوں کو۔ پس
وہ حلال کرتے ہیں جس چیز کو چاہتے ہیں
اور حرام کرتے ہیں جس چیز کو چاہتے ہیں۔
اور نہیں چاہتے ہیں وہ مگر جو چاہے اللہ۔

اس حدیث سے چند فائدے حاصل ہوئے۔

اوّل یہ کہ ائمہ کو یہ اختیار تھا کہ جس حرام چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس حلال چیز کو چاہیں حرام کر دیں۔ اور محمد بن سنان نے جو شیعوں میں اختلاف کا ذکر کیا تھا اُس کا جواب امام محمد تقی علیہ السلام نے یہی دیا کہ شیعوں میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ائمہ کے فتووں میں اختلاف تھا اور ائمہ کے فتووں میں اس وجہ سے اختلاف تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے لے کر آخر امام تک معہ جناب سیدہ کے ہر ایک کو اختیار تھا کہ جس حلال چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس حرام کو چاہیں حلال کر دیں مثلاً محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جس چیز کو حرام کیا ہو علی علیہ السلام کو اختیار تھا کہ اُس کو حلال کر دیں اور علیؓ نے جس چیز کو حرام کیا ہو جناب سیدہ کو اختیار تھا کہ اُس کو حلال کر دیں اور یہی اختیار اُن تمام ائمہ کو حاصل تھے

اور اسی وجہ سے احکام ائمہ میں اختلاف پڑا۔

پس خطبہ مندرجہ روضہ کافی میں جن جن ظلموں کا ذکر ہے مثلاً مسلمانوں کی بیبیوں کو ناحق چھین لینا اور اُن سے زنا کرنا، بیت المال کو اغنیا کی دولت بنانا اور سُنت کے موافق تقسیم نہ کرنا، قرآن پر عمل نہ کرنا وغیرہ وغیرہ ان سب امور کو جناب امیر نے ضرور حلال کر دیا ہو گا اس لیے کہ جب امر ناجائز کو جائز کر دینے کا اختیار اُن کو حاصل تھا پھر جو ناجائز امور جناب امیر کو اپنے عہد خلافت میں جاری رکھنے پڑے اُن کو ناجائزی کی حالت میں کیوں رکھتے۔ اب اگر یہ شبہ ہو کہ اگرچہ جناب امیر جس حرام چیز کو چاہتے حلال کر سکتے تھے مگر اُن کا چاہنا اللہ کے چاہنے پر موقوف تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی تو نہیں ثابت ہوا کہ جناب امیر کے عہد میں اللہ نے یہ نہیں چاہا تھا شاید جناب امیر کو ظلم باقی رکھنے کے الزام سے بچانے کے لیے اس وقت اللہ نے یہی چاہا ہو۔ علاوہ اس کے یہ ایک ایسا مضمون ہے جو اللہ نے سب بندوں کے حق میں فرمایا ہے جس میں کافر بھی شامل ہیں وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اور نہیں چاہتے تم مگر وہی جو اللہ چاہے۔

دوسرا فائدہ اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ ائمہ پر اتباع قرآن و حدیث واجب نہ تھا بلکہ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنا ان کی خواہش پر تھا اور ظاہر ہے کہ جب حلال یا حرام کر دینے کا اختیار ان کو حاصل تھا اور تمام امور خلائق کے اُنھیں کے سپرد تھے پھر وہ دوسرے کا اتباع کیوں کرتے اور یہی وجہ ہو

کہ ائمہ اپنی حدیثوں کی سند رسول ؐ تک نہیں پہونچاتے شاید اسی وجہ سے
انھوں نے اپنے شیعوں کو اصلی قرآن نہ دیا اور قرآن محرف کی اصلاح نہ
کی اس لیے کہ جب حکم حلت و حرمت کا خود ان کو اختیار حاصل تھا پھر کیا
ضرور تھا کہ وہ اپنے شیعوں کو قرآن کا پابند کرتے اور اسی وجہ سے ہر امام
کی اطاعت واجب ہوئی اس لیے کہ اگر ائمہ کے سب احکام انھیں چیزوں
سے ماخوذ ہوتے جو رسول ؐ نے دی تھیں یعنی قرآن اور حدیث تو رسول ؐ کے
سوا کسی اور کی اطاعت واجب نہ ہوتی جیسا کہ قرآن میں جابجا فقط اللہ
اور رسول کی اطاعت کا حکم مذکور ہے اور اسی وجہ سے ہر امام خطا سے
معصوم سمجھا جاتا ہے اس لیے کہ اگر کسی شریعت کی پابندی واجب ہوتی
تو اس کی مخالفت کی صورت خطا سمجھی جاتی اور جب کسی قانون کی پابندی
اُن پر واجب نہیں بلکہ حکم حلت و حرمت اُن کے اختیار میں ہے پھر خطا
کی کیا صورت۔

تیسرا فائدہ اس حدیث کا یہ ہے کہ رسول اور امام میں کوئی
فرق باقی نہ رہا اور اگرچہ حضرات شیعہ لفظ رسول امام کے واسطے نہیں
بولتے مگر یہ فقط لفظی بحث ہے اس لیے کہ جو معنی رسول کے تھے وہ اس
حدیث کے بموجب ائمہ کے لیے ثابت ہوگئے۔ اس لیے کہ جس طرح محمد
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت واجب ہے اور ان کو یہ اختیار ہے
کہ جس چیز کو چاہیں حلال کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور
بندوں کے تمام امور ان کو سپرد تھے یہی صفت ہر امام کی تھی پس ہر امام

رسول مستقل تھا اور یہی صفات جناب سیدہ علیہا السلام کو بھی حاصل تھیں پس
اس امت کے لیے چودہ رسول مستقل ثابت ہوئے جو چہاردہ معصوم کے نام
سے مشہور ہیں اور ان چودہ رسولوں کے احکام میں اختلاف بھی ہے جیسا کہ بیان
سابق سے ظاہر ہو چکا۔

تعجب ہے کہ حضرات شیعہ جناب سیدہؓ کا نام فہرستِ ائمہ سے کیوں
خارج کرتے ہیں حالانکہ اس حدیث سے ثابت ہوگیا کہ اختیارات منصب
رسالت و امامت کے ان کو بھی وہی حاصل تھے جو جناب محمد صلے اللہ علیہ و
آلہ اور تمام ائمہ کو تھے۔ پس اس صورت میں دوازدہ امام کے عوض سیزدہ
امام کہنا چاہیے۔

مذہب شیعہ کے بانیوں نے یہ اختیارات ائمہ کو اس مصلحت سے
عطا کیے تھے کہ ائمہ کی طرف نسبت کر کے جس حرام کو چاہیں حلال کر لیں
اور اس مذہب کو اپنی نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے کا بہت عمدہ ذریعہ
بنا لیں۔

بلکہ یہاں تک قابو حاصل کر لیا کہ جو چیز قرآن میں بنص صریح حرام ہو
اُس کو بھی حلال کر لیں اور اگر کوئی شخص مخالفت قرآن کا اعتراض کرے تو اُس
اعتراض کے لیے دو جواب اُن کے پاس موجود تھے۔

ایک یہ کہ قرآن کا مطلب ائمہ کے سوا کوئی نہیں سمجھتا۔

دوسرے یہ کہ جو چیز قرآن میں حرام ہو اُس کے حلال کرنے کا ائمہ کو
اختیار ہے۔

چونکہ ائمہ کے نام سے حدیثوں کا تصنیف کر لینا اُن کا ایک معمولی کام تھا پس انھوں نے ایک ایسا مذہب بنا دیا جس میں نفسانی خواہشوں کے حاصل کرنے کی پوری آزادی حاصل رہے۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق اس مذہب کے مسائل پر غور کرنے سے بخوبی حاصل ہے۔

مثلاً ستر کا یہ مسئلہ کہ آگے کے ستر پر فقط ہاتھ رکھ لینا کافی ہے پیچھے کا ستر خود بخود چھپا ہوا ہے وہاں ہاتھ رکھنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس سے بڑھ کر امام پر یہ افترا کیا کہ وہ نورہ لگا کر حمام میں دوسروں کے سامنے بالکل برہنہ ہو جایا کرتے تھے (معاذ اللہ منہا) اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ہاتھ رکھنے یا نورہ لگانے کی قید فقط مسلمانوں کے ستر کے لیے ہے۔ کافروں کا ستر بغیر اس آڑ کے بھی دیکھنا جائز ہے اس لیے کہ وہ گدھے ہوتے ہیں پس اُن کے ستر کا بھی وہی حکم ہے جو گدھے کے ستر کا۔ تفصیل ان روایات کی جلد اول میں گزر چکی۔ یہ نمونہ مسائل مذہب شیعہ کا ہے جس پر تمام مذہب کا حال بخوبی قیاس ہو سکتا ہے۔

ہر منصف غور کر سکتا ہے کہ یہ مسائل کیسی نفسانی خواہشوں کے جوش میں بنائے گئے ہیں جب ان حضرات نے امام کو حمام میں غیروں کے سامنے برہنہ کر دیا تو پھر اور کیا باقی رہا۔ اے اللہ تو جانتا ہے کہ خاندان اہل بیت کے مقدس بزرگوں پر کیسے افترا کیے گئے۔ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ○

جو دلائل اس کتاب کی سب جلدوں میں یہاں تک ہم بیان

کر چکے وہ مسئلہ امامت کے باطل کرنے کو بہت کافی و وافی ہیں۔ مگر اب ہم حضرات شیعہ کے اُن دلائل پر بھی غور کرتے ہیں جن پر اس مسئلہ کے ثبوت کا مدار ہے۔

حضرات شیعہ نے فضول کوشش بہت کی مگر کسی طرح اس مسئلہ کو قرآن سے کچھ لگاؤ نہ ہو سکا۔ ہر چند بڑے بڑے منطقیوں نے عجیب عجیب مقدمات بے سر و پا ترتیب دیے مگر رکیک تاویلیں کسی طرح نہ بن سکیں۔ جب تحریف معنوی سے کام نہ چلا تو تحریف لفظی میں بہت کچھ کوشش کی جس کی تفصیل جلد اول میں گزر چکی مگر اللہ اپنے کلام کا محافظ تھا کسی طرح قرآن میں بڑھانے کی جرأت نہ پائی مجبور ہو کر کافی وغیرہ اپنی کتابوں میں اُن روایتوں کو درج کر لیا مگر اس کا نتیجہ یہی ہوا کہ قرآن میں تحریف کا دعویٰ کرنا پڑا تفسیر قمی کے مضامین ہم اول بحوالہ تفسیر صافی کے نقل کر چکے ہیں۔ اب ہم کو اصل تفسیر قمی[1] کا بھی ایک قلمی نسخہ میسر آگیا اس کے مقدمہ میں جو آیات قرآنی کی قسمیں بیان کی ہیں اُس میں یہ بھی لکھا ہے :-

---

[1] یہ کتاب بعنایت مسبب الاسباب اسی ہفتہ میں راقم الحروف کو میسر آئی ہے۔ میں نے اول ہی روز جو اس کو کھولا تو سورۂ توبہ میں آیۃ ثانی اثنین اذ ہما فی الغار کی تفسیر میں یہ روایت لکھی ہے۔ صاحب تفسیر قمی اپنے باپ کی سند سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کرتا ہے :-

قال لما کان رسول اللہ فی الغار قال لابی بکر کانی انظر الی سفینۃ	فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہ جب تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ غار میں (باقی ص ۵۲۶ پر)

ومنہ محرف ومنہ علی خلاف ما انزل اللہ

اور کچھ حصہ قرآن کا محرف ہے اور کچھ ایسا ہے جو مخالف اُس کے ہے جو اللہ نے اُتارا تھا۔

(بقیہ ص ۵۲۵) جعفر فی اصحابہ تقوم فی البحر، وانظر الی الانصار محتبین فی افنیتھم

تو انھوں نے ابوبکرؓ سے کہا کہ گویا میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ جعفر اور اُن کے ساتھیوں کی کشتی دریا میں کھڑی ہوتی ہے (جعفر طیارؓ نے اسی زمانے میں حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار میں تھے اس وقت جعفر بذریعہ کشتی کے سمندر کو طے کر رہے تھے) اور دیکھ رہا ہوں میں انصار مدینہ کو جو اپنے گھروں کے اندر ہیں۔

فقال ابوبکر وتراھم یا رسول اللہ، قال نعم قال فارنیھم، فمسح علی عینیہ فرأھم فقال رسول اللہ انت الصدیق۔

تو ابوبکرؓ نے کہا کہ کیا تم اُن کو دیکھ رہے ہو یا رسول اللہ رسولؐ نے فرمایا ہاں دیکھ رہا ہوں۔ ابوبکرؓ نے کہا مجھے بھی دکھاؤ۔ پھر رسولؐ نے ہاتھ پھیر دیا ابوبکرؓ کی آنکھوں پر تو ابوبکرؓ کو بھی وہ سب نظر آگئے۔ تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو صدیق ہے۔

صدیق ایک ایسا عالی مرتبہ قرب الٰہی کا ہے کہ بعد رسول کے صدیق کا مرتبہ ہوتا ہے پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکرؓ کو صدیق فرمایا (باقی ص ۵۲۷ پر)

اور دوسری جگہ خلاف ما انزل اللہ کی چند مثالیں لکھ کر آخر میں یہ لکھ دیا ہے ومثلہ کثیر یعنی اسی طرح خلاف ما انزل اللہ قرآن کی بہت سی آیتیں ہیں۔ پھر محرف کی چند مثالیں لکھ کر آخر میں لکھ دیا ہے ومثلہ کثیر یعنی اسی طرح تحریف بھی قرآن کی بہت سی آیتوں میں ہے۔

جب حضرات شیعہ کو اس کوشش میں ہر طرح ناکامی ہوئی اور کسی طرح مسئلہ امامت قرآن سے کوئی تعلق پیدا نہ کر سکا تو اسی جلن میں ان حضرات نے قرآن پر محرف اور خلاف ما انزل اللہ ہونے کا عیب لگایا۔

(بقیہ ص ۵۲۶) تو قرب الٰہی میں ان کا مرتبہ عالی بہت اچھی طرح ظاہر ہو گیا اور اس روایت سے معلوم ہو گیا کہ یہ خطاب ابوبکرؓ کو رسولؐ نے دیا تھا جو قیامت تک اُن کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔

غزوہ خیبر میں رسولؐ نے علیؓ کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر آشوب چشم کھو دیا تھا اور غار میں ابوبکرؓ کی آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر ان کو روشن ضمیر بنا دیا۔ رسولؐ کے ہاتھ نے علیؓ کے جسم پر اثر کیا تھا اور ابوبکرؓ کے قلب پر۔ اسی طرح اس غزوہ میں علیؓ کو کرار غیر فرار فرمایا یہ بھی ایک جسمانی کمال ہے اور ابوبکرؓ کو غار میں صدیق فرمایا یہ قلبی کمال ہے۔ غزوہ خیبر میں اس برکت کے نتیجہ میں علیؓ سے جو امر خارق عادت ظاہر ہوا وہ یہ تھا کہ ان کے بدن میں اتنی قوت آگئی کہ درۂ خیبر کو اکھاڑ لیا جو ایک آدمی کی قوت سے باہر کام تھا۔ ابوبکرؓ کی آنکھوں پہ جو رسولؐ نے ہاتھ پھیرا تو ان سے جو امر خارق ظاہر ہوا وہ یہ تھا کہ اُن کا قلب ایسا روشن ہو گیا کہ غار میں بیٹھے ہوئے مشرق و مغرب کی سیر کرنے لگے درحقیقت رسولؐ نے ابوبکرؓ کی آنکھوں پہ ہاتھ پھیر کر وہ تسکین نازل کی جس کا ذکر اللہ نے قرآن میں کیا ہے ۱۲

آخر حضرات شیعہ کو نہایت مجبوری کی حالت میں یہ بھی اقرار کرنا پڑا کہ مسئلہ امامت کا بیان قرآن میں نہیں بلکہ رسولؐ کی یہ آرزو بھی کہ کسی طرح یہ مسئلہ قرآن میں نازل ہوجائے اسی وجہ سے تبلیغ ولایت کے علم کو بار بار رد کرتے تھے۔

علامہ قزوینی نے صافی شرح کافی میں کتاب الحجۃ باب ما نص اللہ میں لکھا ہے:۔

میل رسولؐ آن بود کہ شاید کہ تصریح و تفسیر ولایت در قرآن شود و اکتفا بہ سنت نہ شود۔

اور رسولؐ کی خواہش یہ تھی کہ شاید تصریح اور توضیح ولایت علیؓ کی قرآن میں ہوجائے اور فقط حدیث پر یہ مسئلہ موقوف نہ رہے

اب اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے کہ حدیث سے یہ مسئلہ کس طرح، ثابت ہوتا ہے۔

حضرات شیعہ اہل سنت پر بڑے زور و شور کے ساتھ یہ حجت پیش کرتے ہیں کہ اہل سنت کی کتابوں میں موجود ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج سے واپس ہوتے تھے تو انھوں نے مقام خم میں ایک چشمہ کے کنارہ پر لوگوں کو جمع کیا اور علیؓ کی طرف اشارہ کر کے یہ کہا من کنت مولاہ فعلی مولاہ یعنی میں جس کا مولا ہوں علی رضؓ بھی اُس کا مولا ہے۔ یہی قول امامت علیؓ کی نص ہے یعنی اس قول میں پیغمبرؐ نے یہ حکم سُنا دیا کہ میرے بعد علیؓ کو امام بنانا۔

جواب یہ ہے کہ حضرات شیعہ مسئلہ امامت کو عین ایمان ٹھیراتے ہیں

اور نجات اُسی پر موقوف سمجھتے ہیں اور بغیر امامت اصطلاحی کے اعتقاد فضیلت علیؓ کو نجات کے لیے کافی نہیں سمجھتے پس ایسا ضروری مسئلہ بغیر دلیل قطعی کے ثابت نہیں ہوسکتا۔ یہ حدیث مناقب علیؓ میں مقبول ہے اس لیے کہ جس چیز کی فضیلت کسی دلیل یقینی سے معلوم ہوجائے اس کے مناقب میں ضعیف حدیث بھی مقبول ہوجاتی ہے۔

لیکن جب اس حدیث سے ایسا ضروری مسئلہ ثابت کرنا مقصود ہے تو ضرور ہے کہ اس حدیث کے مرتبہ صحت پر غور کیا جائے۔

محدثین اہل سنت کا اس حدیث کے ثبوت میں اختلاف ہے۔ اکثر کا قول ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں لکھا ہے:۔

اما قولہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ فلیس فی الصحاح لکن ھو مما رواہ العلماء و تنازع الناس فی صحتہ۔

رسولؐ کا قول من کنت مولاہ فعلی مولاہ صحیح حدیثوں میں شامل نہیں۔ لیکن وہ اس قسم کی حدیثوں میں سے ہے کہ علماء نے اس کی روایت کی ہے اور لوگوں نے اس کی صحت میں اختلاف کیا ہے۔

فنقل عن البخاری وابراھیم الحربی وطائفۃ من اھل العلم بالحدیث انھم طعنوا فیہ و ضعفوہ۔

چنانچہ بخاری اور ابراہیم حربی اور علمائے حدیث کے ایک گروہ سے یہ منقول ہے کہ انھوں نے اس حدیث میں طعن کیا ہے اور اُس کو ضعیف بتایا ہے۔

قال ابو محمد بن حزم و اما من کنت مولاہ فعلی مولاہ فلا یصح من طریق الثقات اصلا

ابو محمد بن حزم کا قول ہے کہ حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ نہیں ثابت ہوئی سند ثقات سے ہرگز۔

علامہ اصفہانی نے مطالع الانظار میں لکھا ہے:-

واما قولہ صلی اللہ علیہ وسلم من کنت مولاہ فعلی مولاہ فھو من باب الاحاد - وقد طعن فیہ ابن ابی داؤد و ابو حاتم الرازی وغیرھما من ائمۃ الحدیث

اور لیکن قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا من کنت مولاہ فعلی مولاہ قسم اخبار احاد سے ہے۔ اور بے شک اس حدیث میں طعن کیا ہے ابن ابی داؤد اور ابو حاتم رازی اور ان دونوں کے سوا اور ائمہ حدیث نے۔

علامہ اسحٰق ہروی نے سہام ثاقبہ میں لکھا ہے:-

وقد قدح فی صحۃ الحدیث کثیر من ائمۃ الحدیث کابی داؤد و الواقدی و ابن خزیمۃ وغیرھم

اور بے شک طعن کیا ہے اس حدیث کی صحت میں بہت سے ائمہ حدیث نے جیسے کہ ابو داؤد اور واقدی اور ابن خزیمہ وغیرہ نے۔

ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں لکھا ہے:-

الطاعنون فی صحتہ جماعۃ من ائمۃ الحدیث وعدولہ المرجوع الیھم فیہ کابی داؤد

طعن کرنے والے اس حدیث کی صحت میں فن حدیث کے ایسے ائمہ اور معتبر لوگوں کی جماعت ہے جن کی طرف

السجستانی و ابی حاتم الرازی۔

حدیث میں رجوع کیا جاتا ہے جیسے ابو داؤد السجستانی اور ابی حاتم الرازی۔

اگر فقط اصحاب صحاح ستہ کو دیکھا جائے تو صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور سنن ابو داؤد اور سنن نسائی میں اس حدیث کا ذکر نہیں فقط سنن ترمذی اور سنن ابن ماجہ میں یہ حدیث بہ تغیر الفاظ مذکور ہے۔

ابن ماجہ نے اس حدیث کی حالت سے سکوت کیا ہے۔ ترمذی نے حسن غریب کہا حسن کے لفظ سے صحت کی نفی ہوگئی اور لفظ غریب ایک قسم کی جرح ہے۔ بہرحال ترمذی اور ابن ماجہ کے مقابلہ میں بخاری اور ابو داؤد ضعیف کہنے والے ہیں۔

سوائے اصحاب صحاح ستہ کے جو اور محدثین ہیں ان میں بھی اسی طرح اختلاف ہے چنانچہ عبارات منقولہ سابق سے ظاہر ہو گیا کہ بخاری اور ابو داؤد کے سوا ابراہیم حربی اور ابن حزم اور ابن ابی داؤد اور ابو حاتم رازی اور واقدی اور ابن خزیمہ اور حافظ ابن تیمیہ اور ان کے سوا ایک جماعت ائمہ محدثین کی اس کو ضعیف کہنے والی ہے۔

پس جس حدیث کی صحت میں ایسا اختلاف ہو اس سے ایسا مسئلہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے جو عین ایمان ہو اور جس پر نجات موقوف ہو۔ البتہ اس حدیث کی بہت سے محدثین نے تخریج کی ہے اور اپنی کتابوں میں اس کو ذکر کیا ہے جن کے نام عبقات میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ فقط یہی ہے کہ مناقب میں ضعیف حدیث بھی مقبول ہوتی ہے اور جن لوگوں

نے فقط تخریج پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے صحیح یا حسن ہونے کی بھی تصریح کی ہے ان کے مقابلے میں ضعیف کہنے والوں کا مرتبہ بڑھا ہوا ہے۔

جب اس حدیث کی صحت میں ایسا اختلاف ثابت ہو گیا تو آئندہ اور جواب کی ہم کو ضرورت نہ تھی مگر ہم اس بحث سے قطع نظر کر کے اس حدیث کے معنی میں بھی غور کرتے ہیں۔ لفظ مولیٰ کے بہت سے معنی ہیں منجملہ اس کے بھائی اور دوست اور مددگار اور ہم سوگند کو بھی مولیٰ کہتے ہیں۔ ہم سوگند کے معنی یہ ہیں کہ دو شخص آپس میں دوستی اور مددگاری کا معاہدہ کر لیں تو وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے مولے کہلاتے ہیں ان معانی میں سے ہر معنی اس حدیث میں بہت اچھی طرح بن سکتے ہیں اور ان سب معانی کو محبوبیت کے معنی لازم ہیں پس ظاہر معنی حدیث کے یہ ہیں کہ میں جس کا پیارا ہوں علیؓ بھی اس کا پیارا ہے اور اس کے بعد جو رسولؐ نے فرمایا کہ اے اللہ محبت کر اس سے جو علی سے محبت کرے اور دشمنی کر اُس سے جو علیؓ سے دشمنی کرے یہ بہت ظاہر قرینہ اس بات کا ہے کہ اس حدیث میں حضرت علیؓ کی محبت کا حکم ہے اور یہ ہمارا عین مدعا ہے اس سے شیعوں کا مطلب کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا اور جب اس حدیث کے یہ معنے بہت اچھی طرح بن سکتے ہیں اور ہمارے مقصود کے مطابق ہیں تو اب کیا وجہ کہ بے دلیل ہم کوئی دوسرے معنی اختیار کریں اور جب تک حضرات شیعہ کسی دلیل سے اس معنی کو باطل نہ کریں تب تک ہم کو اور بحث کی ضرورت نہیں اور اب کوئی حجت شیعوں کی باقی نہ رہی۔

اب ہم اس بحث سے بھی قطع نظر کرتے ہیں اور جو معنی حضرات شیعہ اختیار کرتے ہیں اُس پر غور کرتے ہیں۔

شریف مرتضیٰ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مولے بمعنی اولے بھی آتا ہے اور یہاں وہی مراد ہے اور اولے سے اولے بالحکومت مراد ہے پس معنی یہ ہوئے کہ میں جس کے لیے اولے بالحکومت ہوں علیؓ بھی اُس کے لیے اولے بالحکومت ہے۔

مگر یہ معنی کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتے اس لیے کہ مولے بمعنی مطلق اولی مستعمل نہیں بلکہ کوئی صیغہ مفعل کا بمعنی افعل نہیں آتا البتہ مولیٰ جب ظرف کا صیغہ مانا جاتا ہے تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کے معنی ایسے مکان کے ہوتے ہیں جو کسی چیز کے لیے بہ نسبت اور مکانوں کے اولی ہو بعض محققین اس معنی کو بھی دعوئے بے دلیل بتاتے ہیں اس لیے کہ اشعار عرب میں کوئی ایسی مثال نہیں ملی جہاں مولیٰ کے معنی میں مکان کے ساتھ اولویت کی صفت ضرور لگانا پڑے بغیر اس کے معنی نہ بن سکتے ہوں اُن کے مقابلہ میں بغیر کسی ایسی مثال کے بعض علماء کے اقوال پیش کرنا ہرگز کافی نہیں اس لیے کہ وہ انھیں اقوال کو دعویٰ بے دلیل کہتے ہیں۔

مگر ہم اس قصہ کو بڑھانا نہیں چاہتے اور اس بحث سے قطع نظر کر کے مطابق اقوال بعض علما کے اتنی بات تسلیم کرتے ہیں کہ مولے جب ظرف کا صیغہ مانا جاوے تو ایسے مکان کے معنی میں ہوتا ہے جو کسی چیز کے لیے بہ نسبت اور مکانوں کے اولے ہو مگر یہ معنی شیعوں کو کیا مفید ہوں گے

اس لیے کہ مکان اولیٰ کے معنی اس حدیث سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔

یہ لطیفہ بھی سننے کے لائق ہے کہ جناب مولوی حامد حسین صاحب مشہور مناظر لکھنوی نے عبقات میں بڑے زور و شور سے یہ دعوی کیا ہے کہ مولے بمعنی اولے کے کلام عرب میں شائع و ذائع ہے اور اس کے ثبوت میں فراء، زجاج، اخفش، جوہری، صاحب کشاف، بیضاوی، خفاجی، صاحب جمل وغیرہ وغیرہ بیسیوں علماء کے اقوال نقل کر دیے اور اُن علماء کے مناقب و مدائح دفتر کے دفتر لکھ دیے الحمد للہ علیٰ ذلک۔ لیکن ان تمام اقوال سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مولیٰ بمعنی مکان اولیٰ آتا ہے پس دعویٰ تو مطلق اولیٰ کا تھا اور دلیل سے مکان اولیٰ ثابت ہوا اس لیے دلیل مثبت مدعا نہ ہوئی۔

اب اگر حضرات شیعہ یہاں اس معنی کو پسند کریں جو مولوی حامد حسین صاحب کی نہایت کوشش اور کمال جد و جہد سے ثابت ہوئے تو حدیث کے معنی یہ ہو گئے کہ میں جس کے تصرف کا محل بننے کے لیے اولیٰ ہوں علیؓ بھی اس کے تصرف کا محل بننے کے لیے اولے ہے۔ پس رسولؐ اور علیؓ کو بجائے حاکم کے محکوم بنا دیا اب حضرات شیعہ کو چاہیے کہ مولوی حامد حسین صاحب کی کوشش کے بڑے شکر گزار رہوں کہ انھوں نے اس حدیث کے معنی بہت اچھے پیدا کر دیے ذلك مبلغهم من العلم۔

کتاب عبقات جس پر حضرات شیعہ کو بڑا فخر ہے اُس میں بحث حدیث ولایت دو حصوں میں ہے اور ہر حصہ دو مجلدوں پر شامل ہے اور

فرع رد عبقات مصنفہ مولوی حامد حسین صاحب لکھنوی بقدر ضرورت متعلق بحث ولایت بخوف تطویل لاطائل۔

ان چاروں جلدوں میں ایک خروار وزن ہے۔ حسب اتفاق اسی مہینے میں راقم الحروف نے بنظر سرسری اُس کے حصۂ ثانی کی جلد اول کو دیکھا تو یہ معلوم ہوا کہ اس کا حاصل اور لب لباب فقط اسی قدر ہے جو یہاں چند سطروں میں بیان ہوا۔ بڑی کوشش اُس میں مولیٰ کو بمعنی اولیٰ ثابت کرنے میں کی گئی ہے مگر مصنف عبقات نے دعویٰ یہ کیا کہ مولیٰ بمعنی مطلق اولیٰ کے آتا ہے اور جوہری اور کشاف اور بیضاوی وغیرہ کی عبارتیں جو نقل کیں وہ صاف ظاہر کر رہی ہیں کہ مولیٰ جب ظرف مکان کا صیغہ مانا جاوے تو محل اولیٰ کے معنی میں آتا ہے۔ اس موقع پر مولوی حامد حسین صاحب نے کم فہمی کی وجہ سے ایسی ٹھوکر کھائی کہ حدیث کے معنی اُلٹے ہو گئے اور وہ نہ سمجھے پیغمبر کو بجائے حاکم کے محل اولیٰ بالتصرف یعنی محکوم بنا دیا اور اُن کو خبر نہ ہوئی۔ ایمان ثابت کرنے کے لیے لفظ مولے کے وہ معنی اختیار کیے جس نے اس حدیث میں کفر کے معنی پیدا کر دیے اور نص امامت کو نص کفر بنا دیا مگر معتقدین مصنف عبقات کو آج تک اس کتاب پر بڑا ناز ہے اور سب کے سب وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ کے نشے میں سرشار ہیں۔

بڑی طوالت اس کتاب میں یہ ہے کہ علمائے اہل سنت کے مناقب بہت سے لکھے ہوئے ہیں۔ جس طرح اللہ دین کی تائید دشمنان دین سے کرا دیتا ہے اور حضرت موسیٰ کو فرعون کے گھر میں پرورش کرا دیا اسی طرح یہ بھی اللہ کی قدرت تھی کہ علمائے اہل سنت کے مناقب اور فضائل کا ذخیرہ ایک شیعہ نے بڑی محنت سے جمع کیا اور بصرف کثیر چھپوایا اور عوام شیعہ اس کو اہل

سنت کا رد سمجھ کر گراں قیمت سے خرید کر کے اپنے کتب خانوں میں محفوظ
رکھتے ہیں۔

حالانکہ اہل سنت کا جس قدر اس میں رد ہے اُس کا نمونہ ہم ظاہر
کر چکے۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

صاحب عبقات نے جو مولیٰ کو بمعنی اولیٰ ثابت کرنے کی کوشش
کی ہے اُن کا تمام استدلال دو امروں پر ہے :۔

ایک یہ کہ قرآن میں جو یہ آیت سورۂ حدید میں ہے :۔
مَأْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ٹھکانا تمہارا آگ
ہے وہ تمہاری مولا ہے اور بُرا ٹھکانا ہے۔ اس آیت میں لفظ مولاکم کی تفسیر
میں مفسرین چند اقوال لکھا کرتے ہیں کہ مولا بمعنی مددگار ہے یا بمعنی دوست
ہے یا بمعنی متولی ہے من جملہ اُس کے یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ مکان تمہارے لیے
اولےٰ ہے۔

فقط اتنی بات سے صاحب عبقات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان مفسرین
نے مولیٰ کو بمعنی اولےٰ لکھا اور یہ خیال نہ کیا کہ مطلق اولےٰ کے معنی میں نہیں
لیا بلکہ اس کو صیغۂ اسم مکان مان کر مکان اولےٰ کے معنی میں لیا اور یہ معنی
حدیث من کنت مولاہ میں صحیح نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ زجاج، فراء، ابو
عبیدہ، اخفش، ثعلبی، واحدی، زمخشری، صاحب کشاف، ابن جوزی،
نیشاپوری، بیضاوی، ابن سمین، صاحب مدارک، جلال محلی، خفاجی،

سلیمان جمل وغیرہ بہت سے محققین اور مفسرین کے اقوال معہ اُن کے
مدائح اور مناقب کے نقل کر دیے۔ ان سب نے مولاکم کی تفسیر یہ
کی ہے کہ آگ ایسا مکان ہے جو تمہارے لیے اولیٰ ہے اسی وجہ سے
صاحب عبقات نے ان سب کی طرف یہ نسبت کر دی کہ یہ سب
مولیٰ کو بمعنی اولےٰ مانتے ہیں۔ اگرچہ مکان کے معنی ان سب مفسرین کی
عبارت سے ظاہر ہیں مگر خفاجی اور سلیمان جمل کی عبارتیں جو عبقات میں
منقول ہیں اس میں یہ مضمون نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھا دیا گیا
ہے۔

دوسرا استدلال ان کا یہ ہے کہ سبعہ معلقہ میں ایک قصیدہ
لبید شاعر کا شامل ہے جس کا ایک مصرع یہ ہے مولی المخافۃ خلفہا وامامہا
اس عربی مصرعہ کا فارسی ترجمہ یہ مصرعہ ہے ؎

موضع خوف ست پس و پیش اُو

اس کی شرح میں جوہری نے صحاح میں مولیٰ کا ترجمہ اولیٰ موضع
لکھا ہے اسی طرح اور علماء نے اس کی شرح میں یہ معنی لکھ دیے ہیں کہ
مولی المخافۃ کے معنی یہ ہیں کہ ایسا مقام جو خوف کے لیے اولےٰ ہو فقط
اتنی بات پر صاحب عبقات نے جوہری اور تمام شارحین کی طرف یہ
نسبت کر دی کہ ان سب نے مولیٰ کو بمعنی اولیٰ لیا ہے حالانکہ اُن سب
کی مراد یہ ہے کہ ایسا محل جو خوف کے لیے اولیٰ ہو۔

اب ناظرین میرے اس بیان کی تصدیق کے لیے عبقات کی

اس موقع پر حضرات شیعہ کا عجز قابل تماشہ ہے وہ اس با
خواہ مخواہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس حدیث کے الفاظ حضرت علیؓ کی اما
کو ثابت نہیں کر سکتے اور مولیٰ کے معنی اگر اولےٰ کے لیں تب بھی یہ نا
نہیں آتا کہ اولےٰ بالحکومت مراد ہو مگر یہ کہتے ہیں کہ اس حدیث سے خار
ادھر اُدھر کی انگلیں ملائی جائیں تب یہ ثابت ہو گا کہ اولیٰ سے اولیٰ بالحکومت
مراد ہے۔

اب حضرات شیعہ ذرا انصاف کریں کہ رسول صلی اللہ علیہ
وسلم جو افصح العرب تھے اُن کی گویائی نص امامت کے بیان کرنے میں ایسی
بند ہو گئی کہ صاف صاف اس مطلب کو اس طرح ادا نہ کر سکے جس میں
کچھ جھگڑا باقی نہ رہتا جو لفظ ان کی زبان سے نکلے وہ ایسے لفظ تھے جس
میں بیسیوں احتمال موجود۔ ایسا ضروری مسئلہ جس پر نجات موقوف ہو
اور اللہ کی طرف سے اُس کی تبلیغ کی اتنی تاکید اور پھر اس کے ادا کرنے
میں رسول ؐ کو ایسے الفاظ یاد نہ آئے جن سے مطلب کی ایسی وضاحت ہو
جاتی کہ دوسرا احتمال باقی نہ رہتا۔

پس یہ کیسی نص امامت ہے
اولیٰ ادنے

جلد ثانی کے حصہ اول کو دیکھیں اور ان کی حقیقت معلوم کر لیں۔

اب حضرات شیعہ یہ فرمائیں کہ مولوی حامد حسین صاحب یہ کیوں
نہ سمجھے کہ دعویٰ اُن کا یہ تھا کہ مولیٰ بمعنی اولےٰ آتا ہے اور جو عبارتیں انھوں
نے نقل کیں جن کے نام ہم بتا چکے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولیٰ جب اسم
مکان مانا جائے تو محل اولےٰ کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے پس جو دلیلیں انھوں
نے بیان کیں اُن سے اُن کا دعویٰ ہرگز نہ ثابت ہوا اور انھوں نے یہ خیال
کیوں نہ کیا کہ حدیث من کنت مولاہ میں محل اولےٰ یا التصرف کے معنی
کسی طرح نہیں بن سکتے بلکہ خلاف مقصود معنی پیدا ہو جاتے ہیں یہ ایک
ایسی غلطی ہے جو ادنیٰ طالب علم سے بھی نہ ہوگی اور اگر حضرات شیعہ کی یہی
خواہش ہے کہ پیغمبرؐ اور علیؓ کو محل حکومت بنانے کے لیے اولےٰ سمجھیں اور
اسی کفر کو ایمان ٹھہرائیں تو ان کو اختیار ہے مولوی حامد حسین صاحب کو
بہت سی دعائیں دیں کہ انھوں نے اس معنی کو بہت اچھی طرح ثابت
کر دیا۔

اب ہم اس بحث سے بھی قطع نظر کرتے ہیں اور یہی معنی تسلیم کیے
لیتے ہیں کہ مولےٰ بمعنی اولےٰ بھی آتا ہے اور محل کے معنی اس کے ساتھ نہیں
ہوتے تب بھی تو شیعوں کا مطلب نہیں ثابت ہوتا اس لیے کہ یہ کیا
ضرور ہے کہ اولےٰ سے اولےٰ بالحکومت مراد لیں بلکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ اولیٰ
بالمحبۃ یا اولیٰ بالتعظیم مراد ہو اور جب تک حضرات شیعہ
نہ کر دیں گے ان کا استدلال کسی طرح

ساتھ ملا کر حضرات شیعہ اس حدیث کو نص امامت بنانا چاہتے ہیں اور اولیٰ سے اولیٰ بالحکومت مراد لیتے ہیں۔ مگر اول چند باتیں بطور تمہید کے سمجھ لیجیے۔

قدمائے شیعہ اکثر تقیہ کی حالت میں رہتے تھے اور اپنے اعتقاد تعصب اور غلوئے رفض کو چھپا کر سُنی بنتے تھے اور اہل سُنت کو دھوکا دینے کے لیے قصداً ان سے روایتیں بیان کیا کرتے تھے چنانچہ کسی قدر پتہ اس فریب دہی کا شیعوں کی کتابوں سے بھی ملتا ہے۔ مجالس المومنین میں بحوالہ مختار کشی کے فضل ابن شاذان کا جو شیعوں کا بڑا معتمد راوی ہے یہ قول لکھا ہے :۔

بسیارے از اصحاب خود را دیدہ بودم کہ چوں استماع علم عامہ و علم خاصہ کردند ہر دو را باہم مخلوط ساختند تا آنکہ حدیث عامہ را از خاصہ روایت نمودند و حدیث خاصہ را از عامہ۔

میں نے بہت سے اپنے ہم مذہبوں کو دیکھا ہے کہ جب انھوں نے سُنی اور شیعہ دونوں کا علم حدیث حاصل کیا تو دونوں کو باہم ملا دیا۔ انھوں نے یہاں تک کیا کہ سُنیوں کی حدیثیں شیعوں سے بیان کیں اور شیعوں کی حدیثیں سُنیوں سے بیان کیں۔

اس بیان سے صاف ظاہر ہو گیا کہ شیعہ راویوں نے کس طرح مذہب کو خلط ملط کیا اور شیعوں کی حدیثیں سُنیوں میں اور سُنیوں کی حدیثیں شیعوں میں داخل کر دیں۔ شیعوں کے پاس جو سُنیوں کی

حدیثیں پہونچیں اُن کے ذریعہ سے انھوں نے ان عقائد و مسائل جو اپنے واسطے ایجاد کر لیے تھے باقی تمام مذہب مرتب کیا۔ سُنـ
جو شیعوں کی حدیثیں آئیں اُن سے بڑا نقصان یہ پہونچا کہ آ
انھیں حدیثوں کو ہمارے مقابلے حجۃً پیش کرتے ہیں اور یوں کہـ
حدیثیں تمھاری کتابوں میں موجود ہیں۔

بہرحال اس قول سے اتنا مطلب ہمارا ثابت ہو گیا کہ راوی دھوکا دے کر سُنیوں میں اپنی حدیثیں پہنچایا کرتے تھے ا
سُنیوں نے دھوکا کھا کر ان کی حدیثیں یاد کر لیں اور ان کی ر
کرنے لگے۔ بڑی وجہ دھوکا کھانے کی یہ ہوتی تھی کہ اُن کو اگرچہ وہ شـ
تھے مگر شیعہ تبرائی نہیں سمجھتے تھے۔

یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ زمانہ قدیم میں اہل سُنت کا بھی
شیعہ کہلاتا تھا اور ان کا مذہب فقط یہ تھا کہ وہ حضرت علیؓ کو تما
افضل سمجھتے تھے مگر کسی صحابی کو بُرا نہیں کہتے تھے اور خلفائے ثلٰثہ اور تمام صحابہ کی فضیلت کے معتقد تھے۔

دوسرا فرقہ شیعہ کے نام سے اہل بدعت کا تھا مگر ان کی قدر تھی کہ امیر معاویہؓ اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ سے بدظنی رکھتے کے سوا تمام عقائد میں اہل سُنت سے موافق تھے اور شیخینؓ کے اور باقی تمام صحابہؓ کے فضائل کے معتقد تھے۔ صحیحین میں جو شیعہ ہیں وہ اسی قسم کے شیعوں کی ہیں۔ تبرائی شیعوں کی ہرگز کوئی

میں نہیں ہے۔

پس تبرائی شیعوں نے جو تقیہ کر کے اہل سنت کو دھوکا دینا چاہا اور اپنی بنائی ہوئی حدیثوں کی روایت شروع کی تو بعض نے اس وجہ سے دھوکا کھایا کہ ان کو تبرائی نہ سمجھے بلکہ اس قسم کا شیعہ سمجھے جن سے حدیثیں لی جاتی تھیں۔ انھیں خرابیوں کے رفع کرنے کے لیے محدثین نے حدیثوں کو خوب پرکھا اور صحیح حدیثوں کی دو کتابیں صحیح بخاری اور صحیح مسلم تالیف کیں۔ اور ان کے بعد سنن اربعہ کا مرتبہ ہے۔ انھیں کتابوں پر اہل سنت کے دین کا دار و مدار ہے اسی قسم کی کتاب موطا بھی ہے۔ ان مصنفین کی اس تالیف سے یہ غرض تھی کہ ان حدیثوں پر اہل سنت عمل کریں اور ان کو معتمد سمجھیں ان کے علاوہ بھی محدثین نے حدیث کی کتابیں دوسری غرض سے بھی جمع کیں اُنھوں نے یہ کیا کہ ہر قسم کی حدیثیں معہ سند کے لکھ دیں اور ان کی تحقیق نہ کی یہ کوشش انھوں نے اس لیے کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی حدیث صحیح جو ابھی کتابوں میں نہ آئی ہو تلف ہو جائے ان کو یہ خیال تھا کہ انھیں سنگریزوں میں کچھ جواہرات بھی نکل آویں گے انھوں نے معہ سند کے ہر قسم کی حدیثیں لکھ دیں تاکہ سند کو دیکھ کر اور راویوں کی تحقیق کر کے علما ان حدیثوں کو پرکھ لیں اور صحیح و سقیم میں امتیاز کریں۔ پس اُنھوں نے وہ کتابیں اس لیے جمع نہیں کیں کہ ان کی روایتوں پر بغیر تحقیق کے عمل کیا جائے بلکہ اس لیے جمع کی تھیں کہ علما ان حدیثوں کی جانچ کر کے معتمد حدیثیں منتخب کر لیں چنانچہ بتوفیق الٰہی علما نے یہی کیا اور ان میں سے

جو معتمد حدیثیں تھیں وہ نکال لیں۔ اسماء رجال اور اصول حدیث کے علوم اسی کام کے لیے مرتب ہوئے۔ البتہ بعض مصنفین ایسے بھی ہوئے کہ انھوں نے حدیثوں کی تحقیق کا زیادہ اہتمام نہ کیا اور بعض غیر معتمد حدیثیں بھی اُن کتابوں سے لے لیں اور اپنی تصنیفات میں درج کر دیں۔ پس اکثر حدیثیں جو حضرات شیعہ اہل سنت کے مقابلہ میں پیش کرتے ہیں وہ اسی قسم کی حدیثیں ہیں جو تبرائی شیعوں کی روایتوں سے آگئیں اور جن کتابوں کی وہ حدیثیں ہوتی ہیں وہ اسی قسم کی کتابیں ہیں جن میں ہر قسم کی حدیثیں جمع کی گئی تھیں اور جب اُن کتابوں سے معتمد حدیثیں اہل علم نے چھانٹ لیں تو اُس کے بعد وہ کتابیں رواج سے متروک ہو گئیں اور اب اُن کا وجود بھی شاذ و نادر باقی ہے اور اُن روایتوں کو بھی حضرات شیعہ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سند کا ذکر نہیں کرتے تاکہ راویوں کا حال نہ کھلے پھر بھلا ایسی حدیثیں اہل سنت کے مقابلے میں حجت کیونکر ہو سکتی ہیں اور کوئی ضروری مسئلہ دین کا ایسی حدیثوں سے کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔

آمدم بر سر مطلب، حدیث ولایت کو نص امامت بنانے کے لیے جو قرائن حضرات شیعہ نے تجویز کیے ہیں وہ چند ہیں:۔

اول یہ کہ آیت يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اے رسول پہونچا دے جو حکم نازل ہوا تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے اور اگر تو ایسا نہ کرے گا تو تو نے اپنے

رب کی رسالت نہیں پہونچائی اور اللہ بچاوے گا تجھ کو آدمیوں سے" اُسی
دن نازل ہوئی تھی جس روز مقام خم میں رسولؐ نے حدیث من کنت مولاہ
ارشاد فرمائی تھی۔

جواب یہ ہے کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ آیت اُسی دن اُتری
تھی اور یہ بھی مان لیں کہ حضرت علیؓ کے باب میں اُتری تھی تب بھی تو اس
آیت کے ملانے سے حدیث من کنت مولاہ نص امامت نہیں بن
سکتی۔ شیعوں کا مطلب تو جب ثابت ہوتا جب اس آیت میں یہ
مطلب ہوتا کہ امامت علی کا حکم سُنادو اور اُس کے مطابق رسولؐ اس حکم
کو بیان فرماتے اور جب اس آیت سے کچھ بھی نہ نکلا کہ کون سا حکم مراد ہے
پھر حضرات شیعہ اس سے کیا ثابت کر سکتے ہیں ظاہر ہی ہے کہ یہ آیت
کسی ایک حکم سے مختص نہیں بلکہ ہر حکم الٰہی کی تبلیغ کی تاکید ہے یعنی اے پیغمبر
جو حکم نازل ہو اس کو پہونچا دے۔

تماشا یہ ہے کہ جس اللہ نے تمام مسائل ایمانیہ اور اعتقادیہ کو
قرآن میں بڑی تفصیل سے بیان کیا اُس اللہ نے مسئلہ امامت کی توضیح
میں ایسی کمی کی کہ کچھ بھی مطلب نہ کھلا اور جب اللہ کی طرف سے ایسی
کمی ہوئی تو پیغمبرؐ نے بھی توضیح کرنی مناسب نہ سمجھی اسی لیے لفظ مولیٰ فرما دیا
جس کے بہت سے معنی ہیں۔

اب فرض کرلو کہ اللہ کی طرف سے یہی حکم آیا ہو کہ سب مسلمانوں
کو یہ حکم سُنادو کہ علیؓ سے محبت رکھیں اور اسی کی تبلیغ کی یہ تاکید ہو اور

اسی کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث من کنت مولاہ۔
تو اس آیت کو اس حدیث کے ساتھ ربط دینے سے حضرات
فائدہ ہوا؟ ۔ علیؓ کی محبت اہل سُنت کا عین مقصود ہے ا
اصطلاحی شیعہ نہ اس آیت سے ثابت ہوتی ہے نہ حدیث
کے ملانے سے۔

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس آیت کا غدیر خم کے
ہرگز صحیح نہیں اس لیے کہ صحیح روایتوں سے یہ ثابت ہوا ہے کہ
میں نازل ہوئی ہے اور غدیر کا مجمع اور خطبہ دن میں ہوا تھا۔ حا
نے اپنی تفسیر میں ترمذی وغیرہ بہت سے محدثین سے یہ روای
کہ صحابہ رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاسبانی کے ل
تھے جب آیت وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ نازل ہوئی تو
اللہ علیہ وسلم نے قبہ سے سر نکالا اور فرمایا کہ اے لوگو تم چلے جاؤ
سے حفاظت کا وعدہ کر لیا۔ حاکم نے اس روایت کو صحیح الاس

اس روایت سے یہ ظاہر ہے کہ رات کے وقت ص
میں مشغول تھے اُسی وقت یہ آیت نازل ہوئی اور آپؐ
کر دیا۔

اور نیز حافظ ابن کثیر نے سورۂ مائدہ کی آیت يَا أَيُّهَا
آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ کے تح
ابن جریر نے زہری سے نقل کیا ہے کہ عبادہ بن صامتؓ نے یہود

دوستی توڑ دیا اور عبداللہ بن اُبی نے نہ توڑا تو اُس وقت آیت یا یھا الذین
امنوا سے واللہ یعصمك من الناس تک سب آیتیں نازل ہوئیں
اس روایت سے معلوم ہو گیا کہ یہ سب آیتیں ایک وقت میں مدینہ میں نازل
ہوئی تھیں اس لیے کہ یہ قصہ مدینہ میں واقع ہوا تھا۔

صحیح مسلم وغیرہ کتب احادیث میں روایت ہے کہ حجۃ الوداع کے
خطبہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا کہ قیامت کے دن
تم سے میری رسالت کا سوال پوچھا جائے گا تم کیا جواب دو گے؟ سب نے
کہا کہ ہم یہ کہیں گے کہ آپ نے احکام الٰہی کی تبلیغ کی اور رسالت اچھی طرح ادا
کی۔ اُس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آسمان کی طرف سر
اُٹھایا اور فرمایا کہ اللھم ھل بلغت، اللھم ھل بلغت اے اللہ کیا
میں نے رسالت کی تبلیغ کر دی۔ دوسری روایتوں سے بھی ظاہر ہے کہ خطبہ
حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار تبلیغ رسالت پر
لوگوں کو گواہ کرتے تھے اور اللھم ھل بلغت فرماتے تھے۔

یہ روایت جو ہم نے صحیح مسلم سے نقل کی شیعوں کی کتابوں میں بھی
موجود ہے۔ چنانچہ تفسیر قمی میں آیۃ یا یھا الرسول بلغ ما انزل الیك
کے تحت میں مذکور ہے اور یہ بہت بڑا قرینہ اس امر کا ہے کہ آیہ یا یھا
الرسول بلغ ما انزل الخ خطبہ حجۃ الوداع سے پہلے نازل ہوئی ہوگی اور
چونکہ اس آیت میں اللہ نے تبلیغ رسالت کی تاکید کی تھی اسی لیے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ حجۃ الوداع میں جو چالیس ہزار صحابہ کا مجمع تھا بار بار

اپنی تبلیغ رسالت پر سب کو گواہ کرتے تھے اور اس مضمون کا بڑا اہتمام
تھا۔

ان دلائل اور قرائن سے بہت اچھی طرح ظاہر ہو گیا کہ آیت یا یھا
الرسول بلغ الخ روز غدیر خم سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔

اب اُن روایتوں کا حال سُنیے جن سے مولوی حامد حسین صاحب
اپنی کتاب عبقات میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ آیہ یا یھا الرسول بلغ ما
انزل الخ غدیر خم کے روز نازل ہوئی تھی ان میں ایک روایت ابو سعید
خدری کی ہے جس کو عطیہ روایت کرتا ہے اس کی نسبت ذہبی نے میزان
الاعتدال میں لکھا ہے کہ عطیہ بن سعد کوفی ایک مشہور تابعی ہے جو ضعیف
ہے۔ ابن عباسؓ اور ابو سعیدؓ اور ابن عمرؓ سے روایتیں نقل کرتا ہے۔ سالم
مرادی کا قول ہے کہ وہ شیعہ تھا اور امام احمد کا قول ہے کہ وہ کلبی کے پاس
آتا تھا اور اُس کی تفسیر میں جو روایتیں کسی ابو سعید کی لکھی ہوتیں ان کو یاد کر لیتا
اور پھر اُن روایتوں کو یوں نقل کرتا کہ ابو سعید نے یوں کہا ہے۔ ذہبی نے لکھا
ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو یہ وہم دلاتا تھا کہ ابو سعید خدری نے کہا
ہے۔ نسائی اور ایک جماعت محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے۔

اب غور فرمائیے کہ جس راوی کی یہ حالت ہو کہ وہ شیعہ ہو اور کلبی
رافضی سے روایت لے اور خواہ کسی ابو سعید کا قول ہو وہ کلبی کا واسطہ درمیان
سے چھوڑ کر ابو سعید خدری کا قول بتا دے ایسے راوی کی روایت کیوں کر قابل
اعتبار ہو سکتی ہے۔ چونکہ کلبی اور عطیہ دونوں ہم مذہب شیعہ تھے اس لیے ظاہرا

یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت کلبی نے بنائی اور اس سے عطیہ نے لی اور اپنی عادت
کے بموجب ابو سعید خدری کی طرف نسبت کر دی۔ یہ ابو سعید خدری کی روایت
جس کی حالت ہم ظاہر کر چکے مولوی حامد حسین صاحب نے بہت سی کتابوں
سے نقل کی اور ہر کتاب کے اعتبار سے اُس کو جدا ایک روایت فرض
کر لیا۔ اب غور فرمایئے کہ ان کی یہ کتنی بڑی چالاکی تھی کہ ایک روایت کی بیسیوں
روایتیں بنا دیں۔

دوسری روایت ابن عباسؓ سے ہے جو کلبی نے بواسطہ ابو
صالح ابن عباسؓ سے نقل کی ہے۔ میزان الاعتدال میں کلبی کی نسبت
لکھا ہے:-

"بخاری کا قول ہے کہ سفیان یہ کہتے تھے کہ کلبی نے مجھ سے کہا
ہے کہ جتنی روایتیں میں ابو صالح سے نقل کروں وہ جھوٹی ہیں"۔ یزید بن
زریع کا قول ہے کہ کلبی عبد اللہ بن سبا کے فرقہ کا آدمی تھا۔ ابن حبان
کا قول ہے کہ کلبی عبد اللہ بن سبا کے فرقہ میں سے تھا اور ان لوگوں میں
سے تھا جو یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ علیؓ نہیں مرے اور وہ پھر دنیا میں آویں گے
اور جب وہ بادل کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ امیر المومنین اس میں ہیں۔
تبوذکی یہ کہتے تھے کہ میں نے کلبی سے یہ سُنا کہ میں سبائی مذہب ہوں یعنی
عبد اللہ بن سبا کے مذہب میں ہوں۔ حسن بن یحییٰ کہتے تھے کہ میں نے کلبی
سے یہ سُنا کہ جبرئیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لاتے تھے اور اگر نبیؐ پاخانہ میں
چلے جاتے تو اتنی دیر جبرئیل علیؓ سے وحی بیان کرتے تھے۔ احمد بن زہیر کا

قول ہے کہ میں نے احمد بن حنبلؒ سے پوچھا کہ کلبی کی تفسیر کو دیکھنا جائز
کہا کہ جائز نہیں۔ جوزجانی وغیرہ نے کلبی کو کذاب کہا ہے اور دار قط
جماعت نے اس کو متروک کہا ہے۔ ابن حبان کا قول ہے کہ کلبی
اور جھوٹ ایسا کھلا ہوا ہے کہ محتاج بیان نہیں اور کلبی بواسطہ ا
ابن عباسؓ سے یہ روایت کرتا ہے حالانکہ ابو صالح نے ابن عبا
نہیں، کلبی ایسا شخص تھا کہ کتابوں میں اس کا ذکر جائز نہیں"۔

کلبی شیعوں کے نزدیک بہت بڑا معتبر راوی ہے
اُس کی روایتیں ہیں۔ چنانچہ ایک روایت اُسی کے باب مایفص
والمبطل میں موجود ہے اُسی روایت میں یہ بھی لکھا ہے فلم یزل
یدین اللہ بحب اهل البیت حتی مات یعن
اللہ کے دین کا مطابق حب اہل بیت کے معتقد رہا اور اسی دین
تعجب ہے کہ اہل سُنت کے مقابلہ میں صاحب عبقات اس کی
پیش کریں جس کا شیعہ ہونا کافی سے ثابت ہے درحقیقت یہ ان کی ہ
خیانت ہے۔

اس تحقیق سے کلبی کا کذاب ہونا اور رافضی پیرو عبد اللہ
ہونا اور جتنی روایتیں اُس نے ابو صالح سے لی ہیں اُن کا یقیناً جھو
اچھی طرح ظاہر ہو گیا یہ روایت بھی کلبی نے ابو صالح سے لی ہے۔
کی روایت کا یہ حال ہے جو مذکور ہوا یہ روایت جتنی کتابوں میں مذ
مولوی حامد حسین صاحب نے ہر کتاب کے اعتبار سے اُس کو جدا

فرض کرلیا اور ایک روایت کی بیسیوں روایتیں بنا دیں۔

تیسری روایت براء بن عازب کی ہے جس کے راویوں کا حال کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیسے لوگ ہیں۔ بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ امام باقر علیہ السلام کا یہ قول ہے کہ آیت یا یہا الرسول بلغ ما انزل الیک الخ فضل علیؓ میں نازل ہوئی۔ اس قول کی پوری سند نہیں معلوم ہوئی۔ مگر عبقات حصہ ثانی کے صفحہ ۵۴۰ پر جو عبارت روایت شہاب الدین احمد کی توضیح الدلائل سے مذکور ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالجارود اس کی سند امام باقر تک پہنچاتا ہے۔ ابوالجارود کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھا ہے ابن معین کا قول ہے کہ وہ کذاب اور عدو اللہ ہے۔ نسائی کا قول ہے کہ متروک ہے ابن حبان کا قول ہے کہ متروک ہے جھوٹی حدیثیں فضائل اور مطاعن کی بنایا کرتا تھا۔ بعض محدثین کا قول ہے کہ مذہب جارودیہ اسی کی طرف منسوب ہے اس مذہب والے ابوبکرؓ اور عمرؓ پر تبرا کہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ امامت اولاد فاطمہؓ کے سوا کسی اور کو نہیں ملتی اور بعض ان میں رجعت کا اعتقاد رکھتے ہیں اور متعہ کو مباح کہتے ہیں۔"

اس ابوالجارود کا نام زیاد بن منذر ہے شیعوں کے معتبر راویوں میں شامل ہے کافی میں بھی اس کی روایتیں موجود ہیں اسی نے امام باقر علیہ السلام پر اس قول کا افترا کیا ہے۔

چوتھی روایت یہ پیش کی جاتی ہے کہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یوں پڑھا کرتے تھے یا یہا الرسول

بلغ ما انزل الیک من ربک ان علیا مولی المومنین اس روایت کی پوری سند معلوم نہ ہوئی البتہ اتنا مذکور ہے کہ ابوبکر بن عیاش نے عاصم سے اس نے زر سے اس نے ابن مسعود سے اس کی روایت کی ہے جو مصنفین ابوبکر بن عیاش کی سند نقل کرتے ہیں انھوں نے بذات خود ابوبکر بن عیاش کا زمانہ نہیں پایا پس خدا جانے ابوبکر بن عیاش سے ان مصنفین تک کتنے راوی ہیں اور ان کا کیا حال ہے جب تک ان کا حال معلوم نہ ہو اس وقت تک یہ روایت بے کار ہے۔ کسی طرح قابل حجت نہیں۔

ابوبکر بن عیاش کا حال یہ ہے کہ آخر میں اس کا حافظہ ایسا خراب ہوگیا تھا اور وہم ایسا غالب ہوگیا تھا کہ کچھ کا کچھ اس کو یاد آجاتا تھا میزان الاعتدال میں اس کی نسبت لکھا ہے:۔

"وہ حدیث میں غلطی کرتا تھا اور اس کو وہم ہو جاتا تھا۔ محمد بن عبد اللہ بن نمیر نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ یحییٰ بن سعید اس کا کچھ اعتبار نہیں کرتا تھا، اور جب اس کے سامنے ابوبکر بن عیاش کا ذکر ہوتا تو یحییٰ بن سعید جبیں بجبیں ہو جاتا تھا۔ امام احمدؒ کا قول ہے کہ وہ حد سے زیادہ کثیر الغلط ہے، یحییٰ بن سعید کا قول ہے کہ اگر ابوبکر بن عیاش میرے سامنے ہوتا تو میں کبھی اس سے کچھ نہ پوچھتا۔ ابن مبارکؒ کا قول ہے کہ حدیث پر بہت جلد جرأت کرنے والا ابوبکر بن عیاش سے بڑھ کر میں نے نہیں دیکھا۔"

اس روایت کی سند میں ابوبکر بن عیاش کے بعد عاصم کا نام ہے

یہ نہیں معلوم ہوا کہ یہ کون سا عاصم ہے بعض عاصم کذاب بھی ہیں۔ میزان الاعتدال میں ابن علیہ اور یحییٰ القطان کا یہ قول منقول ہے کہ عاصم نام کے جتنے راوی ہیں ان کا حافظہ خراب ہے۔ بہرحال اگر حضرات شیعہ اس روایت سے حجت پکڑیں تو کسی دلیل سے یہ بھی ثابت کریں کہ یہ کون سا عاصم ہے اور بغیر اس کے یہ روایت کسی طرح قابل اعتماد نہیں۔

مولوی حامد حسین نے عبقات میں اس امر پر بڑا زور دیا ہے کہ آیت یاایھا الرسول بلغ الخ غدیر خم کے روز نازل ہوئی تھی اور اس کے ثبوت میں یہ روایتیں لکھی ہیں جن کا حال ظاہر ہو چکا۔ البتہ صاحب عبقات نے یہ کمال کیا ہے کہ انھیں روایتوں کو بہت سی کتابوں سے نقل کر کے بہت سی روایتیں بنا دیا ہے۔

پس بفضلہ تعالیٰ بخوبی ثابت ہو گیا کہ یہ روایتیں کسی طرح قابلِ لحاظ نہیں اور اہل سنت کی صحیح روایتوں کی مخالف ہیں اور رافضیوں نے یہ روایتیں دھوکا دے کر اہل سنت کے راویوں میں پہونچا دیں۔ اور بہت سے قرائن سے ظاہر ہے کہ یہ فساد کلبی کا ہے اسی نے یہ روایت بنا کر ابن عباسؓ کی طرف منسوب کی اور عطیہ نے اس سے سن کر ابو سعید خدری کی طرف اس کی نسبت کر دی اسی طرح کسی رافضی نے اس کو ابن عازب کی طرف لگا دیا۔ ابو الجارود رافضی نے اس قول کا امام باقر پر افترا کیا۔

اس موقع پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ شیعوں کی صحیح روایت سے بھی

ظاہر ہوتا ہے کہ آیت یاایھا الرسول بلغ مع لفظ (واللہ یعـ[صمک] من الناس) کے حجۃ الوداع میں عرفہ کے روز نازل ہوئی تھی جو [غدیر] خم سے نو دن پہلے تھا اس روایت کو ہم آئندہ نزول آیۃ اکملـ[ت لکم] دینکم کی بحث میں نقل کریں گے۔

پس بخوبی ثابت ہو گیا کہ آیۃ یاایھا الرسول بلغ الخ حدیـ[ث من] کنت مولاہ کو نص امامت نہیں بنا سکتی اور اگر مولیٰ کے معنی ہم لے لیں تو یہ آیت کسی طرح تصرف اور حکومت کو اس کے ساتھ ر[بط] دے سکتی۔

دوسرا قرینہ مولےٰ کو معنی اولویت سے بڑھا کر اولیٰ بالتـ[صرف] بنانے کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آیت الیوم اکملت لکم دینکم [واتممت] علیکم نعمتی بھی غدیر خم کے روز بعد بیان کرنے حدیث من کنـ[ت مولاہ] کے نازل ہوئی۔

یہ آیت سورۂ مائدہ میں اس طرح ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا	آج پورا کر دیا میں نے تمہار[ے لیے] تمہارا دین اور پوری کر دی [میں نے] اپنی نعمت اور پسند کیا میں نے تمہارے دین کے لیے۔

اس آیت میں نہ علیؓ کا ذکر ہے نہ مسئلہ امامت کا [مطلب] اس آیت کے یہ ہیں کہ اللہ مسلمانوں سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے کہ

دین کامل ہوگیا اب آئندہ کوئی نیا حکم نہیں آوے گا۔

چونکہ حضرات شیعہ مسئلہ امامت کو اسلام سے خارج سمجھتے ہیں یہ دلیل بھی اسی بات کی ہے کہ اللہ نے اسلام کو پسند کیا تھا جس میں مسئلہ امامت شامل نہ تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی بتادیا تھا کہ اب اور کوئی حکم نازل نہ ہوگا۔

بخاری اور مسلم اور ترمذی اور نسائی اور بہت سے محدثین نے بطریق کثیرہ روایت کی ہے کہ یہ آیت عرفہ کے روز حجۃ الوداع میں نازل ہوئی تھی اور یہ خبر محدثین کے نزدیک ایسی صحیح اور مشہور ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری خبر کسی طرح مقبول نہیں ہوسکتی حضرت علیؓ سے بھی یہی روایت ہے۔

چونکہ اللہ کی طرف سے جتنے احکام دین کے نازل ہونے والے تھے اُس روز سب پورے ہوچکے تھے اس لیے اللہ نے مسلمانوں کو یہ خبر دے دی کہ اب دین پورا ہوگیا کوئی نیا مسئلہ حرام یا حلال کا نازل نہ ہوگا اور چونکہ حجۃ الوداع میں مسلمانوں کو بڑی خوشی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کیا تھا اور تخمیناً چالیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا اُسی خوشی کے وقت میں اللہ نے اُن مخلص بندوں اور اپنے رسولؐ کے رفیقوں کو زیادہ خوش کرنے کے لیے تکمیل دین اور اتمام نعمت اور رضائے اسلام کا مژدہ بھی سُنادیا۔

اب اُن روایتوں کا بھی حال سُنیے جن کو مولوی حامد حسین صاحب نے

عبقات میں کیا ہے اور اہل سُنت کے مقابلے میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آیت اکملت لکم الخ غدیر خم کے روز نازل ہوئی تھی۔

اول روایت ابوہریرہ کی ہے جس کی سند عبارت ابن المغازلی میں عبقات کے صفحہ ۹۴۵ پر مذکور ہے اُس کا ایک راوی ابوالحسین بن اسماک ہے اُس کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھا ہے:۔

"خطیب نے اپنے شیوخ سے نقل کیا ہے کہ وہ کذاب ہے ابن ابی الفوارس نے بھی اُس کو جھوٹا بتایا ہے۔"

دوسرا راوی اس سلسلہ میں ابوجعفر بن محمد بن نصیر الجلدی مجہول ہے یعنی اُس کا حال معلوم نہیں کہ وہ کیسا شخص تھا۔

ایک راوی اس سلسلہ میں مطر وراق ہے اس کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھا ہے:۔

"ابن سعد اور ابوحاتم اور احمد اور یحییٰ نے اس کو ضعیف کہا ہے اور نسائی کا قول ہے کہ وہ قوی نہ تھا یحییٰ القطان کا قول ہے کہ وہ حافظہ کی خرابی میں ایسا تھا جیسے ابن ابی لیلےٰ۔"

ابن ابی لیلےٰ کا حال میزان الاعتدال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سچا آدمی اور فقیہ تھا مگر حافظہ اُس کا بہت خراب تھا۔ شعبہ کا قول ہے کہ میں نے ایسا خراب حافظہ کسی کا نہیں دیکھا۔ دارقطنی کا قول ہے کہ حافظہ اُس کا ردی تھا اور کثیر الوہم تھا۔ حاکم کا قول ہے کہ اکثر حدیثیں اُس نے اُلٹ دیں۔ ابن حبان کا قول ہے کہ اُس کا حافظہ خراب تھا فحش غلطیاں کرتا تھا اُس کی بہت حدیثیں

قابل انکار ہیں اس وجہ سے وہ چھوڑ دینے کے لائق ہے اور احمد اور یحیی نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔

اب غور کرنا چاہیے کہ جس ابن ابی لیلے کے حافظہ کی خرابی ایسی معلوم ہو چکی اُس سے مطر وراق کو تشبیہ دی گئی ہے اس سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ مطر وراق کا حافظہ بہت خراب تھا البتہ محدثین نے مطر وراق کو صدوق لکھا ہے یعنی وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ پس قول فیصل مطر وراق کے بارے میں یہ ہے کہ اُس میں حافظہ کی خرابی کے سوا اور کوئی عیب نہ تھا لیکن حافظہ کی خرابی کی وجہ سے اُس سے خطا بہت ہوتی تھی اسی وجہ سے تقریب میں اس کو کثیر الخطا لکھا ہے محدثین نے مطر وراق سے وہ روایتیں لی ہیں جن کی تصدیق کسی دوسرے راوی سے بھی ہو گئی ہے اور جس روایت میں مطر وراق متفرد ہے اس کو قبول نہیں کیا۔ اور اس روایت میں کہ آیت اکملت لکم کی نسبت ابوہریرہؓ نے یہ بیان کیا ہے کہ غدیر خم کے روز اُتری مطر وراق متفرد ہے اس نقل میں کوئی اس کا ساتھی نہیں فقط مطر وراق نے بواسطہ شہر بن حوشب کے ابوہریرہؓ سے یہ خبر نقل کی ہے۔

مولوی حامد حسین صاحب کو جو اس روایت کے ثابت کرنے کے لیے مطر وراق کی توثیق کی ضرورت پڑی تو حلیہ ابونعیم سے اس کے زہد اور فقہ اور علم کی تعریف نقل کر دی جو عبقات مجلد حدیث ولایت کے حصۂ ثانی کے صفحہ ۲۱۵ پر مذکور ہے مگر یہ خیال نہ کیا کہ فقط عالم اور زاہد ہونا راوی کی توثیق کے واسطے کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ اُس کا حافظہ بھی قوی ہو اور یاد بھی نہایت صحیح ہو

اور جو خرابی مطر وراق کے حافظہ کی کتب اسماء رجال میں مذکور ہے اُس کا حسین صاحب نے کچھ بھی ذکر نہ کیا۔

مطر وراق اس روایت کو شہر بن حوشب سے نقل کرتا ہے حوشب کے باب میں محدثین کا اختلاف ہے۔ بہت سے محدثین اس کرتے ہیں اور بعض توثیق کرتے ہیں۔ توثیق کے اقوال عبقات میں مذکو کتابوں میں جرح کے اقوال بھی تھے جو مصنف عبقات نے چھوڑ د

صحیح مسلم کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ شہر کو محدثین نے چھوڑ د

میزان الاعتدال میں لکھا ہے "ابن عون کا قول ہے کہ شہر متروک کیا ہے نسائی اور ابن عدی نے کہا ہے کہ وہ قوی نہیں ہے۔ اپنے باپ سے نقل کرتا ہے کہ شہر بیت المال پر نوکر ہوا تھا اُس نے درہم اُس میں سے نکال لیے۔ ابوداؤد کا قول ہے کہ شہر ہمارے کسی جب شعبہ نے اس کو چھوڑ دیا۔ عباد منصور کہتا ہے کہ میں نے شہر بن کے ساتھ حج کیا تھا اُس نے میرا مال چُرا لیا۔ شعبہ کا قول ہے کہ عبد بہرام سچا ہے مگر اُس میں یہ عیب ہے کہ وہ شہر سے روایت کرتا ہے عدی کا قول ہے کہ شہر اُن میں سے ہے جن سے حجت نہیں پکڑ سکتے حدیثوں پر اعتبار نہیں ہوتا۔

حافظ ابن حجر نے جو شہر کی جرح اور توثیق دونوں پر لحاظ کر قول فیصل تقریب میں لکھا ہے وہ یہ ہے صدوق کثیر الارسال یعنی وہ سچا تھا مگر اس کی یہ عادت اکثر تھی کہ وہ درمیان میں سے واسطہ

تھا اور اس کو وہم بہت ہوتے تھے۔ واسطہ چھوڑ دینا بڑا عیب ہے اس لیے کہ ضعیف راوی کے واسطہ کا درمیان سے چھوڑ کر آئندہ راوی کی طرف بلا واسطہ نسبت کر دینا دھوکا دے کر ضعیف سند کو قوی بنانا ہے۔

اب ہم ابن المغازلی کی عبارت کا ترجمہ نقل کرتے ہیں جس میں اس روایت کی سند مذکور ہے یہ عبارت عبقات حصۂ ثانی کے صفحہ ۵۴۹ پر مذکور ہے۔

ابن المغازلی کتاب المناقب میں لکھتے ہیں کہ ہم کو ابوبکر احمد بن محمد نے خبر دی اُس نے کہا کہ ہم کو ابوالحسین احمد بن الحسین بن السماک نے خبر دی اُس نے کہا کہ مجھ سے ابومحمد جعفر بن محمد بن نصیر الجلدی نے بیان کیا اُس نے کہا کہ مجھ کو علی بن سعید بن قتیبہ رملی نے بیان کیا اُس نے کہا کہ مجھ سے حمزہ بن ربیعہ قرشی نے بیان کیا ابن شوذب سے اُس نے مطر وراق سے اُس نے شہر بن حوشب سے اُس نے ابوہریرہؓ سے کہ انھوں کہا کہ جس نے اٹھارھویں ذی الحجہ کو روزہ رکھا اُس کے لیے ساٹھ مہینے کے روزے لکھے گئے اور وہ دن غدیر خم کا ہے جب کہ پکڑا نبیؐ نے علی بن ابی طالبؓ کا ہاتھ اور فرمایا کہ کیا نہیں ہوں میں پیارا مومنوں کو اُن کی جانوں سے۔ سب نے کہا بے شک یا رسول اللہ تو آپؐ نے فرمایا کہ میں جس کا مولیٰ ہوں علی بھی اُس کا مولیٰ ہے۔ تو عمر بن خطابؓ نے کہا کہ مبارک ہو تمھیں اے ابن ابی طالب ہو گئے تم مولیٰ میرے اور مولے ہر مومن اور مومنہ کے تو اُتاری اللہ نے آیت الیوم اکملت لکم دینکم۔

یہی ایک سند ہے اس سند کے سوا کسی اور سند سے یہ روایت ابوہریرہؓ سے ثابت نہیں ہوئی ہر راوی اس میں اپنے بیان میں اکیلا ہے۔ کوئی دوسرا اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ اب اس روایت کی حالت یہ ہے کہ آٹھ واسطوں سے واسطہ در واسطہ یہ خبر ملی جس میں چار ایسے ہیں جن کا حال معلوم ہو چکا پس اس روایت کے جھوٹے ہونے میں کوئی شک نہیں رہا۔ اس لیے کہ ایک راوی کذاب بھی ہے اور فقط اتنی بات اس روایت کے جھوٹے ہونے کو کافی تھی حالانکہ اس سند میں اور بھی کئی راوی نہایت ضعیف ہیں پس اگر ہم ابوالحسین کذاب اور جعفر بن محمد مجہول سے قطع نظر کر لیں تب بھی مطر وراق اور شہر بن حوشب کا ضعف اس روایت کے ساقط الاعتبار بنانے کو کافی ہے۔

ایک بہت بڑا شبہ اس سند میں یہ بھی ہے کہ حمزہ کے ساتھ ابن ربیعہ کی قید ابوالحسین بن کذاب نے بڑھائی ہے اس لیے کہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اس روایت کو کذب کہا ہے اور اس کے سیاق کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حمزہ پر طعن کرتے ہیں اور ان کی عبارت میں حمزہ کے ساتھ ابن ربیعہ کی قید نہیں اور ذہبی کی عبارت بھی انھوں نے نقل کی ہے اُس میں بھی حمزہ بغیر قید ابن ربیعہ کے مذکور ہے اور اس عبارت کا سیاق بھی شاہد ہے کہ ذہبی حمزہ پر طعن کرتے ہیں پس یہ امر یقینی ہے کہ یہ حمزہ حمزہ بن ربیعہ نہیں بلکہ کوئی ایسا حمزہ ہے جو مجروح ہے اور ضرور ہے کہ یہ حمزہ حمزہ بن جبیب مقدسی ہوگا اس سے کہ باعتبار زمانہ کے ابن شوذب سے اس کی

روایت ممکن ہے۔ حمزہ بن حبیب مقدسی کو میزان الاعتدال میں لکھا ہے
"یہ نہیں معلوم کہ وہ کون شخص ہے ایک اسناد مجہول میں حدیث باطل اُس کی
مذکور ہے۔"

دوسری روایت جس کو صاحب عبقات اہل سُنت کے سامنے
اس حجت کے لیے پیش کرتے ہیں کہ آیۃ اکملت لکم دینکم غدیرخم کے
روز نازل ہوئی وہ ہے جس میں ابوہارون عبدی ابوسعید خدریؓ سے روایت
کرتا ہے۔

ابوہارون العبدی کا نام عمارہ بن جوین تھا وہ تابعی تھا صحابہ
سے روایت کرتا ہے۔ میزان الاعتدال میں اُس کی نسبت لکھا ہے:۔
"حماد بن زید نے اس کو جھوٹا کہا ہے۔ شعبہ کا قول ہے کہ میری گردن
کٹ جانا اس سے بہتر ہے کہ میں ابوہارون سے روایت کروں۔ احمد کا
قول ہے کہ وہ کوئی چیز نہیں۔"

ابن معین کا قول ہے کہ وہ ضعیف ہے اُس کی حدیث نہ مانی جائے
نسائی کا قول ہے کہ وہ متروک الحدیث ہے۔ دارقطنی کا قول ہے کہ وہ رنگ
بدلا کرتا تھا کبھی خارجی بنتا تھا کبھی شیعہ بنتا تھا۔ شعبہ کا قول ہے کہ اس
کے پاس ایک کتاب تھی اس میں حضرت علیؓ کے باب میں بہت سی
جھوٹی روایتیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے اُس سے کہا کہ یہ کیسی کتاب ہے
اُس نے کہا کہ یہ کتاب حق ہے۔ جوزجانی کا قول ہے کہ ابوہارون کذاب
مفتری تھا۔ شعبہ کہتا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ابوہارون سے کہا کہ مجھے

وہ روایتیں دکھاؤ جو تم نے ابوسعید سے سُنی ہیں۔ اُس نے ایک
جس میں یہ لکھا تھا کہ ابوسعید نے ہم سے یہ حدیث بیان کی کہ عثما
میں مرے (معاذ اللہ منہا) میں نے یہ دیکھ کر وہ کتاب اُس کے
اُس کے پاس سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شعبہ کا یہ قول بھی ہے کہ اگر میں
جو کہوں اُسی کی ابوہارون ابوسعید خدری سے روایت کرد
کر سکتا تھا۔ صالح بن محمد نے علی کا قول یہ نقل کیا ہے کہ ابوہارو
سے بھی زیادہ جھوٹا تھا۔ ابن حبان کا قول ہے کہ وہ ابوسعید سے
بیان کیا کرتا تھا جو اُن کی حدیثوں میں نہیں ہوتی تھیں۔"

پس یہ وہی ابوہارون عبدی ہے جو ابوسعید سے ر
کرتا ہے اس کا حال بخوبی ظاہر ہو گیا کہ وہ کذاب بھی تھا اور تبرا
اور تقیہ کر کے کبھی خارجی بھی بنتا تھا۔ اس سند میں اور راوی
مگر ابوہارون نے اس روایت کی جڑ ایسی کاٹ دی کہ اور راو
ضرورت نہ رہی۔

اب ہم بفضلہ تعالیٰ اُن روایتوں سے فارغ ہو گئے
علمائے شیعہ یہ کہتے تھے کہ اہل سُنت کی روایتوں سے یہ
یا یہا الرسول بلغ اور آیہ اکملت لکم دینکم د
روز نازل ہوئی تھیں۔

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ شیعوں کی صحیح روایت
ہے کہ یہ دونوں آیتیں عرفہ کے دن نازل ہوئی تھیں۔ اور روز غد

پہلے تھا۔ اصول کافی[1] میں ہے کہ ابو الجارود[2] یہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ سُنا۔

ثم نزلت الولایۃ وانما اتاہ ذلك فی یوم الجمعۃ بعرفۃ انزل اللہ عز وجل الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی وکان کمال الدین بولایۃ علی بن ابی طالب علیہ السلام فقال عند ذلك رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امتی حدیثو عهد بالجاهلیۃ ومتی اخبرتهم بهذا فی ابن عمی یقول قائل ویقول قائل فقلت فی نفسی من غیر ان ینطق بہ لسانی۔ فاتانی عزیمۃ من اللہ عز وجل تبۃ فنزلت

پھر نازل ہوئی ولایت اور نہیں آیا نبی کے پاس یہ حکم مگر جمعہ کے دن عرفہ میں اُتاری اللہ عز وجل نے آیت الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی اور تھا دین کا پورا ہونا علی بن ابی طالبؑ کی ولایت سے۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت جاہلیت سے ابھی نئی نئی نکلی ہے اور جب خبر سُناؤں گا میں اس حکم کی اپنے بھائی کے لیے تو کوئی کچھ کہے گا اور کوئی کچھ کہے گا۔ یہ میں نے اپنے دل میں کہا تھا۔ زبان سے نہیں کہا تھا۔ تو آیا میرے پاس حکم اللہ کی طرف سے قطعی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اے رسول پہونچا دے جو نازل

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص۲۷۵ باب ما نص اللہ ۱۲ [2] یہ وہی ابو الجارود ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ اس نے امام باقر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ آیت یایها الرسول بلغ غدیر خم کے روز فضل علیؑ میں نازل ہوئی تھی ۱۲

یایها الرسول بلغ ما انزل الیك من ربك وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمك من الناس ان اللہ لا یهدی القوم الکفرین۔

ہوا ہے تیری طرف تیرے رب کی طرف سے اور اگر تو ایسا نہ کرے گا تو تُو نے اپنی رسالت نہیں پہونچائی اور اللہ بچاوے گا تجھ کو آدمیوں سے بے شک اللہ ہدایت نہیں کرتا کافروں کے گروہ کو۔

اس روایت سے چند فائدے ظاہر ہوئے:۔

اول یہ کہ آیت اکملت لکم دینکم عرفہ کے روز نازل ہوئی تھی اور اس کے متصل آیۃ یایها الرسول بلغ نازل ہوئی تھی۔ قطع نظر اس کے شیعوں کا اجماع و اتفاق ہے کہ یہ دونوں آیتیں ایک دن میں نازل ہوئی ہیں پس آیۃ اکملت لکم دینکم کا عرفہ کے دن نازل ہونا دلیل اس امر کی ہے کہ آیت یایها الرسول بھی عرفہ کے دن نازل ہوئی۔

دوسرا فائدہ یہ ثابت ہوا کہ اول آیت اکملت لکم دینکم نازل ہوئی اس کے بعد آیت یایها الرسول بلغ نازل ہوئی۔

اس روایت کو صاف تفسیر صافی وغیرہ بہت سے علمائے شیعہ نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اگر ہم صاحب عبقات کا طریقہ اختیار کریں تو اس ایک روایت کی بیسیوں روایتیں بنا سکتے ہیں۔

اب فریقین کی صحیح روایتوں کا اتفاق ہو گیا کہ آیت اکملت لکم دینکم عرفہ کے روز نازل ہوئی تھی پس اس اتفاقی قول کے مخالف جو روایتیں فریقین کی ہیں وہ یقیناً باطل ہیں۔

حضرات شیعہ کے پاس اولٰے سے اولٰے بالحکومت مراد لینے کے
لیے بڑی عمدہ یہی دو دلیلیں تھیں کہ یہ دونوں آیتیں غدیر خم کے روز نازل
ہوئی ہیں۔ ان دلیلوں کا حال خوب معلوم ہو چکا اب اس سے زیادہ جو وہ اور
قرینے ملاتے ہیں وہ ایسی فضول باتیں ہیں جو قابل بحث بھی نہیں۔

تیسرا قرینہ اس امر کا کہ اولٰے سے اولٰے بالتصرف مراد ہے حضرات
شیعہ یہ پیش کرتے ہیں کہ جب قصہ غدیر خم کا واقع ہو چکا اور رسولؐ علیؓ
کے باب میں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے اُس وقت حسان بن ثابتؓ نے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر کچھ اشعار پڑھے جس میں اس تمام قصہ
اور گفتگوئے رسول کو نظم کیا تھا ان میں یہ شعر بھی تھا ؎

فقال[1] له قم یا علی فانني
رضيتك من بعدی اماما وهاديًا

حسانؓ کے اس بیان سے ثابت ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے جو من کنت مولاہ فعلی مولاہ فرمایا تھا اس سے مراد یہ تھی کہ علیؓ اُن
کے بعد امام اور ہادی ہیں۔

جواب یہ ہے کہ اگر ہم اس روایت کو تسلیم بھی کر لیں تو اس سے
شیعوں کا مطلب کیا ثابت ہو گا اس لیے کہ اہل سنت کا اعتقاد بھی
یہی ہے کہ علیؓ امام اور ہادی تھے بلکہ علیؓ کا تو بڑا مرتبہ ہے اہل سنت تو

[1] پس فرمایا رسولؐ نے کہ اے علیؓ اُٹھ بے شک میں یہ پسند کرتا ہوں کہ تو میرے بعد
امام اور ہادی بنے ۱۲

ان کے غلام قنبر کو بھی اپنا امام اور ہادی جانتے ہیں شیعوں کا
ثابت ہوتا جب حسانؓ امام کے وہ معنی ظاہر کر دیتے جو شیعہ
کر لیتے ہیں۔ مجالس المومنین میں خواجہ نصیر الدین طوسی کی تعر
ہے :-

"امامے کہ ائمہ دین بفضل و تقدیم او معترف اند"
کہ اس عبارت میں امام اور ائمہ دین کے کیا معنی ہیں؟ اور اگر
یہاں بھی امام کے وہی معنی لیں جو دوازدہ امام کے واسطے لیے
نصیر الدین طوسی کو بھی امام سیزدہم مان لیں۔ یہ کیا قیامت ہے کہ
سا شخص ایسی پوچ دلیل پیش کرے۔

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ روایت کسی ایسی سنـ
نہیں جو کچھ اعتبار کے لائق ہو بلکہ ابن عباسؓ کی روایت کلبی نے
صالح نقل کی ہے اور ابو سعید خدریؓ کی روایت ابو ہارون عبد
سب راویوں کا حال معلوم ہو چکا۔

چوتھا قرینہ اولیٰ کو اولٰے بالتصرف بنانے کا یہ ہے کہ
صحابی نے جنگ صفین کے روز حضرت علیؓ کے سامنے چند شعر
میں سے ایک شعر کا مطلب یہ ہے کہ علیؓ ہمارے اور سب
حکم تنزیل میں اُس دن آیا تھا جس دن رسولؐ نے حدیث من
فرمائی۔

جواب یہ ہے کہ یہ روایت کسی سند سے ثابت نہیں

بے سند قول ہم کو مسلّم نہیں قطع نظر اس کے اس شعر میں لفظ تنزیل سے
ممکن ہے کہ وہ وحی مراد ہو جو قرآن کے سوا ہے یعنی بموجب وحی کے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ کی محبت کا حکم کیا تھا پس وہ ہمارے اور سب مسلمانوں
کے واجب التعظیم پیشوا ہیں اس لیے کہ رسولؐ اُسی شخص کی محبت کا حکم کریں
گے جو ہادی اور پیشوا ہو گا۔ پس یہ مضمون شیعوں کو کچھ بھی مفید نہیں اس لیے کہ
اہل سنت بھی علیؓ کو امام سمجھتے ہیں۔

اگر حسانؓ بن ثابت اور قیسؓ بن عبادہ کے نزدیک ایسی امامت
مراد ہوتی جو شیعوں نے فرض کر لی ہے تو وہ مثل اور صحابہ کے خلفائے ثلثہ کے
گروہ میں کیوں شامل ہوتے۔

پانچواں قرینہ حضرت علیؓ کے دیوان کے بعض اشعار پیش کیے جاتے
ہیں حالانکہ دیوان مشہورہ کی نسبت حضرت علیؓ کی طرف محدثین کے نزدیک
ہرگز صحیح نہیں۔

چھٹا قرینہ اولیٰ کو اولے بالتصرف بنانے کا یہ ہے کہ ثعلبی اپنی تفسیر
میں یہ روایت کرتا ہے کہ سفیان بن عیینہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آیت
سال سائل کس کے حق میں نازل ہوئی ہے اُس نے جواب دیا کہ میرے
باپ نے جعفر صادقؒ سے اور انھوں نے اپنے باپ دادوں سے روایت
کی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقام غدیر خم میں پہونچے تو آپؐ
نے حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ کے فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ یہ قصہ
سب بستیوں میں مشہور ہو گیا۔ حارث بن نعمان فہری کو بھی یہ خبر پہونچی

وہ اپنے اونٹ پر سوار ہو کر مقام ابطح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
آیا جو اُس وقت صحابہ کے مجمع میں تھے اور اس نے کہا کہ اے محمدؐ تم نے ہم کو
اللہ کی توحید اور اپنی رسالت کا حکم کیا ہم نے مان لیا، تم نے پانچ وقت کی
نماز کا حکم کیا اس کو بھی ہم نے مان لیا، تم نے زکوٰۃ کا حکم کیا اُس کو بھی ہم نے مان
لیا، تم نے رمضان کے روزوں کا حکم کیا اس کو بھی ہم نے مان لیا، تم نے حج کا
حکم کیا اُس کو بھی ہم نے مان لیا۔ تم اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور اپنے ابن
عم کے بازو اٹھا دیے اور ہم پر اُس کو بڑھا دیا اور یہ کہہ دیا کہ من کنت
مولاہ فعلی مولاہ یہ تم نے اپنی طرف سے کہا ہے یا خدا کی طرف سے
یہ حکم نازل ہوا ہے؟ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ
حکم اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ یہ سن کر حارث بن نعمان پیٹھ پھیر کر اپنے
اونٹ کی طرف چلا اور یہ کہتا تھا کہ اے اللہ اگر محمدؐ کا یہ قول سچ ہے تو فامطر
علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم ۝ یعنی ہم پر
آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر اپنا عذاب نازل کر دے۔ ابھی وہ اپنے
اونٹ تک نہیں پہونچا تھا کہ آسمان سے ایک پتھر اُس کی کھوپری پر گرا جو دُبر
سے نکل گیا اور وہ مر گیا اور اللہ نے آیت سأل سائل بعذاب واقع
نازل کی۔

جواب یہ ہے کہ اگر ہم اس جھوٹی روایت کو مان بھی لیں تو اس سے
شیعوں کا مطلب کیا ثابت ہو گا؟ اس لیے کہ اس روایت کا حاصل
یہ ہے کہ رسولؐ نے جو علیؓ کی محبت کا حکم کیا تھا یہ حکم حارث کو ناگوار ہوا اور

اور اُس نے جو رسولؐ کے حکم سے ناراض ہو کر کفر کے کلمے کہے اس وجہ سے اُس
پر عذاب نازل ہوا پس اس عذاب کے نازل ہونے سے حدیث من
کنت مولاہ کے معنے کیوں کر بدل گئے اور اولے سے اولےٰ بالتصرف
کیسے مراد ہو گیا۔ اُس نے تو یہ شکایت کی تھی کہ تم نے علیؓ کو ہم پر کیوں بڑھا دیا
اتنی بات سے علیؓ کی امامت موافق اصطلاح شیعہ کے کیسے ثابت ہو گی۔
بالفرض اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم بلالؓ سے محبت رکھنے کا حکم کرتے اور کوئی
شخص معاذ اللہ اس کی اس طرح تکذیب کرتا اور یہ کہتا کہ اگر یہ حکم سچ ہے
تو مجھ پر عذاب نازل ہو تب بھی وہ مستحق عذاب ہو جاتا اور اس نزول عذاب
سے بلالؓ کے لیے وہ صفت امامت نہ ثابت ہو جاتی جو شیعوں نے علیؓ کے
لیے فرض کی ہے۔

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ روایت یقیناً جھوٹی ہے۔

اول اس لیے کہ ثعلبی کے سوا کسی نے اس کو نقل نہیں کیا اور ثعلبی
ساقط الاعتبار ہے وہ اپنی تفسیر میں جھوٹی سچی ہر طرح کی کہانیاں لکھ دیتا ہے
اور صحیح غلط میں کچھ تمیز نہیں کرتا۔ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں طبقات
مفسرین میں لکھا ہے:۔

والاخباری لیس له شغل الا القصص واستیفاءھا والاخبار عمن سلف سواء کانت صحیحۃ او باطلۃ کالثعلبی۔

اور جو مفسر خبریں بیان کرنے کا شائق ہوتا ہے اس کو تفسیر قرآن میں اور کوئی شغل نہیں ہوتا مگر یہ کہ قصے لکھا کرے اور ہر طرح کے قصے لکھے خواہ صحیح ہوں خواہ باطل ہوں جیسے کہ ثعلبی

پس جب ثعلبی کی یہ حالت تھی کہ وہ سچی جھوٹی ہر طرح کی خبریں اپنی
تفسیر میں لکھتا ہے تو جو روایت ایسی ہو کہ اس کی تفسیر کے سوا کہیں اس کا پتہ
نہ ملے وہ ہرگز قابل اعتبار نہیں۔

دوسرے اس لیے کہ ثعلبی سفیان بن عیینہ کا قول نقل کرتا ہے اور
ثعلبی کا انتقال ۴۳۷ھ میں ہوا ہے اور سفیان بن عیینہ کا انتقال ۱۹۸ھ
میں ہوا ہے پس ضرور ہے کہ ثعلبی سے سفیان بن عیینہ تک کئی واسطے
درمیان میں ہوں جن کا پتا نہیں ملتا خدا جانے وہ کیسے لوگ ہوں گے پھر
ایسی بے سند روایت کیا قابل اعتبار ہے۔ مولوی حامد حسین صاحب
نے اس روایت کی توثیق کے لیے اول ثعلبی کے مناقب لکھے پھر سفیان کے
مناقب شروع کر دیے حالانکہ سفیان کی وفات سے ڈیڑھ سو برس کے بعد
ثعلبی پیدا ہوا ہے اور دونوں کی وفات کے سنہ بھی عبقات میں مذکور ہیں اور
جب تک تمام راویوں کا حال معلوم نہ ہو پھر بعض کی توثیق لکھنے سے کیا
فائدہ۔ درحقیقت عوام کو انھوں نے یہ دھوکا دیا کہ اس سند کے راوی سب
ثقہ ہیں۔

تیسرے یہ کہ سفیان بن عیینہ اگرچہ معتمد راوی ہے مگر آخر عمر میں
اس کا حافظہ خراب ہو گیا تھا تقریب میں اس کی نسبت لکھا ہے تغیر
حفظہ باخرۃ بگڑ گئی تھی یادداس کی آخر عمر میں۔ پس سفیان نے جو روایت
آخر عمر میں کی ہو وہ معتبر نہیں اور شاید یہ روایت اسی زمانے کی ہو۔

چوتھے یہ کہ سفیان اس روایت کو اپنے باپ سے نقل کرتا ہے جس کا علم

عیینہ بن ابی عمران تھا اس کا حال کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیسا شخص تھا۔ مولوی حامد حسین صاحب نے اس روایت کی توثیق کے لیے سفیان کے بہت سے مناقب لکھے مگر سفیان کے باپ کا کچھ ذکر نہ لکھا حالانکہ وہ بھی اس سند میں ایک راوی ہے بغیر اُس کی توثیق کے یہ سند کیا اعتبار ہو سکتی ہے۔

پانچویں یہ کہ اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجمع عظیم کے سامنے حارث پر آسمان سے عذاب نازل ہوا اور ایک پتھر ایسا برسا کہ حارث کے سر پر گرا اور نیچے سے نکل گیا جس کے صدمہ سے حارث مر گیا یہ ایک ایسا عجیب واقعہ تھا کہ اس کا بہت چرچا ہوتا اور بہت سے لوگ اس کے ناقل ہوتے حالانکہ ثعلبی کے سوا کوئی اس کو نقل نہیں کرتا پس ایسی عجیب خبر جس کا سلسلہ امام جعفر صادق تک ایسے غیر مقبول طریقے سے پہنچا اور اُن سے اوپر اس کا کچھ پتہ نہیں ملتا یقیناً غلط سمجھنے کے لائق ہے۔ کیا یہ کسی کی سمجھ میں آتا ہے کہ اتنے بڑے ہنگامے میں علیؓ کے سوا کسی کو اس حادثہ پر اطلاع نہ ہوئی اگر اوروں کو بھی اطلاع ہوئی ہوتی تو ضرور یہ خبر اوروں سے بھی منقول ہوتی پھر علیؓ نے حسینؓ کے سوا کسی سے یہ قصہ بیان نہیں کیا ورنہ چرچا ہو جاتا۔ اور اُن طریقوں سے بھی یہ خبر کتب حدیث میں موجود ہوتی۔ پھر امام حسینؓ سے امام جعفر صادقؒ تک ایسی امانت کے ساتھ یہ خبر پہونچی کہ ہر امام اپنے بڑے بیٹے کے سوا کسی سے بیان نہیں کرتا تھا ورنہ اوروں سے بھی سلسلہ اس خبر کا پہونچتا مگر امام باقر نے اس طریقے کو چھوڑا اور سفیان کے باپ سے بھی یہ قصہ کہہ دیا پھر سفیان سے بہت سے محدثین روایتیں لیتے تھے اور

ان کی روایتیں کتب احادیث میں بھری ہوئی ہیں مگر یہ روایت سفیان نے اُن محدثین سے نہ بیان کی جن کی روایتیں کتب صحاح و سنن وغیرہ میں پہونچیں اسی راوی سے بیان کی جس نے ایک نامعلوم طریقے سے ثعلبی تک پہنچا دی یہ عجائبات ہرگز قبول کرنے کے لائق نہیں اور ایسی عجیب خبر اس طرح مخفی بھی نہیں رہ سکتی۔

چھٹے یہ کہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حارث پر عذاب نازل ہونے کے بعد آیت سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ نازل ہوئی، یہ آیت انتیسویں پارہ میں سورۂ معارج کے شروع میں ہے معنی اس کے یہ ہیں کہ "طلب کیا ایک طالب عذاب نے وہ عذاب جو کافروں کے لیے ہے" یعنی کسی نے یہ دعا مانگی کہ اسی وقت وہ عذاب اُس پر نازل ہو جائے۔

یہ سورت قبل ہجرت مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ نسائی نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ اس آیت میں جس دعا مانگنے والے کا ذکر ہے اُس کا نام نضر تھا۔ محدثین نے لکھا ہے کہ نضر جنگ بدر میں مارا گیا۔ پس حارث کے قصہ میں بعد روز غدیر خم کے اس کا نازل ہونا غلط ہے اگر یہ شبہ ہو کہ شاید یہ آیت دوبارہ نازل ہوئی ہو ایک بار مشرکین کے قصہ میں اور دوبارہ حارث کے قصہ میں تو جواب یہ ہے کہ فریقین کے علمائے سلف میں سے کسی نے اس آیت کو اُن آیتوں میں شامل نہیں کیا جو مکرر نازل ہوئی ہیں اور یہ دلیل اس امر کی ہے کہ انھوں نے حارث کی روایت کو باطل سمجھا اور اس زمانے کے علما یہ لیاقت نہیں رکھتے کہ آج اپنی طرف سے کسی آیت کی نسبت تکرار نزول کا احتمال

پیدا کریں۔

مفسرین شیعہ بھی اس آیت کو مکی کہتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ کے نزدیک اس آیت میں لفظ سأل اور لفظ سائل سیلان سے مشتق ہے اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ "جاری ہوئی ایک سیلان والی چیز واسطے عذاب کے جو کافروں پر واقع تھا۔"

اور امام جعفر صادق نے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ یہ سیلان والی چیز آگ پھیلی ہوئی ہوگی جس کو فرشتے بڑھاتے ہوئے بنی امیہ کے گھروں تک لا دیں گے اور اُن گھروں کو وہ آگ جلا دے گی اور اس آگ کے ساتھ مہدی ہوں گے۔ پس امام جعفر صادق نے اس آیت کے ایسے معنی بتا دیے کہ اُس کو حارث کے قصہ سے کوئی تعلق باقی نہ رہا بلکہ اس آیت میں اُس عذاب کا ذکر ہے جو امام مہدی کے وقت میں آگ پھیل کر بنی امیہ کے گھروں کو جلائے گی اور سَأَلَ سَائِلٌ کے معنی یہ ہیں کہ "پھیلی پھیلنے والی چیز عذاب کے لیے" نہ یہ کہ "دعا مانگی دعا مانگنے والے نے عذاب کی" پس حارث نے جو دعا عذاب کی مانگی تھی اس کو اس آیت سے کوئی ربط نہ رہا اور اس تفسیر کے مطابق اس قصہ کا جھوٹا ہونا یقیناً ثابت ہو گیا۔ صاحب تفسیر قمی نے سورہ معارج کی تفسیر میں اول اس سورۃ کو مکی لکھا ہے پھر آیت سال سائل بعذاب واقع کی تفسیر میں لکھا ہے:۔

سئل ابو جعفر علیہ السلام عن معنی ھذا فقال نار تخرج من العذاب وملك یسوقھا

امام باقر علیہ السلام سے آیت سال سائل کے معنی پوچھے گئے تھے تو اُنھوں نے فرمایا کہ آگ ہوگی جو عذاب سے نکلے گی اور ایک

من خلفھا حتی یاتی دار بنی سعد بن ھشام عند مسجدھم فلا تدع دارا لبنی امیۃ الا احرقتھا۔

فرشتہ بڑھاتا ہوگا اُس کو اُس کے پیچھے سے یہاں تک کہ وہ اولاد سعد بن ہشام کے گھروں میں ان کی مسجد کے پاس آجائے گی۔ پس نہ چھوڑے گی بنی امیہ کا کوئی گھر مگر اس گھر کو اور گھر والوں کو جلا دے گی۔

ولا یدع دارا فیھا وتر لآل محمد الا احرقھا وذلك المھدی

اور نہ چھوڑے گی کوئی گھر جس میں آل محمد کا مال ہوگا مگر اس کو جلا دے گی اور یہی ہونگے مہدی۔

اس روایت سے ظاہر ہو گیا کہ اس آیت میں جس سائل یعنی سیلان کرنے والی چیز کے سیلان کا ذکر ہے وہ عذاب کی آگ مہدی کے زمانہ میں ہوگی۔ حارث کے قصہ سے اس آیت کا کوئی لگاؤ نہیں۔

ساتویں یہ کہ اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حارث بن نعمان فہری نے یہ کہا تھا کہ اے اللہ اگر پیغمبر کا یہ قول سچ ہے تو فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ یعنی ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا ہم پر سخت عذاب نازل کر دے۔ حالانکہ فریقین کے مفسروں کا اتفاق ہے کہ یہ قول ابوجہل وغیرہ مشرکین قریش کا تھا جس کو اللہ نے سورہ انفال میں نقل کیا ہے جو روز غدیر خم سے برسوں پہلے غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اہل سنت کے مفسرین کے اقوال مشہور ہیں حاجت ذکر نہیں۔ اب ہم مفسرین شیعہ کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ تفسیر قمی میں لکھا ہے:۔

وقوله- اِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ○ فانها نزلت لما قال رسول الله لقريش ان الله بعثني ان اقتل جميع ملوك الدنيا و اَجُرّ الملك اليكم فاجيبوني الى ما ادعوكم اليه-

اور قول اللہ کا اذ قالو الخ یعنی جب کہ کہا مشرکوں نے کہ اے اللہ اگر محمدؐ کا قول سچا ہے تیرے پاس سے تو برسا دے ہم پر پتھر آسمان سے یا لا ہم پر عذاب درد انگیز۔ یہ اس وقت نازل ہوئی تھی جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس لیے بھیجا ہے کہ تمام دنیا کے بادشاہوں کو قتل کروں اور سلطنت کو تمہاری طرف پہنچاؤں تو میری بات قبول کرلو جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں۔

؎ اس روایت کی مفصل بحث جلد ثانی میں بحث آیت استخلاف میں گزر چکی وہاں ہم نے اس روایت کا ترجمہ حیات القلوب سے نقل کیا تھا اب یہ روایت تفسیر قمی میں بھی مل گئی۔ اور جو اہل انصاف ہیں وہ اس روایت پر غور کر کے آیت استخلاف کا مطلب بھی بہت اچھی طرح سمجھ لیں گے اور یقین کر لیں گے کہ مصداق اس وعدہ کے خلفاء ہیں اب حضرات شیعہ یہ فرمائیں کہ قریش کے جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے موجود تھے اور انھیں سے رسولؐ نے یہ وعدہ کیا اُن میں سے عرب اور عجم کی سلطنت کس کو ملی اور کس کے حق میں یہ وعدہ پورا ہوا یا کسی کے حق میں پورا نہ ہوا اور خدا رسول کا وعدہ جھوٹا ہو گیا۔ معاذ اللہ منہا۔ اور اگر خلفاء کے حق میں پورا ہوا تو وہ ضرور جنت کے بھی بادشاہ ہیں (باقی صفحہ ۵۷۵)

تملكون بها العرب و تدين لكم بها العجم و تكونوا ملوكا في الجنة

بادشاہ ہو جاؤ گے تم اُس کی وجہ سے عرب کے اور محکوم ہو جاوے گا تمہارا اُس کے سبب عجم۔ اور ہو گے تم بادشاہ جنت میں۔

فقال ابوجهل اللهم ان كان هذا الذي يقول محمد هو الحق فامطر علينا حجارة الخ

تو ابوجہل نے کہا کہ اے اللہ اگر یہ قول جو محمدؐ کہتا ہے سچا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے۔

پس بخوبی ظاہر ہو گیا کہ یہ قول روز غدیر خم سے پہلے کفار قریش نے کہا تھا اور چونکہ اس روایت میں اس کی نسبت حارث کی طرف ہے اس لیے یہ روایت غلط ہے۔ اگر یہ شبہ ہو کہ جس طرح مشرکین قریش نے پہلے یہ قول کہا تھا اسی طرح حارث نے بھی کہا تو جواب یہ ہے کہ تب بھی اس روایت کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گیا اس لیے کہ جن کفار قریش نے یہ قول کہا تھا اُن پر عذاب نازل نہیں ہوا اور پتھر نہیں برسے۔

حالانکہ اُن کا کفر حارث کے مقابلہ میں بہت بڑھا ہوا تھا پس نہایت بعید ہے کہ اس قول کے کہنے سے حارث پر عذاب نازل ہو جائے حالانکہ اُس کا کفر مشرکین قریش کے کفر کے برابر نہ تھا۔

آٹھویں یہ کہ آیت نص قرآن کے خلاف ہے قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ اور نہیں ہے اللہ ایسا کہ اُن پر عذاب نازل کرے اور تو اُن میں موجود رہو۔ اس آیت سے

(بقیہ صفحہ ۵۷۴) یہ روایت اسی آیت کے تحت میں تفسیر صافی میں بھی مذکور ہے ۱۲

معلوم ہوگیا کہ جہاں رسولؐ موجود ہوں گے اُن لوگوں پر دنیا میں عذاب نازل نہ ہوگا۔ پس حارث بن نعمان فہری پر عذاب کا نازل ہونا قرآن کے مخالف ہے اس لیے یقیناً غلط ہے۔

نویں یہ کہ جو مضمون اس روایت میں ہے وہ شیعوں کی روایتوں کے مطابق بھی صحیح نہیں اس لیے کہ تفسیر صافی میں تحت آیۂ فامطر علینا حجارۃ من السماء الخ بحوالۂ کافی یہ منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ علیؓ میں عیسےٰؑ کی مشابہت ہے اور اگر مجھ کو یہ خوف نہ ہوتا کہ میری امت بھی علیؓ کو یہی کہنے لگے گی جو نصاریٰ نے عیسیٰ کو کہا تو میں علیؓ کے حق میں ایسی فضیلت بیان کر دیتا کہ لوگ اُن کی خاکِ قدم سے برکت حاصل کرنے لگتے اس پر حارث فہری ناراض ہوا اور اس نے کہا کہ اے اللہ اگر یہ سچ ہے تو مجھ پر آسمان سے پتھر برسا دے۔ چنانچہ جب وہ وہاں سے چلا اور مدینہ سے باہر ہوا تو ایک پتھر اُس پر پڑا جس سے اُس کی کھوپڑی پاش پاش ہوگئی۔

اس روایت سے بخوبی معلوم ہوگیا کہ ثعلبی کی روایت مطابق روایاتِ شیعہ بھی جھوٹی ہے۔ اور حدیث کافی کے مخالف ہے اس لیے کہ کافی کی روایت سے یہ معلوم ہوگیا کہ حارث پر جو عذاب نازل ہوا تھا اس کو حدیث ولایت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

دسویں یہ کہ جب اس حارث فہری کا اتنا بڑا حادثہ ہوا تھا تو جن محدثین نے ذکر صحابہ میں کتابیں جمع کی ہیں وہ ضرور حارث فہری کا نام لکھ کر

اس قصہ کو نقل کرتے مگر اس قسم کی کسی کتاب میں اس حارث فہری کا ذکر نہیں یہ دلیل اس امر کی ہے کہ تمام محدثین اس روایت کو باطل اور موضوع جانتے تھے اور اس نام کو فرضی نام سمجھتے تھے۔

پس بوجوہ مذکورہ بخوبی ثابت ہوگیا کہ حارث فہری پر عذاب نازل ہونے کی روایت جو تفسیر ثعلبی میں منقول ہے محض کذب و افترا ہے۔

ساتواں قرینہ مولیٰ کے معنی میں اولیٰ کو اولیٰ بالتصرف بنانے کا یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے حدیث من کنت مولاہ کی بہت سے صحابہ سے تصدیق کرائی اور مسجد کوفہ میں یہ فرمایا کہ جس نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سُنی ہو وہ گواہی دے چنانچہ بہت سے آدمیوں نے تصدیق کی یہ بڑی دلیل اس بات کی ہے کہ رسولؐ نے جو یہ حدیث فرمائی تھی اس سے مراد امامتِ علیؓ تھی۔

جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ہرگز اس روایت کو بطور نص امامت کے پیش نہیں کیا یعنی اس حدیث کے معنی انھوں نے یہ نہیں بتائے کہ رسولؐ یہ حکم کر گئے ہیں کہ میرے بعد علیؓ کو خلیفہ بنانا اور صحابہ سے جو اس روایت کی تصدیق چاہی وہ اپنی فضیلت ثابت کرنے کے لیے تھی نہ اس روایت کو نصِ امامت بنانے کے لیے۔

اس موقع پر صاحب عبقات نے چند عبارتیں اس مضمون کی نقل کی ہیں کہ بعض صحابہ کو یہ حدیث معلوم تھی مگر انھوں نے چھپائی۔ حضرت علیؓ نے اُن کے لیے بددعا کی جس کی وجہ سے وہ اندھے ہوگئے یا برص کی بیماری

ہو گئی۔

درحقیقت یہ سب جھوٹی باتیں شیعوں کی بنائی ہوئی ہیں۔

اب اس کے ثبوت کے لیے جو روایتیں صاحب عبقات نے پیش کی ہیں اُن کا حال سُنیے:۔

اول روایت اسد الغابہ کی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ابن عقدہ اپنی سند سے ابو غیلان سعد بن طالب سے اور وہ ابو اسحٰق سے اور وہ بہت سے آدمیوں سے روایت کرتا ہے کہ حضرت علیؓ نے صحن مسجد کوفہ میں یہ فرمایا کہ جس نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حدیث من کنت مولاہ الخ سُنی ہو وہ گواہی دے۔ بعض لوگوں نے گواہی دی اور بعض نے چھپایا اُن میں سے یزید بن ودیعہ اور عبدالرحمٰن بن مدلج بھی تھے۔

اس روایت کا پہلا راوی ابن عقدہ ہے جو متعصب رافضی ہے میزان الاعتدال میں اس کی نسبت لکھا ہے:۔

"برقانی کا قول ہے کہ میں نے دارقطنی سے پوچھا کہ تم ابن عقدہ کو کیسا سمجھتے ہو؟ اُس نے کہا کہ وہ ایسی حدیثیں زیادہ بیان کرتا تھا جو قابل انکار ہوتی تھیں اور حمزہ نے دارقطنی سے یہ روایت کی ہے کہ وہ بُرا آدمی تھا اُس میں رفض کی علامتیں تھیں اور ایک قول دارقطنی کا یہ ہے کہ ابن عقدہ دین میں قوی نہ تھا۔ ابو عمر کا قول ہے کہ ابن عقدہ صحابہ کی بُرائیاں بیان کیا کرتا تھا یا یہ کہا کہ شیخین کی بُرائیاں بیان کرتا تھا اس لیے میں نے اُس کی حدیث لینی چھوڑ دی۔ ابن عدی کا قول ہے کہ وہ شیعوں کا سردار تھا۔ ابو بکر بن ابی غالب کا

قول ہے کہ ابن عقدہ حدیث میں دیانت دار نہ تھا۔ اہل کوفہ کو حدیثوں کا رسالہ لکھ دیتا اور کہتا کہ ان کی روایت کرو پھر خود اُن سے اُن حدیثوں کی روایت کرتا۔

علماء شیعہ نے بھی یہ تصریح کی ہے کہ ابن عقدہ شیعوں کے فرقوں میں شامل تھا چنانچہ یوسف بحرانی نے لولوۃ البحرین میں اس کو زیدی جارودی لکھا ہے اور خلاصہ سے بھی اُس کا زیدی ہونا نقل کیا ہے اور یہ بھی نقل کیا ہے کہ وہ بہت سی روایتیں شیعوں سے لیتا تھا اور شیعوں سے اُس کا بہت اختلاط تھا۔

نہایت عجیب بات یہ ہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے کتاب اصابہ میں ابن عقدہ کی کتاب موالات سے نقل کیا ہے کہ ابن عقدہ نے بطریقہ موسی بن نصر الربیع حمصی روایت کی ہے کہ موسیٰ نے یہ بیان کیا کہ مجھ سے سعد بن طالب ابو غیلان نے یہ بیان کیا کہ مجھ سے ابو اسحٰق نے کہا کہ مجھ سے بہت لوگوں نے یہ بیان کیا کہ حضرت علیؓ نے مسجد کوفہ میں لوگوں کو قسم دلا کر کہا کہ جس نے رسولؐ سے حدیث من کنت مولاہ الخ سُنی ہے وہ گواہی دے۔ چند لوگ کھڑے ہوئے اُن میں عبدالرحمٰن بن مدلج بھی تھے ان سب نے گواہی دی کہ ہم نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سُنی ہے یہ روایت عبقات میں صفحہ ۱۳۲ پر مذکور ہے۔

پہلی روایت اسد الغابہ کی جس میں یہ مذکور ہے کہ عبدالرحمٰن بن مدلج نے گواہی چھپائی اسی ابن عقدہ کی ہے اور یہی سند ہے البتہ اس میں موسیٰ کا

واسطہ مذکور نہیں جو دوسری روایت کی سند سے ظاہر ہوگیا۔ اور دوسری روایت جو اصابہ کی ہے وہ بھی ابن عقدہ کی ہے اس کی بھی یہی سند ہے اُس میں یہ مذکور ہے کہ عبد الرحمٰن بن مدلج نے گواہی دی پس گواہی چھپانے کی روایت گواہی دینے کی روایت سے رد ہوگئی۔

مولوی حامد حسین صاحب کی لیاقت دیکھیے کہ اول ابن مدلج کا گواہی دینا ثابت کر چکے اور اُس کے ایک ورق بعد اُس کا گواہی چھپانا اُسی سند سے ظاہر کرتے ہیں۔

دوسری روایت عبداللہ بن احمد کی ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ احمد بن عمر وکیعی نے بیان کیا اُس نے کہا زید بن خباب نے بیان کیا اُس نے کہا کہ ولید بن عقبہ نزار عیسٰی نے بیان کیا اُس نے کہا کہ سماک بن عبید عیسٰی نے بیان کیا کہ میں عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے پاس گیا تو اُس نے بیان کیا کہ میں رحبہ یعنی صحن مسجد کوفہ میں حضرت علیؓ کے پاس گیا تھا انھوں نے فرمایا کہ جس نے غدیر خم کے روز رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قول سنا ہو ہیں، اُس کو قسم دیتا ہوں وہ کھڑا ہو جاوے اور وہی کھڑا ہو جس نے وہ حال دیکھا ہو اور جس نے نہ دیکھا ہو وہ نہ کھڑا ہو تو بارہ آدمی کھڑے ہوئے کہ ہم نے دیکھا ہے اور سُنا ہے کہ رسولؐ نے علیؓ کا ہاتھ پکڑا اور یہ فرمایا کہ اے اللہ دوست رکھ اس کو جو علیؓ کو دوست رکھے اور دشمنی کر اُس سے جو علیؓ سے دشمنی کرے اور مدد کر اُس کی جو علیؓ کی مدد کرے اور چھوڑ اُس کو جو علیؓ کو چھوڑے۔ تین آدمی نہیں کھڑے ہوئے اُن کے لیے علیؓ نے بد دعا کی اُس کا

وبال اُن پر پہونچا۔

اس روایت کی سند سے ولید بن عقبہ کو تقریب میں مجہول لکھا ہے یعنی اُس کا حال نہیں معلوم کیسا تھا ممکن ہے رافضی کذاب ہو۔ اسی طرح سماک بن عبید کا بھی حال معلوم نہیں لہذا یہ سند کسی طرح قابل اعتبار نہیں۔

تیسری روایت عبقات میں اس مضمون کی نقل کی ہے کہ زید بن ارقم نے اس حدیث کی گواہی چھپائی تھی اُس کے وبال میں وہ اندھے ہوگئے (معاذ اللہ منہا) یہ روایت ابن مغازلی کی کتاب مناقب سے نقل کی ہے جس کی عبارت یہ ہے:۔

اخبرنا ابو الحسین علی بن عمر بن عبد اللہ قال حدثنی احمد بن یحیٰی حدثنی اسرائیل الملائی عن الحکم بن ابی سلیمان المؤذن عن زید بن ارقم قال نشد علی الناس فی المسجد انشد رجلا سمع النبی یقول من کنت مولاہ الخ کنت انا فیمن کتم فذھب بصری۔

ہم سے خبر بیان کی ابو الحسین علی بن عمر نے انھوں نے کہا کہ ہم سے کہا احمد بن یحیٰی نے انھوں نے کہا کہ ہم سے کہا اسرائیل ملائی نے حکم بن ابی سلیمان موذن سے انھوں نے زید بن ارقم سے انھوں نے کہا کہ قسم دلا کر پوچھا علیؓ نے مسجد میں کہ قسم دلاتا ہوں میں اُس کو جس نے نبی سے حدیث من کنت مولاہ الخ سُنی ہو۔ زید کہتے ہیں کہ میں اُن میں تھا جنھوں نے گواہی چھپائی تو میری بینائی جاتی رہی۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اس حدیث کی روایت چھپانے کی

وجہ سے زید کی بینائی جاتی رہی تھی اسی روایت کی وجہ سے بعض مصنفین اس غلطی میں پھنس گئے ہیں۔

اس روایت سے چھ ورق پہلے عبقات کے صفحہ ۵۲ پر ابوبکر شافعی کی کتاب فوائد سے جو روایت منقول ہے اُس سے ظاہر ہے کہ زید بن ارقم نے کھڑے ہو کر گواہی دی وہ روایت یہ ہے:-

حدثنا محمد بن سلیمان بن الحرث حدثنا عبید الله بن موسیٰ ثنا ابو اسرائیل الملائی عن الحکم عن ابی سلیمان المؤذن عن زید بن ارقم ان علیاً انشد الناس من سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللهم وال من والاہ وعاد من عاداہ فقام ستۃ عشر رجلا فشهدوا بذلک و کنت فیهم۔

بیان کیا ہم سے محمد بن سلیمان نے وہ کہتا ہے بیان کیا ہم سے عبید اللہ بن موسیٰ نے وہ کہتا ہے بیان کیا ہم سے ابو اسرائیل ملائی نے حکم سے اُس نے ابی سلیمان موذن سے اُس نے زید بن ارقم سے کہ علیؓ نے قسم دلا کر پوچھا لوگوں سے کس نے سُنا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں جس کا پیارا ہوں علیؓ بھی اُس کا پیارا ہے۔ اے اللہ محبت کر اُس سے جو علی سے محبت کرے اور دشمنی کر اُس سے جو علی سے دشمنی کرے تو کھڑے ہوئے سولہ آدمی اُنھوں نے اس کی گواہی دی زید بن ارقم کہتے ہیں کہ اُنھیں میں سے میں بھی تھا۔

اس روایت سے ثابت ہوگیا کہ زید بن ارقمؓ بھی اُنھیں صحابہ میں شامل تھے جنھوں نے اس حدیث کی گواہی دی یہی روایت عبقات حدیث ولایت کے حصہ ثانی کی جلد اول میں صفحہ ۱۳۷ پر بحوالہ ابن کثیر منقول ہے۔

ابو اسرائیل الملائی سے لے کر آخر تک سندیں ان دونوں روایتوں کی ایک ہیں پس ظاہر ہے کہ روایت چھپانے کا افترا اُن راویوں نے کیا جو مغازلی کی سند میں ابو اسرائیل سے نقل کرتے ہیں۔

زیدؓ بن ارقم سے حدیث ولایت کی اتنی روایتیں عبقات میں منقول ہیں کہ اگر اُن سب کو جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے

عبقات کی جلد مذکورہ میں صفحہ ۵۷ پر بحوالہ سند امام احمد ابو الطفیل سے یہ روایت ہے کہ جب علیؓ نے مسجد کوفہ میں حدیث ولایت پر شہادت طلب کی تو میرے دل میں کچھ شبہہ پیدا ہوا میں وہاں سے نکلا اور زیدؓ بن ارقم سے ملا اور اُن سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ تو اس حدیث کا کیوں انکار کرتا ہے میں نے یہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے۔ اب غور فرمائیے کہ اگر زید بن ارقم اس روز اس حدیث کی گواہی چھپاتے تو اُسی وقت ابو الطفیل کے سوال کے جواب میں اُس کی شہادت کیوں دیتے یہ روایت عبقات میں پانچ چھ جگہ متعدد کتابوں کے حوالے سے منقول ہے۔ پس تعجب ہے کہ صاحب عبقات یہ تمام روایتیں نقل کر چکے ہیں اور جب اُن سب کو بھول کر یہ ثابت کرتے ہیں کہ زیدؓ بن ارقم نے اس حدیث کی گواہی چھپائی یہ مدہوشی نہیں تو اور کیا ہے؟-

چوتھی روایت یہ ہے کہ انسؓ بن مالک نے بھی یہ گواہی چھپائی تھی جس کے وبال میں اُن پر برص کا مرض ظاہر ہو گیا۔ اس کے ثبوت میں صاحب عبقات نے محض بے سند اقوال نقل کیے ہیں جو کسی طرح قابل اعتبار نہیں۔

حالانکہ اس موقع سے پانچ ورق پہلے صفحہ ۱۲۸ پر عبقات میں بحوالہ ابن مغازلی یہ روایت معہ سند منقول ہے کہ ابو سعیدؓ خدری اور ابو ہریرہؓ اور انسؓ بھی اُن صحابہ میں شامل تھے جنھوں نے مسجد کوفہ میں حضرت علیؓ کے سوال کے جواب میں حدیث ولایت کی شہادت دی تھی اور پھر اُسی روایت کو صفحہ ۲۰۳ پر بحوالہ طبرانی کے نقل کیا ہے اور اسی حدیث کو حصہ ثانی کی جلد اول میں صفحہ ۱۰۸ پر بحوالہ تاریخ ابن کثیر نقل کر چکے ہیں اور یہی مضمون صفحہ ۱۳۹ پر بحوالہ کنز العمال نقل کیا ہے اس کے علاوہ جا بجا یہ روایت متعدد کتابوں سے معہ سند کے نقل کی ہے باایں ہمہ یہ دعویٰ کہ انسؓ نے یہ روایت چھپائی ایسا کھلا ہوا تعصب اور عناد ہے جس کی انتہا نہیں۔

پھر جمال الدین محدث کی کتاب اربعین کے حوالے سے ایک روایت محض بے سند نقل کی ہے جس میں انسؓ بن مالک اور براءؓ بن عازب کی گواہی چھپانے کا ذکر ہے۔ بہت بڑا قرینہ اُس کے غلط ہونے کا یہ ہے کہ براء بن عازب سے بھی حدیث ولایت کی روایتیں موجود ہیں اور عبقات میں جا بجا منقول ہیں۔ جب براء بن عازب علانیہ اس حدیث کی روایت کرتے تھے پھر کیوں چھپاتے؟۔

دوسری دلیل اس روایت کے جھوٹے ہونے کی یہ ہے کہ اس میں انسؓ کی گواہی چھپانے کا بھی ذکر ہے۔ حالانکہ انسؓ کا گواہی دینا بہت سی روایتوں سے ثابت ہے جو عبقات میں جا بجا منقول ہیں۔

تیسری دلیل اس روایت کے جھوٹے ہونے کی یہ ہے کہ یہ روایت جمال الدین محدث کی کتاب اربعین سے نقل کی ہے یہ شخص شیعہ تھا تقیہ کرکے اپنے آپ کو اہل سنت ظاہر کرتا تھا بعض علمائے اہل سنت نے بھی اس کے حال میں دھوکا کھایا مگر علامۂ شوستری نے مجالس[1] المومنین میں اُس کا راز فاش کر دیا۔ چنانچہ اُس میں جمال الدین کے بہت سے مناقب لکھے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس تمام سلسلہ علیہ نے بہ نظر مصلحت و بغرض تحصیل معاش اہل سنت کی کتب حدیث کا درس اختیار کیا تھا لیکن اُن کے حق ہونے کے معتقد نہ تھے اور اصل عقیدہ جمال الدین کا اُس کی کتاب تحفۃ الاحبا سے ظاہر ہوتا ہے۔ مخدوم الملک لاہوری نے اُس کتاب کے نسخے جلوا دیے تھے۔

یہ وہی جمال الدین محدث ہیں جن کی تصنیف کتاب روضۃ الاحباب ہے جس کی روایتیں حضرات شیعہ اکثر پیش کیا کرتے ہیں چنانچہ مجالس[1] المومنین میں لکھا ہے:-

"از مولفات فصاحت صفات حضرت نقابت منقبت روضۃ الاحباب فی سیرۃ النبی والآل والاصحاب در اقطار شہرت تمام دارد۔"

۱؎ مجالس المومنین مطبوعہ طہران ص ۲۲۷ مجلس پنجم ۲؎ شرح میسم مطبوعہ طہران ج ۱۔

ایک روایت کتاب الانساب الاشراف کے حوالے سے نقل کی ہے یہ بھی بے سند ہے اس لیے حجت نہیں ہو سکتی اس میں مذکور ہے کہ انسؓ اور براء بن عازبؓ اور جریرؓ بن عبداللہ بجلی نے حضرت علیؓ کے جواب میں حدیث ولایت کی گواہی چھپائی اُن کے لیے حضرت علیؓ نے بددعا کی۔ انسؓ کو برص ہو گیا، براء بن عازبؓ اندھے ہو گئے، جریرؓ بن عبداللہ وحشی ہو کر جنگل کو نکل گئے۔

اس روایت کا جھوٹا ہونا اس سے ظاہر ہو گیا کہ انسؓ کا گواہی چھپانا اس میں مذکور ہے جس کی تکذیب بہت سی روایتوں سے اسی عبقات میں منقول ہے۔ براء بن عازبؓ سے بھی حدیث ولایت کی روایتیں موجود ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ جریر بن عبداللہ کی گواہی چھپانے کا بھی صاحب عبقات نے یقین کر لیا حالانکہ یہ امر علمائے شیعہ کی شان سے نہایت بعید ہے۔ یہ وہ جریر ہیں جو حضرت علیؓ کے زمانۂ خلافت میں اُن کے بڑے معتمد اور مقرب تھے اور امیر معاویہؓ سے خط کتابت انھیں کی معرفت ہوتی تھی۔ اور وہ مشہور خط جناب امیر کا جس میں یہ مضمون تھا انہ بایعنی القوم الذین بایعوا ابا بکر و عمر و عثمان یعنی مجھ سے اُن لوگوں نے بیعت کر لی جنھوں نے ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ سے بیعت کی تھی" انھیں جریر کے ہاتھ امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ علامۂ میثم نے شرح نہج البلاغت میں وہ پورا خط جناب امیر کا نقل کیا ہے جس کے آخر کا فقرہ یہ ہے:-

لے شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۱۱

وقد ارسلت جریر بن عبداللہ وھو من اھل الایمان والھجرۃ فبایع

اور میں نے بھیجا ہے جریر بن عبداللہ کو اور وہ صاحب ایمان اور صاحب ہجرت ہے تو بیعت کر لے۔

پس جناب امیر نے جریر بن عبداللہ کو صاحب ایمان اور مہاجر فرمایا اور اپنا معتمد سمجھ کر امیر معاویہؓ کے پاس بھیجا اور امیر معاویہ کو یہ لکھ بھیجا کہ ان کے ہاتھ پر ہماری بیعت کر لو پس کیوں کر ممکن ہے کہ جریر جو ایسا کامل الایمان اور صاحب مناقب ہو وہ جناب امیر کے جواب میں حدیث ولایت کی گواہی چھپاوے۔ حالانکہ کافی کی روایتوں سے ثابت ہے کہ ائمہ ہر شخص کی صورت دیکھ کر معلوم کر لیتے تھے کہ وہ نجات پانے والا ہے یا ہلاک ہونے والا ہے۔

پس جس کو جناب امیر اہل ایمان کہہ دیں وہ کبھی مخالف ایمان نہیں ہو سکتا۔

ایک روایت حلیہ کی نقل کی ہے جس میں اسماعیل بن یحیٰی مسعر سے وہ طلحہ بن مصرف سے وہ عمیرہ بن سعد سے روایت کرتا ہے کہ حضرت علیؓ نے جب حدیث ولایت پر شہادت طلب کی تو اُس وقت ممبر کے پاس بارہ آدمی تھے جن میں ابو سعیدؓ اور ابوہریرہؓ اور انسؓ بھی تھے سب نے اس حدیث کی گواہی دی مگر ایک شخص نے نہیں دی اُس کے لیے حضرت علیؓ نے بددعا کی تو موت سے پہلے اُس کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں برص کا داغ ظاہر ہو گیا۔

اس روایت میں کسی شخص کا نام نہیں لیا گیا کہ وہ کون تھا پس صاحب
عبقات کا اپنی طرف سے یہ قیاس کرنا کہ وہ انسؓ تھے کسی طرح صحیح نہیں
ہو سکتا اس لیے کہ انسؓ کا گواہی دینا بہت سی روایتوں سے ثابت
ہے۔

یہ روایت عمیرہ بن سعد سے ہے میزان الاعتدال میں اس کی
نسبت لکھا ہے:۔
"یحییٰ بن قطان کا قول ہے کہ اُس کے بیان پر اعتماد نہیں کرتے
تھے" ایک راوی اس سند کا اسماعیل بن عمر بجلی ہے اُس کی نسبت
میزان الاعتدال میں لکھا ہے" ابو حاتم اور دارقطنی کا قول ہے کہ وہ ضعیف
ہے" ابن عدی کا قول ہے کہ وہ ایسی حدیثوں کی روایت کرتا تھا جن کی
کسی دوسرے کی روایت سے تصدیق نہیں ہوتی تھی من جملہ ان کے اُس
کی ایک حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو
امام ہو وہ اذان نہ دے۔ پھر ذہبی نے لکھا ہے کہ اُس کا انتقال سنہ دوسو
ستائیس میں ہوا ہے اور اُس نے باطل حدیث کی روایت کی ہے۔
عبقات جلد آخر حصہ ثانی کے صفحہ ۱۵۳ پر حدیث بساط مذکور ہے
اُس میں بھی انسؓ کی گواہی چھپانے کا ذکر ہے۔ صاحب عبقات نے یہ روایت
اس امر کے ثبوت کے لیے نقل کی ہے کہ جناب امیر نے ابوبکرؓ کے سامنے
اپنی خلافت اور امامت ثابت کرنے کے لیے رسولؐ کا حکم اس مضمون کا پیش
کیا تھا کہ علیؓ کو میرے بعد امام اور خلیفہ بنانا۔

حاصل اس روایت کا یہ ہے کہ اسعد بن ابراہیم اپنے استاذ ابن
دحیہ سے بسند ثوری یہ روایت کرتا ہے کہ سالم کہتا تھا کہ میں انسؓ کے پاس
گیا تو وہ اندھے تھے اور اُن کے بدن پر برص کا داغ تھا ایک شخص نے اُن سے
پوچھا کہ تمھارے یہ داغ کیسے ہوگیا حالانکہ رسولؐ نے فرمایا ہے کہ مومن کو برص اور
جذام نہیں ہوتا تو انسؓ نے سر جھکا لیا اور رو دیے پھر یہ قصہ بیان کیا کہ جب سورۂ
کہف نازل ہوئی تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض صحابہ نے کہا کہ ہم اصحاب
کہف کے دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ رسولؐ نے فرمایا کہ علیؓ کو بلاؤ۔ جب علیؓ آئے
تو رسولؐ نے مجھ سے کہا کہ انس یہ بساط یعنی بچھونا بچھاؤ جو حسب اتفاق کسی نے
ہدیہ بھیجا تھا۔ جب میں نے وہ بچھونا بچھایا تو رسولؐ نے صحابہ کو حکم کیا کہ اس پر بیٹھ جاؤ
جب لوگ بیٹھ گئے وہ بچھونا ہوا میں اُڑ کر چلا اور ہم سب اُس پر بیٹھ کر ظہر کے
وقت وہاں پہنچ گئے جہاں اصحاب کہف تھے وہ سب سوتے تھے اُن کے منھ
قندیلوں کی طرح روشن تھے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے اور کُتا دروازے پر
اپنے دونوں بازو پھیلائے بیٹھا تھا۔ ہم سب پر رعب غالب تھا۔ امیرالمومنین
آگے بڑھے اور السلام علیکم کہا اور اصحاب کہف نے سلام کا جواب دیا پھر
ہم سب آگے بڑھے اور سلام کیا تو اصحاب کہف نے سلام کا جواب نہ دیا۔
علیؓ نے اُن سے پوچھا کہ تم نے صحابہ کے سلام کا جواب کیوں نہ دیا؟ تو انھوں
نے کہا کہ تم رسولؐ سے اس کی وجہ پوچھ لینا۔ پھر علیؓ نے صحابہ سے کہا کہ اب
بساط پر بیٹھ جاؤ جب سب بیٹھ گئے تو علیؓ نے ملائکہ کو حکم کیا کہ اس بساط کو اُڑا
لے چلو چنانچہ وہ بساط اُڑ چلی۔ راستہ میں ایک جگہ حکم کیا کہ ہم کو ظہر کی نماز کے لیے

اُتار دو تو ہم ایسی زمین میں اُترے جہاں پانی نہ تھا۔ علیؓ نے زمین پر ٹھوکر ماری تو پانی جاری ہوگیا ہم سب نے وضو کر کے نماز پڑھی اور پانی پیا پھر وہاں سے بساط اُڑی اور عصر کے وقت مدینہ میں مسجد کے دروازے پر پہونچ گئے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دیکھ کر فرمایا کہ تم سب قصہ بیان کرو گے یا میں بیان کر دوں۔ پھر رسولؐ نے وہ سارا قصہ اس طرح بیان کر دیا کہ گویا ہمارے ساتھ تھے۔ علیؓ نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ کہ انھوں نے میرے سلام کا جواب دیا اور صحابہ کے سلام کا جواب نہ دیا تو رسول نے فرمایا کہ اصحاب کہف نبی اور وصی کے سوا کسی کے سلام کا جواب نہیں دیتے۔ پھر رسولؐ نے علیؓ سے کہا کہ اے علیؓ انس کو اس پر گواہ بنالو۔ پھر جب رسولؐ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ کو سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے لیے منتخب کیا گیا تو علیؓ نے مجھ سے کہا کہ اے انس قصہ بساط بیان کر میں نے کہا کہ میں بھول گیا تو علیؓ نے فرمایا کہ اگر تو نے رسولؐ کی وصیت کے بعد اس کو چھپایا تو اللہ تیرے منھ پر برص پیدا کر دے اور تیرے پیٹ میں حرارت پیدا کر دے اور تجھے اندھا کر دے۔ چنانچہ انسؓ پیٹ کی حرارت کی وجہ سے رمضان کے روزے نہیں رکھ سکتے تھے اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتے تھے۔

اس قصہ سے صاحب عبقات اتنا ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نبیؐ نے علیؓ کو وصی کہا تھا مگر اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ نبیؐ نے علیؓ کو کس امر کی وصیت کی تھی۔

اس سے پہلے صاحب عبقات یہ دعویٰ کر چکے ہیں کہ انسؓ نے مسجد کوفہ میں حدیث ولایت کی گواہی چھپائی تھی اور حضرت علیؓ نے اُن کے لیے بددعا کی تھی اس وجہ سے وہ برص میں مبتلا ہو گئے مگر وہ دعویٰ اس روایت سے خود بخود رد اور باطل ہوگیا اس لیے کہ اس روایت سے یہ ثابت ہوگیا کہ انسؓ نے مدینہ میں خلافت ابی بکرؓ کے وقت حدیث بساط کی گواہی چھپائی تھی اس کی وجہ سے انسؓ برص وغیرہ میں مبتلا ہوئے۔ پس اس روایت کو نقل کر کے صاحب عبقات نے اپنے پہلے دعوے کو خود ہی رد کر لیا۔

اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ قصہ جھوٹا ہے۔

اول اس لیے کہ ابن وحیہ کے سوا اس کی کوئی روایت نہیں کرتا ابن وحیہ کی نسبت جلال الدین سیوطیؒ نے کتاب تدریب الراوی میں اُن لوگوں کے ذکر میں جو جھوٹی حدیثیں بنایا کرتے تھے یہ لکھا ہے:۔

وضرب یلجون الی اقامۃ دلیل علی ما افتوا بہ فیضعون وقیل ان الحافظ ابا الخطاب ابن دحیۃ کان یفعل ذلك وکانہ ھو الذی وضع الحدیث لقصر المغرب	اور ایک فریق جھوٹی حدیث بنانے والوں کا وہ ہے کہ وہ مجبور ہوتے ہیں اس بات پر کہ جو فتوے وہ دے چکے ہیں اُس پر کوئی دلیل قائم کریں اس لیے وہ جھوٹی حدیث بنا لیتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ بے شک حافظ ابو الخطاب ابن وحیہ ایسا ہی کیا کرتا تھا اور شاید اسی ابن وحیہ نے یہ حدیث جھوٹی بنائی ہے کہ مغرب کی نماز میں بھی قصر کرنا چاہیے۔

پس جب ابن دحیہ کی یہ حالت تھی اور اُس کے سوا کوئی دوسرا شخص اس حدیث کی روایت نہیں کرتا تو یقیناً ثابت ہوگیا کہ حدیث بساط کا ناول ابن دحیہ کی تصنیف ہے یا ابن دحیہ نے شیعوں کی کتابوں میں یہ روایت دیکھ کر ایک سند اُس کے لیے تصنیف کرلی۔

دوسرے یہ کہ حدیث بساط میں یہ بھی مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کو برص اور جذام نہیں ہوتا اور یہ حدیث جھوٹی ہے پس حدیث بساط بھی جھوٹی ہے۔

تیسرے یہ کہ ایسا عجیب قصہ اگر واقع ہوا ہوتا تو بہت مشہور ہوتا اور بہت سی روایتوں میں اُس کا ذکر ہوتا اور جتنے صحابہ اُس بساط پر گئے تھے اور جن کے سامنے وہ بساط واپس آئی اور جس جس نے یہ قصہ سُنا ہوگا سب اُس کی روایت کرتے حالانکہ فقط ایک ابن دحیہ جس کا حال معلوم ہوچکا ایک انسؓ سے اس قصہ کو نقل کرتا ہے ایسی حالت میں اس روایت کے جھوٹے ہونے میں کیا شبہ باقی رہا۔

آٹھواں قرینہ حدیث ولایت میں اولےٰ کو اولیٰ بالتصرف بنانے کا یہ ہے کہ جب مسجد کوفہ میں علیؓ نے حدیث ولایت پر گواہی طلب کی تو ابوالطفیل کہتے ہیں کہ میرے دل میں کچھ شبہ پیدا ہوا میں زید بن ارقمؓ سے ملا اور اُن سے کہا کہ علیؓ ایسی حدیث بیان کرتے ہیں تو زید نے کہا کہ تو کیوں انکار کرتا ہے میں نے رسولؐ سے یہ حدیث سُنی ہے۔ ابوالطفیل کو جو تعجب ہوا اس سے ثابت ہوگیا کہ اس حدیث میں علیؓ کی امامت مراد نہ تھی ورنہ تعجب کیوں ہوتا۔

جواب یہ ہے کہ ابوالطفیل کو شبہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں یہ حدیث بیان فرمائی تھی تو ضرور تھا کہ نہایت مشہور ہوتی حالانکہ ابوالطفیل نے اُس روز تک یہ حدیث سُنی بھی نہ تھی۔

درحقیقت یہ ابوالطفیل کی روایت بہت بڑی دلیل اس امر کی ہے کہ زیدؓ بن ارقم نے مسجد کوفہ میں حدیث ولایت کی گواہی نہیں چھپائی تھی ورنہ اسی وقت وہ ابوالطفیل کے سامنے اس حدیث کی شہادت کیوں دیتے؟

نواں قرینہ حدیث ولایت میں اولیٰ کو اولیٰ بالتصرف بنانے کا یہ ہے کہ بعض روایتوں میں وارد ہے کہ رسولؐ نے حدیث ولایت کی ابتدا میں یہ فرمایا تھا کہ کیا میں مومنوں کے لیے اُن کی جان سے اولےٰ نہیں ہوں؟ اس میں اولےٰ سے اولےٰ بالتصرف مراد ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ جس کا میں مولےٰ ہوں علیؓ بھی اُس کا مولےٰ ہے پس معلوم ہوا کہ مولیٰ سے بھی اولیٰ بالتصرف مراد ہے۔

جواب یہ ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا کہ میں مومنین کے نزدیک اُن کی جانوں سے اولےٰ نہیں ہوں، اس میں بھی مراد اولےٰ سے اولیٰ بالمحبت ہے۔ کیا تم مجھ کو اپنی جانوں سے زیادہ محبوب نہیں سمجھتے اور یہ قرینہ اس امر کا ہے کہ مولیٰ سے بھی محبوب مراد ہے۔ پس رسولؐ کی تقریر کا حاصل یہ ہوا کہ جب مجھے اپنی جانوں سے زیادہ عزیز جانتے ہو تو میری یہ بات مان لو کہ جو

مجھ سے عہدِ دوستی رکھتا ہے وہ علیؓ سے بھی دوستی رکھے جس کا حاصل یہ ہوا کہ جو مجھ سے
محبت رکھتا ہے وہ علیؓ سے محبت رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو یہ فرمایا تھا کہ کیا میں مومنوں
کے لیے اُن کی جان سے اولیٰ نہیں ہوں اس کی تفسیر دوسری حدیث صحیح سے
بہت اچھی طرح ہوتی ہے اور وہ یہ ہے :- لن یومن احدکم حتی اکون
احب الیہ من نفسہ نہیں مومن ہوگا کوئی تم میں کا جب تک کہ مجھ کو اپنی
جان سے بڑھ کر محبوب نہ بنالے گا۔ قرآن میں جو اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ
اَنْفُسِھِمْ مذکور ہے اُس کا بھی یہی مطلب ہے۔ اور جن مفسرین کی عبارت
عبقات میں منقول ہے سب کی یہی مراد ہے بلکہ تفاسیر شیعہ میں بھی یہی مذکور
ہے۔ چنانچہ تفسیر صافی میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:- فیجب علیھم
ان یکون احب الیھم من انفسھم یعنی مومنین پر واجب ہے کہ
رسولؐ اُن کو اپنی جان سے زیادہ محبوب ہو۔ اور آخر جملہ حدیث کا بھی معنی،
محبت کا قرینہ ہے۔

صاحب عبقات نے اسی قسم کے فضول قرینے اولیٰ کو اولیٰ بالتصرف
بنانے کے بہت سے ذکر کیے ہیں جن میں سے جو عمدہ دلائل تھے اُن کی حقیقت
ہم ظاہر کر چکے باقی ایسے ہیں جو قابل بحث بھی نہیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت عمرؓ حضرت
علیؓ کو ہمیشہ اپنا مولیٰ کہا کرتے تھے اور غدیر خم کے روز بھی انہوں نے مبارک
باد دی کہ اے علیؓ اب تم ہر مومن و مومنہ کے مولیٰ ہوگئے۔
اس سے ظاہر ہوگیا کہ مولیٰ سے اولےٰ بالتصرف مراد ہے۔ یہ ایسی

دلیلیں ہیں کہ علماء کو ایسی باتوں سے شرم چاہیے مگر اس کا کیا علاج کہ حضرات
شیعہ کی تمام دلیلیں اسی قسم کی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس وجہ سے مبارک باد دی
کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں عین خطبہ میں علیؓ
کی فضیلت بیان کر دی اور تمام مومنین کو اُن سے محبت رکھنے کا حکم کیا ایسے
مجمع عظیم میں ایسی فضیلت کا بیان ہونا ایک ایسی شرافت تھی جو جناب امیر
سے مختص تھی اس لیے قابل مبارک باد تھی۔ حضرت عمرؓ اُن کو ہمیشہ مولیٰ یعنی یار
کہتے تھے جو معنی ہم سوگند کا حاصل ہے پھر اس سے معنی امامت مصطلحہ حضرات شیعہ
کیوں کر ثابت ہوگئے۔

اس موقع پر ایک اور بحث بھی صاحب عبقات نے پیش کی ہے۔
اور وہ یہ ہے کہ مولیٰ بمعنی متولی امر اور متصرف امر بھی آتا ہے اس اعتبار سے
بھی مولیٰ کے معنی حاکم کے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ مولیٰ کا لفظ جب اللہ کے واسطے بولا جاتا ہے اور
اُس وقت جو متصرف اور متولی کے معنی لیے جاتے ہیں اُس سے تصرف ربوبیت
مراد ہوتا ہے اس لیے کہ مولیٰ کے معنی رب کے بھی ہیں یہ تصرف اللہ سے مختص ہی
بندہ کے لیے ثابت نہیں ہوسکتا اور جب کسی انسان کے لیے مولیٰ بمعنی متصرف
اور متولی بولا جاتا ہے تو وہاں وہ تصرف مراد ہوتا ہے جو ولی اور متولی کو حاصل
ہوتا ہے اور متصرف کے معنی مہتمم کے ہوتے ہیں جیسے ولی میت اور ولی وقف اور
ولی نکاح اور ولی یتیم اور ولی بیع۔

مولیٰ کے ایک معنی مالک کے بھی ہیں پس مولیٰ کے معنی میں کبھی وہ

تصرف مراد ہوتا ہے جو تصرف مالک کو اپنے مملوک میں ہوتا ہے وہ بھی حکومت
شاہی کا تصرف نہیں ہوتا پس مولیٰ جو بمعنی متصرف اور متولی ہے اُس سے حاکم
مراد لینا بہت بڑا مغالطہ ہے۔

صاحب عبقات نے یہ بھی لکھا ہے کہ بخاری نے معمر خارجی کا یہ قول
نقل کیا ہے کہ مولیٰ بمعنی ملیک بھی آتا ہے اور اور ملیک کے معنی بادشاہ
کے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ مولیٰ بمعنی ملیک کے معمر خارجی کے سوا کسی نے نہیں
کہا نہ اُس سے پہلے نہ اُس کے بعد پس یہ قول باتفاق واجماع اہل لغت غیر
مقبول ہے۔ شارحین بخاری نے معمر کے قول کی تاویل یہ کی ہے کہ مولےٰ کا
اطلاق بادشاہ پر اس وجہ سے صحیح ہو سکتا ہے کہ بادشاہ آدمیوں کا متولی
بھی ہوتا ہے یعنی جس طرح وہ حاکم ہوتا ہے اسی طرح اوقاف اور یتامے کا
متولی بھی ہوتا ہے۔ اس تاویل سے یہ ثابت ہو گیا کہ شارحین نے یہ تسلیم نہیں
کیا کہ مولیٰ کے معنی حقیقی بادشاہ کے ہیں بلکہ اُن کی مراد یہ ہے کہ مولےٰ کے
معنی حقیقی متولی کے ہیں اور اس وجہ سے بادشاہ کو بھی معمر نے مولیٰ کہہ دیا کیونکہ
وہ بھی متولی ہوتا ہے۔ پس یہ قول بھی شیعوں کو کچھ مفید نہیں ہوا اس لیے کہ
ہماری بحث معنی حقیقی میں ہے پس جس طرح باعتبار معنی متولی کے بادشاہ کو مولیٰ
کہہ دیا اسی طرح باعتبار معنی منعم اور محب اور ناصر کے بھی جو مولیٰ کے حقیقی معنی
ہیں بادشاہ کو مولےٰ کہہ سکتے ہیں اس لیے کہ بادشاہ میں یہ صفتیں بھی ہوتی
ہیں بلکہ مولیٰ کے معنی غلام کے بھی ہیں اس اعتبار سے بھی بادشاہ کو مولےٰ کہہ

سکتے ہیں اس لیے غلام خادم ہوتا ہے اور بادشاہ بھی تمام ملک کا خادم ہوتا
ہے اس طرح جس لفظ سے چاہو بادشاہ مراد لے لو۔

ظاہرا معمر کی مراد ملیک سے مالک ہے اور بڑی دلیل اس کی یہ ہے
کہ جتنی کتابیں لغت کی موجود ہیں اور وہ بخاری کے بعد تصنیف ہوئی ہیں اور اُن
کے مصنفین کو معمر کا یہ قول معلوم ہو گیا ہے پھر بھی انھوں نے مولیٰ کے معنی میں
ملیک نہ لکھا مالک لکھا اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اس قول میں ملیک
بمعنی مالک سمجھا۔ صحاح اور قاموس اور نہایہ اور مجمع البحار وغیرہ ایسے مصنفوں
کی کتابیں ہیں کہ بخاری ان سب کے سامنے تھی مگر انھوں نے مولیٰ کے معنی میں
مالک لکھا ملوک نہ لکھا۔ اور معمر نے مولیٰ کے پانچ معنی بتائے اُس میں مالک نہ
بتایا اس لیے یقیناً ثابت ہو گیا کہ اس قول میں ملیک بمعنی مالک ہے۔ پس
لفظ ملیک جب ملک بضم لام سے مشتق ہو گا جس کے معنی حکومت ہیں،
اُس وقت ملیک کے معنی بادشاہ ہوں گے اور جب ملک بکسر لام سے
مشتق ہو گا جو بمعنی ملکیت ہے تو اُس وقت ملیک کے معنی مالک ہوں گے
منتہی الارب سے صاحب عبقات نے ملیک کے دونوں معنی نقل کیے ہیں چنانچہ
اُس کی عبارت یہ ہے:۔

"ملیک کا امیر بادشاہ خداوند۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ ملیک کے
ایک معنی بادشاہ کے ہیں دوسرے معنی خداوند یعنی مالک کے ہیں"

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ظاہر کر دیا ہے کہ اس معمر سے معمر
بن مثنی مراد ہے جو خارجی تھا۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اس معمر کی نسبت

دارقطنی کا یہ قول نقل کیا ہے یتھم بالاحداث اُس میں یہ عیب تھا کہ نئی نئی باتیں نکالا کرتا تھا۔

پس بفضلہ تعالیٰ بخوبی ثابت ہوگیا کہ حدیث ولایت کسی طرح نص امامت نہیں بن سکتی۔

اب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ حدیث ولایت یا اور کوئی حدیث جو نص امامت بن سکے شیعوں کی روایتوں کے مطابق کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے۔

حضرات شیعہ کی تمام روایتوں کا مدار ائمہ پر ہے اب ہم روایات شیعہ کے بموجب ائمہ کے حالات پر غور کرتے ہیں۔

ایک ائمہ اہل بیت وہ ہیں جن کی بزرگی و تقدس کے اہل سنت بہت کچھ معتقد ہیں اور اُن کو ہم اپنا ہم مذہب اور ہم عقیدہ جانتے ہیں مشائخ صوفیہ نے فیض باطنی اُنھیں سے حاصل کیا ہے۔

دوسرے ائمہ اہل بیت وہ ہیں جو شیعوں کے بیان کے مطابق مذہب شیعہ کے بانی تھے اور اہل سنت کے مخالف۔

چونکہ حسب روایات فریقین ان دونوں قسم کے ائمہ کے مذہب اور صفات جدا جدا ہیں اس لیے یہاں جو ہماری بحث ہے وہ شیعوں کے ائمہ سے ہے اہل سنت کے ائمہ سے اس بحث کو کچھ تعلق نہیں۔

اب شیعوں کے ائمہ کی اُن صفات کو ملاحظہ فرمائیے جو روایات شیعہ سے ثابت ہوتی ہیں:۔ وہ نورہ لگا کر دوسروں کے سامنے برہنہ ہو جاتے تھے

اُنھوں[1] نے عام حکم یہ دے دیا تھا کہ آگے کا ستر ڈھک لینے کے لیے فقط ہاتھ رکھ لینا یا نورہ لگا لینا کافی ہے پیچھے کا ستر ڈھکنے کی کچھ حاجت نہیں وہ خود بخود چھپا ہوا ہے۔

انھوں[2] نے یہ حکم دیا تھا کہ کافر کا ستر دیکھنا ایسا ہے جیسے گدھے کا ستر دیکھنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بڑی تاکید سے دوسروں کے ستر دیکھنے کو حرام کہا تھا اس حکم کو رد کرنے کے لیے انھوں نے یہ قیاس بنایا کہ کافر گدھے ہیں اور گدھے کا ستر دیکھنا جائز ہے اس لیے کافر کا ستر دیکھنا بھی جائز ہے۔

انھوں[3] نے قرآن موجودہ کی نسبت اپنا اعتقاد یہ ظاہر کیا تھا کہ "تحریف کرنے والوں نے اس قرآن میں ایسا کلام ملا دیا جو اللہ نے نہیں فرمایا ہم تقیہ کی وجہ سے اُن لوگوں کے نام نہیں ظاہر کر سکتے جنھوں نے قرآن میں ایسی تحریف کی اور نہ آیتوں کو بتا سکتے ہیں جو بڑھائی گئیں[4] درحقیقت قرآن میں وہ مضمون جس کا قابل انکار اور قابل نفرت ہونا ظاہر ہے بڑھایا گیا"

---

[1] نصیحۃ الشیعہ جلد اول صـ [2] ایضاً۔ [3] دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد دوم صـ

[4] اگرچہ حضرت علیؓ کا قول صاف صاف موجود ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتیں گھٹا دی گئیں اور بہت سا کلام محرفین نے اپنی طرف سے بڑھا دیا اور کافی وغیرہ میں یہ روایتیں بھی موجود ہیں کہ حضرت علیؓ کا جمع کیا ہوا قرآن دوسرا ہے جب صحابہ نے اس قرآن کو نہ مانا تو حضرت علیؓ نے کہا کہ اب کوئی اُس کو نہ دیکھے گا اور امام جعفر صادق نے فرمایا ہے کہ وہ قرآن ائمہ کے پاس ہے اور قائم اس کو ظاہر کریں گے اُس وقت تک اسی قرآن (باقی صفحہ ۶۰۰ پر)

مسائل شرعیہ میں ہمیشہ وہ ایک سوال کے جواب میں ہر شخص کو نیا حکم دیتے تھے کسی سے کچھ کہہ دیتے تھے کسی سے کچھ اور خاص اپنے شیعوں میں اختلاف ڈالتے تھے

(بقیہ صـ ۵۹۹) محرف کو پڑھنے کا حکم ہے اور قرآن ائمہ کا پڑھنا جائز نہیں پھر ائمہ نے اس قرآن موجودہ میں عربیت کی بھی غلطیاں بتائیں اور بہت سی آیتیں خلاف ما انزل اللہ بتا دیا جس کی تفصیل جلد ثانی کی ابتدا میں گزر چکی با ایں ہمہ فرقہ جدیدہ ائمہ کی ان تصریحات سے آنکھیں بند کر کے آفتاب کو خاک اُڑا کر چھپانا چاہتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ائمہ نے تحریف سے انکار کیا ہے مگر اس زبانی دعوے پر کوئی دلیل نہیں ملتی تو یوں کہا جاتا ہے کہ ائمہ سے ہر ہر سورت کے پڑھنے اور تمام قرآن کے پڑھنے کا ثواب اور نفل کی ایک رکعت میں دو سورتوں کے پڑھنے کا جواز اور فرض کی ایک رکعت میں دو سورتیں جمع کرنے کا عدم جواز اور ایک رات میں تمام قرآن ختم کرنے کی نفی جو مذکور ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ائمہ قرآن میں کمی و بیشی نہیں سمجھتے تھے ورنہ قرآن محرف کے لیے ایسے احکام کیوں صادر فرماتے۔ جواب یہ ہے کہ ان روایتوں سے تحریف کی نفی ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ وقوع تحریف کی ائمہ نے صاف تصریح کی ہے اور ان روایتوں میں عدم تحریف کی تصریح نہیں قطع نظر اس کے جب ائمہ نے شیعوں کو اپنے قرآن کے پڑھنے سے منع کیا اور اسی قرآن کو پڑھنے کا حکم دیا جس کو سب آدمی پڑھتے ہیں پس قرآن محرف کے لیے یہ ثواب اور احکام ثابت کر دیے اس لیے کہ شیعوں کی نماز بھی اسی قرآن محرف سے ہوتی ہے پس اُن کو ثواب بھی اسی قرآن محرف کی تلاوت پر ملنا چاہیے اور تمام احکام اصلی قرآن کے اسی قرآن محرف کے لیے ثابت ہونے چاہییں اس لیے کہ اُن کے لیے اسی قرآن محرف کو (باقی صـ ۶۰۱ پر)

وہ خاندان اہل بیت کو فحش گالیاں دیا کرتے تھے چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے نکاح ام کلثوم کے قصہ کو فحش الفاظ میں نقل کیا جس کی روایت کافی میں ہے

اُن کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ نجوم کے ذریعہ سے غیب کی خبریں معلوم ہو جاتی ہیں اور نجوم حق ہے ستارہ مشتری زمین پر اُتر کر اہل عرب اور اہل ہند کو سکھا گیا ہے۔

وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے پاس قرآن موجودہ کے سوا ایک اور قرآن بھی ہے جو حضرت فاطمہ علیہا السلام پر نازل ہوا تھا جو قرآن موجودہ سے سہ چند ہے اور اُس میں اس قرآن کا ایک حرف بھی نہیں البتہ انھوں نے

(بقیہ صـ ۶۰۰) پڑھنے کا حکم ہے۔ قطع نظر اس کے قرآن کے فضائل اور احکام مذکور ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن موجود بھی ہو۔ چنانچہ امام زین العابدینؒ اور اُن کے بعد کے ائمہ سے جہاد کے فضائل اور احکام منقول ہیں۔ حالانکہ یہ بھی معلوم تھا کہ امام حسین رض کے بعد قائم تک جہاد نہ ہوگا اس کے علاوہ اس محرف قرآن میں بھی کسی قدر اصلی حصہ قرآن کا موجود ہے اور یہ ثواب اور احکام اُسی حصہ باقی کی وجہ سے ہیں۔ قطع نظر اس کے شاید یہ فضائل اور احکام قرآن کے اس لیے بیان کیے گئے ہوں کہ جب قائم کے زمانہ میں اصلی قرآن ظاہر ہو اس وقت لوگ اس پر عمل کریں اس کے علاوہ ظاہر یہ ہے کہ قرآن کے فضائل اور تلاوت کے احکام جن روایتوں میں مذکور ہیں وہ روایتیں بطور تقیہ وارد ہوگئی ہیں اس لیے کہ روایات عامہ سے مطابق ہیں اور تحریف قرآن کی تصریح ائمہ سے ثابت ہو چکی ہے ۱۲

نام بدل دیا تھا قرآن فاطمہؑ کے عوض مصحف فاطمہؑ کہتے تھے مگر اس کے مقر تھے کہ اللہ کی طرف سے بواسطہ جبرئیل نازل ہوا ہے۔

جھوٹ اور خلاف واقع باتیں اکثر ان کی زبان پر جاری ہوتی تھیں چنانچہ انھوں نے اپنے خاص لوگوں سے یہ کہہ دیا تھا کہ جو کچھ ہم سے معلوم کر چکے ہو اُسی پر یقین رکھو اور اُس کے خلاف جو ہم سے سنو اس کو سمجھ لو کہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں یعنی جھوٹی ہیں۔ انھوں[1] نے اپنی امامت سے بھی انکار کیا ہے۔

وہ[2] بغرض مصلحت احکام شرعی بھی جھوٹے بیان کر دیا کرتے تھے۔

چنانچہ امام باقر نے باز کا شکار بغیر ذبح کے حلال کر دیا تھا۔

اُن کے خلاف واقع باتیں کہنے کا ایک انداز یہ بھی تھا کہ کسی کے سامنے قسم کھا کر اُس کی تعریف کرتے جب وہ چلا جاتا تو اس کی ہجو کرتے اور جو الفاظ اس کی تعریف کے کہہ چکے ہیں اس کی تاویل ایسی رکیک اور بعید الفہم کرتے جو اُن الفاظ سے ہرگز متبادر نہیں ہوتی تھی بلکہ خلاف ظاہر ہوتی تھی اور ان الفاظ کو سُن کر وہ معنی کوئی نہ سمجھتا۔ چنانچہ امام جعفر صادق اور امام ابو حنیفہؒ کا قصہ جو اس کتاب کی جلد اول میں مذکور ہو چکا اس بیان کا شاہد ہے۔

ان کا ظاہر ان کے باطن کے مخالف ہوتا تھا چنانچہ ظاہر میں مخالفوں کی جنازوں کی نماز پڑھتے اور باطن میں اُن کے لیے بد دعا کرتے۔

شیخ صدوق نے رسالہ اعتقادیہ میں لکھا ہے۔

وفی الاخبار ماورد للتقیۃ   حدیثیں ایسی بھی ہیں کہ جو بطور تقیہ

---

[1] نصیحۃ الشیعہ جلد اول [2] ایضاً [3] ایضاً

وارد ہوئی ہیں۔

ان کی بیان کی ہوئی حدیثیں ایسی بھی موجود ہیں جن سے ظاہر ہے کہ انھوں نے پیغمبرؐ پر بھی خلاف واقع باتیں عمداً بنائیں۔ چنانچہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سہو ہو جانے کی حدیثیں جو ائمہ سے منقول ہیں وہ اسی قسم کی ہیں۔ حیات القلوب جلد دوم کے باب دوازدہم میں لکھا ہے:۔

معظم علمائے امامیہ ہیچ جہت سہو نسیان بر آں حضرت روا نداشتہ اند و احادیثے کہ دلالت بر وقوع آں می کند حمل بر تقیہ می کنند۔   بڑے بڑے علمائے شیعہ کسی طرح سہو اور بھول پیغمبرؐ پر جائز نہیں جانتے اور جن حدیثوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر کو سہو ہوا تھا ان کو یہ سمجھتے ہیں کہ ائمہ کا تقیہ ہے یعنی انھوں نے کسی مصلحت سے پیغمبر کی طرف خلاف واقع نسبت کر دی۔

انبیا سابقین کی نسبت جو انھوں نے اس قسم کی روایتیں بنا دی ہیں وہ بے انتہا ہیں چنانچہ حیات القلوب کی جلد اول میں بیسیوں روایتیں انبیائے سابقین کے ذکر میں ائمہ سے ایسی منقول ہیں کہ ان کو محمول بر تقیہ لکھا ہے ہم نے بخوف تطویل اس مختصر کتاب میں ان کو ذکر نہ کیا۔

ہر منصف اس امر کا اقرار کرے گا کہ جن لوگوں کی یہ حالت ہو ان کی روایت کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔

چونکہ ائمہ امور خلاف واقع کا بیان کرنا موجب اجر و ثواب بلکہ بعض صورتوں میں واجب سمجھتے تھے اس لیے ان کی نسبت یہ گمان بھی نہیں

ہوسکتا کہ وہ اللہ کے خوف سے امور خلاف واقع کے بیان سے اجتناب کریں گے۔

یہ ائمہ بغیر کسی ضرورت دینی کے بلکہ فقط اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے کے لیے جھوٹ بولنا بھی موجب ثواب اور دین کا کام سمجھتے تھے چنانچہ امام جعفر صادق[1] علیہ السلام نے حضرت یوسفؑ کا تقیہ نقل کیا ہے کہ انھوں نے یہ کہا کہ "اے قافلہ والو بے شک تم چور ہو حالانکہ انھوں نے کچھ چرایا نہ تھا"۔

ایک احتمال اور بھی ہے اور وہ یہ کہ ان ائمہ[2] نے بیان کیا تھا کہ اُن کے پاس چمڑے کا تھیلا ہے تمام علوم انبیا اور اوصیا کے اُسی میں سے نکل آتے ہیں پس ممکن ہے کہ حدیث ولایت بسند متصل اُن تک نہ پہونچی ہو بلکہ اُسی چمڑے کے تھیلے میں سے نکلی ہو اور اس صورت میں وہ کیا قابل اعتبار ہوسکتی ہے شاید کسی نے موقع پایا ہو اور امام کو دھوکا دینے کے لیے یہ حدیث لکھ کر اُس تھیلے میں ڈال دی ہو جب وہ پرچہ امام کے ہاتھ آیا تو اس کو واقعی حدیث سمجھ لیا۔ اس احتمال کا گمان اس وجہ سے غالب ہے کہ ائمہ کی اولاد میں بھی بعض بے دین ہوتے تھے پس ان کو اس تھیلے میں تصرف کرنے کا اکثر موقع ملتا ہوگا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ روایت ائمہ کو بذریعہ نجوم معلوم ہوئی ہو اس لیے کہ وہ علم نجوم کو بھی حق سمجھتے تھے۔

ان ائمہ نے اپنے لیے اور اپنے باپ دادوں کے لیے اور اپنی

[1] نصیحۃ الشیعہ جلد دوم ۱۲ منہ [2] ایضاً جلد اول ۱۲ منہ

اولاد کے لیے امامت یعنی دین و دنیا کی بادشاہی ثابت کرلی اور یہ حکم ظاہر کر دیا کہ ہم معصوم ہیں اور تمام جہان پر ہماری اطاعت واجب ہے یہ ایک ایسی عزت ہے جس کے حاصل کرنے کی نفس کو خواہ مخواہ رغبت ہوتی ہے پس جن ائمہ کی حالت بخوبی ظاہر ہو چکی کہ رات دن خلاف واقع باتیں اُن کی زبان پر جاری رہتی تھیں فقط اُن کے بیان سے یہ امامت اُن کے لیے کیونکر ثابت ہوسکتی ہے۔

جو لوگ ائمہ سے احادیث کی روایت کرتے ہیں اُن کی حالت بھی اس قابل نہیں کہ اُن کی روایت مقبول ہو۔

ان سب[1] سے اللہ ایسا ناراض تھا کہ دنیا میں اُن پر اللہ کا غضب نازل ہونے والا تھا آخر امام موسیٰ کاظم نے اپنی جان کا فدیہ دیا تب دنیا میں نزول عذاب ملتوی ہوا۔

یہ ایسے[2] لوگ تھے کہ ان میں امانت اور صدق اور وفا کی صفت نہ تھی البتہ اہل سنت صفت امانت اور صدق اور وفا سے موصوف تھے۔

ائمہ[3] ان سے اپنی اصلی حدیثیں چھپایا کرتے تھے اور امام جعفر صادق کو تین شخص بھی ایسے نہ ملے جن سے امام اپنی اصلی حدیثیں نہ چھپاتے اور اس سے ظاہر ہے کہ حدیث ولایت بھی امام نے اُن سے بیان نہ کی ہوگی۔

[1] نصیحۃ الشیعہ جلد اول ۱۲ منہ [2] ایضاً ۱۲ منہ [3] ایضاً ۱۲ منہ

امامؑ موسیٰ کاظم کا قول ہے کہ ایک شخص کے سوا کوئی بھی مجھ کو ایسا نہ ملا جو میرا کہنا مانے۔[1]

امامؑ موسیٰ کاظم کا یہ بھی قول ہے کہ اگر میں اپنے شیعوں کو منتخب کروں تو اُن سب کا دعویٰ فقط زبانی ثابت ہوگا اور اگر میں اُن کا امتحان کروں تو وہ سب مرتد ظاہر ہوں گے۔[2]

اب اگر فرض کرلو کہ ائمہ نے یہ روایتیں نہیں بنائیں اور یہ مذہب تصنیف نہیں کیا تو ان لوگوں نے بنائیں اس لیے کہ یہ لوگ صفت امانت اور صدق سے معرا تھے ائمہ ان سے اپنی حدیثیں چھپاتے تھے اور اگر امتحان ہوتا تو ظاہر ہوجاتا کہ یہ سب مرتد تھے۔

اہل سنت جن ائمہ اہل بیت کے معتقد ہیں اور ان کو اپنا امام مذہب جانتے ہیں وہ ان تمام عیوب سے پاک تھے اور اہل سنت کے طریقوں سے جو اُن کی روایتیں ہیں وہ مذہب اہل سنت کی تائید کرتی ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ شیعوں کے مقابلے میں اہل سنت کی روایتیں زیادہ قابل اعتبار ہیں اس لیے کہ یہ ثابت ہوچکا ہے کہ صفت امانت اور صدق و صفا شیعوں میں نہ تھی اور اہل سنت ان صفات سے موصوف تھے۔

پس بخوبی ثابت ہوگیا کہ نص امامت شیعوں کی روایتوں سے بھی ثابت نہیں ہوسکتی۔

---

[1] نصیحۃ الشیعہ جلد دوم ۱۲ منہ [2] ایضاً جلد دوم ۱۲ منہ

اب اگر باوجود ایسی سند کے جو ہرگز قابل اعتبار نہیں حدیث ولایت کی صحت بھی تسلیم کرلی جائے تب بھی اس حدیث سے وہ معنی نہیں ثابت ہوتے جو شیعوں نے فرض کرلیے ہیں اور اس حدیث سے جناب امیر کے لیے وہ امامت نہیں ثابت ہوسکتی جو شیعوں نے اپنی اصطلاح میں مقرر کی ہے۔

اب ہم خاص حضرت علیؓ کا قول نقل کرتے ہیں جس سے ثابت ہوگا کہ اس حدیث کے فرمانے کی وجہ کیا تھی اور اس حدیث میں مولے کے معنے دوست یا بھائی کے ہیں۔ روضہ کافی میں حضرت علیؓ کا ایک خطبہ منقول ہے جس کا نام خطبۂ وسیلہ ہے۔ اس کا ایک فقرہ یہ[1] ہے:—

وقوله حين تكلمت طائفة فقالت نحن موالي رسول الله فخرج رسول الله الى حجة الوداع ثم صار الى غدير خم وامر فاصلح له شبه المنبر ثم علاه واخذ بعضدی قائلا من كنت مولاه فعلي مولاه اللهم

اور قول ہے رسولؐ کا جب کہ کلام کیا ایک گروہ نے اور انھوں نے کہا کہ ہم رسول کے مولیٰ یعنی دوست ہیں تو نکلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کی طرف۔ پھر مقام خم کے تالاب پر گئے اور حکم کیا تو بنائی گئی اُن کے لیے منبر کی صورت پھر اس پر چڑھے اور میرا بازو پکڑا یہ کہتے ہوئے

---

[1] روضہ کافی مطبوعہ لکھنؤ ۱۳

وال من والاہ وعاد من عاداہ	کہ جو شخص کہ میں اس کا دوست ہوں علی بھی اس کا دوست ہے اے اللہ دوستی کر اس سے جو علی سے دوستی کرے اور دشمنی کر اس سے جو علی سے دشمنی کرے۔

اس روایت سے پہلی بات یہ ثابت ہوئی کہ وجہ اس حدیث کے فرمانے کی یہ ہوئی کہ صحابہ نے جو اپنے آپ کو رسولؐ کا دوست کہا تھا ان کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ تم میرے دوست ہو علیؓ سے بھی دوستی کرو اور جب یہ وجہ خود حضرت علیؓ نے بیان کر دی تو اس کے سوا جو کچھ کہا جاتا ہے وہ غلط ہے۔

دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ جس معنی سے صحابہ نے اپنے آپ کو رسولؐ کا مولیٰ کہا تھا وہی معنی من کنت مولاہ کے ہوں گے اس لیے کہ یہ قول رسولؐ نے اُنھیں کے جواب میں کہا ہے اور چونکہ صحابہ کی مُراد لفظ مولے سے یہ نہ تھی کہ ہم رسولؐ کے حاکم یا بادشاہ ہیں پس رسولؐ کے قول من کنت مولاہ میں بھی یہ مراد نہ ہوگی ورنہ مناسبت جواب کی باقی نہ رہے گی۔

تیسری بات یہ ثابت ہوئی کہ آخر میں جو فرمایا کہ اللھم وال من والاہ یعنی اے اللہ دوستی رکھ اُس سے جو علیؓ سے دوستی رکھے اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ مولیٰ سے دوست مُراد ہے اور لفظ وال من والاہ اور لفظ مولیٰ ایک ہی مادہ ولا سے مشتق ہیں جو دوستی کے معنے میں ہے۔

اس کے بعد حضرت علیؓ نے یہ فرمایا ہے:-

فکان علی ولایتی ولایت اللہ وعلی عداوتی عداوۃ اللہ۔	پس ہے میری ولایت پر اللہ کی ولایت اور میری عداوت پر اللہ کی عداوت۔

حدیث من کنت مولاہ سے حضرت علیؓ نے یہ ثابت کیا کہ میری ولایت پر اللہ کی ولایت ہے یہ درحقیقت تفسیر حدیث من کنت مولاہ کی ہے اور چونکہ لفظ ولایت کے مقابلے میں عداوت مذکور ہے اس سے ظاہر ہے کہ ولایت سے محبت مراد ہے۔

اس کتاب میں اس سے پہلے بہت سے دلائل اور اقوال جناب امیر کے مذکور ہو چکے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نص امامت کا دعوے یقیناً باطل ہے اب اس حدیث کی بحث میں بھی بعض دلائل ابطال نص امامت کے نقل کیے جاتے ہیں:-

اصُول کافی[1] کی کتاب الایمان والکفر کے باب الکتمان میں امام رضا علیہ السلام سے روایت ہے:-

قال ابو جعفر علیہ السلام ولایۃ اللہ اسرھا الی جبرئیل واسرھا جبرئیل الی محمد صلی اللہ علیہ والہ واسرھا	فرمایا امام باقر علیہ السلام نے اللہ کی ولایت بطور راز مخفی کے بیان کیا اس کو اللہ نے جبرئیل سے اور بطور راز مخفی کے ظاہر کیا تھا اس کو جبرئیل نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کے

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص۴۸۶

محمد الی علی علیہ السلام واسرھا علی الی من شاء ثم انتم تذیعون ذلک

اور بطور راز مخفی کے ظاہر کیا تھا اس کو محمدؐ نے علیؓ سے اور بطور راز مخفی کے ظاہر کیا تھا اس کو علیؓ نے جس سے چاہا پھر اب تم مشہور کرتے ہو اُس کو۔

اس روایت سے ظاہر ہوگیا کہ مسئلہ ولایت کی تبلیغ ایسے مخفی طور پر ہوئی تھی کہ اللہ نے اس کو فقط جبرئیلؑ پر بطور راز مخفی کے اس طرح ظاہر کیا کہ جبرئیل کے سوا کسی کو خبر نہ ہوا اور جبرئیل نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ پر اس طرح ظاہر کیا کہ محمدؐ کے سوا کسی کو خبر نہ ہوا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ نے علیؓ پر اس طرح ظاہر کیا کہ علیؓ کے سوا کسی کو خبر نہ ہوا اور علیؓ نے بھی اس مسئلہ کو ہر شخص پر ظاہر نہیں کیا بلکہ جس سے اس کا کہنا مناسب سمجھا اُسی سے کہا اور ائمہ ہمیشہ اُس کے ظاہر کرنے سے منع کرتے رہے۔

اس روایت سے وہ سب کہانیاں جھوٹی ہوگئیں کہ رسولؐ نے ہزار ہا آدمیوں کے سامنے اس مسئلہ کی تبلیغ کی تھی۔

اسی مضمون کی تائید میں ایک دوسری روایت اصول کافی کے اسی باب میں موجود ہے۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال قال لی ما زال سرنا مکتوما حتی صار فی یدی ولد کیسان فتحدثوا بہ فی

راوی کہتا ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا کہ ہمیشہ ہمارا راز مخفی تھا یہاں تک کہ اولاد کیسان کے ہاتھوں میں پہونچا انہوں نے راستوں میں

الطریق وقری السواد

اور سواد عراق کے دیہات میں اس کو بیان کرنا شروع کیا۔

شارحین کافی نے لکھا ہے کہ کیسان کے معنی مکر وفریب کے ہیں اور ولد کیسان سے مکار لوگ مراد ہیں۔

اس روایت سے ثابت ہوا کہ امام نے اپنے شیعوں کو مکار کہا اور فرمایا کہ ہمارا راز ہمیشہ سے مخفی تھا۔ یعنی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے ان مکاروں کے زمانہ تک ائمہ کی امامت کی کسی کو خبر نہ تھی مگر ان مکاروں نے اس کو راستوں میں اور دیہات میں مشہور کیا۔

اب اہل انصاف غور کریں کہ جس مسئلہ کا ایسا اخفا ہو اس پر ایمان لانے کی تکلیف سب بندوں کو کیوں کر ہو سکتی ہے اور غصب خلافت کا خلفا پر کیا الزام ہے اس لیے کہ ان کو اس راز کی خبر بھی نہ تھی یہ تو ایسا راز مخفی تھا کہ جبرئیل کے سوا تمام ملائکہ سے اور محمدؐ کے سوا تمام انبیا سے اور علیؓ کے سوا تمام صحابہ سے چھپایا گیا تھا۔

نہایت عجیب یہ ہے کہ اللہ اور رسول نے تو مسئلہ ولایت کا ایسا اخفا کیا مگر اس زمانہ میں حضرات شیعہ بہ ندائے بلند اذان میں اشہد ان علیا ولی اللہ پکارتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول کے ساتھ علانیہ مخالفت کرتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ وہم پیدا ہو کہ ان کلمات کے اذان میں شامل کرنے کا ائمہ نے حکم دیا ہوگا مگر یہ وہم ہرگز صحیح نہیں اس لیے کہ ائمہ نے تو صاف

کہہ دیا تھا کہ مسئلہ ولایت کو اللہ اور رسول نے بڑے اہتمام سے چھپایا تھا۔ پھر بھلا ائمہ اذان میں اُس کے اعلان اور جہر کا کیوں کر حکم کرتے اب ائمہ نے جو اذان سکھائی ہے اُس کی تفصیل بھی بحسب روایات کتب شیعہ ملاحظہ فرمائیے اور اسی سے ظاہر ہو جائے گا کہ مسئلہ ولایت جن لوگوں نے اذان میں ایجاد کیا ہے اُن پر محدثین و فقہا لعنت کرتے ہیں۔ من لایحضر میں لکھا ہے:۔

روی ابوبکر الحضرمی وکلیب الاسدی عن ابی عبد اللہ انہ حکی لھما الاذان	ابوبکر حضرمی اور کلیب اسدی کا بیان ہے کہ ہمیں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے یہ اذان بتلائی ہے۔
اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔	اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔
اشھد ان لا الہ الا اللہ،	اشہد ان لا الہ الا اللہ
اشھد ان لا الہ الا اللہ،	اشہد ان لا الہ الا اللہ
اشھد ان محمدا رسول اللہ	اشہد ان محمدا رسول اللہ
اشھد ان محمدا رسول اللہ	اشہد ان محمدا رسول اللہ
حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ	حی علی الصلوۃ، حی علی الصلوۃ۔
حی علی الفلاح، حی علی الفلاح	حی علی الفلاح، حی علی الفلاح
حی علی خیر العمل، حی علی خیر العمل	حی علی خیر العمل، حی علی خیر العمل۔
اللہ اکبر اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ	اللہ اکبر، اللہ اکبر لا الہ الا اللہ۔

والاقامۃ کذلک ولا باس ان یقال فی صلوۃ الغداۃ علی اثر حی علی خیر العمل الصلوۃ خیر من النوم مرتین للتقیۃ۔	اور اقامت بھی اسی طرح ہے۔ اور مضائقہ نہیں ہے اگر کہا جائے صبح کی نماز میں بعد حی علی خیر العمل کے الصلوۃ خیر من النوم۔ بطور تقیہ کے۔
وقال مصنف ھذا الکتاب ھذا ھو الاذان الصحیح لا یزاد علیہ ولا ینقص منہ والمفوضۃ لعنھم اللہ قد وضعوا اخبارا وزادوا فی الاذان محمد وآل محمد خیر البریۃ۔	اور کہتا ہے مصنف اس کتاب کا (ابن بابویہ قمی) یہی اذان صحیح ہے نہ اس پر زیادتی کی جائے نہ کمی کی جائے اور فرقہ مفوضہ نے اللہ اُن پر لعنت کرے بنائیں جھوٹی حدیثیں اور بڑھایا اذان میں جملہ (محمد و آل محمد خیر البریہ) یعنی محمد اور آل محمد کے سب مخلوق میں بہتر ہیں۔
وفی بعض روایاتھم بعد اشھد ان محمدا رسول اللہ اشھد ان علیا ولی اللہ مرتین ومنھم من روی بدل ذلک۔	اور ان کی بعض روایتوں میں ہے۔ بعد اشہد ان محمدا رسول اللہ کے اشہد ان علیا ولی اللہ دوبار۔ اور ان میں سے بعض نے اس کے بدلے یہ روایت کی ہے۔
اشھد ان امیر المومنین حقا، مرتین۔	(اشہد ان امیر المومنین حقا، دوبار
ولا یشک ان علیا ولی اللہ و	اور اس میں شک نہیں ہے کہ علی ولی اللہ

انہ امیر المومنین حقا وان محمدا وآلہ خیر البریۃ لکن لیس ذلک فی اصل الاذان۔

ہیں اور وہ امیر المومنین ہیں اور بے شک محمد اور ان کی آل بہترین خلائق ہیں۔ لیکن یہ الفاظ اصل اذان میں نہیں۔

شرح لمعہ میں لکھا ہے

ولا یجوز اعتقاد شرعیۃ غیر هذه الفصول فی الاذان و الاقامۃ۔

کالتشهد بالولایۃ لعلی علیہ السلام وان محمدا خیر البریۃ وان کان الواقع کذلک فما کل واقع حقا یجوز ادخالہ فی العبادات الموظفۃ شرعا المحدودة من اللہ تعالیٰ فیکون بدعۃ وتشریعا کما لو زاد فی الصلوٰۃ رکعۃ او تشهدا۔

اور نہیں جائز ہے یہ اعتقاد رکھنا کہ ان کلمات کے سوا اور کلمات بھی اذان اور اقامت میں داخل کرنا مشروع ہیں۔

جیسے کہ شہادت ولایت علی علیہ السلام کی اور اس بات کی کہ محمد سب مخلوق میں بہتر ہیں اور اگرچہ درحقیقت اسی طرح ہے پس ہر امر واقعی ایسا نہیں ہوتا کہ ان عبادات میں اس کا داخل کرنا جائز ہو جو شرعاً روزانہ مقرر ہیں اور ان کی حد اللہ کی طرف سے مقرر ہو گئی ہے پس اُن حدود پر بڑھانا بدعت ہے اور اپنی طرف سے شریعت بنانا ہے جیسے کہ بڑھالے نماز میں ایک رکعت یا تشہد۔

یہی مضمون اکثر کتب فقہ شیعہ میں مذکور ہے۔

یہ بحث فقط شہادت ولایت کی تھی اب چونکہ روز بروز فساد بڑھتا جاتا ہے اور بدعات کی طرف طبائع کا میلان زیادہ ہے اس لیے اس زمانہ میں حضرات شیعہ نے اذان میں شہادت ولایت پر ایک طرہ اور بڑھایا چنانچہ بعض شہروں کے بعض مقامات پر یوں کہا جاتا ہے اشہد ان امیر المومنین علیا ولی اللہ خلیفۃ رسول اللہ بلافصل اگرچہ کلمہ بلافصل کے اعلان کو اہل سنت متضمن معنی تبرا سمجھتے ہیں مگر پھر بھی حضرات شیعہ کو اُس کے اعلان پر اصرار ہوتا ہے۔ پس فقط اہل سنت کی دل آزاری کے لیے حضرات شیعہ اس بدعت کا وبال اپنے واسطے گوارا کرتے ہیں۔

بہر حال مسئلہ ولایت ایک ایسا مسئلہ تھا جس کو اللہ اور رسولؐ نے چھپایا اب کسی اور کو اُس کا زبان پر لانا کیونکر جائز ہو گا۔

یہ خبر بھی مسئلہ امامت کو رد کرنے کے لیے بہت کافی ہے کہ وفات کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ حضرت عباسؓ کو اپنا وصی اور وارث بنانا چاہتے تھے کئی بار اُن سے کہا جب بھی اُنھوں نے منظور نہ کیا تب مجبور ہو کر علیؑ کو وصی اور وارث بنایا اور چونکہ وصی اور وارثِ نبی ہونا صفت امام ہے پس اگر حضرت عباسؓ قبول کر لیتے تو امامت انھیں کو ملتی اس سے ظاہر ہے اگر جناب امیر کے لیے امامت من اللہ ہوتی تو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ عباسؓ کو وصی اور وارث بنانے کا قصد کیوں

کرتے۔ اصُول کافی میں ہے :۔

عن ابی عبد اللہ قال لما حضرت[1] رسول اللہ الوفاۃ دعا العباس بن عبد المطلب وامیر المومنین.

فقال للعباس یا عم محمد تاخذ تراث محمد وتقضی دینہ وتنجز عداتہ فرد علیہ فقال یا رسول اللہ بابی انت وامی شیخ کثیر العیال قلیل المال من یطیقک وانت تباری الریح فاطرق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھنیئۃ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے انھوں نے فرمایا کہ جب رسول اللہ کی وفات قریب ہوئی تو انھوں نے عباسؓ بن عبد المطلب اور امیر المومنین کو بلایا

پھر عباس سے کہا کہ اے محمد کے چچا تم یہ منظور کرتے ہو کہ محمد کی میراث لو اور اُس کا قرض ادا کرو اور اس کے وعدے پُورے کرو تو عباسؓ نے انکار کر دیا پھر کہا کہ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں ایک بوڑھا ہوں بہت سی اولاد والا اور تھوڑے مال والا۔ تمھارے وعدے پورے کرنے کی کس کو طاقت ہے اس لیے کہ تم سخاوت میں ہوا کی برابری کرتے ہو۔ تو سر جھکایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر۔

ف۔ یہ سر جھکانا غور و فکر کے لیے تھا۔ غور و فکر کی ضرورت یہ تھی

[1] اصول کافی کتاب الحجۃ باب اصلاح مطبوعہ لکھنؤ ص۱۴۴

کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ اس کام کے لیے عباسؓ کو مقدم سمجھتے تھے اور وہ انکار کرتے تھے اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اُن سے دوبارہ یہ درخواست کی :۔

ثم قال یا عباس اتاخذ تراث محمد وتنجز عداتہ وتقضی دینہ فقال بابی انت وامی شیخ کثیر العیال قلیل المال وانت تباری الریح فقال اما انی ساعطیھا من یاخذھا بحقھا۔

پھر رسول نے فرمایا کہ اے عباس کیا قبول کرتے ہو تم میراث محمد کی اس طرح کہ پُورے کرو اُس کے وعدے اور ادا کرو اس کا قرض تو عباسؓ نے کہا کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں میں ایک بوڑھا ہوں بہت سی اولاد اور تھوڑے مال والا اور تم برابری کرتے ہو ہوا کی۔ پھر رسولؐ نے فرمایا کہ ہاں میں میراث اُس کو دوں گا جو اُس کا حق ادا کرے گا۔

ف۔ شاید عباسؓ کو یہ خیال ہو کہ رسولؐ اپنی میراث مجھ کو دے دیں اور قرضہ ادا کرنا اور وعدوں کا وفا کرنا میرے ذمہ نہ لگا دیں۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا کہ میراث بغیر اس شرط کے نہ ملے گی میں میراث اُسی کو دوں گا جو اس شرط کو بھی قبول کرے۔ اس کہنے سے رسول اللہ کا مقصود یہ تھا کہ شاید عباس اب بھی قبول کر لیں اور چونکہ اب بھی عباسؓ نے یہ شرط قبول نہیں کی تب مجبور ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وآلہ نے حضرت علیؑ کی طرف توجہ کی

ثم قال یا علی یا اخا محمد اتنجز عداۃ محمد وتقضی دینہ وتقبض تراثہ۔ فقال نعم بابی انت وامی ذالک علی ولی۔	پھر فرمایا کہ اے علی اے بھائی محمدؐ کے کیا تم پورے کروگے محمد کے وعدے اور ادا کروگے اُس کا قرض اور قبضہ کروگے اُس کی میراث پر تو علی نے کہا کہ ہاں میرے ماں باپ آپ پر قربان یہ کام میرے ذمہ ہے اور میراث میرے لیے ہے۔

اس کے بعد اس روایت میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنی انگوٹھی اور ہتیار ذوالفقار وغیرہ اور کچھ کپڑے اور سواری کے جانور علیؑ کو دیدیے۔

چونکہ اصول کافی کی روایتوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ امامت رسولؐ کے ہتیاروں کے ساتھ ہے جس کے پاس ہتیار پہونچیں گے وہی امام ہوگا۔ پس اگر عباس میراث قبول کرلیتے تو یہ ہتیار اُنھیں کو ملتے اور امام بھی وہی ہوتے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ حضرت علیؑ کے لیے نص امامت نہ تھی۔

طُرفہ یہ ہے کہ اکثر اکابر اہل بیت اور اقارب رسول مسئلہ امامت کے اُس معنی سے جو شیعوں نے تصنیف کیے ہیں محض بے خبر تھے۔ جناب امیر کے بہت سے اقوال ہم ایسے نقل کرچکے ہیں جن سے

ثابت ہوتا ہے کہ نص امامت کا دعویٰ محض بے اصل ہے۔ جناب امیر کو اس کا دعویٰ نہ تھا بلکہ اُن کا قول یہ تھا کہ مہاجرین وانصار اپنے مشورہ سے جس کو امام بنادیں اُسی کی امامت سے اللہ راضی ہوتا ہے اور جو کوئی اس کی امامت قبول نہ کرے اُس سے لڑنا چاہیے۔ اور اس مضمون کو انھوں نے قرآن سے ثابت کیا تھا۔ انھوں نے اپنی خلافت ثابت کرنے کے واسطے یہ دلیل قائم کی تھی کہ جن لوگوں نے ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ سے بیعت کی تھی اُنھیں لوگوں نے مجھ سے بیعت کی ہے پس جس طرح وہ امام برحق تھے اسی طرح میں بھی امام برحق ہوں۔ جناب امیر ایسے شخص کی امامت بھی جائز سمجھتے تھے جو فاجر ہو۔

جب لوگوں نے جناب امیر سے بیعت کا قصد کیا تو جناب امیر نے فرمایا کہ مجھے چھوڑ دو اور کسی دوسرے شخص کو امام بنالو تمھاری طرح بلکہ شاید تم سے زیادہ میں اُس کی اطاعت کروں گا۔ ان کا یہ بھی قول تھا کہ خلافت کے لیے سب آدمیوں کا بیعت کرنا ضروری نہیں بلکہ بعض کی بیعت کا حکم سب پر جاری ہوجاتا ہے۔ خطبہ شقشقیہ کے پہلے فقرے کے معنی اگر ہم وہی تسلیم کرلیں جو حضرات شیعہ کہتے ہیں تب بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناب امیر نے اپنے استحقاق خلافت پر اپنے علم اور اپنے مرتبہ سے استدلال کیا تھا نص سے استدلال نہیں کیا حالانکہ یہ خطبہ جناب امیر نے اپنی خلافت کے زمانہ میں بیان کیا تھا اور حضرات شیعہ کا گمان یہ ہے کہ اس خطبہ میں خلفا کی برائی بیان کی ہے۔ پس ایسے وقت میں نص

کے چھپانے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی بجز اس کے کہ ان کو اپنی خلافت کی نص معلوم نہ تھی۔ خطبۂ شقشقیہ کے آخر میں اپنی خلافت قبول کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ جب مددگار مل جاویں تو ہر عالم کو مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی کے لیے امام بن جانا واجب ہوتا ہے۔ امیر معاویہ رض کا دین اور اپنا دین ایک بتایا حالانکہ امیر معاویہؓ جناب امیر کی امامت کے منکر تھے۔ عمرؓ کی خلافت کو جناب امیر نے اُن خلافتوں میں سے مانا جن کا اللہ نے آیت استخلاف میں وعدہ کیا ہے۔ یہ وہ مطالب ہیں جن کی تفصیل اس کتاب میں گزر چکی ہے اور اُن میں سے ہر ہر مضمون نص امامت کے دعوے کو باطل کرتا ہے۔

جناب امیر نے اپنی موت سے تھوڑی دیر پہلے جو وصیت حاضرین کو زبان مبارک سے ارشاد فرمائی وہ نہج البلاغت میں اس طرح مذکور ہے:۔

ومن كلام له قاله قبل موته لما ضربه ابن ملجم لعنه الله وصيته وصيتي لكم ان لا تشركوا بالله شيئا ومحمد صلى الله عليه واله فلا تضيعوا سنته اقيموا هذين العمودين وخلاكم ذم

اور جناب امیر کا کلام ہے جو اپنی موت سے تھوڑی دیر پہلے بطور وصیت کے فرمایا تھا جب کہ اُن کو ابن ملجم ملعون نے زخمی کیا تھا، تمھارے لیے میری وصیت یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کی سنت کو مت چھوڑو قائم کرلو ان دونوں عمودوں کو اور چھوٹ گئی تم سے برائی۔

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۲۲

اس وصیت سے ظاہر ہوگیا کہ فقط اعتقاد توحید اور اتباع سنت نجات کے لیے کافی ہے اگر مسئلہ امامت بھی واجب ہوتا تو بغیر اس کے نجات نہ ہوتی اور اس آخری وصیت میں اُس کا ذکر ضرور ہوتا پس ثابت ہوگیا کہ نص امامت یقیناً باطل ہے۔

اس تمام تفصیل پر غور کرنے کے بعد ہر منصف یہ یقین کرلے گا کہ جناب امیر کو نص امامت کی خبر بھی نہ تھی۔

اقارب رسولؐ میں سب سے زیادہ قریب خاندان حضرت عباسؓ تھا۔ ابن عباسؓ نص امامت کے منکر تھے اس لیے کہ انھوں نے اس مسئلہ میں حضرت علیؓ سے بحث کی جس کے نتیجہ میں فرشتے نے اُن کی آنکھیں پھوڑ دیں پھر امام باقر علیہ السلام سے بحث کی اور امام باقر نے انھیں جہنمی کہا (معاذ اللہ منہا) تفصیل اس کی جلد ثانی میں گزر چکی اس سے ظاہر ہوگیا کہ وہ بھی نص امامت کے منکر تھے۔

اولادِ علیؓ میں سے محمد بن حنفیہ نے خود امام بننا چاہا تھا اور بعد شہادت حسینؓ کے انھوں نے امام زین العابدین علیہ السلام سے کہا تھا کہ اب اولاد علیؓ میں سب سے بڑا میں ہوں مجھے امام بناؤ یہ قصہ اصول کافی میں مذکور ہے۔

اس سے ظاہر ہو گیا کہ اُس وقت تک اُن کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ امامت اہل بیت سے مختص ہے اور نص سے ثابت ہوتی ہے اور امام معصوم مفترض الطاعت ہوتا ہے اس لیے کہ محمد بن حنفیہ نہ اپنے آپ کو منصوص جانتے تھے نہ معصوم مفترض الطاعت نہ من جملہ اہل بیت تھے با ایں ہمہ دعویدار امامت تھے۔ پس امامت کے معنی اُن کے نزدیک فقط اسی قدر تھے کہ جو شخص کسی قوم میں بڑا ہو اور سب لوگ اس کی بزرگی تسلیم کر لیں وہ امام ہے۔

اس قصہ کے آخر میں یہ بھی ہے کہ امام زین العابدین نے حجر اسود سے گواہی دلوائی تب محمد بن حنفیہ نے ان کی امامت تسلیم کی مگر اس ضمیمہ سے ہمارے استدلال میں خلل نہیں آتا اس لیے کہ ہمارا استدلال فقط اس قدر ہے کہ جناب امیر اور حسینؓ کے زمانہ میں مسئلہ امامت کی ان کو خبر نہ ہوئی اور جناب امیر اور حسنین نے اتنا بھی ان کو تعلیم نہیں کیا تھا کہ امام من جملہ اہل بیت ہوتا ہے۔ البتہ امام زین العابدین نے اپنے زمانہ میں ان کا اعتقاد اُس تعلیم سے بدلا اور جو مذہب انھوں نے اپنے باپ اور بھائیوں سے سیکھا تھا اُس کی ترمیم کی۔ پس جب مسئلہ امامت ایسا بے اصل ہے کہ اولاد علیؓ کو بھی حسینؓ کے زمانہ تک اُس کی خبر نہ تھی تو اب کیوں کر وہ جزو ایمان بن گیا۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن تھا کہ جناب امیر اپنے پیارے بیٹے محمد بن حنفیہ کو اتنا بھی تعلیم نہ کرتے کہ امامت اہل بیت سے خاص ہے اور جو شخص من جملہ اہل بیت نہ ہو وہ امام نہیں ہو سکتا۔

اس موقع پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے محمد بن حنفیہ کے مقابلے میں تو اس حکمت عملی کی تدبیر سے امامت حاصل کر لی مگر اس مسئلہ کو وہ ضروریات دین سے نہیں جانتے تھے۔ بڑی دلیل اس کی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے نور چشم امام زید شہید علیہ السلام کو یہ مسئلہ تعلیم نہیں کیا۔ چنانچہ اصولِ کافی[1] کے باب الاضطرار الی الحجۃ میں ہے:۔

عن ابان قال اخبرنی الاحول ان زید بن علی بن الحسین بعث الیہ وھو مستخف قال فاتیتہ فقال لی یا ابا جعفر ما تقول ان طرقک طارق منا اتخرج معہ۔	ابان سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ابو جعفر احول نے یہ خبر دی کہ زید بن علی بن حسین نے اس کو بلایا اور اُس وقت زید روپوش تھے (احول کہتا ہے کہ میں زید کے پاس گیا تو زید نے مجھ سے کہا کہ اے ابو جعفر تو کیا کہتا ہے اگر کوئی ایک ہمارا آدمی تیرے پاس پہونچے اور لڑائی میں شریک ہونے کے لیے تجھ کو بلاوے تو تو اُس کے ساتھ ہو کر نکلے گا؟
قال فقلت لہ ان کان اباک او اخاک خرجت معہ۔	(احول) کہتا ہے کہ میں نے زید سے یہ کہا کہ اگر تمھارے باپ (امام زین العابدینؓ) یا تمھارے بھائی (امام باقرؓ) بلاتے تو میں ان کے آدمی کے ساتھ نکلتا۔

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنو ص ۱۰۱

قال فقال لی فانا ارید ان اخرج واجاهد هؤلاء القوم فاخرج معی۔ قال قلت لا ما افعل۔ قال فقال لی اترغب بنفسك عنی فقلت له انما هی نفس واحدۃ۔

احول کہتا ہے کہ پھر مجھ سے زید نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ خروج کروں اور اس قوم سے لڑوں تو بھی میرے ساتھ شریک ہو۔ (احول) کہتا ہے کہ میں نے کہا کہ نہیں میں تمہارے ساتھ شریک نہوں گا۔ (احول کہتا ہے کہ پھر زید نے مجھ سے کہا کہ کیا تو اپنی جان مجھ سے عزیز رکھتا ہے؟ تو میں نے زید سے کہا کہ میری جان ایک جان ہے۔

فان کان للہ فی الارض حجۃ فالمتخلف عنك ناج والخارج معك هالك وان لا یکن للہ حجۃ فی الارض فالمتخلف عنك والخارج معك سواء

پھر اگر زمین میں اللہ کی طرف سے کوئی امام حجت ہے تو جو شخص کہ لڑائی میں تیرے ساتھ شریک نہ ہو وہ آخرت میں نجات پانے والا ہے اور جو تیرے ساتھ ہو کر خروج کرے وہ آخرت میں ہلاک ہونے والا ہے اور اگر زمین میں کوئی امام حجۃ اللہ نہیں تو اس جنگ میں تیرے ساتھ شریک ہونے والا اور شریک نہ ہونے والا دونوں برابر ہیں۔

قال فقال لی یا ابا جعفر کنت

(احول) کہتا ہے کہ پھر مجھ سے زید نے کہا

اجلس مع ابی علی الخوان فیلقمنی البضعۃ السمینۃ و یبرد لی اللقمۃ الحارۃ حتی تبرد شفقۃ علی۔

کہ اے ابوجعفر میں اپنے باپ کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے خوان پر بیٹھتا تھا تو چکنی بوٹیاں مجھ کو کھلاتا تھا اور میری محبت کی وجہ سے گرم لقمہ کو میرے لیے ٹھنڈا کرتا تھا۔

ولم یشفق علی من حر النار اذ اخبرك بالدین ولم یخبرنی به۔

اور نہ شفقت کی مجھ پر دوزخ کی آگ سے اس لیے کہ دین کی تجھ کو خبر دی اور مجھ کو خبر نہ دی۔

ف یعنی امام زید علیہ السلام نے احول سے کہا کہ میرے باپ امام زین العابدین علیہ السلام مجھ سے اتنی محبت کرتے تھے کہ اپنے ساتھ کھانا کھلاتے تھے اور چکنی بوٹیاں میرے منہ میں دیتے تھے اور میری محبت کی وجہ سے گرم لقمہ کو میرے لیے ٹھنڈا کرتے تھے تا کہ میرے منہ کو گرمی کی ایذا نہ پہونچے پس ایسے شفیق باپ نے جو لقمہ کی گرمی سے مجھ کو بچاتا تھا نہ دوزخ کی گرمی سے مجھ کو نہ بچایا اور مسئلہ امامت تجھ کو سکھایا مجھ کو نہ سکھایا۔ یہاں سے ظاہر ہو گیا کہ امام زید شہید علیہ السلام کو مسئلہ امامت کی خبر بھی نہ تھی اور امام زین العابدینؓ اس مسئلہ کو ضروریات دین سے نہیں سمجھتے تھے ورنہ اپنے پیارے بیٹے کو ضرور یہ مسئلہ سکھاتے کہ ایمان کی تعلیم سب کاموں پر مقدم ہے۔

فقلت له جعلت فداك من شفقته علیك من حر النار

تو میں نے زید سے کہا کہ میں تم پر قربان ہو جاؤں تمہارے باپ نے جو تم کو خبر

لم یخبرك خاف علیك الا تقبله تدخل النار واخبرني فان قبلت نجوت وان لم اقبل لم یبال ان ادخل النار۔

نہ کی یہ بھی اُن کی شفقت تم پر تھی کہ تم کو آگ کی سوزش سے بچایا۔ اُن کو تم پر یہ خوف ہوا کہ اگر تم مسئلہ امامت کو نہ مانو گے تو دوزخ میں داخل ہو گے اور مجھے اس مسئلہ کی خبر دی پھر اگر میں قبول کروں گا تو نجات پاؤں گا اور اگر قبول نہ کروں گا تو میری دوزخ میں جانے کی اُن کو کچھ پروا نہ تھی۔

یہاں سے یہ ثابت ہوگیا کہ ائمہ معصومین پر مسئلہ امامت کی تبلیغ واجب نہ تھی اور جس کو وہ عزیز رکھتے تھے اور دوزخ سے بچانا منظور رہوتا تھا اُس کو ائمہ یہ مسئلہ نہیں سکھاتے تھے اور جس کے دوزخ میں جلنے کی اُن کو پروا نہیں ہوتی تھی اس کو یہ مسئلہ سکھاتے تھے۔ یہ قول فقط احول کا نہیں۔ بلکہ آئندہ مذکور ہوگا کہ امام جعفر صادقؑ نے اس تمام گفتگو کو سُن کر بہت تعریف کی۔

ثم قلت له جعلت فداك انتم افضل ام الانبیاء قال بل الانبیاء۔

پھر میں نے زید سے کہا کہ میں تم پر قربان ہو جاؤں کیا تم افضل ہو یا انبیا افضل ہیں۔ زید نے کہا بلکہ انبیا افضل ہیں۔

قال قلت یقول یعقوب لیوسف یبنی لا تقصص

(احول) کہتا ہے کہ میں نے زید سے کہا کہ یعقوب علیہ السلام نے یوسفؑ سے کہا تھا

رؤیاك علی اخوتك فیكیدوا لك كیدا۔ لم یخبرهم حتی كانوا لا یكیدونه ولكن كتمهم ذلك

کہ اے میرے بیٹے تو اپنا خواب بھائیوں پر ظاہر مت کیجیو ورنہ وہ تیرے لیے کسی بُرائی کی گھات لگا دیں گے۔ برادران یوسف کو اس خواب کی خبر نہ کی تاکہ یوسف کے ساتھ دغا نہ کریں اور لیکن چھپایا اُن سے اس خواب کا حال۔

فكذا ابوك كتمك لانه خاف علیك

اسی طرح تیرے باپ نے تجھ سے چھپایا اس لیے کہ اُس کو تجھ پر خوف تھا۔

ف یعنی جس طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اُن کے بھائیوں سے چھپایا تھا تاکہ اُن کے بھائی حسد کی وجہ سے حضرت یوسف کو ایذا نہ پہنچا دیں اسی طرح امام زین العابدینؑ نے امامت کا مسئلہ تجھ سے چھپایا کہ تجھ کو امام باقرؑ کی امامت پر حسد ہوگا اور تو اُن کو ایذا پہنچائے گا۔

قال فقال اما والله لئن قلت ذلك لقد حدثني صاحبك بالمدینة اني اقتل واصلب بالكناسة وان عنده صحیفة فیها قتلي وصلبي۔

احول کہتا ہے کہ پھر زید نے مجھ سے کہا کہ ہاں اگر تو یہ کہتا ہے تو واللہ تیرے صاحب (امام جعفر صادق) نے بھی جو مدینہ میں ہے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اے زید تو قتل ہوگا اور مقام کناسہ میں سُولی پہ چڑھایا جاوے گا اور وہ اپنے پاس کوئی

صحیفہ بناتا ہے جس میں میرے قتل ہونے
اور سولی پانے کا حال لکھا ہوا ہے۔

قزوینی نے ترجمۂ کافی میں لکھا ہے کہ یہاں صحیفہ سے وہ مصحف مراد ہے جو حضرت فاطمہؓ پر جبرئیلؑ نے نازل کیا تھا اس لیے کہ اس قسم کی باتیں اُسی میں لکھی تھیں۔

یہاں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ امام زید شہید علیہ السلام اس صحیفہ کے وجود کو جھوٹ سمجھتے تھے۔

فحججت فحدثت اباعبداللہ بمقالۃ زید وما قلت لہ فقال لی اخذتہ من بین یدیہ ومن خلفہ وعن یمینہ وعن شمالہ ومن فوق راسہ ومن تحت قدمیہ ولم تترك له مسلكا يسلكه	احول کہتا ہے کہ پھر میں حج کو گیا تو میں نے امام جعفر صادق سے زید کی گفتگو اور جو کچھ میں نے اُسے جواب دیا تھا سب بیان کیا تو امام نے مجھ سے فرمایا کہ روک لیا تو نے اس کو سامنے سے اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے اور اوپر سے اور نیچے سے اور نہ چھوڑا اس کے لیے کوئی نکلنے کا راستہ۔

یعنی امام نے کہا کہ تونے ایسی کامل دلیل بیان کی کہ جس کے الزام سے زید کسی طرح نہیں بچ سکتے تھے۔

اس موقع پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ امام زین العابدینؓ کے کُل گیارہ فرزند تھے جن میں سے ایک امام باقر علیہ السلام تھے ان کے سوا جو دس تھے

اُن سب کی وہی حالت تھی جو زید کی تھی۔ چنانچہ اصول کافی میں باب الاشارۃ والنص علی ابی جعفر میں مذکور ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہتیاروں کا صندوق امام باقر علیہ السلام کے حوالے کر دیا تھا جب امام زین العابدین کا انتقال ہو گیا تو امام باقر کے بھائیوں نے اس میں میراث کا دعوے کیا اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام باقر کے سوا امام زین العابدین کی تمام اولاد مسئلہ امامت سے بے خبر تھی ورنہ ہتیاروں کے صندوق میں جو امام سے مختص ہوتا ہے کبھی میراث نہ مانگتے۔

پس اُس وقت امام حسینؓ کی جس قدر اولاد تھی اُن میں سے فقط امام باقر بموجب روایات شیعہ مدعی نص امامت تھے باقی سب منکر تھے۔

پس ثابت ہو گیا کہ اکثر اہل بیت منکر نص امامت تھے اور یہی حالت عبداللہ محض وغیرہ امام حسنؓ کے چھ پوتوں کی تھی پس مدعی امامت فقط امام باقر اور منکر امامت اُن کے سوا تمام اہل بیت تھے۔ جم غفیر اہل بیت کے مقابلے میں ایک امام باقر کا دعویٰ کیا قابل اعتبار تھا پس ثابت ہوا کہ حسینؓ کے پوتوں میں ایک کے سوا سب کا مذہب یہی تھا۔

اب فرمائیے کہ حضرات شیعہ کا یہ دعویٰ کہ اُن کا مذہب موافق مذہب اہل بیت کے ہے کس قدر جھوٹا ہے۔

انھیں امام زید شہید علیہ السلام نے ایک مرتبہ امام باقر علیہ السلام

سے جا کر جھگڑا کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ وہ شخص امام نہیں ہو سکتا جو تمھاری طرح جہاد چھوڑ کر گھر میں چھپ کر بیٹھے بلکہ امام وہ ہے جو جہاد کو نکلے اس سے مطلب ان کا یہ تھا کہ امام تم نہیں میں ہوں۔

چنانچہ اصول[1] کافی کے باب فیصلہ حق و باطل میں مذکور ہے کہ حضرت زید شہید اہل کوفہ کے خطوط لے کر امام باقر کے پاس گئے جن میں اہل کوفہ نے ان کو خروج کی ترغیب دی تھی اور رفاقت کا وعدہ کیا تھا امام باقر نے پوچھا کہ ان خطوط کے لکھنے میں انھوں نے اپنی طرف سے ابتدا کی ہے یا تمھارے خطوط کے جواب ہیں۔ حضرت زید شہید نے کہا کہ ان خطوط کے لکھنے میں انھوں نے اپنی طرف سے ابتدا کی ہے اس لیے کہ وہ قرابت رسولؐ کے حقوق سے واقف ہیں اور ہماری محبت اور اطاعت کو واجب سمجھتے ہیں۔ اس پر امام باقر نے فرمایا کہ اللہ کا یہ حکم ہے کہ محبت ہم سب کی واجب ہے مگر اطاعت ہم میں سے ایک کی واجب ہے اور ہر ایک کام اپنے وقت پر موقوف ہے۔

فغضب زید عند ذلك ثم قال لیس الامام منا من جلس فی بیتہ وارخی سترہ وثبط عن الجهاد۔

تو غصہ آگیا زید کو اس بات پر پھر انھوں نے فرمایا کہ امام ہم میں کا وہ شخص نہیں ہے جو گھر میں بیٹھ رہے اور پردہ لٹکالے اور جہاد سے غافل ہو جائے۔

ولکن الامام منا من منع حوزتہ

اور لیکن امام ہم میں سے وہ ہے جو اپنی

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۲۴

وجاهد فی سبیل الله حق جهادہ ودفع وذب عن حریمہ۔

سلطنت کی نگاہبانی کرے اور اللہ کے لیے ایسا جہاد کرے جو جہاد کا حق ہے اور اپنی رعیت پر ظلم نہ ہونے دے اور اپنے متوسلین کی حمایت کرے۔

شاید امام باقر علیہ السلام کو یہ ناگوار ہوا کہ اہل کوفہ نے حضرت زید شہید کے لیے امامت تجویز کی حالانکہ امام باقرؑ ان کے بڑے بھائی تھے ان کی طرف توجہ نہ کی اس لیے انھوں نے حضرت زید شہید کے مقابلے میں بھی اُسی تدبیر کا ڈھنگ ڈالا جو تدبیر امام زین العابدین نے محمد بن حنفیہ کے مقابلے میں کی تھی۔ حضرت زید شہید اگرچہ عمر میں چھوٹے تھے مگر علم و فضل میں مرتبہ عالی رکھتے تھے انھوں نے اپنی امامت کے ثبوت میں ایسی حجت قوی پیش کی کہ اگر امام باقر علیہ السلام انصاف سے کام لیتے تو اس کا کوئی جواب نہ تھا اس لیے کہ جو شخص اپنی حکومت قائم نہ کرے وہ امام کیسے ہوگا۔ لیکن یہ ایک معمولی بات ہے کہ بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی کے مقابلے میں ساکت ہونا پسند کرتا اس لیے انھوں نے اس حجت قوی کو لاجواب چھوڑ کر دوسرے ڈھنگ پر گفتگو شروع کی۔

قال ابو جعفر هل تعرف یا اخی من نفسك شیئا مما نسبتها الیہ فتجیء علیہ بشاهد من کتاب الله او حجۃ

امام باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا جانتا ہے تو اے میرے بھائی اپنی ذات میں کوئی علامت امامت کی جس کی تو اپنی طرف نسبت کرتا ہے کہ بیان کرے تو اس پر

من رسول اللہ — کوئی دلیل قرآن کی یا قول رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

اب امام باقر زید شہید سے پوچھتے ہیں کہ تم اپنی امامت قرآن یا حدیث سے ثابت کرو حالانکہ حضرت زید شہید علیہ السلام نے جو دلیل بیان کی تھی اُس میں قرآن کی ایک آیت کی طرف بہت صاف اشارہ تھا اس لیے کہ اللہ نے قرآن میں اولی الامر کی اطاعت واجب کی ہے اور اولی الامر وہ ہے جو صاحب حکومت ہو۔ حضرت زید شہید حکومت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور اہل کوفہ نے ان کی حکومت قبول کرلی تھی۔ امام باقر علیہ السلام اگر حضرت زید شہید کی تقریر سے اس آیت کی طرف اشارہ سمجھ جاتے تو پھر ان کی امامت کی دلیل ان سے نہ پوچھتے۔

شاید امام باقر علیہ السلام کو خطبۂ شقشقیہ پر بھی اطلاع نہ تھی اس لیے کہ اس کے آخر میں بھی جناب امیر علیہ السلام کا یہ قول موجود ہے کہ علما کو جب مددگار مل جاویں تو مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی کے لیے امامت حاصل کرنا ان پر واجب ہوجاتی ہے اور حضرت زید شہید کو مددگار مل گئے تھے پھر وہ امامت حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہ کرتے۔ امام زید شہید علیہ السلام اپنے جد امجد امام حسینؓ کا نمونہ تھے جو حالت ان کی ہوئی وہی ان کی ہوئی۔

اس روایت کے آخر میں یہ بھی ہے کہ امام باقر نے حضرت زید شہید سے کہا کہ اے بھائی کیا تمھارا یہ ارادہ ہے کہ تم اُن لوگوں کے طریقہ کو زندہ کرو

جنھوں نے اللہ اور رسول کی نافرمانی کی اور بغیر دلیل کے خلافت کا دعویٰ کیا میں اللہ سے پناہ مانگتا ہوں کہ تم کل کے دن کناسہ میں سُولی پر چڑھائے جاؤ۔

بہرحال مسئلہ امامت میں حضرت زید شہید کا مذہب بہت اچھی طرح ظاہر ہوگیا کہ وہ امامت کے اس معنی کو جو حضرات شیعہ نے فرض کیے ہیں باطل اور بے اصل سمجھتے تھے اور قوی دلیلوں سے اس کو رد کرتے تھے۔

اب شیعوں پر یہ سخت مشکل پیش آئی کہ امام حسینؓ کے پوتے اور فاطمہؓ کے پرپوتے نے ان کے مذہب کی جڑ کاٹ دی اور مسئلہ امامت کو ایسا بگاڑ دیا جو کسی طرح بن نہیں سکتا۔ بہت بڑا دام فریب بانیان مذہب شیعہ کی طرف سے یہ بچھایا گیا ہے کہ وہ اہل بیت کے طرفدار ہیں مگر یہ طرفہ تماشا ہوگیا کہ خود اہل بیت نے اس طلسم فریب کو توڑ دیا۔ ایسی مجبوری کی حالت میں بانیان مذہب شیعہ نے بعض ایسی روایتیں تصنیف کریں کہ کسی طرح اس قصہ کی کچھ تاویل کریں اور اس بگڑی ہوئی بات کو زبردستی بنائیں۔

یہ تاویل یہ ہے کہ حضرت زید شہید دل میں امام باقر اور ان کے بعد امام جعفر صادق سے ملے ہوئے تھے۔ ظاہر میں بہ لحاظ مصلحت ایسی باتیں کرتے تھے اور امام جعفر صادق کا یہ قول تصنیف کرلیا کہ وہ فرماتے تھے کہ اگر زید غلبہ پاتے تو اپنا وعدہ پورا کرتے اور امامت ہم کو دیتے۔

اس تاویل کا صاف صاف مطلب یہ ہوا کہ امام جعفر صادق خود
تو گھر میں بیٹھے رہے اور اپنے چچا زید شہید کو لڑنے کے لیے میدان میں بھیج دیا تاکہ
اگر غلبہ پاویں تو امامت امام جعفر صادق کے حوالے کر دیں اور شکست پاویں تو
جو کچھ گزرے اُن کی جان پر گزرے۔

اب اہل انصاف غور فرمائیں کہ یہ تاویل کیسی پوچ اور رکیک ہے۔

ابوجعفر احول مخلصین اصحاب ائمہ سے ہے اور ائمہ کی بہت سی روایتیں اُسی
سے منقول ہیں اور اُس کے مناقب کتب شیعہ میں بہت کچھ لکھے ہیں اُس
کے مقابلے میں حضرت زید شہید نے مسئلہ امامت کو رد کیا اور صاف کہدیا کہ
میرے باپ امام زین العابدینؓ نے باوجود کمال شفقت کے یہ مسئلہ مجھ کو نہیں
سکھایا۔ حضرت زید شہید کو ابوجعفر سے تقیہ بھی نہ تھا اس لیے کہ قصد خروج کے
راز پر اس کو مطلع کر دیا حالانکہ اُس زمانہ میں وہ رُوپوشی کی حالت میں تھے۔

امام باقر علیہ السلام سے حضرت زید شہید نے صاف کہہ دیا کہ امام
وہ نہیں جو گھر میں بیٹھے بلکہ امام وہ ہے جو میدان میں نکل کر جہاد کرے۔ یہ سب
باتیں اس وقت ہوئی تھیں جب تخلیہ میں اہل کوفہ کے خطوط حضرت زید شہید
نے ان کو دکھائے تھے اور قصد خروج میں مشورہ کرتے تھے پس ظاہر ہے کہ
ایسے وقت میں جو انھوں نے امام باقر کی امامت کا انکار کیا اور اپنی امامت
ثابت کی اور امام باقر نے جو کچھ ان کو جواب دیا یہ گفتگو بطور تقیہ نہ تھی۔

امام باقر نے کنایۃً اور امام جعفر صادق نے صراحت کے ساتھ اُن سے
کہہ دیا تھا کہ تمھارے خروج کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مقام کناسہ میں سُولی پر چڑھائے

جاؤ گے۔ پس جب امام جعفر صادق کو انجام ان کی ناکامی اور ہا
معلوم بلکہ سُولی پانے کا مقام بھی معلوم تھا تو پھر یہ کیسے صحیح ہو
باطن میں ان کو خروج کا مشورہ دیتے اور ظاہر میں مخالف ب
جعفر صادق نے ایسا کیا تو عمداً اپنے چچا زید شہید کو ہلاکت کے
صورت میں فتح کی امید کیا ہو سکتی تھی۔ پھر یہ قول کیسے صحیح ہو
شہید غلبہ پاتے تو اپنا وعدہ پورا کرتے۔ کتاب الخرائج میں یہ بھی
امام جعفر صادق نے زید شہید سے یہ کہہ دیا تھا کہ بنی فاطمہ میں
پہلے خروج کرے گا وہ مارا جاوے گا۔ پس یہ تاویل ہرگز صح
کہ ایسی حالت میں امام جعفر صادق نے زید کو خروج کی اجاز
زید نے اس لیے خروج کیا ہو کہ اگر فتح پاویں گے تو سلطنت
کو دے دیں گے امام جعفر صادق نے تو زید کو یہ خبر دی تھی کہ تم
مارے جاؤ گے بلکہ بنی فاطمہ سے جو کوئی خروج کرے گا وہ مارا
شہید نے ان کے اس قول کو جھوٹ سمجھا اگر سچ سمجھتے تو خروج کیو
روضہ کافی میں بھی موجود ہے:۔

عن علی بن الحسین علیہما السلام	امام زین العابدین علیہ
قال واللہ لا یخرج واحد منا	ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ
قبل خروج القائم الا کان	کرے گا بنی فاطمہ میں سے
مثلہ مثل فرخ طار من	قائم سے پہلے مگر اس کی
وکرہ قبل ان یستوی جناحاہ	جیسے چڑیا کا بچہ اپنے با

فاخذہ الصبیان فعبثوا بہ۔ (ہونے سے پہلے آشیانہ سے نکل پڑے اور لڑکے اُس کا کھیل بنا دیں۔ (مطلب یہ ہے کہ ضرور مارا جاوے گا)

اس روایت سے ثابت ہوگیا کہ سادات بنی فاطمہ میں سے زمانہ قائم سے پہلے جو کوئی خروج کرے گا وہ ناکام ہوگا اور یقیناً مارا جاویگا پس یہ بھی ثابت ہوگیا کہ ان میں سے کوئی شخص مستحق خلافت نہ تھا اور اللہ نے ہرگز ایسے شخصوں کے امام بنانے کا حکم نہ کیا ہوگا جو جہاد میں یقیناً شکست پانے والے اور مارے جانے والے تھے۔

اور چونکہ یہ مضمون بیان ائمہ سے سب پر ظاہر ہوگیا تھا۔ پس مسلمانوں کو اولاد فاطمہ سے کسی کا امام بنانا حرام تھا اس لیے کہ جب یہ معلوم ہو چکا کہ اگر وہ امام بنیں گے اور لڑائی پیش آئے گی تو وہ شکست پاویں گے اور مارے جاویں گے اور اس صورت میں اسلام کی ذلت اور توہین تھی۔ اور جس صورت میں اسلام کی ذلت اور توہین ہو اُس کا اختیار کرنا حرام ہے۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ حضرات شیعہ تو یہ کہتے ہیں کہ اُن کا امام بنانا واجب تھا بلکہ یہ اعتقاد کہ وہ مستحق امامت تھے عین ایمان ہے اور بغیر اس اعتقاد کے انسان مومن نہیں ہوسکتا مگر اس دلیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کا امام بنانا حرام تھا۔

اب اہل انصاف غور فرمائیں کہ جب ان ائمہ کی یہ حالت تھی تو اگر ان میں سے کسی کو خلافت مل جاتی تو شوکت اسلام کو کیسا خلل پہونچتا اور

کافروں کا کیسا غلبہ ہو جاتا۔ پس ہرگز یہ خیال صحیح نہیں کہ خدا نے ایسے لوگوں کو خلیفہ بنانے کا حکم کیا تھا۔ ان سے تو خلفائے بنی امیہ بہتر تھے کہ اگرچہ ظالم تھے مگر ایسے شکست نصیب تو نہ تھے ان کی وجہ سے شوکت اسلام تو باقی تھی۔

شاید جناب امیر کو ائمہ کی اس شکست نصیبی اور قسمت کی ناکامی کی مطلق خبر نہ تھی اس لیے کہ انھوں نے اپنی وفات کے وقت حسنین علیہما السلام کو جو وصیت کی تھی اس میں جہاد کی بہت ترغیب دی تھی چنانچہ یہ پوری وصیت نہج البلاغت[1] میں مذکور ہے اُس میں یہ بھی ہے:-

اللہ اللہ فی الجہاد باموالکم وانفسکم والسنتکم فی سبیل اللہ (اللہ کے واسطے جہاد کرنا اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور اپنی زبانوں سے اللہ کی راہ میں۔)

یہ ظاہر ہے کہ یہ حکم جناب امیر کا سب کے لیے تھا ائمہ کی اولاد بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھی پس اگر جناب امیر کو یہ ناکامی معلوم ہوتی تو یوں وصیت کرتے کہ میری اولاد میں سے بنی فاطمہ کبھی جہاد نہ کریں۔

اب یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ائمہ کی تقدیر میں ایسی ناکامی کیوں تھی۔ حضرات شیعہ کی روایتوں پر اگر غور کیا جائے تو اُن سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ ہر انسان کے لیے طالع کا ایک ستارہ ہوتا ہے اور اُس کے تمام حالات کا حاکم وہی ستارہ ہے۔ ائمہ کے طالع کا ستارہ ٹھنڈے پانی سے

---

[1] شرح میثم مطبوعہ طہران ج ۳ ص ۵

بنایا گیا ہے اور ان کے سوا دوسروں کے طالع کے ستارے گرم پانی سے بنائے گئے ہیں پس کیا عجب ہے کہ اسی ٹھنڈے پانی کے اثر سے ائمہ کے طالع میں ایسی سرد مہری ہو اس لیے کہ حاکم اُن پر وہی ستارہ ہے جو ٹھنڈے پانی سے بنا ہے اُسی کے احکام اور خواص ائمہ کی حالت پر جاری ہوتے ہیں وہ ستارہ اللہ کا بڑا مقرب ہے۔ چنانچہ کافی کی کتاب[1] الروضہ میں ہے:-

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال ان اللہ خلق نجما فی الفلک السابع فخلقہ من ماء بارد وسائر النجوم الستۃ من ماء حار وھو نجم الانبیاء والاوصیاء ونجم امیر المومنین یامر بالخروج من الدنیا والزھد فیھا ویامر بافتراش التراب وتوسد اللبن ولباس الخشن واکل الخشب وما خلق اللہ نجما اقرب الی اللہ منہ۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ اللہ نے فلک ہفتم پر ایک ستارہ پیدا کیا ہے اُس ستارے کو ٹھنڈے پانی سے پیدا کیا ہے اور اس کے سوا اور جو چھ ستارے باقی چھ آسمانوں کے ہیں اُن کو گرم پانی سے پیدا کیا ہے اور وہی ٹھنڈے پانی کا ستارہ انبیا اور اوصیا کا ستارہ ہے اور وہی امیر المومنین علیہ السلام کا ستارہ ہے حکم کرتا ہے دنیا کے نکل جانے اور اُس کو چھوڑ دینے کا اور حکم کرتا ہے خاک پر سونے اور اینٹوں سے تکیہ بنانے اور موٹا کپڑا پہننے اور

[1] کتاب الروضہ کافی مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۲۰

بدمزہ طعام کھانے کا اور نہیں پیدا کیا ہے اللہ نے کوئی ستارہ جو اُس ستارہ سے زیادہ اللہ کا مقرب ہو۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ تمام جہان کے حاکم ستارے ہیں اور وہ اللہ کے مقرب ہیں انبیاء اور اولیاء کے طالع کا ستارہ جو اُن پر حاکم ہے وہ سب سے زیادہ اللہ کا مقرب ہے اُسی ستارہ کا حکم اُن پر جاری ہے جس سے وہ تارک الدنیا بنے۔

بانیان مذہب شیعہ نے تمام جہان کا حاکم اور اللہ کا مقرب ستاروں کو بنایا یہاں تک کہ انبیا اور اوصیا کو بھی ستاروں کا محکوم بنا دیا اور ستاروں کو اللہ کا مقرب مانا۔ یہ ویسا ہی عقیدہ ہے جیسا کہ مشرکین مکہ اپنے بتوں کو کہتے تھے کہ یہ اللہ کے مقرب ہیں ہم کو بھی اللہ کا مقرب بنا دیں گے۔ چونکہ بانیان مذہب شیعہ مسلمان نہ تھے یہودی یا ملحد تھے اس لیے انھوں نے اس قسم کے عقیدے مذہب شیعہ میں داخل کر دیے۔ افسوس کہ حضرات شیعہ کو اب بھی ان امور پر تنبیہ نہیں ہوتی اور ایسے عقیدوں کو لے کر اسلامی فرقوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ بھلا اسلام ایسے عقیدوں اور ایسے عقیدے والوں کو کیوں کر قبول کر سکتا ہے۔

اب عبد اللہ بن حسن کا حال سُنیے یہ حسن مثنیٰ کے بیٹے اور امام حسنؓ کے پوتے ہیں اور اُن کی ماں فاطمہ بنت حسینؓ تھیں اس وجہ سے امام حسینؓ کے نواسے ہیں اسی لیے ان کو عبد اللہ محض کہتے تھے کہ ان میں ماں

اور باپ دونوں طرف سے سیادت خالص تھی۔ اصول کافی[1] میں باب مایفصل بین المحق والمبطل میں بطریقہ سماعہ کلبی[2] نسابہ سے روایت ہے۔ کلبی کہتا ہے کہ میں مدینہ میں گیا اُس وقت تک مسئلہ امامت کا میں معتقد نہ تھا۔ مسجد میں داخل ہوا تو وہاں قریش کی جماعت بیٹھی ہوئی تھی میں نے اُن سے پوچھا کہ مجھے یہ بتادو کہ اہل بیت کا عالم کون ہے؟ اُن سب نے عبداللہ بن حسن کو بتایا میں اُن کے پاس پہونچا تو وہ ایک شیخ گوشہ نشین بڑی ریاضت کرنے والے تھے میں نے پوچھا کہ ایک شخص نے اپنی بی بی سے کہا کہ تجھ پر اتنی طلاقیں جتنے کہ آسمان پر ستارے تو کیا حکم ہے۔ انھوں نے کہا کہ تین طلاقیں پڑجاویں گی اور تین سے زیادہ جتنی تعداد ستاروں کی ہے اتنے گناہ اس پر ہوں گے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ ان کی پہلی غلطی ہے۔ پھر میں نے پوچھا:-

مایقول الشیخ فی المسح علی الخفین فقال قد مسح قوم صالحون ونحن اھل البیت لایمسح فقلت فی نفسی ثنتان

کیا کہتے ہیں شیخ موزوں پر مسح کرنے میں تو انھوں نے کہا کہ مسح کیا ہے اُن لوگوں نے جو صالحین تھے اور ہم اہل بیت مسح نہیں کرتے تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ دو خطائیں ثابت ہوئیں۔

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۲۱۵

[2] یہ وہی محمد بن السائب کلبی ہے جو مفسر مشہور ہے۔ صاحب عبقات نے جابجا اسکی روائتیں اہل سنت کے مقابلے میں پیش کی ہیں ۱۲

اس روایت سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ اہل بیت میں سب سے بڑے عالم امام عبداللہ بن حسن تھے اور امام جعفر صادق سے بھی اُن کا علم زیادہ تھا اس لیے کہ جماعت قریش نے سب سے پہلے اُنھیں کو عالم بتایا اور ظاہر ہے کہ اس جماعت قریش میں اہل بیت اور بنی ہاشم اور خاندان رسولؐ کے آدمی بھی ہوں گے اور سب عبداللہ بن حسن کو عالم اہل بیت جانتے تھے۔

دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ امام عبداللہ مسح خفین کو جائز سمجھتے تھے اس لیے کہ انھوں نے یہ فرمایا کہ صالحین نے مسح کیا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ صالحین سے مُراد اُن کی صحابہؓ ہوں گے اس لیے کہ یہ عبداللہ سنہ ستر ہجری میں پیدا ہوئے تھے جو صحابہؓ کا زمانہ تھا پس صالحین انھوں نے خلفائے ثلثہ وغیرہ تمام صحابہ کو کہا جو موزوں پر مسح کرتے تھے اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ موزوں کے مسح کو جائز سمجھتے تھے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ عموماً ان صحابہ کو صالحین سمجھتے تھے جن کو شیعہ مرتد کہتے ہیں (معاذ اللہ منہا) اور یہ جو انھوں نے کہا کہ ہم اہل بیت مسح نہیں کرتے اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل بیت وہ صورت اختیار کرتے ہیں جو اولیٰ ہے اس لیے کہ موزوں پر مسح کرنا جائز ہے اور اگر موزے اُتار کر پاؤں دھوئے تو وہ اولیٰ ہے اہل سنت کا مذہب بھی یہی ہے۔

پس امام عبداللہ علیہ السلام کی تحقیق سے ظاہر ہو گیا کہ اہل بیت کا مذہب یہ تھا کہ مسح موزہ پر جائز ہے اولیٰ نہیں اور وہ صحابہ جو موزوں پر مسح کرتے

تھے صالحین تھے پس اہل بیت کا مذہب موافق مذہب اہل سنت کے تھا۔ والحمد
للہ علیٰ ذلک۔

اس روایت میں اس کے بعد یہ ہے کہ کلبی اُن کے پاس سے ناراض
ہو کر اٹھا اور پھر مسجد میں آیا وہاں جماعت قریش وغیرہ کی بیٹھی تھی اُن سے پھر
پوچھا کہ اہل بیت میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ اُن سب نے کہا کہ عبداللہ
بن حسن۔ کلبی نے کہا کہ میں اُن کے پاس گیا تھا ان کو کچھ بھی علم نہیں ایک شخص
نے کہا کہ تو جعفر بن محمد کے پاس جا وہ بڑے عالم ہیں۔ اس کہنے پر اور لوگوں نے
اس کو ملامت کی تو میں سمجھ گیا کہ ان لوگوں نے اول بار حسد کی وجہ سے اُن کا
پتہ نہیں بتایا تھا۔ اُس کے بعد وہ امام جعفر صادق کے پاس پہونچا اُن سے طلاق
کا مسئلہ پوچھا کہ اگر کسی نے اپنی بی بی سے کہا کہ تجھ پر اتنی طلاقیں ہیں جتنے کہ
آسمان پر ستارے تو کیا حکم ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ایک طلاق بھی نہ
ہوگی۔ کلبی نے اپنے دل میں کہا کہ یہ پہلی علامت ان کے علم کی ہے۔ پھر پوچھا
کہ موزوں کے مسح کا کیا حکم ہے؟ انھوں نے کہا کہ قیامت کو موزے اُس
جانور کی پشت پر پہونچ جائیں گے جس کی کھال سے بنے تھے اور ان پر مسح
کرنے والے بے وضو رہ جائیں گے۔ کلبی نے یہ سُن کر کہا کہ یہ دوسری نشانی
اُن کے علم کی ہے اس روایت کے آخر میں سماعہ کا یہ قول بھی مذکور ہے کہ
کلبی ہمیشہ شیعہ مذہب پر قائم رہا اور اسی مذہب پر مرا۔

اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ امام جعفر صادق کے مسئلے ہمیشہ
رائے اور قیاس پر مبنی ہوتے تھے جس طرح کہ بچھے کے ستر میں انھوں نے یہ

رائے لگائی کہ وہ خود بخود چھپا ہوا ہے اُس کے چھپانے کی کوئی ضرورت نہیں
یا کافر کا ستر دیکھنے میں انھوں نے یہ قیاس کر لیا کہ کافر گدھے ہیں پس ان کا
ستر دیکھنا ایسا ہے جیسے گدھے کا ستر دیکھنا اسی طرح انھوں نے یہ بھی
قیاس کر لیا کہ مسح موزے پر ہوا تھا اور موزہ اس جانور پر پہونچ گیا جس کی کھال
سے بنا تھا پس وضو کرنے والا بے وضو رہ گیا۔ حدیث اور قول رسولؐ سے اُن کا
استدلال بہت کم ہوتا تھا۔

یہ عبداللہ بن حسن اپنے بیٹے محمد کو جو نفس زکیہ کے نام سے مشہور ہیں
امام بنانا چاہتے تھے۔ اصول[1] کافی کے اسی باب میں ایک دوسری روایت
ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبداللہ بن حسن نے امام جعفر صادق سے بار بار
آ کر کہا کہ تم میرے بیٹے محمد کی بیعت کر لو اور اس کو امام مانو امام جعفر صادق
نے عذر کیا تو عبداللہ بن حسن نے کہا کہ امام حسن نے امامت اپنی اولاد کو نہ دی
اپنے بھائی حسین کو دی تو حسین کو کیا اختیار تھا کہ اپنی اولاد کو امامت دے
گئے۔ ان کو مناسب تھا کہ اولاد حسن میں جو سب سے بڑا ہوتا اس کو امامت
دیتے۔ امام جعفر صادق نے یہ کہا کہ حسین نے اپنی طرف سے ایسا نہیں
کیا بلکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت اسی طرح تھی۔ عبداللہ بن حسن نے اس
کو نہ مانا۔

اس روایت سے ظاہر ہو گیا کہ عبداللہ بن حسن کو مسئلہ امامت
کی خبر بھی نہ تھی اور چونکہ عبداللہ بن حسن کے اس خیال میں کہ اُن کے بیٹے محمد کو

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص۲۲۴

امام بنایا جاوے۔ اکثر اہل بیت خصوصاً امام حسنؓ کی تمام اولاد شریک تھی۔
چنانچہ اسی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ منصور دوانیقی خلیفہ کو جب اس
سازش کی خبر ہوئی تو اس کے حکم سے اس سازش کے جرم میں عبداللہ محض
اور سلیمان اور حسن مثلث اور ابراہیم اور داؤد اور علی گرفتار ہوئے اور
قتل کیے گئے یہ سب امام حسن علیہ السلام کے پوتے تھے اور اُن کی اولاد
کے بھی بہت سے لوگ گرفتار ہوئے تھے اور اس کے بعد جب محمد نفس زکیہ
اور اُن کے بھائی نے اور اس کے بعد دوسروں نے امام بن بن کر خروج کیا
ہے اُن کے ساتھ بھی اہل بیت شریک تھے پس اس سے صاف ظاہر ہے کہ
اکثر لوگ خاندان اہل بیت کے مسئلہ امامت کے اس معنی سے جو شیعوں
نے مقرر کیے ہیں محض ناواقف تھے بلکہ امام سے ان کی مراد ایک سردار تھی
جس کو منتخب کر لیتے تھے۔ چنانچہ عبداللہ محض اپنے بیٹے کو اسی طرح کا امام بنانا
چاہتے تھے۔ یہ تمام اکابر سادات امامت کو ہرگز منصوص نہیں جانتے تھے
اسی وجہ سے عبداللہ بن حسن نے کہا کہ حسینؓ کو مناسب تھا کہ اولاد حسن میں
سب سے بڑے کو امامت دیتے اور جب امام حسنؓ اور امام حسینؓ کے
پوتوں کو بھی مسئلہ امامت کی خبر نہ تھی تو اس کے باطل ہونے میں کیا شک
ہے؟۔

عبداللہ بن جعفر امام جعفر صادق علیہ السلام کے بڑے بیٹے ہیں اور
بعد وفات صادق علیہ السلام کے انھوں نے امامت کا دعویٰ کیا یہ بزرگ عبداللہ افطح[1]

[1] افطح اس کو کہتے ہیں جس کے پاؤں کا پنجہ مڑا ہوا ہو اور رفتار میں (باقی ص ۶۴۵ پر)

کے نام سے مشہور ہیں ان کے مقابلے میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے امامت
کا دعویٰ کیا۔

جن لوگوں نے عبداللہ کی امامت مان لی وہ فرقہ افطحیہ کے نام سے
ملقب ہوا اور جنھوں نے موسیٰ کاظم کو امام مانا وہی شیعہ اثنا عشری ہیں چنانچہ
حق الیقین میں لکھا ہے:۔

"افطحیہ بعد از حضرت صادق علیہ السلام عبداللہ افطح پسر بزرگ
آں حضرت را کہ در ظاہر و باطن ہر دو معیوب بود و بایں سبب
امامت باو منتقل شد امام دانند۔"

دیکھیے ملا صاحب نے اپنے امام زادے کی کیسی تعظیم کی (معاذ اللہ
منہا) محبت اہل بیت کا مقتضا یہی تھا۔

اس قصہ سے بخوبی ثابت ہو گیا کہ عبداللہ بن جعفر امامت کو منصوص
نہیں جانتے تھے اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان کو یہ مسئلہ نہیں سکھایا تھا
اور یہ بھی دلیل اس امر کی ہے کہ نص امامت کا وجود نہ تھا ورنہ یہ امام زادے
ہرگز اس سے بے خبر نہ ہوتے۔

اہل سُنت کے نزدیک بزرگان اہل بیت میں سے کبھی کسی نے
امامت کا دعویٰ نہیں کیا جو شیعوں نے فرض کر لی ہے اور اگر روایاتِ
شیعہ کو دیکھا جائے تب بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ حسنی سلسلے کے سادات نص
امامت کی ہمیشہ تکذیب کرتے رہے اور حسینی سلسلے کے سادات میں سے

(بقیہ ص ۶۴۴) نصف پشت پا اُس کو زمین پر ٹکنا پڑے ابن عبداللہ کا پاؤں اسی طرح کا تھا ۱۲

اُن لوگوں کے سوا جن کو شیعوں نے امام مان لیا ہے اور تمام بزرگوار نص امامت کو باطل کہتے تھے۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی اولاد میں اکثر یہی ہوتا رہا کہ ہر امام کے بھائی اپنے اقوال اور افعال سے نص امامت کی تکذیب کرتے رہے۔ چنانچہ امام یازدہم کے بعد اُن کے بھائی جعفر ثانی نے بھی یہی کیا جن کا نام فرقۂ سبائیہ نے کذاب رکھا اور تعظیم اہل بیت کا حق پورا پورا ادا کیا انہوں نے بہت سچی بات کہی تھی کہ امام حسن عسکری کے اولاد نہ تھی مگر شیعوں نے ایک خیالی بچہ فرض کر کے غائب بنا دیا اور اُسی خیالی بچہ کو صاحب الامر فرض کر لیا۔ حضرت جعفر نے اس سچی بات کہنے کی وجہ سے فرقۂ سبائیہ کی زبان سے کذاب کا لقب پایا۔ سادات کے خروج کے بہت سے قصے کتب سیر میں مذکور ہیں یہ سب نص امامت کے منکر تھے اور امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ وغیرہ مجتہدین اہل سنت ان کے حامی اور طرفدار تھے اسی جرم میں امام[1] ابو حنیفہؒ قید میں قتل کیے گئے اور امام مالکؒ کے کوڑے مارے گئے کہ وہ چاہتے تھے کہ خلافت سادات کو مل جائے۔

[1] صافی ترجمہ کافی کتاب الحجۃ جزو سوم باب فیصلہ محق و مبطل نسخہ مطبوعہ لکھنؤ کے ص ۲۶۳ پر لکھا ہے :-

"پس ظاہر شد محمد بن عبداللہ و مجتمع شدند مردم برائے او و اختلاف نکردہ برا و ہیچ یک از قریش کہ مدنی بود و نہ ہیچیک از اہل مدینہ و مثل ابو حنیفہؒ کہ بسبب ایں در زندان منصور دوانیقی مُرد و مثل مالکؒ بن انس کہ بسبب ایں عیسٰی بن موسٰی اورا زد۔"

اس سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اکابر اہل سنت اہل بیت پر جاں نثاری کے لیے حاضر تھے ۱۲۔

سادات حسنی اور حسینی نے جو بار بار خلفائے بنی امیہ اور عباسیہ کے زمانے میں خروج کیا ہے اُن میں جو سردار ہوتا تھا وہ امام بنتا تھا اور باقی دونوں سلسلوں کے سادات جو اُس کے ساتھ شریک ہوتے تھے وہ اُس کی بیعت کرتے تھے اور اس پر غور کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عموماً تمام اہل بیت نص امامت کے منکر تھے بلکہ خروج کرنے والے کو امام بناتے تھے پس تعجب ہے کہ حضرات شیعہ حسنینؓ کے بعد دو ہزار آدمیوں میں سے فقط آٹھ ایسے آدمی اپنے ساتھ فرض کر کے جو دو سو برس کے عرصہ میں ظاہر ہوئے اپنی مذہب کو اہل بیت کے مذہب کے موافق بتاتے ہیں یہ کیسا جھوٹا دعوے ہے۔ بلکہ شیعوں کا مذہب اُس مذہب کے مخالف ہے جو عموماً اہل بیت کا مذہب تھا۔ شاید حضرات شیعہ اپنے متقدمین کے افتراؤں سے مدد لے کر بیس پچیس آدمی خاندان اہل بیت سے اور بھی ایسے گنا دیں جو اس دو سو برس کے عرصہ میں جو واقعہ شہادت حسینؓ سے امام یازدہم کی وفات تک گزرا۔ ان آٹھ اماموں کی امامت فرض کردہ حضرات شیعہ پر ایمان لائے ہوں مگر دو ہزار آدمیوں کے مقابلے میں یہ تعداد کیا وقعت رکھتی ہے۔

پس یہ کیسی نص امامت تھی جس کی اہل بیت کو بھی خبر نہ تھی حالانکہ یہ مثل مشہور ہے کہ اَھْلُ[1] البیت ادری بما فی البیت پس اگر اہل بیت کے لیے نص امامت ہوتی تو اہل بیت ضرور اس سے واقف ہوتے حالانکہ یہ ثابت ہو چکا کہ اولاد ائمہ بھی اُس سے بے خبر ہوتی تھی پس نص امامت کے

[1] گھر والے گھر کی چیزوں کو خوب جانتے ہیں ۱۲

باطل ہونے میں کوئی شک نہ رہا۔

اگر یہ شبہ ہو کہ اہل بیت میں سے جن لوگوں نے امام وقت کی امامت کا انکار کیا ہے اس کی وجہ فقط یہ ہوتی تھی کہ اپنے بھائی کی امامت پر ان کو حسد ہوتا تھا اور بمقتضائے شوق حکومت امامت کی عزت بطور ناجائز اپنے واسطے ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن ائمہ کی امامت شیعوں نے مان لی ہے اُن میں بھی یہ احتمال موجود ہے کہ انھوں نے بھی بمقتضائے شوق حکومت امامت کی عزت بطور ناجائز اپنے واسطے ثابت کی ہو اور اپنے واسطے نص امامت تصنیف کرلی ہو بلکہ یہ احتمال اور بزرگان اہل بیت کی نسبت انھیں ائمہ میں زیادہ موجود ہے اس لیے کہ ان کی صفات جو اوپر مذکور ہو چکیں وہ ایسی ہیں کہ جس شخص میں ایسی خصلتیں ہوں اس کی بات قابل اعتبار نہیں ہوتی یہ خصلتیں اور بزرگان اہل بیت میں ثابت نہیں ہوئیں۔

قطع نظر اس کے دوسرے بزرگان اہل بیت کا قول اس وجہ سے زیادہ قابل اعتبار کے ہے کہ صحابہؓ کے وقت سے جمہور اہل اسلام کا بھی قول تھا۔

اس موقع پر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حسب روایات شیعہ یہ بھی ثابت ہے کہ شیعوں کے ائمہ بھی اپنی امامت کے منکر تھے چنانچہ کافی کی روایت سے ثابت ہے کہ امام جعفر صادق نے اپنی امامت سے انکار کیا ہے۔ مجالس[1] المومنین میں بھی بحوالہ کتاب مختار کے اس روایت کو نقل کیا ہے جس کی اصل

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول ۱۲ منہ

عبارت ہم جلد[1] اول میں نقل کر چکے ہیں۔ حاصل اُس روایت کا یہ ہے کہ "سعید کہتا ہے کہ میں امام جعفر علیہ السلام کی خدمت میں موجود تھا کہ دو آدمی آئے اور انھوں نے اہل مجلس سے پوچھا کہ کیا تم میں کوئی امام مفترض الطاعت ہے؟ امام جعفر صادق نے فرمایا کہ ہم اپنے گروہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں پہچانتے جو امام مفترض الطاعت ہو۔ انھوں نے کہا کہ کوفہ میں بعض لوگ یہ پتہ دیتے ہیں کہ تمھارے گروہ میں کوئی امام مفترض الطاعت ہے اور وہ جھوٹے نہیں اس لیے کہ بڑے متقی ہیں اور عبداللہ بن یعفور وغیرہ بھی انھیں میں ہیں۔ امام نے فرمایا کہ میں نے اُن کو اس اعتقاد کا حکم نہیں کیا اس میں میرا کیا گناہ ہے؟"

اس کے بعد امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنی اور اپنے باپ کی امامت سے انکار کیا۔ اس کا ماجرا یہ ہے کہ اول محمد اور ابراہیم پسران عبداللہ محض نے یکے بعد دیگرے خروج کیا جب وہ دونوں شہید ہو چکے۔ پھر حسین بن علی بن حسن مثلث بن حسن مثنیٰ نے خروج کیا اور مقام فخ میں شہید ہوئے۔ پھر یحییٰ بن عبداللہ محض نے خروج کا قصد کیا اور لوگوں کو اپنی بیعت کی طرف ترغیب دینے کے لیے اُس نے جا بجا اپنے آدمی بھیجے تھے۔ یحییٰ کو یہ خبر پہنچی تھی کہ امام موسیٰ کاظم لوگوں کو میری بیعت سے روکتے ہیں۔ اس لیے یحییٰ نے امام موسیٰ کاظم کو خط لکھا اور اس کا جواب امام موسیٰ کاظم نے دیا۔ یہ دونوں خط اصول[2] کافی کے باب فیصلۃ الحق والمبطل میں مذکور ہیں۔

[1] نصیحۃ الشیعہ جلد اول ۱۲ منہ [2] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص۲۳۱

كتب يحيى بن عبد الله بن الحسن الى موسى بن جعفر عليه السلام اما بعد فاني اوصي نفسي بتقوى الله وبها اوصيك فانها وصية الله في الاولين ووصية في الآخرين اخبرني من ورد علي من اعوان الله على دينه ونشر طاعته بما كان من تحننك مع خذلانك وقد شاورت في الدعوة للرضا من آل محمد وقد احتجبتها واحتجبها ابوك من قبلك

یحیٰی بن عبد اللہ محض بن حسن مثنیٰ نے امام کاظم علیہ السلام کو یہ خط لکھا۔ حمد و نعت کے بعد مطلب یہ ہے کہ میں نصیحت کرتا ہوں اپنے نفس کو اللہ کے خوف کی اور یہی نصیحت تجھے کرتا ہوں۔ یہی اللہ کا حکم ہے پہلوں کے لیے اور یہی اُس کا حکم ہے پچھلوں کے لیے۔ خبر دی ہے مجھ کو انھوں نے جو آئے میرے پاس اللہ کے مددگار اس کے دین کی مدد میں اور اس کی طاعت کے رواج دینے میں اس بات کی کہ بے سامانی میں بھی تجھ کو امامت حاصل کرنے کا شوق ہے اور خلل ڈالا تو نے لوگوں کے بلانے میں رضا[1] من آل محمد کی طرف۔ (یعنی لوگوں کو جو میری بیعت کی ترغیب دی جاتی تھی اُس میں تو نے مزاحمت کی) اور بے شک در پردہ رکھا تو نے دعواے

[1] رضا من آل محمد سے یحیٰی نے اپنی ذات مراد لی ہے اور سادات میں جتنے آدمیوں نے خروج کیا سب کا لقب یہی ہوتا تھا۔ صافی ترجمہ کافی میں لکھا ہے کہ رضا بکسر را وہ شخص ہے جس کی امامت پر لوگ راضی ہو جاویں ۱۲

امامت کو اور در پردہ رکھا اس کو تیرے باپ نے تجھ سے پہلے۔

وقد بما ادعيتم ما ليس لكم وبسطتم آمالكم الى ما لم يعطكم الله۔ فاستهويتم وضللتم

اور ہمیشہ دعوٰی کیا تم نے امامت کا جس میں تمھارا حق نہیں اور وسیع کیں تم نے اپنی آرزوئیں اس امامت کی طرف جو اللہ نے تم کو عطا نہیں کی۔ پس تم نے لوگوں کو بہکایا اور گمراہ کیا۔

وانا محذرك ما حذرك الله من نفسه۔

اور میں ڈراتا ہوں تجھ کو جیسے کہ ڈرایا ہے تجھ کو اللہ نے اپنی ذات سے (یعنی اپنے عذاب سے)

فكتب اليه ابو الحسن موسى بن جعفر من موسى بن عبد الله جعفر وعلي المشتركين في التذلل لله وطاعته

تو جواب لکھا اُس کو ابو الحسن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق نے۔ یہ خط دو شخصوں کی طرف سے ہے ایک موسیٰ بن عبد اللہ جعفر (یعنی امام موسیٰ کاظم) دوسرے علی (یعنی اُن کے بیٹے امام رضا) یہ دونوں اس امر میں شریک ہیں کہ اللہ کی عبادت اور بندگی کرتے ہیں۔

الى يحيى بن عبد الله بن الحسن اما بعد فاني احذرك الله

طرف یحیٰی بن عبد اللہ بن حسن کے۔ بعد حمد و نعت کے مطلب یہ ہے کہ میں ڈراتا ہوں

ونفسی اتانی کتابك تذکر فیه انی مدع وابی من قبل وما سمعت ذلك منی وستکتب شهادتهم ویسئلون

تجھ کو اور اپنی ذات کو اللہ سے۔ آیا میرے پاس تیرا خط تو اس میں ذکر کرتا ہے کہ میں امامت کا مدعی ہوں اور اس سے پہلے میرا باپ بھی مدعی تھا اور نہیں سنا ہے تو نے یہ مجھ سے اور لکھی جاوے گی اُن کی گواہی اور وہ پوچھے جاویں گے (یعنی جو لوگ مجھ پر اور میرے باپ پر یہ افترا کرتے ہیں کہ ہم نے امامت کا دعویٰ کیا قیامت کے دن اللہ اُن سے اس افترا کا مواخذہ کرے گا)

وذکرت انی ثبطت الناس عنك لرغبتی فی ما فی یدیك وما منعنی من مد خلافك الذی انت فیه لو کنت مراغبا ضعف عن سنة ولا قلة بصیرة بحجة۔

اور تو نے ذکر کیا ہے کہ میں نے لوگوں کو تیری بیعت سے اس لیے روکا کہ مجھ کو اُس امامت کی رغبت تھی جو تیرے ہاتھ میں ہے اور میں نے جو یہ دعویٰ نہیں کیا جو تو نے کیا ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ علم سنت مجھ کو کم ہے یا دلیل کے سمجھنے میں میرا ذہن کمی کرتا ہے۔ بس اگر مجھکو رغبت ہوتی تو میں بھی یہی کر سکتا تھا۔

ولکن اللہ خلق الناس امشاجا وانا متقدم

اور لیکن اللہ نے لوگوں کی طبیعتیں مختلف بنائی ہیں اور میں تاکید کرتا ہوں تجھ کو اور

الیك احذرك معصیة الخلیفة واحثك علی برہ وطاعته وان تطلب لنفسك امانا قبل ان تاخذك الاظفار ویلزمك الخناق من کل مکان فتروح الی النفس من کل مکان ولا تجدہ حتی یمن اللہ علیك بمنه وفضله ورقة الخلیفة ابقاہ اللہ فیؤمنك ویرحمك ویحفظ فیك ارحام رسول اللہ۔

منع کرتا ہوں تجھ کو خلیفہ کی نافرمانی سے (اُس زمانہ میں خلیفہ ہارون رشید تھا) اور رغبت دلاتا ہوں میں تجھ کو خلیفہ کی فرماں برداری اور اطاعت پر اور یہ کہ طلب کرے تو اپنی جان کے لیے نجات اُس سے پہلے کہ پکڑ لیں تجھ کو (شیروں کے ناخن) اور پھانسی پڑے تیرے گلے میں ہر طرف سے۔ پھر سانس لینے کی کوشش کرے تو ہر طرف سے اور سانس نہ لے سکے تو اس وقت تک کہ احسان کرے اللہ تجھ پر اپنے کرم اور فضل سے اور بغیر مہربانی خلیفہ کے کہ اللہ اس کو باقی رکھے وہ امن دے تجھ کو اور رحم کرے تجھ پر اور لحاظ کرے تیرے معاملہ میں رسول کی قرابتوں کا۔

یہاں تک تو امام موسیٰ کاظم کا خط تھا۔ ایک شخص جعفری جو اس کا راوی ہے اُس نے اپنی طرف سے یہ فقرہ بڑھا دیا ہے کہ یہ خط حسب اتفاق ہارون رشید کے ہاتھ میں پہونچ گیا اور اس نے اس مضمون کو پڑھ کر یہ کہا کہ لوگ مجھ کو موسیٰ بن جعفر پر بھڑکاتے تھے مگر وہ امامت کے خیال سے بری ہے۔

مقصد اس ضمیمہ کے بڑھانے سے یہ ہے کہ یہ ضمیمہ تقیہ کا قرینہ بن جائے یعنی اگرچہ امام موسیٰ کاظم اور ان کے باپ امام جعفر صادق درحقیقت مدعی امامت تھے اور خلیفہ ہارون غاصب خلافت تھا مگر امام کی یہ بہت بڑی چالاکی تھی کہ انھوں نے اپنی اور اپنے باپ کے دعوی امامت سے انکار کر دیا اور خلیفہ غاصب خلافت کی جھوٹی خوشامد کی اور اس چالاکی کی بدولت امام موسیٰ کاظم نے خلیفہ کو اپنے اوپر مہربان کر لیا اور اس قسم کی چالاکیوں اور خوشامدوں سے امام اپنا تقرب ایسا بڑھاتے گئے کہ خلیفہ ماموں رشید نے ان کو اپنا ولی عہد بنانے کا قصد کیا۔

مگر اہل انصاف جانتے ہیں کہ ایسی ناجائز چالاکیاں اُن دنیا داروں کا شیوہ ہیں جو دنیا کو دین پر ترجیح دیتے ہیں اور ناحق اور خلاف واقع کلام کہنے اور اُمرا کی جھوٹی خوشامد کرنے میں اُن کو خدا کا خوف نہیں آتا۔ امام معصوم کی یہ شان نہیں کہ جھوٹی بات اُن کی زبان یا قلم سے نکلے۔ اور جھوٹی خوشامد سے وہ خلیفہ کے مزاج میں رسوخ حاصل کریں۔ جب وہ امام معصوم ہیں اور سب مسلمانوں پر ان کی اطاعت فرض ہے تو ضرور ہے کہ جو کلام ان کی زبان سے نکلے اس کے ظاہر مطلب پر ایمان لانا اسی طرح واجب ہوگا جیسے اللہ اور رسول پر ایمان لانا واجب ہے۔

یہ یقینی بات ہے کہ اللہ جس کو امام معصوم بنا دے گا اور تمام جہان پر اس کی ہر بات پر ایمان لانا فرض کرے گا تو بمقتضائے لطف و کرم کم سے کم اتنی حمایت اس کی ضرور کرے گا کہ وہ جھوٹ بولنے اور جھوٹی خوشامد کرنے پر

مجبور نہ ہو۔ اور اگر امام بنظر مصلحت کبھی جھوٹ بھی بولا کرے تو اس کے معصوم ہونے سے کیا فائدہ ہوا۔

اب ہم حضرات شیعہ سے پوچھتے ہیں کہ امام جعفر صادق اور امام موسیٰ کاظم نے جو اپنی امامت سے انکار کیا یہ جھوٹ تھا یا سچ اگر سچ تھا تو فی الواقع امام نہ تھے اس لیے کہ اپنی امامت سے انکار کرتے تھے اور اُن کا کلام سچا ہے اور اگر یہ قول اُن کا جھوٹ ہے تب بھی امام نہیں اس لیے کہ جس شخص کی زبان پر جھوٹ جاری ہو وہ ہرگز امام نہیں ہو سکتا۔

اس کی کیا وجہ کہ جب امام کا قول انکار امامت کا ثابت ہو جائے تو ہم امام کا یہ قول نہ مانیں اور شیعوں کا یہ قول مان لیں کہ امام نے بنظر مصلحت جھوٹ بولا ہے۔

رسول معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کی ایذائیں اٹھائیں مگر کبھی اپنی رسالت سے انکار نہیں کیا پس امام معصوم کو بھی یہ جائز نہ ہوگا کہ اپنی امامت سے انکار کرے اس لیے کہ جس طرح رسولؐ کا قول حجت ہے اسی طرح امام کا قول بھی حجت ہے۔ اور جو امام کسی کے سامنے اپنی امامت کا اقرار کرے اور کسی کے سامنے اپنی امامت کا انکار کرے وہ ہرگز امام نہیں اس لیے کہ اس کے قول کا اعتبار نہیں۔

اب فرض کرلو کہ اللہ ان ائمہ کی کچھ حمایت اور محافظت نہیں کرتا تھا اور اپنے لطف کو ان سے روک کر ان کو ایسی حالت میں بھی مبتلا کر دیتا تھا کہ وہ جھوٹ بولنے پر مجبور ہوں اور یہ جو اللہ نے فرمایا ہے وَهُوَ يَتَوَلَّى الصَّالِحِينَ

یعنی صالحین کا اللہ کارساز اور کفیل ہوتا ہے اُن صالحین میں ائمہ شامل نہ تھے اور اُن ائمہ کو صبر و تحمل بھی ایسا نصیب نہیں ہوتا تھا کہ حضرت سلمانؓ کی طرح ایذا اٹھاویں اور موت گوارا کریں مگر جھوٹ نہ بولیں اور امر حق کو بے دھڑک بیان کریں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔

اور اسم اعظم اور رسولؐ کے ہتیار اور عصائے موسیٰ اور خاتم سلیمان وغیرہ جو ان کے پاس تھے وہ بھی محض بے کار تھے اور اگرچہ حضرت علی نے ان چیزوں سے کبھی کبھی کچھ کام لیا تھا مگر ائمہ کچھ کام نہیں لے سکتے تھے تب بھی تو جھوٹ بولنا وہیں تک معاف ہوگا جہاں تک اس کی ضرورت ہوگی پس یحییٰ بن عبداللہ کے خط کا اگر امام موسیٰ کاظم کچھ جواب نہ دیتے اور اس کا خط پھاڑ کر پھینک دیتے تو ان پر کیا آفت آتی اور بے وجہ وہ امر حق سے کیوں انکار کرتے پس یہ یقینی بات ہے کہ امام موسیٰ کاظم نے جو کچھ لکھا وہ سچ لکھا انھوں نے کبھی امامت کا دعوےٰ نہیں کیا اور خلیفہ کی اطاعت بھی وہ واجب سمجھتے تھے اس لیے کہ اولی الامر کی اطاعت واجب ہے۔ چنانچہ جناب امیر نے بھی یہی فرمایا تھا کہ مجھے چھوڑ دو اور امامت کے لیے کسی اور کو ڈھونڈ لو شاید میں اس کی اطاعت تم سے زیادہ کروں گا۔

امام جعفر صادق نے جو اپنی امامت سے انکار کیا اس میں تقیہ کا خیال کسی طرح نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اُن دو آدمیوں سے کیا خوف تھا قطع نظر اس کے اللہ کی طرف سے اُن کو تقیہ کی ممانعت تھی چنانچہ عہد نامہ کا سر بمہر

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد اول

لفافہ جو ان کے لیے عرش سے اُترا تھا وہ اصولؒ کافی میں اس طرح منقول ہے:-

ثم دفعہ الی ابنہ جعفر ففك خاتما فوجد فیہ	پھر امام باقر نے دیا وہ لفافہ اپنے بیٹے جعفر کو انھوں نے اُس کی مہر توڑی تو اس میں یہ عبارت پائی۔
حدث الناس و افتهم وانشر علوم اهل بيتك۔	حدیث سُنا لوگوں کو اور انھیں مسائل کا فتوےٰ دے اور اپنے اہل بیت کے علوم کو شائع کر۔
وصدق آبائك الصالحين و لا تخافن الا الله وانت فے حرز و امان	اور تصدیق کر اپنے بزرگان صالحین کی اور اللہ کے سوا کسی سے ہرگز خوف نہ کر اور تو حفاظت اور امن میں رہے گا۔

پس ثابت ہوگیا کہ امام جعفر صادق علیہ السلام کو تقیہ منع تھا اور ان کو حکم تھا کہ بے خوف ہو کر دین کو ظاہر کر و اللہ تمھاری امن اور حفاظت کا ذمہ دار ہے۔ بھلا ایسی حالت میں امام جعفر صادق کو کس کا خوف تھا پھر وہ امر حق سے انکار کیوں کرتے ان کو تو حکم تھا کہ اپنے باپ دادا کی تصدیق کرو پھر اگر مسئلہ امامت حق تھا اور امام جعفر نے اس کا انکار کیا تو اپنے بزرگوں کی تکذیب کی۔

امام جعفر صادق تو ایسے صابر اور مستقل تھے کہ جب ان پر سخت

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص۱۷۱

تشدد کیا گیا اور جان اور مال اور اولاد کے تلف کر دینے کی دھمکی دی گئی اور قید میں بھیج دیا گیا اس وقت میں بھی انھوں نے تقیہ نہیں کیا۔ چنانچہ اصُول کافی[1] کے باب فیصلۃ المحق والمبطل میں مذکور ہے کہ عبد اللہ محض کے بیٹے محمد نے جب خروج کا قصد کیا تو زید شہید کا بیٹا عیسٰی اس کا بڑا معتمد اور وزیر تھا اس نے محمد سے اجازت لے کر امام جعفر صادق کو محمد سے بیعت کرنے کے لیے بُلوایا :۔

قال فواللہ لبثنا اذاتی بابی عبد اللہ علیہ السلام فقال لہ عیسی بن زید اسلم تسلم فقال ابوعبد اللہ احدثت نبوۃ بعد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ فقال محمد لا ولکن بایع تامن علی نفسك ومالك وولدك ولا تکلفن حربا فقال لہ ابو عبد اللہ یا ابن اخی علیك بالشباب ودع عنك الشیوخ فقال لہ محمد واللہ لا بد

عبد اللہ محض کا بیٹا موسٰی جو اس حدیث کا راوی ہے وہ کہتا ہے کہ تھوڑی دیر میں لوگ امام جعفر صادق کو لے آئے تو عیسٰی بن زید نے کہا کہ اطاعت قبول کر تاکہ سلامت رہے تو امام نے فرمایا کہ کیا تو نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کے بعد کوئی نئی نبوت نکالی ہے ؟ تو محمد بن عبد اللہ نے جواب دیا کہ نہیں اور لیکن بیعت کر تو تجھ کو جان اور مال اور اولاد کی امن ملے اور تجھ کو لڑنے کی تکلیف نہیں دی جائے گی تو امام جعفر صادق نے اس سے کہا کہ اے میرے بھتیجے جوانوں سے بیعت لے

[1] اصول کافی مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۲۹

من ان تبایع فقال ابوعبد اللہ واللہ والرحم ان تدیرعنا قال واللہ لتبایعنی طایعا او مکرھا ولا تحمد فی بیعتك فابی علیہ اباء شدیدا فامر بہ الحبس فقال لہ عیسی بن زید اما ان طرحناہ فی الحبس وقد خرب السجن ولیس الیوم غلق خفنا ان یھرب فیہ۔ فضحك ابو عبد اللہ علیہ السلام ثم قال لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

اور بوڑھوں کو چھوڑ دے۔ تو محمد نے اُن سے کہا کہ واللہ ضرور تجھ کو بیعت کرنی پڑے گی تو امام نے فرمایا کہ تجھ کو اللہ کی اور حق قرابت کی قسم ہے کہ تو ہم سے درگزر کر محمد نے کہا واللہ تجھ کو بیعت کرنا پڑے گی خوشی سے بیعت کر یا مجبوری سے۔ اور اگر تو نے مجبور ہو کر بیعت کی تو لوگ تیری اس بیعت کو پسند نہ کریں گے تو امام نے بیعت سے سخت انکار کیا تو محمد نے حکم کیا امام کو قید خانہ میں لے جانے کا۔ تو عیسٰی بن زید نے اس سے کہا کہ اگر ہم اس کو قید خانہ میں بھیجیں اور بے شک خراب ہو گیا ہے قید خانہ کا مکان اور سہس ہے اُس میں بندش ہم کو خوف ہے کہ یہ اُس میں سے بھاگ جاوے گا۔ تو ہنسے امام علیہ السلام پھر فرمایا کہ نہیں ہوتی حالت کی تبدیلی اور نہیں ہوتی قوت مگر اللہ غالب برتر کے حکم سے۔

اوتراك تسجنني قال نعم فالذي اكرم محمدا صلى الله عليه وآله بالنبوة لاسجننك ولاشددن عليك۔

کیا اے محمد تیری یہ رائے ہے کہ تو مجھ کو قید کرے گا؟ اُس نے کہا ہاں اور قسم ہے اُس اللہ برتر کی جس نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ کو نبوت کا شرف دیا البتہ میں تجھ کو قید کروں گا اور تجھ پر تشدد کروں گا

فقال عيسى بن زيد احبسوا في المحبا فقال ابوعبد الله عليه السلام اما والله اني سأقول ثم اصدق فقال له عيسى بن زيد لو تكلمت لكسرت فمك

تو عیسیٰ بن زید نے کہا کہ اس کو گودام کے مکانوں میں قید کر دو تو اُس سے امام نے فرمایا کہ میں ایک بات کہتا ہوں آخر کو وہی سچ ہوگی تو اُس سے عیسیٰ بن زید نے کہا کہ اگر تو نے بات کی تو میں تیرا منھ توڑ دوں گا۔

فقال له ابوعبد الله عليه السلام اما والله يا اكشف يا ازرق لكاني بك تطلب لنفسك جحرا تدخل فيه وما انت في المذكورين عند اللقاء واني لاظنك اذا صفق خلفك طرت مثل الهيق النافر فنفر عليه محمد

تو امام نے فرمایا کہ ہاں واللہ اے منحوس اے نیلی آنکھوں والے گویا یہ حالت میرے سامنے ہے کہ تو اپنی جان کے واسطے ایک سوراخ ڈھونڈتا ہوگا کہ اس میں پناہ لے اور نہیں ہے تو ان بہادروں میں جو لڑائی کے وقت یاد کیے جاتے ہیں اور میرا یہ گمان ہے کہ جب تیرے پیچھے تالی پیٹی جاوے گی تو تو شترمرغ کی طرح بھاگے گا

بانتهار احبسه وشدد عليه واغلظ عليه وقام اليه السراقي بن سلخ الحوت فدفع في ظهره حتى ادخل السجن واصطفى ما كان له من مال وما كان لقومه ممن لم يخرج مع محمد۔

تو مسلط کیا سپاہی محمد نے امام پر جھڑکنے کے لیے یہ حکم کیا کہ اس کو قید کر اور اس پر تشدد کر اور اس سے سخت کلامی کر اور اٹھا امام کی طرف سراقی بن سلخ الحوت پھر اُس نے امام کی پیٹھ میں دھکا دیا اور ان کو جیل خانہ میں داخل کیا اور ضبط کر لیا جو امام کے پاس مال تھا اور جو اُن کی قرابت والوں کے پاس مال تھا جنھوں نے محمد کے ساتھ خروج نہیں کیا تھا۔

اس قصہ پر غور کرو کہ محمد بن عبد اللہ کی طرف سے امام پر کیسی کیسی سختی کی گئی اور جان اور مال اور اولاد تلف کر دینے کی دھمکی دی گئی اور کیسی سخت زبانی اور شدت ہوئی آخر قید میں بھیج دیے گئے اور کل مال ان کا اور ان کے ساتھیوں کا ضبط کیا گیا مگر امام نے یہ تمام سختیاں جھیلیں اور تقیہ نہ کیا پھر بھلا کیوں کر ممکن ہے کہ یہی امام جعفر صادق دو آدمیوں کے خوف سے ایسا تقیہ کریں کہ اپنی امامت منصوص من اللہ سے انکار کر دیں پس اس میں کچھ شک نہیں کہ امام نے جو امامت سے انکار کیا وہ ان کا سچا کلام تھا، ہرگز جھوٹا نہ تھا اور وہ ہرگز ایسی امامت کے مدعی نہ تھے جو شیعوں نے فرض کر لی ہے اور چونکہ ایک امام کا قول سب اماموں کا قول ہوتا ہے پس،

ثابت ہوگیا کہ تمام ائمہ امامت فرض کردہ حضرات شیعہ سے انکار کرتے تھے۔

اب ہم کافی کی ایک طویل روایت کا حاصل نقل کرتے ہیں جس سے خلفائے ثلثہ کے بہت سے مناقب ثابت ہوتے ہیں اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بعض مشرکین عرب اور کسریٰ اور قیصر سے جہاد کیے ان کو اللہ کی طرف سے اس جہاد کی اسی طرح اجازت تھی جیسے مکہ کو فتح کرنے کی اجازت تھی اور چونکہ یہ جہاد خلفائے ثلثہ کے زمانہ میں واقع ہوئے اس سے ثابت ہوگیا کہ خلفائے ثلثہ امام عادل مفروض الطاعت تھے اس لیے کہ کافی کی کتاب[1] الجہاد میں امام جعفر صادق سے یہ بھی منقول ہے کہ جو امام مفروض الطاعت نہ ہو اس کے ساتھ ہو کر قتال کرنا ایسا حرام ہے جیسے مردار جانور کا گوشت یا خون یا خنزیر کا گوشت۔ اور اور جب خلفائے ثلثہ امام مفروض الطاعت ہو گئے اور اللہ کی طرف سے جہاد کی ان کو اجازت ہوئی تو ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کے واسطے جو نص امامت کا دعوے کیا جاتا ہے وہ خود بخود باطل ہوگیا۔

اب ہم اس حدیث طویل کا حاصل مطلب کافی کی کتاب[2] الجہاد سے نقل کرتے ہیں:۔

راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ اللہ کی طرف بلانا اور جہاد کے لیے لوگوں کو بلانا خاص کسی قوم سے مختص ہے یا ہر

[1] فروع کافی کتاب الجہاد مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۶۱۴ [2] ایضاً صفحہ ۶۰۹ ۱۲

شخص کو جو اللہ اور رسولؐ پر ایمان رکھتا ہو یہ جائز ہے کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاوے اور جہاد کی طرف بلاوے۔ امام نے فرمایا کہ یہ کام خاص ایک گروہ کا ہے ان کے سوا دوسرے کو حلال نہیں اور نہ کھڑا ہووے اس کام پر مگر وہی شخص جو اس گروہ میں سے ہو۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا وہ کون لوگ ہیں۔ امام نے فرمایا کہ جو شخص جہاد کی ان شرطوں پر قائم ہو جو اللہ نے مجاہدین پر فرض کی ہیں اسی کو یہ اجازت دی گئی ہے کہ لوگوں کو اللہ کی طرف بلاوے اور جو شخص ان شرطوں پر قائم نہ ہو اس کو نہ جہاد کی اجازت ہے نہ اللہ کی طرف کسی کو بلانے کی۔ راوی نے اس کی تفصیل پوچھی تو امام نے فرمایا کہ اللہ کی طرف بلانے والوں کے مراتب ہیں۔ اللہ خود بندوں کو اپنی طرف بلاتا ہے اور اس نے نبی کو بھی یہ حکم کیا ہے کہ اللہ کی راہ کی طرف لوگوں کو بلادیں اس کے بعد اس طویل روایت میں اصحاب اور اتباع رسول کے بہت سے مناقب منقول ہیں جن کو جہاد کی اجازت اللہ کی طرف سے تھی اور مجاہدین کی شرائط یہ مذکور ہیں کہ وہ گناہوں سے توبہ کرنے والے ہوں، شرک نہ کرتے ہوں، ہر حالت میں اللہ کی حمد کرتے ہوں، روزہ اور نماز اور امر معروف اور نہی منکر کے پابند ہوں اور ان کے واسطے اللہ نے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ وہ مظلوم ہوں چنانچہ آیت أُذِنَ[1] لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا میں ان کے لیے جہاد کی اجازت کا

[1] یہ آیت جزو ہفتدہم سورۂ حج میں واقع ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ جن مومنین سے کفار جنگ کرتے ہیں ان کو جہاد کی اجازت دی گئی اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ اللہ کو اپنا رب بتاتے تھے ناحق اپنے گھروں سے نکالے گئے ۱۲

ذکر ہے۔ اور کسی شخص کو اللہ کی طرف سے جہاد کی اجازت نہیں ہوتی جب تک
کہ وہ مظلوم نہ ہوا اور کوئی شخص مظلوم نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ مومن نہ
ہوا اور کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایمان کی شرائط اس میں موجود
نہ ہوں اور جو شخص شرائط ایمان میں کامل نہ ہو وہ خود ظالم ہے اور اُس پر مومنین
کو جہاد واجب ہے اور اُس کو ہرگز اللہ کی طرف سے جہاد کرنے کی اجازت
نہیں ہے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا کہ آیت اُذِنَ لِلَّذِیْنَ
یُقَاتَلُوْنَ الخ اُن مہاجرین کے حق میں نازل ہوئی تھی جن پر مشرکین مکہ
نے ظلم کیا تھا پس جن لوگوں نے مشرکین مکہ کے سوا دوسرے قبائل عرب سے جہاد
کیا اور کسریٰ اور قیصر سے جہاد کیا ان کا کیا حال ہوگا؟

امام نے فرمایا کہ:۔

"مہاجرین پر دو طرح ظلم ہوا ایک یہ کہ اہل مکہ نے
اُن کو اُن کے گھروں اور جائدادوں سے نکالا، پس اہل
مکہ سے انھوں نے اللہ کے اذن کے بموجب قتال کیا
دوسرے یہ کہ کسریٰ اور قیصر وغیرہ قبائل عرب و عجم نے
بھی اُن پر ظلم کیا اس لیے کہ کسریٰ اور قیصر وغیرہ کے پاس
جو نعمتیں ہیں ان کے حق دار مومنین تھے اور مومنین کو

اُن نعمتوں سے محروم کر کے کسریٰ اور قیصر وغیہ
نعمتوں پر قبضہ کرنا ظلم تھا پس کسریٰ اور قیصر و
بھی اُن مہاجرین نے اللہ کے اذن کے مطابق
اور اسی آیت کی حجت سے ہر زمانہ کے مومن
قتال جائز ہے۔"

چنانچہ اس مضمون کی عبارت اصل حدیث کی ہم بعینہ نقل
امام جعفر صادق کا قول ہے:۔

المهاجرين ظلموا من جهتين
ظلمهم اهل مكة باخراجهم
من ديارهم واموالهم
فقاتلوهم باذن الله لهم في
ذلك وظلمهم كسرى وقيصر
ومن كان دونهم من قبائل
العرب والعجم بما كان في
ايديهم مما كان المؤمنون احق
به منهم

مہاجرین پر دو طرح ظلم کیا گ
پر اہل مکہ نے اس طرح کہ اُ
گھروں اور جائدادوں سے
نے اہل مکہ سے قتال اس سب
نے ان کو اس قتال کا اذن
کیا ان پر کسریٰ اور قیصر او
دوسرے قبائل عرب و عجم
اس دولت کے جو ان کے ا
زیادہ مستحق بمقابلہ ان کا فرو

فقد قاتلوهم باذن الله عز وجل لهم في ذلك و بحجة هذه الآية يقاتل مومنوا كل زمان

پس مہاجرین نے کسریٰ اور قیصر وغیرہ سے بھی جہاد کیا اس لیے کہ اللہ نے اس کا ان کو اذن دیا تھا اور اسی آیت کے مطابق ہر زمانہ کے مومنین قتال کرسکتے ہیں۔

اب اہل انصاف ملاحظہ فرماویں کہ کسریٰ اور قیصر سے قتال کرنے والا خلفائے ثلاثہ کے سوا اور کون تھا۔ پس انھیں خلفا اور ان کے ساتھیوں کی نسبت امام جعفر صادق نے یہ ارشاد فرمایا کہ وہ مہاجرین تھے اور ان پر اہل مکہ نے بھی ظلم کیا تھا اور کسریٰ اور قیصر وغیرہ نے بھی ظلم کیا تھا اور ان سب سے انھوں نے اللہ کے حکم کے مطابق قتال کیا اور اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وہ امام عادل تھے ورنہ ان کے ساتھ ہوکر قتال جائز نہ ہوتا اور ان کا جہاد اللہ کے حکم کے مطابق نہ ہوتا اور نیز وہ مومن کامل اور جہاد کی شرائط سے موصوف تھے۔ الحمد للہ علی ثبوت المطلوب۔

امام جعفر صادق نے صاف فرمایا جنھوں نے قیصر و کسریٰ کو کردیا پامال
مجاہدین کے اوصاف سے تھے وہ موصوف کیا انھوں نے باذن خدا جہاد و قتال
مناقب خلفا کا ہوا ثبوت ایسا
کہ منکروں کو بھی انکار کی رہی نہ مجال

کسریٰ فارس کے بادشاہ کا لقب ہے اور جب یہ ثابت ہوچکا کہ مسلمانوں نے جو فارس پر جہاد کیا وہ اللہ کے اذن کے مطابق تھا اور جو ملک کسریٰ سے چھینا وہ ان مجاہدین کا حق تھا تو یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ حسب تفسیر

امام معصوم یہ بشارت قرآن میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ اللہ نے خبر دی ہے کہ مسلمان اللہ کی مدد سے ملک فارس کو فتح کریں گے اور مومنین اُس سے خوش ہوں گے یہ اللہ کا وعدہ ضرور پورا ہوگا۔ کافی[1] کی کتاب الروضہ میں منقول ہے:-

عن ابی عبیدة قال سالت ابا جعفر عن قول الله عز و جل الٓمٓ غلبت الروم فقال ان لهذا تاویلا لا یعلمه الا الله والراسخون من آل محمد

ابو عبیدہ سے روایت ہے وہ کہتا ہے کہ میں نے امام باقر علیہ السلام سے آیۃ (الٓمٓ غلبت الروم) کے معنے پوچھے تو امام نے فرمایا کہ اس آیت کے معنی ایسے ہیں کہ نہیں جانتا ان کو مگر اللہ اور کامل علم والے آل محمدؐ سے۔

الٓمٓ غُلِبَتِ الرُّومُ[2] فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وهی الشامات وما حولها وَهُمْ یعنی فارس مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیُغْلَبُوْنَ[3] یعنی یغلبهم

مغلوب ہوگئی روم قریب کی زمین میں اور وہ ممالک شام اور اس کے پاس کے ملک تھے (جو فارس کی حد پہ تھے اور شاہ فارس نے ان کو فتح کیا تھا) اور وہ (یعنی اہل فارس) بعد غالب

[1] کافی کی کتاب الروضہ مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۲۷۔ [2] یہ آیت اکیسویں پارہ میں سورۂ روم کے شروع میں واقع ہے ۱۲ [3] قرآن مروجہ میں لفظ (سیغلبون) بفتح یا و کسر لام بصیغہ معروف لکھا ہے مگر اس روایت میں ضم یا و فتح لام یعنی صیغہ مجہول کی قرأت اختیار کی گئی ہے ۱۲

المسلمون فی بضع سنین

ہونے کے جلد مغلوب ہوں گے (یعنی غالب ہوں گے اُن پر مسلمان) چند سال کے بعد۔

لله الامر من قبل ومن بعد ويومئذ يفرح المومنون بنصر الله ينصر من يشاء فلما غزا المسلمون فارس وافتتحوها فرح المسلمون بنصر الله قال قلت اليس الله عز وجل يقول في بضع[1] سنين وقد مضى للمومنين سنون كثيرة مع رسول الله صلى الله عليه واله وفي امارة ابي بكر وانما غلب المومنون فارس في امارة عمر فقال الم اقل لكم ان لهذا تاويلا وتفسيرا لله المشية في القول ان يوخر ما قدم ويقدم ما اخر في القول الى يوم

اللہ کے لیے ہے حکم پہلے سے اور پیچھے سے اور اُس دن خوش ہوں گے مومنین اللہ کی مدد سے اللہ مدد کرتا ہے جس کی چاہتا ہے۔ پھر جب کہ جہاد کیا مسلمانوں نے فارس کا اور اس کو فتح کیا تو مسلمان اللہ کی مدد کرنے سے خوش ہوئے۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے پوچھا کہ کیا اللہ نے چند سال کا ذکر نہیں کیا اور بے شک گزرے مومنین کے لیے بہت سے برس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ اور خلافت ابی بکرؓ میں اور نہیں غالب ہوئے مومنین فارس پر مگر زمانہ خلافت عمرؓ میں۔ تو امام نے فرمایا کہ کیا میں نے تجھ سے نہیں کہہ دیا کہ اس آیت کی خاص تاویل اور تفسیر ہے اللہ کو اختیار رہے

[1] (بضع) دس سے کم کو کہتے ہیں ۱۲

يحتم القضاء بنزول النصر على المومنين۔

قول میں یہ کہ پیچھے کردے اس پہلے ہونا بیان کیا ہے اور پ اس کو جس کا پیچھے ہونا بیان ک دن تک کہ قطعی طور پر حکم جار مومنین پر مدد نازل کرنے کا۔

اس روایت سے ثابت ہوا کہ اللہ کی مدد سے عم سلطنت کسریٰ یعنی ملک فارس کو فتح کیا اور مومنین اس فتح خوش ہوئے اور یہ ایسی خوشی تھی جس کی پہلے سے اللہ نے قرآن میں تھی اور وعدہ کیا تھا۔

اب اسی کی تائید میں ایک دوسری روایت رو میں موجود ہے:-

عن ابی عبد الله علیه السلام قال لما حفر رسول الله صلى الله عليه وسلم الخندق مروا بكدية فتناول رسول الله صلى الله عليه وسلم المعول من يد امير المومنين عليه السلام او من يد سلمان۔

امام جعفر صادق علیہ السلام ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ نے خندق کھودی تو ایک پتھر تو لے لیا رسول اللہ صلی اللہ عل نے تیشہ امیر المومنین علیہ ا ہاتھ سے یا سلمان کے ہاتھ سے

[1] روضہ کافی مطبوعہ لکھنؤ ص۲۹

فضرب بھا ضربۃ فتفرقت بثلث فرق فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ لقد فتحت علیّ فی ضربتی ھذہ کنوز کسری وقیصر

پھر اس کی ایک ضرب ماری تو اُس پتھر کے تین ٹکڑے ہو گئے تو فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے بے شک فتح ہو گئے مجھ پر میری اس ضرب میں خزانے کسریٰ اور قیصر کے۔

کسرے فارس کے بادشاہ کو کہتے ہیں اور قیصر روم کے بادشاہ کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کسرے اور قیصر کے خزانے مجھ پر فتح ہو گئے اور درحقیقت وہ خلفاء کے زمانہ میں فتح ہوئے پس ثابت ہوا کہ خلفا کے ہاتھ پر فتح ہونا رسولؐ کے ہاتھ پر فتح ہونا تھا اس لیے کہ خلفا نائب رسول تھے۔

یہ بھی منقول ہے کہ کسرے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کا نامۂ مبارک چاک کر دیا تھا اور اس کے جواب میں تھوڑی سی خاک بھیج دی تھی۔ چنانچہ حیات[1] القلوب میں لکھا ہے :-

"وبروایت دیگر مشت خاکے از برائے آں حضرتؐ فرستاد۔ حضرتؐ فرمود کہ امت من بزودی مالک زمین اوخواہد شد چنانکہ خاک از برائے من فرستاد۔"

یہ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر یہ وعدہ پورا ہوا اور جو گستاخی کسرے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں

[1] حیات القلوب مطبوعہ لکھنؤ جلد دوم ص۴۱۹۔

کی تھی اُس کا انتقام حضرت عمرؓ نے لیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں خلفا کو امر خلافت سے متعلق خاص خاص ضروری ہدایتیں بھی فرما گئے تھے۔ چنانچہ حیات القلوب[1] میں لکھا ہے :-

"کلینی بسند معتبر از حضرت صادق روایت کردہ است کہ جبرئیل امین از جانب خداوند عالمیاں خبر وفات حضرت رسولؐ را آوردہ در وقتے کہ آں حضرتؐ را ہیچ دردے و المے نبود۔ پس حضرت رسولؐ فرمود کہ درمیان مردم ندا کردند کہ جمع شوند مہاجران و انصار را حکم فرمود کہ اسلحہ خود را بپوشند۔ چوں مردم جمع شدند حضرت بر منبر آمد و خبر فوت خود را بایشاں گفت و فرمود کہ خدا را بیاد کسے می آورم کہ بعد از من والی شود بر امت من کہ البتہ رحم کند بر جماعت مسلماناں و پیران ایشاں را بزرگ شمارد و ضعیفان ایشاں را رحم کند و عالم ایشاں را تعظیم نماید و ضرر بایشاں نہ رساند کہ باعث مذلت ایشاں گردد و فقیر نگرداند ایشاں را کہ مورث کفر ایشاں شود و در خود را بر روئے ایشاں نہ بندد کہ اقویائے ایشاں بر ضعیفاں مسلط شوند و ایشاں را در سرحد کافراں بسیار حبس نہ نماید

[1] حیات القلوب مطبوعہ لکھنؤ جلد ۲ ص۲۴۹

کہ باعث قطع نسل امت من گردد. پس فرمود کہ تبلیغ
رسالت کردم و خیرخواہی شما بجا آوردم پس ہمہ گواہ
باشید. حضرت صادق فرمود کہ ایں آخر سخنے بود کہ آنحضرتؐ
برمنبر گفت۔"

یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری وصیت تھی اور تمام مطالب
اُس کے معاملہ خلافت سے متعلق تھے بایں ہمہ حضرت علیؓ کی نص امامت
کا اُس میں ذکر نہیں اس سے ثابت ہوگیا کہ نص امامت جس کا شیعوں
نے خیال باندھ لیا ہے باطل ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ نے خلیفہ کو معین نہ کیا بلکہ یوں فرمایا کہ
جو کوئی میرے بعد والی ہو اُس کے لیے یہ وصیت ہے۔ یہ دلیل اس
بات کی ہے کہ امر خلافت کو بظاہر مشورۂ مومنین پر چھوڑا پس مذہب
اہل سنت بخوبی ثابت ہوگیا مگر دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
کو امر تقدیری معلوم تھا کہ پہلے خلیفہ ابوبکرؓ ہوں گے اس لیے وہ دل میں
جانتے تھے کہ یہ وصیت خاص ابوبکرؓ سے ہے۔ سیاق کلام سے صاف
ظاہر ہے کہ رسولؐ خلیفہ سے بھی راضی تھے اور اپنی امت سے بھی راضی تھ
ورنہ غاصب خلیفہ سے اس طرح کلام نہ کرتے بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا یہی
تاکید کرتے کہ خلافت حق علیؓ ہے کہ کوئی اس امر میں مزاحمت نہ کرے اور
امت کے لوگ اگر مرتد ہو جانے والے ہوتے جیسے کہ شیعوں کا گمان ہ
تو ان کی اس طرح سفارش نہ کرتے اور یہ جو فرمایا کہ میری فوج کو دشمن کے

ملک میں زیادہ نہ روکنا، یہ وصیت تو غاصب خلافت سے کسی طرح م
نہ تھی اس لیے کہ اس کو کافروں پر جہاد کرنا اور امت کو اس کے ساتھ ش
ہو کر جہاد کو نکلنا شرعاً جائز نہ تھا. پس غاصب خلیفہ سے اگر کہتے تو یہ ک
وہ ہرگز جہاد کا ارادہ نہ کرے اور امت سے کہتے کہ اگر علیؓ کے سوا
اور خلیفہ بن جاوے تو اس کے ساتھ شریک ہو کر لڑنا مستحق
بنا ہے۔

اسی قسم کی ایک وصیت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسل
جہاد خلفاء سے متعلق ہے حیات[1] القلوب میں بحوالۂ ابن شہر آشو
منقول ہے:۔

"فرمود کہ چوں مصر را فتح کنید قبطیاں را نکشید کہ ماریہ مادر
ابراہیم از ایشان ست و فرمود کہ رومیہ را فتح خواہید کرد
چوں آں را فتح کنید کلیسائیکہ در جانب شرقی آں واقع است
آں را مسجد کنید۔"

بھلا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس قسم کی وصیتیں اُن لوگوں
کیوں کرتے جن کی لڑائیاں جہاد نہ ہوں بلکہ شرعاً ناجائز ہوں۔ حیات الق
میں لکھا ہے:۔

ابن شہر آشوب وغیر او روایت کردہ
اند کہ روزے آں حضرتؐ نظر کرد،

ابن شہر آشوب وغیرہ نے روایت ک
کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ عل

[1] حیات القلوب جلد دوم مطبوعہ لکھنؤ ص ۲۴۸ [2] ایضاً

بسوئے ذراعہائے سراقہ بن مالک کہ باریک وپُر موبود و پس فرمود کہ چگونہ خواہد بود حال تو کہ دست رنجہائے بادشاہ عجم را در دست ہائے خود کردہ باشی پس چوں در زمان عمرؓ فتح مداین کردند عمرؓ او را طلبید و دست رنجہائے بادشاہ عجم را در دست ہائے او کرد

نے مالک بن سراقہ کے بازوؤں کو دیکھا کہ پتلے تھے اور اُن پر بال بہت تھے تو فرمایا کہ اس دن تیرا کیا حال ہوگا جب کنگن بادشاہ عجم کے تو اپنے ہاتھوں میں پہنے گا۔ توجب عمرؓ کے زمانہ میں مداین کو فتح کیا، عمرؓ نے اس کو بلایا اور بادشاہ عجم کے کنگن اُس کے ہاتھوں میں ڈالے۔

اگر حضرت عمرؓ اور ان کے رفقا مجاہدین کی شرط اور صفات سے موصوف نہ مانے جائیں تو جو مال غنیمت انھوں نے حاصل کیا وہ مال مغصوب سمجھا جائے گا پس کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سراقہ کو مال مغصوب حاصل کرنے کی بشارت دے گئے تھے۔

اس مقام پر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ اسی ملک فارس کی شاہزادی حضرت عمرؓ کے سامنے من جملہ مال غنیمت کے آئی اور اس کو اختیار دیا گیا تھا کہ جس کو پسند کرے اسی کے حصہ میں دے دی جائے چنانچہ اُس نے امام حسین علیہ السلام کو پسند کر لیا اور حضرت علیؓ نے اُس کا نام شہربانو رکھا اور امام زین العابدینؓ اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یہ تمام قصہ اصول کافی میں مذکور ہے۔ اب اگر فارس کا جہاد جائز نہ تھا اور مجاہدین شرائط جہاد سے موصوف نہ تھے تو وہ بھی مال مغصوب سمجھی جائے گی۔

ان تمام روایات کے ساتھ آیت استخلاف[1] کو ملاؤ جس کو جناب امیر نے بھی حضرت عمرؓ کی خلافت پر صادق کیا تھا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وعدہ کو یاد کرو کہ آپؐ نے خانہ کعبہ میں حجر اسمٰعیل پر کھڑے ہو کر سب سے پہلے قریش کو دین اسلام کی دعوت دی تو یہ فرمایا کہ اگر تم شرک کو چھوڑ کر ایمان قبول کر لوگے تو عرب کے بادشاہ بنوگے اور اہل عجم بھی تمھارے فرمانبردار ہو جائیں گے اور بہشت میں بھی تم بادشاہ بنوگے۔

ان تمام مطالب پر بنظر انصاف تامل کرنے کے بعد اُن مسلمانوں کو جو تعصب سے خالی ہوں یقین قطعی ہو جاتا ہے کہ نص امامت علیؓ جس کا شیعہ دعویٰ کرتے ہیں باطل ہے اور خلفائے ثلٰثہ کی خلافت برحق اور موعود من اللہ تھی۔

آیت استخلاف کے سوا قرآن کی اور بھی بہت سی آیتیں ہیں جن میں حقیّت خلافت خلفاء راشدین اور فضائل مہاجرین وانصار اور مناقب تمام صحابہ عموماً نہایت وضاحت کے ساتھ مذکور ہیں اور چونکہ وہ آیات تمام علمائے مناظرین نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں اور ان کی بحث علما میں مشہور ہے اس لیے اس مختصر کتاب میں ہم نے اُن کے ذکر کی ضرورت نہ سمجھی۔

خلفاء ثلٰثہ کے جہاد جو بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہوئے جن کی وجہ سے انھوں نے اکثر اطراف عالم کو دار الاسلام بنا دیا یہ فضیلت انھیں خلفا سے مختص ہے اور جو فضائل مجاہدین کے قرآن مجید میں مذکور ہیں اُن کے

---

[1] دیکھو نصیحۃ الشیعہ جلد دوم

درجۂ اعلیٰ کے مستحق یہی ہیں۔ حضرات شیعہ خلفاء ثلثہ کی اس فضیلت کو کسی طرح نہیں چھپا سکتے اور بڑا جواب ان کی طرف سے یہی ہے کہ ان تینوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے ساتھ ہو کر اپنے ہاتھ سے جنگ نہیں کی، اس کا مفصل جواب ہم جلد ثانی میں لکھ چکے ہیں اور ثابت کر چکے ہیں کہ اگرچہ رواتِ شیعہ نے تعصب اور عناد کی وجہ سے ان کی لڑائیوں کو چھپایا مگر اہل سنت کی روایتوں سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر بھی انھوں نے جہادوں میں اکثر قتال کیا ہے۔ روایات سابقہ کے علاوہ ایک روایت ان کے قتال کی اس موقع پر بھی نقل کی جاتی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ غزوۂ حنین میں حضرت ابوبکر اور عمر اور عثمان اور علی رضی اللہ عنہم میں کہ ایک ایک نے دس اور کئی ہاتھ تلوار کے دشمنوں پر مارے۔

علامہ زرقانی نے شرح مواہب اللدنیہ میں بحث غزوۂ حنین میں لکھا ہے:۔

روی البزار عن انس ان ابابکر وعمر وعثمان وعلیا ضرب منہم بضعۃ عشر ضربۃ۔	روایت کی ہے بزار نے انسؓ سے کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ اور علیؓ میں کہ ہر ایک نے دس پر کئی ضربیں لگائیں۔

وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ

کتبہ محمد ایوب ناشرؔ
بھاگلپور